مرزا سلامت علی دبیر

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

مرزا سلامت علی دبیر

حیات اور کارنامے

مرزا سلامت علی دبیر

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو اور سارے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی اس زبان کے جاننے والوں کی ضرورتیں جہاں تک ممکن ہو سکے پوری کی جائیں، اور نصابی و غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی اپنی اہمیت ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اُسے سماجی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی سے جوڑنا بھی ضروری ہے اور علوم انسانیہ سے بھی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مرزا دبیر اردو شعر و ادب خصوصاً مراثی میں انیسویں صدی کے ایک اہم شاعر ہیں۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت تھی۔ اس کتاب میں مرزا دبیر کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا غیر جانبدار مطالعہ کیا گیا ہے۔ تاہم اخذ کردہ نتائج حرفِ آخر نہیں ہیں؛ کیونکہ تحقیق میں کوئی نتیجہ حرفِ آخر نہیں ہوا کرتا۔ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ مرزا دبیر کا کتنا کلام مطبوعہ اور کتنا غیر مطبوعہ ہے اور یہ کہ 'دفتر ماتم' کی کتنی جلدیں شائع ہوئیں اور کتنی کہاں دستیاب ہیں۔ اسی طرح مرزا دبیر کی نثری تصانیف 'ابواب المصائب'، 'شمس الضحیٰ' اور 'المیزان' اب نایاب ہیں گو کہ برصغیر کی تمام اہم یونیورسٹیوں میں اُردو مرثیے داخل نصاب ہیں، جس میں مرزا دبیر کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن متذکرہ بالا کتب تو کجا مرثیے کی صنف پر اہم کتابیں تک دستیاب نہیں، سوائے مولانا شبلی کی تصنیف 'موازنۂ انیس و دبیر' کے۔ اس کتاب میں مرزا دبیر اور ان کے فکر و

فن پر سات ابواب میں بحث کی گئی ہے جن میں ان کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، دبیرؔ کے کلام کی اہم خصوصیات، دبیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی، ان کی نثر نگاری اور ادبی مرثیے کا تعین شامل ہیں۔

قوی امید ہے کہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ اہل علم سے گذارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

والدہ معظّمہ

کی خدمت میں

عرض حال

مرزا دبیر اردو شعر و ادب میں انیسویں صدی کی ایک اہم اور قد آور شخصیت ہیں مگر ان پر اب تک بہت کم کام ہوا ہے۔

زیر نظر کتاب مرزا دبیر کے حالات زندگی اور کارناموں کے غیر جانبدارانہ مطالعے پر مبنی ہے، جو شواہد اور مواد راقم السطور حاصل کر سکا اس سے نتائج اخذ کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کون سی ایسی حقیقت سامنے آئے جو علم و ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کو اپنا نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کر دے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مرزا دبیر کے حالاتِ زندگی، مختلف شواہد کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں مرزا دبیر کے شعری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مرثیہ، اس کی روایت اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں کلامِ دبیر کی دیگر خصوصیات کا ذکر ہے۔ پانچویں باب میں مرزا دبیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مراثی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں مرزا دبیر کی نثرنگاری کا جائزہ اور ساتویں باب میں ان کے ادبی مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱ پہلی بار کافی تعداد میں مرزا دبیر کی غزلیں (غیر مطبوعہ) منظر عام پر آئی ہیں۔

۲ مرزا دبیر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۳ مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ قصائد کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴ غیر مطبوعہ فارسی نثری تصانیف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۵ حضرت موسیٰ کاظم کے حال کا ایک طویل مرثیہ دریافت کیا گیا ہے جس کا مطلع افضل حسین ثابت کو دستیاب نہ ہوسکا تھا۔

امید ہے کہ یہ کتاب اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً اور اردو مرثیے سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے خصوصاً توجہ طلب ثابت ہوگی۔ راقم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہے۔ بعض مسائل و مباحث میں اختلاف رائے کی گنجائش ہوسکتی ہے، چند جگہوں پر اضافوں کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن اس احساس سے اطمینان ہے کہ میں نے کسی طرح کے تعصب کو اپنے کام میں دخیل نہیں ہونے دیا ہے۔

کتاب کی تیاری میں بعض بزرگوں اور دوستوں کی امداد شامل حال رہی ہے خاص طور پر قاضی عبدالودود، علامہ جمیل مظہری، پروفیسر سید مسعود رضوی ادیب، علامہ مجتبیٰ حسن کاموںپوری، پروفیسر آلِ احمد سرور، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر اکبر حیدری اور سید زوار حسین زیدی (لاہور) کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے کئی موقعوں پر امداد بہم پہنچائی۔ بعض غیر مطبوعہ مواد تک رسائی محبی محمد رشید اور مکرمی نواب سید علی جعفری کے ذریعے ممکن ہوئی لیکن یہ مہم ہرگز سر نہیں ہوسکتی تھی اگر مرزا دبیر کے پڑپوتے مرزا صادق اور ان کے صاحبزادوں محمد آغا اور گوہر آغا نے تمام تکلفات و حجابات ایک طرف رکھ کے دبیر کے کلام کا بستہ ہی میرے سامنے نہ رکھ دیا ہوتا جس سے اس کام کی آبرو میں اضافہ ہوا۔

کتاب کی تیاری میں مرزا امیر علی جونپوری کے بعض مخطوطات سے مدد ملی۔ برادرم شبیب رضوی کی عربی دانی نے مجھے متعدد اغلاط سے محفوظ رکھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر جعفر رضا سے جو مدد ملی وہ شکریے سے بالاتر ہے۔

برادران عزیز مرزا علی محمد، مرزا غلام حسن، سید فدا حسین اور مرزا محی الدین نے لکھنؤ، کلکتہ، مرشد آباد اور پٹنہ کے قیام کی سہولتیں فراہم کیں، اپنی قوت بازو کا شکریہ کون ادا کرے گا۔

اس کتاب کی خوش قسمتی ہے کہ دور و نزدیک سب نے پڑھی اور جنھوں نے نہیں پڑھی انھیں اس کے پڑھنے کی خواہش بیقرار کیے ہوئے ہے۔ یعنی قومی اردو کونسل کا شکر

گزار ہوں کہ کتاب کی یہ تیسری اشاعت اس کے اہتمام سے ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ (ڈائریکٹر، قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) اور مسرت جہاں (متعلقہ ریسرچ اسسٹنٹ) کے متواتر تقاضوں نے ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ جس نے اس کتاب کو اشاعت کے لیے تیار کرادیا اور میں اس منزل پر پہنچ گیا کہ کہہ سکوں ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

آخر میں ایک تو قومی اردو کونسل کا شکریہ جس نے اس کتاب کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کرلیا۔ دوسرے عابد حسین قادری اور عزیزم محمد موسیٰ رضا کا بھی شکریہ جنھوں نے بڑی محنت سے اس کی کمپوزنگ کی اور شاگردانِ عزیز ڈاکٹر منصور احمد میر اور نصرت جان کا شکریہ جنھوں نے اس کتاب کے پروف پڑھنے اور تصحیح کرنے میں مدد کی۔ جناب ایس اے رحمٰن نے بھی اس کتاب کے پروف پڑھ کے نہ صرف اپنے صبر کو آزما لیا بلکہ اس کتاب کی آبرو بڑھا دی۔

سب سے آخر میں اور سب سے زیادہ آپ کا شکریہ کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔

سری نگر — پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ
۶ اگست ۲۰۰۴ء

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی بازیافت

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں 1803ء میں پیدا ہوئے اور 2003ء میں پوری دنیا میں ان کا دوصد سالہ جشن ولادت منایا گیا۔ اس سلسلے میں دنیا کے مختلف ملکوں میں مذاکرات، مباحثے اور مسالمے ہوئے۔ یہ تقاریب محض انیسؔ و دبیرؔ کی مرثیہ گوئی تک محدود نہیں رہیں بلکہ صنف مرثیہ اور مجلس کی روایت اور زبان اردو کے فروغ کے سلسلے میں بہت فعال ثابت ہوئیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے واسطے سے سارے جہاں میں زبان اردو کی دھوم ہوئی۔

اس سلسلے کا سب سے بڑا سمینار لندن میں ہوا، جس کا اہتمام انیسؔ و دبیرؔ اکیڈمی لندن نے کیا تھا۔ اس سمینار میں مختلف ممالک کے لوگوں نے شرکت کی اور نہ صرف انیسؔ و دبیرؔ کے کارناموں پر سیر حاصل مقالے پڑھے گئے، بلکہ مرثیہ خوانی ہوئی۔ سوز خوانی سے لوگوں کو واقفیت کرائی گئی اور ان مختلف اصناف سخن کا ذکر کیا گیا، جن میں ان دو عظیم شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس سمینار میں ماہنامہ 'صدا' اردو اکیڈمی لندن اور روزنامہ 'نیشن' لندن کا تعاون حاصل رہا۔

افتتاحی اجلاس میں انیسؔ و دبیرؔ اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر اقبال مرزا نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے وقت اس بات کو دہرایا کہ انیس و دبیر جیسے بڑے فنکاروں نے اپنے کارناموں سے اردو زبان کو بین الاقوامی زبانوں کی صف میں شامل ہونے کے امکانات دو سو سال پہلے روشن کیے۔ ایک خاص بات جو اس موقعے پر انھوں نے کہی، وہ یہ تھی کہ اردو زبان کو بین الاقوامی سطح پر مقبول بنانے میں خواتین کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا مردوں کا ہے، بلکہ خواتین کا حصہ کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس سمینار میں جن لوگوں نے مقالات پیش کیے ان میں کینیڈا کے ممتاز ادیب محقق اور ناقد ڈاکٹر تقی عابدی، جناب محمد رضا شمر (لندن)، پروفیسر سحر انصاری (کراچی)، پروفیسر قمر جہاں (بنارس)، عبدالستار دلوی (بمبئی یونیورسٹی، بمبئی)، ڈاکٹر غیور جعفری، جناب اشفاق حسین (لندن)، پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ (سری نگر، کشمیر)، ڈاکٹر ابن کنول (دہلی)، رضا علی عابدی (لندن)، محمودالحسن رضوی (لکھنؤ) شامل ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کسی مجبوری کے سبب خود تو نہیں آسکے تھے؛ اس لیے ان کا مقالہ ڈاکٹر ظفر احسن زیدی (لندن) نے پڑھ کر پیش کیا۔ یہ مرزا دبیر کی رباعیات پر ایسا سیر حاصل مقالہ تھا جس سے نہ صرف صنف رباعی کے امکانات واضح ہوئے، بلکہ مرزا دبیر کے تصور اخلاق کو انتہائی عرق ریزی کے ساتھ ان کی رباعیات میں تلاش کیا گیا تھا۔ پروفیسر سحر انصاری نے مرزا دبیر کے منفرد اسلوب بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اپنے عہد کا عظیم شاعر قرار دیا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے مرزا دبیر کی نثر نگاری پر مقالہ پیش کر کے بعض اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ خاص طور سے مرزا دبیر کی تصنیف 'ابواب المصائب' اور فصیح کی 'نخل ماتم' کا موازنہ شرکاء نے بہت سراہا۔ انھوں نے اس بات کا ذکر بھی کیا کہ مرزا دبیر نے جب 'ابواب المصائب' تصنیف کی تو اس کے کوئی بیس سال بعد غالب نے اردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ ان کے مقالے میں رسالۂ مرزا دبیر کا بھی ذکر آیا جو انھوں نے مرثیہ پر اعتراض کرنے والوں کے جواب میں لکھا تھا، اور دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں لکھا یا کہا جانے والا مرثیہ یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی رنگ کو ضرور لیے ہوئے ہوگا۔

جناب محمد رضا شمر (ٹرسٹی، محمدی ٹرسٹ، لندن) نے میر انیس کے یہاں متصوفانہ آثار کی نشان دہی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میر انیس اس دور کی شعری روایت سے الگ نہیں تھے۔ دلی سے آئے ہوئے ڈاکٹر ابن کنول نے 'کلام انیس' میں ہندوستانی مشترکہ تہذیبی عناصر کی تصویر پیش کرتے ہوئے، ان کے مراثی میں ان رسموں اور رواجوں کی نشان دہی کی جو مرثیے کو یہاں کے عوام کے ساتھ جوڑے ہوئے ہیں۔

اس سمینار کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ انیس اور شکسپیئر کے بعض متماثل شعری مناظر کو ڈاکٹر اقبال مرزا اور ان کے صاحبزادے محسن مرزا نے پڑھ کے پیش کیا۔ جس سے سامعین

بہت متاثر ہوئے۔ اس موقعے پر سوز خوانی کا بھی اہتمام ہوا اور لوگ اس بات پر تعجب کر رہے تھے کہ لندن میں پڑھنے اور رہنے والے لڑکے ہندوستانی روایات کے ساتھ خاصے جڑے ہوئے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مرثیہ خوانی لندن میں نہیں بلکہ دلی یا لکھنؤ میں ہو رہی ہے۔ اس سمینار کے اہتمام میں جناب صفدر جعفری اور ڈاکٹر یوسفی عابدی کی خدمات کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اسی طرح سے ناروے میں بھی مرزا دبیرؔ کی خدمات پر ایک سمینار کا انعقاد ہوا، جس میں کئی ملکوں سے علماء اور ادباء نے شرکت کی۔ انیسؔ و دبیرؔ کے حوالے سے ایک سمینار برمنگھم میں بھی ہوا، جس کا اہتمام عاشور کاظمی نے کیا تھا۔ یہ سمینار اگرچہ جشن اردو سے جڑ گیا تھا مگر جو نتیجہ سامنے آیا وہ یہی تھا کہ کوئی جشن اردو انیسؔ و دبیرؔ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی کے اہتمام سے انیسؔ و دبیرؔ کے کارناموں پر ایک بین الاقوامی سمینار ہوا، جس میں کناڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی، لندن سے ڈاکٹر اقبال مرزا اور رضا علی عابدی، لاہور سے مشکور حسین یاد اور ہندوستان کے مقتدر علماء اور ادباء نے شرکت کی۔ ہندوستان سے جن مقالہ نگاروں نے اس میں اپنے مقالے پڑھے ان میں خاص طور سے پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر آزرمی دخت، شین۔کاف نظام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں متعدد مذاکرات اور سمینار منعقد کیے گئے، جن میں ان دو عظیم شاعروں کے کلام کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی اور مباحثے ہوئے۔ ہندوستان میں منعقدہ بعض ایسے سمیناروں میں قومی اردو کونسل کا اشتراک شامل رہا۔

متذکرہ بالا مذاکرات اور تقاریب سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ زبان اردو کے سفر میں اور اس کی ترقی اور ترویج میں جو بزرگ اپنے انتقال کے صدیوں بعد بھی رہنمائی کا کام انجام دے رہے ہیں، ان میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ صف اول میں ہیں۔ آج بھی اگر کسی لفظ یا محاورے کے استناد پر کہیں بحث چھڑ جائے تو ان کے کلام سے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے مراثی نے یہ ثابت کر دیا کہ زبان اردو، فارسی سے آگے نکل

گئی، ورنہ دیگر اصناف سخن میں اردو فارسی کی تقلید کے بغیر اپنی حیثیت کو نہیں منوا سکتی۔ یہاں کی مشترکہ تہذیبی زندگی، انیس و دبیر کے کارناموں کے ساتھ اپنے نقوش ہمیشہ پیش کرتی رہے گی۔

فہرست

فہرست

باب اوّل

حیات: زمانہ اور ذہنی پس منظر

مرزا دبیر کا سلسلۂ نسب اور بزرگوں کے حالات

مرزا سلامت علی متخلص بہ دبیر اردو شعر و ادب خصوصاً صنف مرثیہ کے ایسے مستحکم ستون ہیں جن کی بدولت اردو مرثیہ کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس نے اردو مرثیہ کو ان بلندیوں تک پہنچا دیا جن سے آگے اب تک کوئی اور نہ لے جاسکا۔ مرزا سلامت علی دبیر کی شاعری کی شہرت ان کی کم عمری ہی میں ہوئی اور رفتہ رفتہ آسمان مرثیہ پر ان کا نام کچھ اس طرح چمکا کہ اس بات کی تمیز کرنا مشکل ہوگئی کہ مرثیہ نے ان کو شہرت بخشی یا انھوں نے صنف مرثیہ کو قبول عام و شہرت دوام کے تاج سے آراستہ کیا۔

مرزا سلامت علی دبیر ایرانی الاصل[1] تھے۔ ان کے جداعلیٰ ملا اہلی شیرازی مصنف مثنوی سحرِ حلال' کے برادر عینی ملا ہاشم شیرازی تھے۔ ملا ہاشم شیرازی اعلیٰ پایہ کے نثر نگار[2] تھے مگر نثر نگاروں کا کوئی تذکرہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حالات مفصل معلوم نہیں ہوئے البتہ ملا اہلی شیرازی کے حالات تذکروں اور مختلف کتابوں میں ہیں۔ وہ بلند پایہ کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی 'سحر حلال' ایران میں مقبول تھی۔ یہ مثنوی صنعت گری کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اس کے ہر شعر کے دو دو قافیے ہیں اور ہر شعر دو دو بحروں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ ان کا دیوان غزل ارباب نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے۔ ایرانی ان کی اتنی قدر کرتے تھے کہ مرنے کے بعد ان کو حافظ شیرازی کے پہلو میں دفن کیا۔

ملا اہلی ائمہ طاہرین سے گہری مودت و عقیدت رکھتے تھے۔ مال دنیا سے بے نیازی تھی۔ ان کی ایک رباعی ہے:

یارب سگ کوئے مقبلی ساز مرا   آئینہ ز عشق منجلی ساز مرا

۱۔ استشہاد مشمولہ شمس الضحیٰ قبل از صفحہ ۱۶۵۔ مصنفہ مولوی صفدر حسین، مطبوعہ مطبع اثناعشری ۱۳۹۸ھ/۱۸۸۱ء عکس ص ۲۸-۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں جو تنقید آب حیات کے اس استشہاد کی نقل سے لیا گیا ہے۔

۲۔ حیات دبیر ج ۱، ص ۳، مصنفہ افضل حسین ثابت لکھنوی، مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء

اقبال جہاں مرا جوئے نیست قبول   مقبول محمد و علی ساز مرا

بڑھاپے میں شیراز میں وفات پائی۔ ملا میرک نے تاریخ وفات کہی:

درمیان شعرا و فضلا   پیر با صدق و صفا بود اہلی
رفت با مہر علی از عالم   پیرو آل عبا بود اہلی
سال فوتش ز خرد جستم و گفت   بادشاہِ شعراء بود اہلی

(۹۴۲ھ) (۱۵۳۵-۳۶ء)

یہ صرف قطعۂ تاریخ نہیں بلکہ اہلی سے لوگوں کی عقیدت اور ان کے مرتبہ کا اظہار بھی ہے۔ تقی الدین کاشانی نے خلاصۃ الاشعار میں یہی تاریخ درج کی ہے۔ صفدر حسین تحریر کرتے ہیں:

> ''مولانا اہلی شیرازی در سلک شعر اعجم کرام و فضلا عظام انتظام داشتہ و فقر و مسکنت وقلت اختلاط او باہل دنیا مشہور تر است کہ احتیاج بنوشتن داشتہ باشد و از اکثر سالکان مسالک سخنوری بوفور مہارت درفن شعر امتیاز تمام داشت و درعلم قافیہ وعروض ومعما کامل بود۔ درجمع اوقات شعری گفت مثنوی ہم گفتہ ہم ذو بحرین و ہم ذو قافیتین عقل در و متحیر است وقصیدہ مصنوع خواجہ سلمان را باسم میرعلی شیر تتبع نمودہ و چند صنعت بر او افزودہ کہ میرعلی شیر انصاف دادہ است کہ بہتر از سلمان گفتہ و دیوان غزل او مسلم ارباب نظر و چاشنی شعر سعدی درکلام اومضمر است۔ ایں قصیدہ درمنقبت گفتہ کہ مطلعش اینست۔

اے با سپہر بو قلموں ہیئت بجنگ   روز و شب از نہیب تو گردید رنگ رنگ

وقصیدۂ دیگر درمنقبت گفتہ کہ مطلعش اینست:

سوز دم از خواب صبحی گر نسیم عنبرین   شبنمی از عنبریں شبنم شبستی بر زمین

والیضاً قصیدہ درمنقبت گفتہ کہ مطلعش اینست:

آن شہنشاہی کہ بحر لافتی را گوہر است   شحنہ دشت نجف شاہ ولایت حیدر است[1]

ایڈ واڑ براؤں تحریر کرتے ہیں:

''شیخ محمد اہلی شیرازی مثنوی بنظم آورد کہ آنرا سحر حلال نامیدہ است۔ در آں مثنوی در آن واحد ہر دو صنعت کا تبی را التزام کردہ، یعنی ہم ذو بحرین است و ہم ذو قافیتین موضوع ایں مثنوی داستانی عشق است مابین شہزادگانی بنام جام وگل و مقدمہ ای بہ نثر دارد و ابتدا می شود بایں بیت:

اے ہمہ عالم بر تو بی شکوہ رفعت خاک در تو بیش کوہ

حکایت را بایں بیت آغام کردہ

ساقی ازاں شیشۂ منصوردم در رگ و در ریشۂ من صوردم

بطوریکہ ملاحظہ می شود سراسر ابیات ایں مثنوی بد و بحر خواندہ می شود۔

یکی بحر رمل مسدس محذوف بہ تقطیع ''فاعلاتن-فاعلاتن-فاعلن-'' و دیگرے بحر سریع مسدس مستوی، بہ تقطیع مفتعلن-مفتعلن-فاعلن کہ ہماں دو بحر در مثنوی مجمع البحرین کاتبی نیز رعایت شدہ است۔''[۲]

مولوی صفدر حسین لکھتے ہیں:

''در بعض تذکرہ ہا مسطوراست کہ اہلی شیرازی از فصحاء نامدار و بلغاء روزگار است برقوت و قدرت شاعری او مثنوی سحر حلال کہ ذو بحرین و ذو قافیتین مع التجنیس است دلیل ساطع است و برہان قاطع و در ترصیع و تجنیس و دیگر صنائع و بدائع شعر یہ از کسی مثل او کم بظہور آمدہ مرقدش در شیراز است پہلوی خواجہ شمس الدین شیرازی و مولوی احمد علی سندیلوی در مخزن الغرائب آوردہ کہ مولانا اہلی شیرازی قدوہ فصحا و زبدۂ بلغاء است فضائلش لاتعد ولاتحصیٰ

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۴۴-۱۴۵ اس کتاب پر بعض حواشی کسی اور نے لکھے ہیں جنھوں نے اپنے نام کے بجائے......صرف مصح عفی عنہ لکھا ہے۔

۲ تاریخ ادبی ایران (از سعدی تا جامی) ص ۱۰۷ تالیف ایڈورڈ براؤن انگلیسی ترجمہ و حواشی علی اصغر حکمت تہران، ایران، مطبع دانش گاہ دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۹ شمسی، ۱۹۴۰ میلادی

است در مراتب سخن وری سحر سامری و اعجاز عیسوی داشتہ شاہد ایں معنی مثنوی سحر حلال اواست کہ ذو قافیتین بد و بحر خوانده می شود و باخواجہ حافظ و مرزا نظام دست غیب در مصلائی شیراز دریک مضجع است و این غزل در سنگ مزاش (مزارش) نقش است۔

جانم بروز واقعہ پہلوی او کنید　　او قبلہ من است زخم سوی او کنید[1]

ایڈوارڈ براؤن تحریر کرتے ہیں:

"اہلی را با امیر کبیر علی شیر نوائی رابط ارسال رسول نیز قائم بوده و در مدح او قصیدہ مصنوع و بسیار مشکل بنظم آورده کہ بر قصیدہ سلمان ساوجی تفوق دارد و متضمن انواع صنائع بدعیہ است۔"

اہلی دو قصیدہ مصنوع دیگر نیز بعد ہا ساختہ یکی در مدح یعقوب آق۔ قونیلو و دیگری در مدح شاہ اسماعیل اول و در ہر سہ قصیدہ داد ہنر نمائی را دادہ است۔

قبر اہلی در حافظیہ شیراز در جوار مزار خواجہ حافظ ہم اکنوں معروف است، و ایں عبارت بر لوح مزارش منقوش:

دوش از غم عمر رفتہ در منزل خویش　　در فکر فرد شدم و من بادل خویش
از حاصل عمرم در کفم ہیچ نبود　　شرمندہ شدم ز عمر بے حاصل خویش[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہم عصر ادبا و شعرا ملا اہلی کے کمال کے نہ صرف معترف تھے بلکہ ان کو فارسی شعراء میں بلند درجے کا مالک قرار دیتے تھے۔ راقم کو باوجود انتہائی کوشش کے ان کی تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں نہیں ملی البتہ صاحب شمس الضحیٰ نے شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری[3] کی تصنیف مجالس المومنین مجلس دوازدہم کے حوالے سے لکھا ہے:

۱　شمس الضحیٰ، ص ۱۴۶-۱۴۵

۲　تاریخ ادبی ایران ص ۱۱۷

۳　قاضی نور اللہ سید شریف المرعشی ستری از اجلہ فقہاء و محدثین شیعہ امامیہ و صاحب تالیفات عدیدہ است کہ از آنجملہ "احقاق الحق" و "مجالس المومنین" در عالم تشیع معروف در زمان اکبر بن ہمایوں بہ ہند رفتہ و بقضاوت شہر لاہور منصوب گردیدہ، در زمان جہانگیر بہ تہمت رفض در سال ۱۰۱۹ھ بقتل رسید بہ "شہید ثالث" ملقب گردید۔ مزارش ہم اکنوں در شہر آگرہ معروف است" (تاریخ ادبی ایران)

"کہ ملا اہلی علیہ الرحمۃ در کبرسن در شہور سنہ نہ صد و چہل و دو در شیراز وفات یافت ولا میرک در تاریخ فوت او قطعہ انشا فرمودہ۔ قطعہ

درمیانِ شعراء و فضلاء بادشاہِ شعر ابود اہلی[1]

اڈورڈ براؤن نے ملا میرک کا قطعہ تاریخ نقل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"شیخ محمد اہلی شیرازی طاب ثراہ ہشتاد و چہار وفات نمود فی سنہ ۹۴۲ھ[2]

براؤن نے چونکہ ملا اہلی کی عمر ان کے انتقال کے وقت ۸۴ برس بتائی ہے اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) یا ۸۵۹ھ (۱۴۵۵ء) ان کا سالِ پیدائش ہوگا۔

مرزا دبیر کے آباء و اجداد کا وطن شیراز ایران تھا اور وہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے لیکن بعد میں امتداد زمانہ و نامساعد ماحول کی بنا پر دہلی اور اکبرآباد (آگرہ) میں وارد ہوئے[3] ان کی غریب الوطنی نے نام و نمود، عزت و شہرت کے علاوہ خاندانی وجاہت پر گمنامی کے پردے ڈال دیے جس سے بچنے کے لیے مرزا دبیر کے والد ماجد مرزا غلام حسین کو استشہاد پیش کرنا پڑا۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

> "یہ استشہاد اس زمانہ میں مرتب ہوا تھا کہ جب مرزا غلام حسین دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے اور لکھنؤ میں شادی کرنا چاہا۔ بزرگوں کی پوچھ پانچھ ہوئی اور مرزا غلام حسین دہلی و آگرہ گئے اور وہاں سے شہادت نامہ لکھوا کر لکھنؤ میں لائے۔ یہاں بھی جو لوگ ان کے خاندان سے واقف تھے انھوں نے شہادت ثبت کی۔"[4]

قطع نظر کہ مرزا غلام حسین نے لکھنؤ میں شادی کی یا نہیں اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔ اس استشہاد سے واضح ہوجاتا ہے کہ مرزا دبیر کے آباء و اجداد شیراز سے آئے تھے وہاں مناصب جلیلہ پر سرفراز تھے اور ہندوستان میں بھی صاحب عزت و اقبال رہے۔ بادشاہوں کے درباروں میں ان کی عزت و تکریم کی جاتی تھی اور مناصب جلیلہ پر یہاں

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۴۵

۲ تاریخ ادبی ایران۔ ص ۱۲۷

۳ حیات دبیر۔ ص ۵ استشہاد شمس الضحیٰ میں شامل ہے

۴ حیات دبیر، ص ۵

بھی فائز رہے۔ چنانچہ اس استشہاد کا سرنامہ مرزا دبیر کے بزرگوں کی خاندانی وجاہت کو ظاہر کرتا ہے۔

"فی الحقیقت بزرگان مستشہد (مرزا غلام حسین پدر مرزا دبیر) از شرفائے شیراز و بسرکار ما بدولت بہ عہد ہائے جلیلہ ممتاز بودہ اند۔" [1]

زیر نظر استشہاد میں درج ہے کہ نامساعد حالات کی وجہ سے مرزا دبیر کے بزرگ اکبر آباد (آگرہ) چلے آئے۔

"بدیں مضامین صداقت آئین از قدیم الایام بزرگان اباعن جداحقر العباد در شیراز کہ موطن و مولد آنہا بودہ ہموارہ بمناصب جلیلہ و مدارج رفیعہ ممتاز بودند چوں بسبب نامساعدت ایام جلائے وطن ساختہ وارد اکبر آباد شدند۔" [2]

اس استشہاد سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نجیب الطرفین تھے اور والدہ کی طرف کے رشتہ دار بھی حکومت میں نہ صرف عمل دخل رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

"مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خان جد مادری (مرزا غلام حسین کے نانا) آثم ناظم صوبہ کشمیر و ماموں صاحب مرزا شہامت علی خان بنو یسایندن خط نستعلیق باد شادی شہزادگان منصوب وجد امجد بعہدہ منشی گری سرفراز و ممتاز گردیدند تا مدت مدید عرصۂ بعید ہمیں مناصب جلیلہ خوش گزران ماندند۔" [3]

اس استشہاد پر شاہ عالم بادشاہ غازی ابوالمظفر جلال الدین کے علاوہ آفتاب جنگ محمد نور اللہ خان بہادر نواب ضیاء الدولہ نیر الملک، حسن رضا خان، کاظم علی، مسیح اللہ خان متخلص بہ مسیح صاحب شرح اعجاز خسروی، مختار خان بہادر امجد علی خان امجد بہادر، سید فرزند علی، میرزا رحمت علی خان، علی مراد خان بہادر داروغہ دیوانہ خانۂ شاہ عالم سیف اللہ خان بہادر مرزا محمد باقر [4] امین الدین، فضل علی خان عرف آقا جان ابن فتح

---

۱ سرنامہ استشہاد شامل شمس الضحیٰ قبل از صفحہ ۱۶۵

۲ استشہاد شامل شمس الضحیٰ قبل از صفحہ ۱۶۵

۳ ایضاً

۴ مرزا اظہر علی برلاس اپنے مضمون میں مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات مطبوعہ دبیر نمبر ماہ نو ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء پاکستان، استشہاد کے مشمولہ حاشیہ پر مرزا باقر کے بدلے مولوی محمد باقر پدر محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہ مان لیا ائے کہ وہ پدر محمد حسین آزاد تھے تو آزاد نے مرزا دبیر کے آباء و اجداد کے بارے میں ان سے ضرور کچھ سنا ہوتا اور آب حیات میں اگر وہ اس کا حوالہ نہ دیتے تو کم از کم مرزا دبیر کے خاندان کے متعلق لکھتے وقت دھوکا نہ کھاتے۔

نقل فرمان شاہی

شاہ عالم بادشاہ غازی

شاہ عالم
فدوی بادشاہ غازی
خانہ زاد خان بہادر

نقل فرمان شہنشاہ دہلی

۱۱۷۳

شاہ عالم بادشاہ غازی

ابو المظفر جلال الدین

(عکس استشہاد شامل شمس الضحیٰ و تنقید آبِ حیات)

علی خان[1] سید احسن کی مہریں ہیں۔ اس کے بعد کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ مرزا دبیر کے بزرگ عالی نسب تھے اور عہدہ ہائے جلیلہ پر سرفراز تھے۔ جوان کے صاحب استعداد اور صاحب لیاقت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

مہروں پر جو سن دیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ استشہاد تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں تیار کیا گیا ہے اور بعد میں بھی اس پر اور شہادتیں ثبت کی گئیں۔ اس استشہاد پر شاہ عالم بادشاہ غازی ابوالمظفر کی بھی مہر ہے جس کے ساتھ ۱۱۸۳ کندہ ہے۔ اس کے آخر میں ۷ رجب ۱۲۱۵ھ نبوی کی تاریخ درج ہے۔

دوسرے فرامین جو شمس الضحیٰ میں چھپے ہیں ان سے بھی مرزا دبیر کے نسل اور نسب کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ شہنشاہ دہلی شاہ عالم کا فرمان (جس پر سوم رجب ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء کی تاریخ ثبت ہے) سے مرزا دبیر کے بزرگوں کے حالات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

بادشاہ نے مرزا دبیر کے دادا مرزا غلام محمد کے لیے ''فضلیت وشریعت مآب تقوی و صلاح دستگاہ'' تحریر فرمایا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بادشاہ کے دل میں ان کے لیے کس قدر عزت تھی اور وہ ان کا کتنا احترام کرتے تھے۔ بادشاہ کا اس طرح لکھنا ان کی (مرزا غلام محمد کی) عظمت کی دلیل ہے۔

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غلام محمد نے عبادت الٰہی کے شوق میں مناصب جلیلہ کو ترک کیا اور یہ کہ اعلیٰ درجہ کے دیانت دار تھے۔

> ''..... مناصب جلیلہ سرکار از خیال مآل آخرے رضینہ برضاے جناب باری عزاسمہ و ما بدولت اقبال بانتہائی تدین کمال رسانیدہ باکراہ فانی از ترک مناصب متعلقہ و تعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الوجود اعتکاف ساختہ۔''[2]

اس فرمان کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نانا عنایت اللہ خان ابن ابوظفر خان

---

۱ یہ وہی آقا جان ہیں جن کے گھر میں مرزا غلام حسین لکھنؤ میں ٹھہرے تھے جنہیں لوگوں نے آغا جان کاغذ فروش لکھ دیا ہے۔

۲ فرمان شاہی شامل شمس الضحیٰ بعد صفحہ ۱۶۴

ناظم صوبہ کشمیر کے اور ان کے ماموں شہامت علی خاں شہزادوں کے استاد تھے اور ان کے جد امجد ملا محمد ہاشم سلطنت ہندوستان کے منشی تھے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:

''بہ صوابدید قدامت عنایت اللہ خان ابو ابوظفر خان ناظم صوبہ کشمیر
جد مادری معزالیہ و شہامت علی خان خال و استاد شاہزادہ ہای ہمایوں و ملا محمد ہاشم
مرحوم جد پدری شان کہ منشی سرکار ابد قرار بودہ۔''[1]

اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان ک چار لاکھ اٹھاسی ہزار ایک سو بیس دام جو چار ہزار سات سو اکتیس روپے کے برابر ہوتے ہیں، پرگنہ حویلی دارالخلافہ شاہجہان آباد سے بطور وظیفہ ملتا رہے اور ہر سال نئی سند طلب نہ کی جائے۔

مرزا غلام حسین کی ولادت

دوسرا فرمان بھی شاہ عالم بادشاہ دہلی کا ہے، اس پر ۷/رمضان ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) کی تاریخ ہے۔ اس پر درج ہے کہ ملا غلام محمد ابن مرزا رفیع ولد ملا ہاشم شیرازی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے جس کا نام غلام حسین رکھا گیا ہے۔ اس موقع پر مصارف دایہ کے لیے ۱۰۰ روپے ماہوار سکہ کہن مقرر کیے گئے۔ اصل عبارت فرمان ملاحظہ ہو:

''دریں وقت میمنت اقتران از وقائع مولود فرزند غلام محمد نوادہ ملا ہاشم
شیرازی و نام نہاد بمسمّی غلام حسین بمسمّہ ہمایوں رسید حکم جہاں مطاع عالم مطیع
بنام خازن خزانہ عامرہ سلطان بادشاہ ماموری یک صد روپیہ سکۂ کہن ماہانہ
مصارف مرضعہ وغیرہم شرف صدور فرمودہ حاسبان دفتر دیوانی سرکار معلّٰی سوای
ماہانہ ملا غلام محمد محسوبہ سنین پیشین ماہانہ ہذا بمصارف مرضعہ ہا وغیرہم غلام حسین
مولود حال بخازن خزانہ خاقانی بجر اے مجدد مجرادادہ قبض مہری غلام حسین بدفتر
داشتہ باشند دریں باب ہر سال سند مجدد نطلبند۔
ہفتم شہر رمضان المبارک ۱۱۹۰ھ ۱۸ از جلوس والاتحریر یافت۔''[2]

اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غلام حسین (والد مرزا دبیر) ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء میں پیدا ہوئے۔

---

۱ فرمان شاہی ایضاً
۲ فرمان شاہی مشمولہ شمس الضحیٰ

مرزا محمد رفیع والد مرزا غلام محمد سلطنت دہلی کے منشی کے عہدے پر سرفراز[1] تھے۔ ان کا نام ملا محمد رفیع تھا اور تخلص رفیع فرماتے تھے۔ شاعر تھے مگر اس میں شہرت حاصل نہ کر سکے۔ غالبًا اسی بنا پر تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ مولف حیاتِ دبیر لکھتے ہیں کہ ان کا ایک قصیدہ نعت و منقبت میں کتاب روضۂ رضوان مطبوعہ بستان مرتضوی ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں صفحہ ۸۸ پر چھپا ہے۔ مطلع اس کا یہ ہے ؎

اے شہنشاہ وئے ملک و تدلے کشور   والضحیٰ روی و قمر طلعت و والنجم افسر[2]

مرزا غلام محمد کے حالات بھی کہیں نہیں ملتے۔ ان کے بارے میں ایک فرمان شاہی سے جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں دیا جاچکا ہے کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا دوست اور دیندار بزرگ تھے۔ اونچے عہدوں کو شوق عبادت الٰہی میں ترک کردیا اور یاد خدا میں زندگی گزار دی۔ ان کی زندگی ایسی تھی کہ بادشاہ نے ان کے نام کے ساتھ ''فضیلت و شریعت مآب تقویٰ و صلاح دستگاہ'' تحریر فرمایا اور یہ بھی لکھا کہ دیانتداری ان کی معراج کمال تک پہنچی۔ ایک خدا دوست آدمی زندگی میں اس سے زیادہ کیا چاہے گا کہ لوگ اس کے بارے میں ایسے خیالات رکھیں۔ پنشن پر ہی گزارہ کیا۔ استشہاد (جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے) سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ چنانچہ مرزا غلام حسین اس استشہاد میں خود لکھتے ہیں:

''...... والد مغفور نیز صاحب اقتدار بودند لاکن چوں والدۂ ماجدہ مستشہد از دار فانی بعالم بقا انتقال نمودہ۔ والد مرحوم عقد دیگر ساختند حقیر کہ درآں ایام نہ سالہ بود و در مکتب خانہ تحصیل علم مینمود۔''[3]

اس کا ذکر نہیں ملتا کہ ان کی اولاد کی تعداد کیا تھی البتہ مرزا غلام حسین کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ مرزا دبیر کے والد زوجۂ اول کے بطن سے تھے۔

مرزا غلام حسین کے حالات زندگی تک ہماری رسائی کا ذریعہ چند خطوط، دو فرامین شاہی اور متذکرہ بالا استشہاد ہے جسے شمس الضحیٰ اور بعد میں حیاتِ دبیر وغیرہ میں نقل کیا گیا ہے۔ ان کی ولادت دہلی میں ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں ہوئی۔ چونکہ اس موقع پر محض صرفہ دایہ کے واسطے ۱۰۰ روپے ماہانہ خزانہ شاہی کی طرف سے منظور ہوئے تھے اس لیے یقین

---

۱ استشہاد مشمولہ شمس الضحیٰ   ۲ حیات دبیر حاشیہ ۱ ص ۸
۳ استشہاد مشمولہ شمس الضحیٰ

ہے کہ ابتدائی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی ہوگی۔ اس وقت کے شرفاء کے بچوں کی طرح تعلیم وتربیت ہوئی ہوگی۔ خود تحریر کرتے ہیں کہ میں مکتب میں زیرِ تعلیم تھا مگر کم سنی میں والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پرورش و پرداخت پر خاصا اثر پڑا، پھر نو برس کی عمر میں دوسری ماں کی آمد نے ذہنی اذیتوں کا سامان فراہم کیا۔ وہ ان کو ایذا دیتی تھیں یہاں تک کہ ایک بار کھانے میں زہر تک ملا دیا۔ استشہاد میں لکھتے ہیں:

> ''والد مرحوم حسب ارشاد شاہی اکثر بفر میماندند مادر نامہربان (سوتیلی ماں) بوجہ مغائرت بطن بانواع و اقسام ایذا می رسانید چنانچہ روزے زہر ہم در طعام دادہ۔''[1]

ان کے والد مرزا غلام محمد کار سرکار کے سلسلے میں اکثر و بیشتر باہر رہتے تھے۔ اس نوخیز کی کسمپرسی بڑھتی گی۔ اپنے خانگی حالات سے عاجز و پریشان ہوکر وہ اپنے استاد کے ہمراہ اکبرآباد سے شاہجہاں آباد گئے وہاں مرزا فتح علی خان ابن مرزا فضل علی خان کے گھر میں پناہ لی[2] مرزا فتح علی خان کے ساتھ ان کے والد نے صیغۂ اخوت پڑھا تھا اس لیے اس رشتہ سے انھوں نے نہ صرف گھر میں پناہ دے دی بلکہ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک بھی کیا۔ مرزا غلام حسین کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:

> ''حقیر را از اکبرآباد شاہجہاں آباد بخانہ مرزا فتح علی خان ابن مرزا فضل علی خان کہ باپدر حقیر صیغہ اخوت و روابط قدیم می داشتند آورد و حال مہربانی مادرِ مہربان حالی ساختہ جناب خان صاحب موصوف متاسف گشتہ مثل بزرگانِ سلف کہ فرزند آشنا را فرزند خود می دانستند حقیر را بخانہ خود باہزار شفقت و محبت نگاہ داشتند۔''[3]

---

۱ استشہاد مشمولہ شمس الضحیٰ

۲ بیان میں مرزا فتح علی خان ابن مرزا فضل علی خان لکھا ہے اور اس پر شہادت کرنے والوں میں ایک فضل علی خان عرف آقا جان ابن مرزا فتح علی خان بھی ہیں جنھوں نے مرزا غلام حسین کا اپنے مکان میں رہنا بھی ظاہر کیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ جن فضل علی خان کا ذکر استشہاد میں ہے وہ ان فضل علی خان کے دادا ہیں جن کے مہر اس استشہاد پر ہے۔ چونکہ دادا اور پوتے کا نام ایک ہی ہے اس لیے دھوکا ہونے کا امکان ہے، اسی لیے راقم نے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

۳ استشہاد مشمولہ شمس الضحیٰ

مرزا غلام محمد والد مرزا غلام حسین جب کار سرکار سے فارغ ہوئے تو اپنے بیٹے (مرزا غلام حسین) کو تلاش کیا۔ بیوی نے بچے پر مختلف الزامات لگائے اور اس کو آوارہ بدچلن قرار دے دیا مگر مرزا غلام محمد شفقت پدری سے مجبور تھے، اپنے بیٹے کی تلاش میں شاہجہاں آباد پہنچے وہاں اپنے دوست مرزا فتح علی خان کے پاس اپنے بیٹے کو دیکھا۔ خان صاحب نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا لیکن بعض نشیب و فراز بھی ان کے گوش گزار کردیے۔ انھوں نے موصوف کو سمجھا دیا کہ اگر مرزا غلام حسین وہاں (اپنے گھر میں) رہتا ہے تو اس کی جان کو خطرہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھایا کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے اس کے یہاں رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر مرزا غلام محمد چند روز قیام کر کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے آئے۔ قسمت دیکھیے کہ تیرہ سال کی عمر میں مرزا غلام حسین کے سر سے سایۂ پدری بھی اٹھ گیا اور اب وہ سراسر بے کس و بے یاور و مددگار ہوگئے۔ سوتیلی ماں کے رشتہ داروں نے مال و اسباب پر قبضہ کرلیا اور مرزا صاحب محتاج ہوگئے پھر رختِ سفر باندھا اور مرزا فتح علی خان کے پاس پہنچے۔ اس زمانے میں خان صاحب کے حالات اچھے نہیں تھے پھر بھی بقول مرزا صاحب ان کی مہمان نوازی پہلے سے کہیں زیادہ بہتر طور پر کی۔ چونکہ دہلی ان دنوں قتل و غارت کا نشانہ بنی ہوئی تھی، لگاتار حملے ہورہے تھے، کتنے ہی اہل کمال اور صاحب عزت و شرافت فیض آباد اور لکھنؤ کی طرف ہجرت کرتے جاتے تھے۔ خان صاحب بھی لکھنؤ چلے آئے اور مرزا صاحب کو اپنے ساتھ لے آئے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

> "والد مرحوم از کار سرکار انفراغ یافتہ مراجعت نمودند جویائے حقیر گشتند،
> مادر نامہربان نسبت آوارگی و بدافعالی بایں بے قصور نمودہ لاکن بایں ہمہ والد مغفور بسبب مہر پدری بیتاب گشتہ برائے تلاشِ حقیر در شاہجہاں آباد آمدند و بخانۂ خان صاحب ممدوح (فتح علی خان) سراغ یافتہ حقیر را در برکشیدند و چند روز مہمان خان صاحب ماندہ حقیر را ہمراہ خود بردند ہر چند کہ خان صاحب ممدوح نام بندہ گرفتہ بوالد ماجدم تفہیم نمودند کہ ایشاں را در خانۂ بندہ بگوارید کہ خانۂ شما ہست و در خانۂ شما یقین ہلاکت ایشان است کہ مادر جدید نامہربان است والدہ بندہ باقتضای حمیت عذر نمودند و مفارقت این جانب گوارا نساختند

چند سال باز بنامہر بانیہای مادر نامہربان بسر بردم چوں والد ماجدم بسن سیزدہ سالگی حقیر از دنیا رخت سفر آخرت بستند و اقربائی مادر نامہربان مال و اسباب و جمیع اشیاء والدم از حقیر پوشیدہ بقبض و تصرف خود آوردند، حقیر کہ بے دست و پا بود چار و ناچار بخانہ فتح علی خان صاحب باز آمدہ سکونت درزید در آں ایام خان صاحب ممدوح ہم مبتلا عسرت بودند لاکن مہمانداری حقیر از اول زیادہ تر نمودند از آنجا کہ شہر مذکور بسبب تاراج و غارت متواتر قابل ماندن نماندہ عزیمت لکھنؤ فرمودند بندہ نیز ہمراہ معظم الیہ وارد لکھنؤ گردیدہ۔"[1]

یہ تھے وہ حالات جن میں مرزا غلام حسین وارد لکھنؤ ہوئے۔ لکھنؤ اس وقت اہل کمال اور شرفاء و معززین کی نگاہ کا مرکز تھا۔ وقت کا تھپیڑا اور انقلاب زمانہ جس کو نشانہ بناتا تھا وہ لکھنؤ کو اپنی ڈھال سمجھتا تھا اور لکھنؤ کا رخ کر کے اپنے آپ کو نجات یافتہ خیال کرتا تھا۔ مرزا غلام حسین کے حالات تو ناگفتہ بہ تھے کہ لکھنؤ آنے سے قبل ہی وہ اپنے آپ کو "بے دست و پا" بیان کرتے ہیں پھر لکھنؤ پہنچتے پہنچتے تو اور حالت خراب ہوئی ہوگی البتہ فتح علی خان صاحب ان کو اپنے عزیز کی طرح سمجھتے تھے اور ان کا پورا خیال رکھتے تھے۔

صاحب حیات دبیر اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ مرزا غلام حسین وارد لکھنؤ کے وقت باوصف عسرت کے صاحب ثروت تھے۔[2]

لکھتے وقت یہ بات ان کے دل میں بھی کھٹکی کہ وہ ایک شخصیت اور ایک ہی وقت کے متعلق دو متضاد باتیں لکھ گئے اس لیے خود ہی اپنی صفائی یوں پیش کی:

"......آپ تعجب کریں گے کہ یہ تو اجتماع نقیضین معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور و تامل سے سنیے۔ عسرت کا اطلاق تو اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ میں مرزا غلام حسین مسافر گویا مفلس تھے کہ کوئی آمدنی نہ تھی۔ پرانی کھرچن اور اپنا اسباب خانہ داری بیچ بیچ کر کھاتے تھے مگر اس زمانہ کے مالدار معزز اہل کاروں پر خیال کیا جائے تو بہت مرفہ الحال تھے۔ دولت، تلف ہونے کے بعد بھی اس قدر تھی کہ سیکڑوں روپیہ خیرات (خمس و زکوٰۃ) میں دیتے تھے۔"[3]

---

۱ استشہاد شامل شمس الضحیٰ ۲ حیات دبیر صفحہ ۸ ۳ حیات دبیر، ص ۸-۹

اس کے ثبوت میں انھوں نے دو خط پیش کیے ہیں جو غفران مآب[1] حجۃ الاسلام مولانا السید دلدار علی صاحب قبلہ (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) اور مختار خان رئیس دہلی[2]، نے مرزا غلام حسین کو لکھے ہیں۔

یہاں یہ مسئلہ محل نظر ہے کہ ثابت نے ورود لکھنؤ کے وقت مرزا غلام حسین کی ثروت کا تعین کس بنیاد پر کرلیا۔ حتیٰ کہ تاریخی واقعات سے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ ورود لکھنؤ کے وقت مرزا غلام حسین کی عمر پندرہ سے سترہ برس تک رہی ہوگی، یعنی ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۰ء سے ۱۷۹۲ء) تک کے زمانے میں وہ لکھنؤ آئے ہوں گے۔ خاندان مغلیہ کے لیے یہ بدترین زمانہ تھا، ایک طرف سکھ رعایا کو لوٹ رہے تھے اور دوسری طرف مرہٹے ادھم مچائے ہوئے تھے۔ بادشاہ اور درباری کسی کی کوئی مدد نہیں کرپارہے تھے۔ ان کی اپنی زندگی محدود ہوکے رہ گئی تھی۔ مرزا جواں بخت ولی عہد سلطنت ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں دہلی سے جان بچاکر بھاگے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے خود تاریخ کا دل دہلتا ہے۔ اگر ایسے حالات میں فتح علی خان دہلی میں رہتے بھی تو کب تک۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مصنف حیات دبیر افضل حسین ثابت نے تذکرہ سراپا سخن میں مرزا غلام حسین متعلقان آغا جان کاغذ فروش لکھا دیکھا تو برافروختہ ہوگئے اور کسی طرح کاغذ فروش کا داغ دور کرنے کی فکر میں شہادت وثبوت فراہم کرنے کی کوشش کرنے لگے حتیٰ کہ کاغذ فروش اول تو کوئی مستقل پیشہ نہیں اور پھر ایسا پیشہ نہیں جس کو معیوب سمجھا جائے۔ دوسری بات یہ کہ مرزا غلام حسین کے حالات دہلی میں (بقول خود ان کے) ایسے ہوگئے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ مرزا صاحب موصوف عسرت میں مبتلا ہوجائیں اور پھر وہ وقت ایسا تھا کہ ولی عہد سلطنت شہر بدر ہوگیا اور غربت میں انتقال کیا۔ روہیلوں نے مغل شہزادیوں کو اپنے سامنے نچوایا۔ شاہ عالم کی آنکھیں نکالی گئیں اور کوئی کچھ نہ کرسکا پھر مرزا غلام حسین کی کیا حقیقت تھی۔ شرفا اور نامی لوگ محتاج ہوکر لکھنؤ آئے، یہ ایسی بات نہیں تھی

---

۱ ہندوستانیوں میں یہ سب سے پہلے مجتہد ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کے تمام شیعوں میں دینداری پھیلی۔ اکثر اہل علم شیعوں کے خاندان انھیں کے خانوادے کے تعلیم یافتہ اور شاگرد ہیں۔ ان کی تحریر کو شیعہ آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ حیات دبیر صفحہ ۹

۲ برادر زادہ نعمت خان عالی حیات دبیر صفحہ ۹

جس سے مرزا غلام حسین کی خاندانی شرافت و نجابت پر حرف آتا۔ مولف سراپا سخن سے تسامح ہوا کہ ایک ہی شخصیت کے ترجمے میں دو متضاد باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اور چند برس کے بعد وہ لکھنؤ آئے ہوں گے تو پھر بھی ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) سے آگے جانا مشکل ہوگا کیونکہ مرزا صاحب موصوف استشہاد میں خود بتا چکے ہیں کہ چند سال بعد ہی فتح علی خان صاحب کے ساتھ لکھنؤ آئے اور قبلہ غفران مآب کے خط پر جو تاریخ درج ہے یعنی ۴ر رمضان ۱۲۱۶ھ (۸ر جنوری ۱۸۰۲ء) اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مرزا صاحب کی عمر اس وقت ۲۶ سال کی تھی اور یہ واقعہ لکھنؤ آنے کے کئی برس بعد کا ہے۔ مرزا صاحب موصوف خود استشہاد میں بیان کرتے ہیں کہ وہ بے دست و پا تھے اور ان کی سوتیلی ماں کے رشتہ داروں نے ان کے والد کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کرلیا تھا اور وہ مجبور ہوکر نکلے تھے۔ اس لیے غفران مآب مولانا سید دلدار علی صاحب قبلہ کے خط سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرزا غلام حسین ورود لکھنؤ کے وقت صاحب ثروت تھے۔ راقم اس خط کی نقل یہاں پیش کرتا ہے:

> ''جناب مرزا صاحب کرمفای دوستاں مجمع الطاف احسان عالی مراتب والا مناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہ، بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائی شریف باد کہ مبلغ پان صد روپیہ منجملہ زکوۃ و خمس کہ بدست مسمی غلام حیدر فرستادند رسید انشاء اللہ تعالیٰ بمستحقین مومنین تقسیم کردہ خواہد شد۔ زیادہ والسلام مرقومہ چہارم شہر رمضان المبارک ۱۲۱۶ھ نبوی۔''[1]

ہمارے نزدیک مرزا علی اظہر برلاس کا خیال صحیح ہے کہ افضل حسین ثابت اپنے دعوے کے ثبوت نہیں فراہم کرسکے کہ مرزا غلام حسین ورود لکھنؤ کے وقت صاحب ثروت تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''......غریب و کم سن غلام حسین کے پاس سوتیلی ماں نے کچھ نہ چھوڑا تھا اور وہ بدرجۂ مجبوری فتح علی خان کے پاس دہلی آگئے، اگرچہ وہ بھی عسرت میں مبتلا تھے اور دہلی کی متواتر تباہی و تاراجی کی وجہ سے لکھنؤ آگئے۔ سمجھ میں

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۵۴-۱۵۵

نہیں آتا مولف حیات دبیر نے ثروت کا کون سا پہلو ان واقعات میں دیکھ لیا
کہ لکھ دیا۔ مرزا غلام حسین باوصف عسرت کے صاحب ثروت تھے۔[1]

دوسرا خط جو اس کے ثبوت میں ثابت نے پیش کیا ہے وہ نواب مختار خان بہادر رئیس شاہجہاں آباد کا ہے جو شمس الضحیٰ کے صفحہ ۱۵۴-۱۵۵ پر درج ہے۔ اس خط سے یہ مسئلہ مزید پیچیدگی اختیار کرتا ہے۔ اس خط میں کوئی تاریخ موجود نہیں ہے البتہ مہر میں ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) کندہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۱۲ھ کے بعد کا ہے۔ بالفاظ دیگر مرزا غلام حسین کے ورود لکھنؤ کے کم از کم دو سال بعد اور ادھر جو شہادت نامہ مرزا غلام حسین نے تیار کیا تھا وہ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) کا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا غلام حسین کے نہ صرف مالی حالات ۱۲۱۵ھ میں خراب تھے بلکہ ان کے حسب نسب کے بارے میں بھی لوگ مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے ان کو وہ شہادت نامہ تیار کرنا پڑا۔ ایک مزید پیچیدگی یہ بھی ہے کہ جب غفران مآب مولانا سید دلدار علی صاحب قبلہ کی طرح کے مجتہد کی لکھنؤ میں موجودگی کے باوجود ایک رئیس کے پاس زکوٰۃ کے تین سو چھہتر روپے (۳۷۶ روپے[2]) شاہجہاں آباد بھیجنے کا کیا جواز ہوسکتا تھا۔ مزید برآں رئیس مذکور کے اجتہاد کے بارے میں کوئی سند نہیں ملتی۔ وہ خط بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"......جناب مرزا صاحب علی ہمت والا مرتبت الطاف فرمائی محبان مرزا غلام حسین صاحب زاد عنایتہم بعد سلام و نیاز آنکہ از شکر و الطاف فرمای آں جناب رطب اللسان و عذب البیان و گردنم زیربار احسان اگر دریں باب حرفے بقلم آرم دفترے باید حق جل و علا بایں مراتب شناسی و محبت گستری از ہرچہ شاید محفوظ و از ہرچہ نشاید محفوظ داشتہ یوماً فیوماً بمرتبہ اعلیٰ و مدارج عالی رساند حال داعی بجناب مقدمہ کما ینبغی روشن است از روز یکہ مبلغ سہ صد روپیہ و ہفتاد وشش روپیہ برائے نذر مومنین در مقدمہ زکوٰۃ بدست نامدار خان ارسال فرمودہ بودند تا ہذا الیوم امانت مذکور نزدم موجود فی الحال از ادراک مضمون چند صاحبان

---

۱ 'ماہ نو' راولپنڈی پاکستان، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء، دبیر نمبر۔ مضمون مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات ص ۵۰

۲ افضل حسین ثابت نے حیات دبیر صفحہ ۱۰ پر تین سو پچھتر (۳۷۵ روپے) لکھا ہے جو راقم کی نظر میں سہواً لکھا گیا ہے ورنہ دوسرا خط ایسا نہیں۔

بسمع رسیدہ کہ آقا شاہ حسین اصفہانی از زیارات و کعبہ مقصود فائض گشتہ از چند روز دریں شہر وارد و در عسرت گرفتار می خواہند کہ بوطن مالوفہ خود بروند لہذا تکلیف پرداز خدمت لازمست کہ اگر جناب را بدل منظور باشد حصہ مومنین را بمنت و سماجت پیشکش ساختہ حوالہ آقاصاحب نمودہ، روانہ اصفہان نمایم....."

(مختار خان[۱۲] بہادر[۱۲])[۱]

اگر اس خط میں تاریخ دی گئی ہوتی تو شاید اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے صحیح نتائج تک رسائی ہوسکتی مگر بدقسمتی سے اس کی شہادت کسی طرح نہیں ملتی کہ یہ خط مرزا غلام حسین کو ورود لکھنؤ کے ایک سال بعد بھی لکھا گیا، نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ لکھنؤ آنے کے فوراً بعد مرزا غلام حسین کے مالی حالات اچھے ہوگئے اور وہ صاحب جائداد بن گئے تھے۔ خود افضل حسین ثابت لکھتے ہیں کہ مرزا غلام حسین نے نواب اودھ کی نوکری نہیں کی۔ جبکہ ان کے لیے یہ بہت آسان کام تھا کیونکہ وہ آصف الدولہ کا زمانہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ دہلی میں میر منشی اور استاد بادشاہ دہلی یہ خاندان رہ چکا تھا۔[۲]

اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک صورت جلدی سے صاحب مال بن جانے کی ضرور تھی مگر بقول ثابت مرزا غلام حسین نے نوکری نہیں کی۔ راقم کا خیال ہے کہ نوکری حاصل کرنا مرزا غلام حسین کے لیے آسان نہ تھا، اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ جب مرزا غلام حسین وارد لکھنؤ ہوئے تو وہ کمسن تھے۔ ۱۲۰۵ھ میں ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی اور وہ اکبرآباد سے شاہجہاں آباد اور شاہجہاں آباد سے پھر لکھنؤ آئے تھے۔ جان پہچان نہیں تھی شہرت بھی ایسی نہیں تھی جو ان سے پہلے لکھنؤ پہنچ گئی ہوتی۔ لہذا نوکری تلاش کرنا اور پھر وہ مل جانا مرزا غلام حسین کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ دوسری وجہ اس کی یہ تھی کہ مرزا غلام حسین کی علمی استعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ ۹ برس کی عمر سے ہی ان کو ماحول ناموافق ملا تھا۔ والدۂ ماجدہ کی موت کے بعد سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں پڑے جو ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتی تھیں یہاں تک کہ زہر دے کر کے ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی۔ ایک بار گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو والد واپس لائے اور تیرہ برس کی عمر میں والد

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۵۵

۲ حیات دبیر ص ۱۲

کے انتقال فرمانے کے بعد تو پاؤں اس طرح اکھڑ گئے کہ مدتوں جمے ہی نہیں۔ شاہجہاں آباد اس وقت آلام روزگار کا نشانہ بنا ہوا تھا وہاں سکون اور اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس لیے جو کچھ پڑھا ہوگا وہ نو برس تک کی عمر میں ہی پڑھا ہوگا۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ مرزا غلام حسین کی علمی استعداد کیا رہی ہوگی۔ فتح علی خان اس لائق نہیں رہے تھے کہ اپنی زندگی اطمینان سے بسر کرتے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کہاں تک خیال کرتے اور پھر مرزا غلام حسین تو دوست کی اولاد تھے۔ اگر مرزا غلام حسین کی علمی استعداد زیادہ ہوتی تو ان کا تذکرہ ضرور کسی نہ کسی کتاب میں ملتا البتہ ان کی جو شہرت ہوئی اور لوگ ان کو جان گئے وہ مرزا سلامت علی دبیر جیسی اولاد کی وجہ سے۔

مرزا علی اظہر برلاس کی رائے بھی یہی ہے کہ مرزا غلام حسین کی علمی استعداد زیادہ نہ تھی[1] ثابت کا یہ کہنا کہ نوکری مل سکتی تھی اور نہیں کی، راقم کے خیال میں مبنی بر تعلّی ہے اور کچھ نہیں۔

مرزا غلام حسین کو صاحب ثروت اور صاحب حشمت ثابت کرنے کے لیے افضل حسین ثابت نے ایک اور خط کا حوالہ دیا ہے جو شمس الضحیٰ میں چھپ گیا ہے۔ یہ خط نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نوراللہ خان آفتاب جنگ کا ہے۔ اس میں مرزا غلام حسین کے کچھ وقت تک متھرا میں قیام کرنے کا ذکر ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بے سبب وہاں قیام پذیر تھے۔ خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب موصوف اس زمانے میں بے فکر نوجوان تھے اور اپنی جائداد وغیرہ لٹا رہے تھے چونکہ نواب صاحب مرزا غلام حسین کے رشتہ دار تھے[2] یہ بات ان کو اچھی نہیں لگی۔ اس خط میں ٹوکنے کے انداز میں انھوں نے تحریر کیا کہ بزرگوں کی جائداد تلف کرنا کیا ثواب ہے اور وطن لوٹنا کیا گناہ ہے۔ خط کا متن یہ ہے:

''مکتوب نواب ضیاء الدولہ منیر الملک محمد نوراللہ خان بہادر آفتاب جنگ

مرزا صاحب مشمل الطاف کثیر الاشفاق جناب مرزا غلام حسین صاحب زاد اعطافکم۔

---

۱ 'ماہ نو' راولپنڈی پاکستان، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء دبیر نمبر - ص ۵۱

۲ استشہاد (مشمولہ شمس الضحیٰ) پر نواب صاحب نے مہر ثبت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ مرزا صاحب کی نانی اور نواب صاحب کی نانی سگی بہنیں تھیں۔

بعد ارسال احسن الھدایا کہ معتبر است بسلام مسنون و اشتیاق ملاقات مسرت مشہون مظہر مدعا رقعہ رافت مرقعہ مع زوج۔ دوشالہ دوردار پرمتن و کمربند شالی پرمتن رنگ زنگاری از مال عمدہ کشمیر۔ ہم چنیں شاہان را سبز و بلافرد تفصیل قیمت باصرار قبول کہ عنایت فرمودند وصول محبت شمول ساختہ حاضرین صحبت و پشمینہ شناسان متعجب صنعت و متحیر تنقیح قیمت خودہا نمودہ باعث مزید خورسندی خاطر محبت ذخائر گشتہ جناب احدیث ہم چنیں شفیق دلدار خالص را بحفظ امان خود دارد۔ ہر چند بکرامت ایزد منان تعالیٰ شانہ پشمینہ کثیر کار کشمیر پیش نیاز گذار است الا بنظر نایابی ہمچوشی لطیف و عمدہ و اصرار گرامی بقبول آں داشتہ دل من میخواہد کہ کمربند مذکور برای تزئین کمر شریف طلب شود و زوج دوشالہ برسرم تا تنہا منبسط نیاشم و دیگر التماس ضروری آنکہ متحیرم کہ باعث قیام متھرا چیست آیا دیدہ و دانستہ تلف کردن۔ جائدات موروثے و املاک ہزارہا روپیہ والد خود کہ در آنجا است ثوابے وارث خیلی دلم می سوزد آیا شاہجہاں آباد قابلِ مشاہدہ چند روز ہم نیست خیر اگر آمدن بوطن مالوف نزد آن شفیق گناہ عظیم دارد پس نزد صوبیدار اودھ بروند کہ جدشان اعنی برہان الملک بجد اعلائے آن شفیق اعنی ملا محمد رفیع صیغۂ اخوت داشتند بلکہ اجداد اوشان زیربار احسان اجداد آں شفیق مستند البتہ بخیال ھل جزاء الاحسان الا الاحسان بخوبی نگہداشت جناب شا خواہند ساخت لیکن می ترسم کہ ایں امر خلاف مزاج مبارک بندگان حضرت قدر قدرت نہ شود ہر آئینہ رفتن آن شفیق نزد اوشان پوشیدہ نخواہد ماند در بصورت استخارہ اولی است اگر ایں ننگ رفتن ناگوار طبع افتد مراجعت وطن مالوف از ہمہ خوب تر بے شک کرایہ مکانات و قیمت فصل باغات جہت خرچ و اخراجات آں شفیق کافی خواہد شد بقول آنکہ گندم اگر بہم نہ رسد جو غنیمت است آئندہ اختیار بدست مختار انچہ حق دوستی بود نوشتم تسلیم نمودن کار آں شفیق است و تفصیل اجمال صدر آنست کہ صفدر جنگ صوبہ دار اودھ بہ زمانہ وزارت ابوالنصر مجاہدالدین احمد شاہ غازی محسود عالم گشتہ اکثر امراء و اراکین دولت و سلطنت کہ از پشتہاپشت مقرب درگاہ بودند از خدمت وزارت اوشان ناخوش شدند بلکہ بعضے از خاندان

وزاری چشیین در پے آبرو جان آں بیچارہ گشتند لیکن از بسکہ اجداد آں شفیق اعنی
عنایت اللہ خاں صوبہ دار کشمیر و ملاّ غلام محمد صاحب شیرازی مدد و معاون اوشان
بودند دشمنی کسی پیش نرفت تا اینکہ اراکین مذکور چنان بادشاہ را از جانب اوشان
برافروختہ کردند کہ قریب بود کہ نوبت ذلت و رسوائی و قید برسد لیکن باغات ہر دو
صاحبان مذکور ازین بلاہا محفوظ ماندند تا اینکہ صوبہ دار کشمیر اوشان راسست اودھ
مرخص ساختند فقط راقم آثم۔

آفتاب ۹۰ جنگ ۱۱، محمد نور اللہ خان بہادر، نواب ضیاء الدولہ منیر الملک[1]

یہاں ایک قابل توجہ ہے کہ مرزا غلام حسین متھرا میں بھی رہے اور اپنے اجداد کی جائداد کو تلف کرتے رہے اور اپنے وطن دہلی واپس آنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن خط میں چونکہ تاریخ نہیں ہے اس لیے زمانہ کا تعین کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ متھرا کب اور کس سلسلے میں گئے۔ دہلی سے گئے یا لکھنؤ سے۔ مگر اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اس زمانے میں جوان تھے۔ خط پر ۱۱۹۰ھ کی مہر کندہ ہے۔ مرزا صاحب موصوف کا سال پیدائش بھی یہی ہے اس لیے خط ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء کے بعد کا ہونا چاہیے بلکہ لکھنؤ میں ایک دفعہ رہنے کے بعد کا کیونکہ یہ خط ظاہر کرتا ہے کہ مرزا صاحب موصوف جوان رہے ہوں گے۔

دوسرا خط جو اس ضمن میں مولف حیات دبیر نے پیش کیا ہے وہ امجد علی خان بہادر کا ہے جو شمس الضحیٰ کے صفحہ ۵۷-۱۵۶ پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اپنے قیام متھرا کے دوران مرزا جواں بخت صاحب عالم بہادر کی خدمت میں ایک گھوڑا بھیجا تھا جس کو صاحب عالم نے قبول کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں ہے بلکہ صرف مہر کے ساتھ سن کندہ ہے اور وہ بھی نامکمل، صرف ۱۱۹ پڑھا جاسکتا ہے۔ اگر اس کو ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء فرض کیا جائے تو وہ ناممکن ہوگا کیونکہ وہی مرزا صاحب کا سال پیدائش[2] ہے۔ اب اگر ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱/۱۸۰۲ء) مان لیا جائے تو اس وقت مرزا جواں بخت کا انتقال ۱۲۰۲ھ (۱۷۸۷ء) میں بنارس میں ہو چکا تھا اگر اسے وہ زمانہ تصور کیا جائے

---

۱ شمس الضحیٰ، ص ۶۲-۱۶۰

۲ فرمان شاہی بسلسلۂ منظوری صرفہ دایہ شامل شمس الضحیٰ حیات دبیر جلد ا ص ۸ حاشیہ دوم

جب مرزا جواں بخت دہلی میں تھے تو زیادہ سے زیادہ ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۳ء) ہوسکتا ہے کیونکہ جواں بخت ۱۱۹۸ھ میں ہی افراسیاب کی بدسلوکی سے تنگ آکر دہلی سے لکھنؤ آصف الدولہ کے پاس آگئے تھے مگر ۱۱۹۸ھ میں مرزا غلام حسین کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی اور ان کے والد مرزا غلام محمد بقیدِ حیات تھے جیسا کہ استشہاد سے ظاہر ہے اس لیے مرزا غلام حسین کی طرف سے نذر بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح مرزا اظہر علی برلاس کا قیاس لائق اعتنا نہیں رہ جاتا ہے۔[1]

دراصل خط پر تاریخ نہ ہونے کی بنا پر تحقیقی دشواریاں لاحق ہوگئی ہیں، جو دیگر شواہد کی عدم موجودگی میں کسی نتیجہ تک رہنمائی نہیں کرتیں۔ شمس الضحیٰ میں نواب ضیاء الدین منیر الملک محمد نوراللہ خان بہادر آفتاب جنگ کا ایک اور خط شامل ہے جس میں وہ مرزا صاحب موصوف کو ان کی سوتیلی ماں کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے جائداد کی حفاظت کے لیے لکھتے ہیں۔ اس میں بھی تاریخ نہیں دی ہے البتہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء مہر میں کندہ کیا ہوا ہے۔ خط کا متن یہ ہے:

"جناب مرزا صاحب جلیل المناقب جزیل المناصب مفخم و متاع ارادتمندان جناب مرزا غلام حسین صاحب دام برکاتہ

بعد آرائش چہرہ نیاز واردات بغازہ ذکر محامد تفصلات بیغایات بالتماس ضروری عرض می دہد۔ سابق ازیں حقیقت اینجا مکرر بمعائنہ انور رسانید جواب یکی ازاں ہا ایراد نیافت امری خبر عافیت عنصر لطیف مبادمظنہ کہ شاید رقائم جرائم نرسانید و الا از عطوفت گرامی خصوصاً در امریکہ نیک اندیشی محبان باشد و جواب نرسد محمول عدم توجہ میشود نظر برآں تحریر و ترسیل نکردہ سہ کرر مفصل واجب افتاد و آں اینکہ والدہ ماجدہ نامہرباں عالی رحلت فرمودند و املاک و اموال میراث والد ماجد ہزار ہا روپیہ گذاشتہ خانہ را دان شان قبضہ نمودہ و سامی کہ غلام علی را مختار نمودہ فرستادہ بودند او نیز از خانہ زادان سازش نمودہ یکو وج دوشالہ و سہ عدد قبای جامہ دار و کمر بند شالی و شمشیر ولایتی اصفہانی از غلامان مذکور گرفتہ ہمچنان بقبضہ

---

۱ ماہ نو، دبیر نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۵۲

آنہا گذاشتہ رفتہ در قائم کہ دریں باب ارسال شدند جواب نرسید و شیخ غلام علی
مذکور کہ فرستادہ می آمدہ بود از من ملاقات ہم نساخت چوں دیدم کہ عمارات و
باغات و دکانہائے کٹرہ بالکل برباد میروند قریب است کہ نوبت بفروخت
آنہارسد و انچہ اموال منقولہ بود خانہ زادان برباد و تباہ نمودہ بمزید محبت مجبور
گردیدہ میر کریم اللہ رفیق خود مع ملتمسۂ ہذا مفصل روانہ خدمت ساختہ مطلع
گردانیدہ مکلف اوقات با برکات است کہ دیدہ و دانستہ عمارات و باغات و
دوکانہاے کٹرہ املاک غیرمنقولہ جدی و پدری کہ باقی ماندہ بربادنمودن خلاف
عقل است اگر شریف آوری خود ناممکن باشد قطعہ مختارنامہ بنام میر کریم اللہ برند
وملتمسہ کہ مرد تعمیر و رفیق قدیم بندہ ہستند نوشتہ دہند و جائداد تنخواہ شان پانزدہ
روپیہ ماہواری از کرایہ دوکانہاے کٹرہ و حاصلات باغات کردہ دہند و نیز خط
مہری خود بنام خلوص آگین باعانت میر صاحب مرقوم نویسند کہ معین بودہ از
حاصلات باغات وکرایہ دوکانہائے مذکور تنخواہ شان دہانیدہ انچہ باقی ماندہ مع جمع
خرچ آن ماہ بماہ ارسال کنانیدہ بپاس محبت اطلاع نمودہ آئندہ ہرچہ رای
شفقت آرای اقتضا سازد ایمارود کہ بعمل آید زیادہ جمعیت و شادمانی باد۔

آفتاب ۱۲۹۰ھ، محمد نوراللہ خان بہادر، نواب ضیاء الدولہ منیرالملک[1]

اس خط پر صریحاً غلط سن درج ہے۔ اس لیے کہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) سے قبل مرزا غلام حسین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا ثبوت کہیں سے نہیں مل سکتا کہ مرزا غلام حسین ۱۲۹۰ھ تک زندہ رہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مرزا دبیر کم سنی ہی میں شاعری میں شہرت پا چکے تھے۔ تاریخ کہنے میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی لیکن مرزا غلام حسین کی وفات پر ان کا کوئی قطعۂ تاریخ بھی نہیں ملتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مرزا غلام حسین کے حالات بہت کچھ معلوم ہوسکتے تھے۔ مرزا دبیر کا سالِ وفات ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ان کی شہرت اس سے بہت پہلے ہوئی تھی اس لیے ان کا ذکر ضرور اس وقت کی کتابوں میں مفصل پایا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ دوسری بات جو

---

۱ شمس الضحیٰ، ص ۵۹-۱۵۷

اس کو غلط ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ ان کی والدہ اتنی مدت تک کہاں زندہ رہتیں اگر وہ اس وقت تک زندہ رہی ہوتیں تو جائداد کی وہ صورت نہ ہوتی جس کا ذکر خط میں کیا گیا ہے۔ اب اگر اسے بجائے ۱۲۹۰ھ کے ۱۱۹۰ھ مان لیا جائے تو وہ بھی ناممکن ہے اس لیے کہ مرزا صاحب کا سال پیدائش ہے۔ مرزا علی اظہر برلاس اسے ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) قرار دیتے ہیں [1] اور وہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مرزا غلام حسین لکھنؤ آچکے تھے۔ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) اور ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) کے درمیان وہ لکھنؤ آئے اور اس کے تقریباً بارہ برس بعد ان کی والدہ کے انتقال کی خبر نواب نوراللہ خان نے ان کو دی اور جائداد کی حصولی کی تاکید کی۔ اس زمانے میں استشہاد پر شہادت قلم بند کرنے کے لیے اس کو بھی (استشہاد کو) ساتھ میں دہلی اور آگرہ لے گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس کے کچھ وقت بعد ہی مرزا غلام حسین متھرا بھی گئے ہوں جس کا ذکر نواب صاحب کے ایک اور خط میں ملتا ہے جس کی نقل گزشتہ صفحات میں راقم نے پیش کی ہے۔ اس میں چونکہ جائداد کے ضائع کرنے کا بھی ذکر ہے جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مرزا صاحب موصوف اس وقت تک جائداد حاصل کر چکے تھے۔

مرزا غلام حسین کی شادی

صاحب حیات دبیر کہتے ہیں کہ مرزا غلام حسین نے لکھنؤ میں شادی کر لی اور اس غرض سے استشہاد بھی مرتب کیا گیا مگر یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ مصنف مذکور نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ لکھنؤ آتے ہی انھیں شادی کی ضرورت سے یہ استشہاد تیار کرنا پڑا [2] استشہاد پر ۷ رجب ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) کی تاریخ درج ہے۔ [3] جس سے واضح ہے کہ یہ استشہاد مرزا غلام حسین نے ورود لکھنؤ کے کافی عرصہ کے بعد مرتب کیا۔ اس استشہاد سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ آنے کے وقت مرزا غلام حسین مفلوک الحال اور کمسن تھے اس لیے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اب اگر صاحب حیات دبیر کی یہ بات

---

۱ دبیر نمبر ماہ نو پاکستان، ستمبر اکتوبر ۷۵ء ص ۵۲

۲ حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۲

۳ استشہاد شامل شمس الضحیٰ

مان لی جائے کہ مرزا غلام حسین نے لکھنؤ میں شادی کی تو اس جگہ کا حوالہ کہیں نہ کہیں ضرور ملتا جہاں شادی ہوئی ہی۔ کم از کم مرزا دبیر کے ننہال کا تذکرہ اس خاندان اور جگہ کا ذکر کسی نہ کسی کتاب میں ضرور ملتا۔ چونکہ مرزا دبیر لکھنؤ میں ہی رہے۔ ان کا ننہال والوں کے ساتھ تعلق ضرور رہا ہوتا اور اس طرف کے رشتہ داروں کا ذکر ضرور کہیں نہ کہیں ملنا چاہیے تھا اس لیے مرزا علی اظہر برلاس کی رائے زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ثابت صاحب کا یہ کہنا کہ مرزا غلام حسین صاحب نے لکھنؤ میں شادی کی خود ان کی تحریر سے پایا نہیں جاتا۔ اگر شادی لکھنؤ میں ہوتی تو ثابت صاحب مرزا غلام حسین صاحب کی سسرال کا ذکر ضرور کرتے اور مرزا صاحب موصوف کے خسر اور دیگر سسرالی اعزا کے حالات کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے جیسا کہ دبیر مرحوم کے سسرالی سلسلہ کا ذکر کیا ہے۔ کم از کم اتنا تو اشارہ ہوتا کہ لکھنؤ کے کس محلے میں شادی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ لکھنؤ میں بوجہ تنگدستی وعسرت کے کسی اچھے خاندان میں رشتہ نہ ہوسکا جب ہی مجبور ہوکر مرزا غلام حسین صاحب نے استشہاد کیا۔ اسی زمانے میں سوتیلی ماں کے مرنے کی خبر ملی تو وہ دہلی پہنچے اور وہاں چونکہ ان کے خاندان سے لوگ واقف تھے اس لیے وہیں شادی کی اور بچے پیدا ہوئے۔''[1]

لکھنؤ میں کہیں مرزا غلام حسین کے نسبتی اعزا کا حوالہ نہ ملنے کی بنا پر یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کی شادی دہلی میں ہوئی اور اولاد بھی وہیں ہوئی۔ چنانچہ چار بچے، دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں اور ولادت سب کی دہلی میں ہوئی۔ ایک لڑکی میر ببر علی بجنوری سے منسوب ہوئی اور دوسری دختر حکیم میر محمد حسین عزیز سے۔ دو فرزند مرزا غلام محمد نظیر[2] اور مرزا سلامت علی دبیر[3] ہوئے۔

''حیات دبیر'' میں آخری بار مرزا غلام حسین کا ذکر اس وقت ملتا ہے جب وہ دبیر کو لے کر میر ضمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مرزا دبیر کی عمر گیارہ برس بیان کی

---

۱ دبیر نمبر ماہِ نو راولپنڈی پاکستان ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۵۳

۲ تفصیل کے لیے اس مقالہ کا صفحہ ۴۸-۱۴۷ ملاحظہ ہو۔

۳ حیات دبیر جلد ۱ صفحہ ۱

جاتی ہے[1] یعنی ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) میں مرزا غلام حسین کی عمر ۳۹ برس رہی ہوگی۔ اس کے بعد کہیں ذکر نہیں ملتا البتہ کسی اور شہادت کی عدم موجودگی میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ ہی میں انتقال کیا اور یہاں دفن ہوئے۔

مختصر یہ کہ مرزا غلام حسین پندرہ یا سترہ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ آئے اور یہاں عسرت میں زندگی بسر کی کیونکہ سوتیلی ماں کے رشتہ دار املاک و اموال والد پر متصرف ہوگئے تھے۔ مرزا، فتح علی خان کے ساتھ دہلی سے آئے تھے جو ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حالانکہ خود مفلس ہوگئے تھے ان کے لیے کتنا کچھ کرتے ثابت نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ بزرگوں کی بچی ہوئی چیزیں فروخت کر کے اپنا گزارہ کرلیتے تھے۔ ممکن ہے گھر کا اثاثہ جو وہ بیچتے رہے اس میں کاغذ بھی رہے ہوں اور آغا جان یعنی فضل علی خان اس کو بھی بیچتے ہوں جس سے وہ کاغذ فروش مشہور ہوگئے اور لوگوں نے ان کے بارے میں آغا جان کاغذ فروش[2] لکھا۔ بعد میں لکھنؤ سے دہلی اور آگرہ گئے۔ دہلی میں شادی کی اور وہیں بچے بھی ہوئے۔ اس کے بعد پھر لکھنؤ آئے اور یہیں رہے۔ یہیں انتقال کیا۔

مرزا سلامت علی دبیر کے برادر اکبر مرزا غلام محمد نظیر بھی دہلی میں پیدا ہوئے تھے شاعر تھے اور مرثیہ کہتے تھے۔ ان کا انتقال لکھنؤ میں ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں ہوا۔[3]

مرزا سلامت علی دبیر کے خاندان اور سلسلۂ نسب کے بارے میں یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ آبا و اجداد ایرانی الاصل تھے اور بعد میں ہندوستان آئے تھے۔ اپنے دور کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے او مناصب جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ جنھوں نے اس کے خلاف لکھا ہے ان کے بیانات درست نہیں ہیں۔ صاحب سراپا سخن نے لکھا ہے:

> ''مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان آغاجان کاغذ فروش۔''[4]

---

۱ ایضاً ص۲۲

۲ سراپا سخن میر محسن علی، صفحہ ۱۰۸

۳ مرزا دبیر نے میر انیس اور مرزا نظیر کی وفات کی تاریخ ایک ہی قطعہ میں نظم کی ہے۔ قطعہ آئندہ صفحات میں پیش ہوگا۔

۴ سراپا سخن میر محسن علی، ص ۱۰۸

یہاں تک کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آغا جان مشہور تھے اور مرزا غلام حسین چونکہ ان کے مکان میں رہتے تھے اس لیے تذکرہ نگار نے انھیں کی نسبت سے ان کا ذکر کردیا لیکن اس تذکرہ میں آگے چل کر لکھا ہے: ''مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش''[1] صاحب تذکرہ کے دونوں بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دیگر شواہد سے توثیق نہیں ہوتی۔

عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ ''سخن شعراء'' میں صاحب سراپا سخن کی تقلید میں مرزا غلام حسین کو کاغذ فروش کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''دبیر تخلص، مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش لکھنوی شاگرد مظفر حسین ضمیر۔''[2]

محمد یحییٰ تنہا نے بھی اپنے تذکرہ ''مراۃ الشعراء'' جلد اول میں یہی نقل کیا ہے اور غالباً ان کی نگاہ میر محسن علی کے پہلے بیان پر نہیں گئی اور دوسرے بیان کے تحت انھوں نے لکھا:

> ''مرزا سلامت علی نام اور دبیر تخلص تھا۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے آسمان پر پہنچا دیا۔ خاندانی شاعر نہ تھے ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔''[3]

محمد یحییٰ تنہا نے تو انتہا کردی کہ دبیر کے والد کا نام آغا جان لکھا جو سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ ایک دوسری جگہ اسی تذکرہ میں مرزا غلام حسین بھی درج ہے۔ اس سے ان کے متضاد بیانات اور غیر ذمہ دارانہ روش بے نقاب ہوجاتی ہے۔ اسی طرح دبیر کے ترجموں کے متعلق تنہا نے مولانا محمد حسین آزاد کے بیانات بغیر حوالہ کے درج کردیے ہیں۔ تنہا کا دوسرا ماخذ ''موازنۂ انیس و دبیر'' تصنیف شبلی نعمانی ہے جس پر اعتماد کر کے خود کو بری الذمہ قرار دیا ہے اور کسی طرح کی مزید تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مولوی محمد حسین آزاد کا ماخذ ''سراپا سخن'' ہے موصوف لکھتے ہیں:

> ''تذکرۂ سراپا سخن میں لکھا ہے کہ ان کے (مرزا دبیر کے) والد مرزا

---

۱ سراپا سخن، ص ۲۱۵

۲ سخن شعراء عبدالغفور نساخ (مرتبہ ۱۲۸۱ھ مطبوعہ ۱۲۹۱ھ یعنی ۱۸۷۴ء) ص ۱۵۸

۳ مراۃ الشعراء جلد اول۔ محمد یحییٰ تنہا مطبع عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور

آغا جان کاغذ فروش تھے پھر ایک جگہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں دبیر ولد غلام حسین متعلقان مرزا آغا جان کاغذ فروش سے ہیں۔ مصنف مذکور کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں۔ اس لیے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک۔"[1]

مدنظر رہے کہ محمد حسین آزاد نے اس مسئلہ کی تحقیق کی جانب توجہ نہیں کی ہے لیکن انھوں نے تذکرہ سراپا سخن کے مولف کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی طرف اشارے کر دیے ہیں۔ ان کے برعکس محمد یحییٰ تنہا نے آزاد سے خوشہ چینی کی اور تذکرہ سراپا سخن کے متعلق کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہ کی، جس سے ان کا غیر محتاط رویہ واضح ہو جاتا ہے۔

مصنف "تنقید آبِ حیات"[2] نے بھی صاحب "آب حیات" مولف "سخن شعراء" اور مولف "مجموعہ سخن" کے مرزا دبیر کے نسب کے ترجمے میں دیے ہوئے بیانات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ "تنقید آب حیات" میں تو "شمس الضحیٰ" میں چھپے ہوئے فرمان بھی نقل کیے گئے تھے جنھیں محمد یحییٰ تنہا نے عمداً نظر انداز کیا۔

تذکرۂ بزم سخن (نامی مفید عام آگرہ ۱۸۸۱ء) میں بھی کہیں آغا جان کاغذ فروش کا ذکر دبیر کے ترجمے میں نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس بیان ہے۔

"مرزا سلامت علی خلف مرزا غلام حسین لکھنوی باضمیر پیوند تلمذ داشت مرثیہ خوشتری گفت بیتے از گفتارش دست ندارد۔"

روان کرتا تھا خنجر گاہ، گاہے روک لیتا تھا
عجب ناز و ادا سے اوس نے کاٹا میری گردن کو[3]

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر ہمارے محققین کرام نے مرزا دبیر کے متعلق تلاش و جستجو سے کام نہیں لیا ہے ورنہ شہادتیں اس زمانہ میں بھی موجود تھیں البتہ لالہ

---

۱ آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد ناشر احسان بکڈپو مطبع سرفراز پریس، حاشیہ ص ۲۷۱
۲ تنقید آب حیات، مولفہ جناب میر محمد رضا (شاگرد دبیر) ص ۴-۳ اردو پریس لکھنؤ ۱۳۰۳ھ
۳ تذکرہ بزم سخن، ابوالنصر سید علی خان مطبع نامی مفید عام آگرہ ۱۸۸۱ء، ص ۴۸

سری رام نے اپنے تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ ''خم خانۂ جاوید'' مرتب کرتے وقت مرزا دبیر کے متعلق نسبتاً تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ''شمس الضحیٰ'' اور ''حیاتِ دبیر'' سے استفادہ کیا بلکہ مرزا اوج صاحب (خلف مرزا دبیر) سے بھی مرزا دبیر کے حالات دریافت کیے اور افضل حسین ثابت سے بھی استفسار کیا یہاں تک کہ ان کا ایک رسالہ مرزا دبیر کے ترجمے میں بعنوان ''خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی'' بھی اپنے تذکرہ میں شامل کیا۔[1]

زیرنظر شجرہ سے مرزا دبیر کے بزرگوں کے علاوہ ان کے بعد کی نسل کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ مرزا دبیر کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی نثار جو ملا اہلی شیرازی کے برادر حقیقی تھے، اپنے دور کے ممتاز نثرنگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا محمد رفیع کو اپنے معاصرین میں بحیثیت شاعر شہرت حاصل تھی۔ مرزا رفیع کے بعد مرزا غلام محمد اور ان کے بیٹے مرزا غلام حسین کے شعر و شاعری سے کسی براہ راست تعلق کے شواہد دستیاب نہیں۔ قدرت نے دونسلوں کی شعر و شاعری سے بے تعلقی مرزا دبیر اور ان کے برادر اکبر مرزا غلام محمد نظیر کے ذریعہ نہ صرف پوری کی بلکہ مرزا دبیر کو اردو مرثیہ نگاری میں عہد آفریں شخصیت کا حامل بنا دیا۔

مرزا دبیر کے بعد مرزا محمد جعفر اوج ان کے بیٹے مرزا محمد طاہر رفیع نے شاعرانہ کمال حاصل کیا۔ حالانکہ اس درجہ کی مرثیہ نگاری جسے بزرگوں نے امتیاز بخشا تھا، زمانے کے نامساعد ہونے کے سبب سے خاندان میں باقی نہیں رہ سکی لیکن یہ امتیاز بھی کیا کم ہے کہ عصر حاضر تک خانوادۂ دبیر میں مرثیہ گوئی کا چراغ روشن ہے۔ مرزا محمد طاہر رفیع کے بیٹے مرزا محمد صادق صادق اور ان کے صاحبزادے آغا گوہر شعر و شاعری خصوصاً مرثیہ گوئی سے ذہنی ربط رکھتے ہیں۔

مرزا دبیر کے معنوی ورثاء کی تعداد مرثیہ گویوں میں سب سے زیادہ ہے اور ملک کے بیشتر مرکزی مقامات پر ان کے شاگرد نظر آتے ہیں جن کے شاگرد در شاگرد مرثیہ گویوں کی

---

۱ تذکرہ ہزارداستان المعروف بہ خمخانہ جاوید۔ مولفہ لالہ سری رام مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۷ء جلد سوم صفحہ ۵۸-۱۵۱

شجرہ
مرزا سلامت علی
دبیر
ملا ہاشم شیرازی نثار (برادر حقیقی ملا اہلی شیرازی)
وفات ۹۴۲ھ
مرزا غلام محمد
مرزا غلام حسین
مرزا سلامت علی دبیر
مرزا محمد جعفر اوج
مرزا محمد طاہر رفیع
مرزا محمد صادق
میاں نجاتی

تعداد متعین نہیں کی جاسکتی ہے[1]

مرزا دبیر نہ صرف اپنے خانوادہ میں بلکہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ایک تناور چھتنار درخت کی طرح ہیں جس کے سایے میں دوسرے پودے قوت نمو کے باوجود سرسبز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ تنقید نگار بسا اوقات دبستان دبیر کے مرثیہ گویوں کے ادبی مرتبہ کے تعین میں مرزا دبیر کے عطا کردہ معیاروں پر دیگر مرثیہ گویوں کے کمال فن کا تجزیہ کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں ان اہم مرثیہ گویوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا کیونکہ ان میں بیشتر اپنی انفرادیت کے مالک ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر مرزا دبیر کے بیٹے مرزا محمد جعفر اوج کا ذکر کیا جاسکتا ہے جنھوں نے نہ صرف مرثیہ گوئی میں اپنے والد کے عطا کردہ علم و فضل، قدرت کلام، زبان دانی، عروض و بیان وغیرہ کے ورثے کی امانت داری کی بلکہ اسے تفکر اور زندگی کے گوناگوں مسائل سے ہم آہنگ کرکے مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرزا اوج کی حقیقت آگیں نگاہ فیض کا کام کرتا تھا جس کی بدولت مرزا دبیر کے شاگرد شاد عظیم آبادی نے مرثیہ گوئی کی تاریخ کو جدید رنگ و آہنگ سے روشناس کردیا جس سے فیض حاصل کرکے عصر حاضر میں مختلف مرثیہ گویوں نے طرح طرح کے تجربے کیے اور مرثیہ کو زندہ متحرک اور نمو پذیر صنف سخن کی حیثیت سے باقی رکھا۔

ہمارا موضوع نہ صرف یہ کہ دبستان دبیر کے تمام شعرا کے کلام کے جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ اس مطالعہ میں دبستان دبیر کے نامور مرثیہ گویوں کے کارناموں پر اجمالی نظر ڈالنا بھی حیطۂ اختیار کے باہر ہے۔ اس دبستان میں کئی اعلیٰ پیمانے اور بلند پایے کے مرثیہ نگار ہوئے ہیں جن کے لیے کسی الگ باب کی نہیں بلکہ الگ الگ مستقل تصانیف کی ضرورت ہے۔

---

1 دبستان دبیر کے مرثیہ گویوں کے حالات پہلی بار افضل حسین ثابت نے ''دربار حسین'' میں پیش کیے جس پر بعض اضافے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ''دبستان دبیر'' میں کیے، لیکن اس میں دبستان دبیر کے تمام مرثیہ گویوں کے حالات اور نمونۂ کلام درج ہونا تو درکنار، ان کے ناموں کی مکمل فہرست بھی شامل نہیں ہے۔ یہ اہم اور دشوار کام کسی ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ ایسے لوگ رخصت ہوتے جارہے ہیں جن سے معلومات کی فراہمی میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ کاش کہ اہل نظر توجہ کرتے!

اس کساد بازاری کے عالم میں جب مرزا دبیر کی طرح کا عظیم الشان مرثیہ گو نظر انداز کر دیا گیا تو دبستان دبیر کے دیگر ناموروں پر کون توجہ کرتا۔ مرزا دبیر اردو مرثیہ کی تاریخ میں بلندترین نام ہے جن کی شخصیت اور کلام کا تجزیہ ایک مقالہ میں پیش کیا گیا ہے۔

مرزا دبیر کی ولادت

مرزا دبیر کی ولادت دہلی میں محلۂ بلی ماران متصل لال ڈگی میں ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو ہوئی۔ ''بخت دبیر'' سال ولادت ہے۔[۱]

گھریلو ماحول

مرزا دبیر کا گھریلو ماحول شرفائے عصر کا تھا۔ اس میں قدیم روایاتِ شرفاء کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ شجرۂ خاندان اور بزرگوں کے حالات دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں علم و تہذیب ہمیشہ سے رہے اور اہل بیتؑ کی مداحی و شاعری بھی تھی۔ اگرچہ خاندان میں شاعری اور ادب کا سلسلہ مرزا غلام حسین کے شاعر نہ ہونے[۲] کی بنا پر ٹوٹ گیا تھا مگر مرزا دبیر کے برادر اکبر مرزا نظیر نے پھر اس سلسلہ کو جوڑ دیا اور مرزا دبیر نے اس کو وہ رفعت بخشی کہ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔[۳]

مرزا دبیر اور ان کے بزرگوں کا مذہب

بعض حضرات نے مرزا دبیر کے مذہب پر بھی قلم اٹھاتے ہوئے قیاس آرائیوں سے کام لیا۔ ''شمس الضحیٰ'' جو مرزا دبیر پر سب سے قدیم ماخذ ہے جسے مولوی صفدر حسین نے مرزا دبیر کی زندگی میں تصنیف کرنا شروع کیا تھا۔ موصوف اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ مرزا دبیر کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ علاوہ بریں اس پوری کتاب میں کہیں مرزا دبیر

---

۱ حیات دبیر، صفحہ ۲۰، صفحہ ۳۸۹

۲ کہیں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا کہ مرزا غلام حسین شاعر یا ادیب تھے۔ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں یہ صلاحیتیں نہیں تھیں البتہ اب تک جو حوالے اور شواہد سامنے آئے ہیں ان میں مرزا غلام حسین کے شاعر یا ادیب ہونے کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔

۳ حیات دبیر، ص ۲۱

کی وفات کا ذکر نہیں ملتا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صفدر حسین نے اسے کافی عرصہ پہلے لکھنا شروع کیا اور بعد میں اس میں واقعات کا اضافہ کرتے رہے۔ یہ کتاب مرزا دبیر کے انتقال کے صرف چھ سال بعد ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں چھپی اور مرزا دبیر اور ان کے خاندان پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل جن تذکروں میں مرزا دبیر کا ذکر ملتا ہے ان میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی ہے جس سے یہ گمان ہو کہ مرزا دبیر مسلمان نہ تھے بلکہ بیانات سے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ مسلمان تھے اور ان کے آباء و اجداد بھی شیعہ مسلمان تھے۔ مداح اہل بیت تھے اور دبیر ساری عمر اس مسلک پر قائم رہے اور عمر بھر جو کچھ کہا اہل بیت کی ہی مدح میں کہا یا ان کے مصائب بیان کیے، لیکن صاحب ''صبح گلشن''[1] نے مرزا دبیر کو ہندو نژاد قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دبیر نامش سلامت علی دراصل ہندو نژاد بود بطیب خاطر بشرف اسلام مشرف شدہ مذہب شیعہ اختیار نمود۔''[2]

صاحب حیات دبیر نے مرزا حیرت مالک کرزن گزٹ دہلی کا اس ضمن میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مرزا دبیر کو کائستھ نو مسلم لکھ دیا۔[3] راقم کی نظر سے ان کا یہ رسالہ (ارمغان ما چراغ بقول ثابت لکھنوی) نہیں گزرا ہے۔ انھوں نے اس کا سن تصنیف بھی درج نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ غلط خبر دینے میں اولیت کسے حاصل ہے۔ سید علی حسن خان مولف ''صبح گلشن'' کو یا مرزا حیرت کو۔

مرزا دبیر صاحب مسلمان تھے اور اثناعشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اہل بیت رسولؐ سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ ساری عمر اس خاندان کی مدح کی یا اس کے مصائب پر روتے اور رلاتے رہے۔

افضل حسین ثابت اس بارے میں ایک اور انکشاف کرتے ہیں:

---

۱ صبح گلشن۔ سید علی حسن خان مطبع فیض شاہجہاں ۱۲۹۵ھ ص ۱۶۴

۲ راقم کا خیال ہے کہ تذکرہ نگار کے ذہن میں دگّیر رہا ہے جو ہندو تھے اور مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے چھنو لال نام رکھتے تھے اور بعد میں غلام حسین اسلامی نام تھا۔ ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی قبر چڑیا بازار نخاس میں ٹیڑھی قبر کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

۳ حیات دبیر جلد ا ص ۱۵

''از بسکہ مرزا صاحب کے کئی استاد اخباری تھے۔ بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ مرما صاحب ایک محتاط اصولی شیعہ تھے۔''[1]

شاد عظیم آبادی بھی اس کی تردید یوں کرتے ہیں:

''وہ (مرزا دبیر) اخباری مسلک ہرگز نہ تھے مگر بات یہ تھی کہ رواتیوں کے نظم کرنے میں وہ آزاد بہت تھے۔''[2]

ورودِ لکھنؤ

بقول صاحب ''خم خانۂ جاوید'' مرزا دبیر پانچ سات برس کی عمر میں اپنے گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور محلّہ نخاس کے مکان میں رہنے لگے۔[3]

حلیہ

افضل حسین ثابت لکھنوی مرزا دبیر کے حلیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:[4]

''(مرزا دبیر) کا پکا سانولا رنگ کسی قدر کشیدہ قامت، ماتھا بڑا، کثرت سجود سے ماتھے پر سجود کا نشان جو نہایت خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی جو ایرانی الاصل ہونے کا پتہ دیتی تھیں۔ گول دہرا ڈیل، دو انگشتی داڑھی، بڑی اور پاٹ دار دل گداز آواز، واعظ و ذاکر کے واسطے بڑی اور دل گداز آواز ہونا بھی ایک خدا داد نعمت ہے مگر حسد بری بلا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس بڑی آواز کو بھی نام رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اس کا اشارہ فرماتے ہیں:

جب شاہ نجف معین و ناصر ہوئے کیوں سب میں نہ ممتاز یہ ذاکر ہوئے

---

۱ حیات دبیر ص ۲۶

۲ پیمبران سخن، ص ۱۳۲

۳ خمخانۂ جاوید، جلد سوم، ص ۱۵۲

۴ حیات دبیر، ص ۲۵-۲۴

آواز ہے بھاری تو ہو پر بات یہ ہے مجلس میں سخن نہ بارِ خاطر ہوئے

شاد عظیم آبادی[1] کا بیان بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب مرحوم خوبصورت نہ تھے بلکہ بدصورت تھے۔ رنگ بہت کالا تو نہ تھا مگر سنولا بھی نہیں کہہ سکتے۔ آنکھیں بڑی اور گول تھیں۔ ان میں سرخی کے ڈورے، ہونٹ بڑے تھے...... پیشانی اونچی تھی، سر کے بال نہایت کم اور چھدرے تھے ان پر مازو کا خضاب نمایاں تھا۔ داڑھی بالکل مورچہ پرتھی خط بھی بنتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ہر دوسرے دن خط بنتا تھا اور داڑھی کتری جاتی ہوگی کیونکہ دوسرے تیسرے دن میں حاضر ہوا کرتا تھا تو اصلاح بنواتے اکثر پایا۔ اس لیے داڑھی کے بال نمایاں نہ تھے۔ مونچھیں کسی قدر نمایاں تھی مگر کتری ہوئی، اس پر مازو کا خضاب...... قد و قامت متوسط، مرزا صاحب نہ بہت جسیم تھے نہ دبلے تھے۔''[2]

نجات حسین عظیم آبادی ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں لکھنؤ کی سیاحت کے لیے آئے تھے اور اپنے سفر کے اہم واقعات انھوں نے سوانح لکھنؤ کے نام سے رقم کیے ہیں اس میں ایک جگہ وہ مرزا دبیر کے حلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جناب مرزا دبیر کے جثۂ منحنی و قامت میانہ وسبزہ رنگ مائل بہ سیاہی دارند۔''[3]

لباس

کسی کی شخصیت کا اظہار اس کی عادتوں سے ہوتا ہے اور ان میں لباس کی بھی خاص

---

۱ انھوں نے مرزا دبیر سے پٹنہ میں ملاقات کی ہے اور وہیں ان کے شاگرد بھی ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فکر بلیغ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں لکھنا شروع کی تھی اور ۱۹۲۲ء میں اسے مکمل کیا تھا۔ اس کا مقدمہ فکر بلیغ حصہ اول کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شاد کے ایک شاگرد جناب حمید نے شائع کروایا تھا اور دوسرا حصہ المعروف بہ پیمبران سخن پہلی بار ۱۹۷۴ء میں لاہور پاکستان سے ڈاکٹر صفدر حسین کی سعی بلیغ سے شائع ہوا۔ یہ حصہ فکر بلیغ کے نام سے نسیم بکڈپو نے بھی اگست ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔

۲ پیمبران سخن (فکر بلیغ حصہ دوم) ص ۱۱۹ شاد عظیم آبادی مرتبہ سید نقی احمد ارشاد، ڈاکٹر سید صفدر حسین ناشر بارگاہ ادب اسلام پورہ، لاہور ۱۹۷۴ء مطبع اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور۔

۳ خلاصۂ سوانح لکھنؤ، نجات حسین عظیم آبادی، معاصر پٹنہ جولائی ۱۹۶۲ء، ص ۷۸

اہمیت ہے۔ لباس جہاں وجاہت کو ظاہر کرتا ہے وہاں پہننے والے کی نفاست بھی اس سے سامنے آتی ہے۔ مرزا دبیر کے لباس کے متعلق ثابت لکھتے ہیں:

''سر پر گول پنج گوشیہ ٹوپی، جسم میں اندر شلوکہ، اوپر ڈھیلا کرتہ جو گھٹنوں سے نیچا ہوتا تھا، اس کے نیچے ڈھیلا پائجامہ اور پائجامے کے نیچے ایک جانگیہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے۔ پاؤں میں گھتیلا جوتا۔''[1]

شاد عظیم آبادی پیمبران سخن میں لکھتے ہیں:

''......دامن دار گوٹ اور بڑے گھیر کا کرتا، کبھی تنزیب کبھی جامدانی کا پہنتے تھے۔ اندر کوئی شلوکا وغیرہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ زیادہ تر گرمیوں میں بھی عمدہ مشروع کا مہری دار پائجامہ اور سفید جرابیں پاؤں میں، سر پر باریک کام کی چکن کی پانچ گوشے والی ٹوپی بغیر قالب کی اور جیسی کہ اس زمانے میں ایک جدید رسم سہ گوشہ جالی لوٹ کے رومال کے اوڑھنے کی نکلی تھی، جب کہیں تشریف لے جاتے تھے تو اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں زردوزی گھتیلا بھاری کام کا، ہاتھ میں مرشدآبادی جریب، انگلیوں کے ناخنوں میں مہندی کا رنگ، بڑے بڑے عقیق کے نگوں کی تین چار انگوٹھیاں بھی پہنا کرتے تھے، جاڑوں میں بیشتر شالی وگلا، شالی رومال یا عمدہ دوشالہ، سر پر لکھنؤ کی پنج گوشہ شال کی ٹوپی۔''[2]

نجات حسین عظیم آبادی نے ان کے لباس کی طرف ایک اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ شانوں پر ایک سرخ رنگ کا رومال رہتا تھا۔

''......رومالی مناسب و سرخ رنگ بر دوش زیر منبر[3] نشستہ بودند۔''[4]

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہ کہ مرزا صاحب نہ صرف رئیسانہ لباس پہنتے تھے بلکہ ان

---

۱ حیات دبیر جلد ا ص ۲۵ ۲ پیمبران سخن، ص ۱۱۹

۳ نجات حسین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہنچنے پر مجلس ختم ہو چکی تھی اور مرزا دبیر منبر سے اتر چکے تھے۔ راقم۔

۴ خلاصہ سوانح لکھنؤ، صفحہ ۷۹-۷۸-۷۷۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مجلس میں سرخ رنگ کے لباس کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ آج کل عام طور پر سیاہ رنگ کو ترجیح دی جاتی ہے اور سرخ رنگ کا کوئی کپڑا پہن کر مجلس میں شریک ہونا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

کے لباس سے نفاست، وجاہت اور وقار کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی نشست و برخاست منفرد اور حشمت انداز کی حامل تھی۔ وہ اپنے گھر میں ہوں یا کہیں باہر اپنی وضع کا خیال رکھتے تھے اور فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ بقول شاد عظیم آبادی جب کہیں تشریف لے جاتے تھے تو تنہا نہیں جاتے تھے خاندان کے دو چار آدمی ضرور ساتھ رہتے تھے۔ ایک دو خدمت گار، چاندی کا خاصدان اور چھتری لیے سر پر پگڑی رکھے ساتھ رہتے تھے۔[1]

شاد کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کے گھر پر بیٹھنے کا انداز امراء و رؤساء سے مماثل تھا۔ صدر میں ایک بڑا گاؤ، جاڑوں میں اونی قالین اور گرمیوں میں بہت بڑی سوزنی بچھی رہتی تھی۔ آگے ایک بڑا فیض آبادی صندوقچہ سیاہ رنگ کا اور پیتل کی بڑی دوات اور چند واسطی قلم دھرے رہتے تھے۔ پائین میں ہر وقت ایک خدمت گار پگڑی باندھے منتظر حکم کھڑا رہتا تھا۔[2]

تصویر

مرزا دبیر کی تصویر کے متعلق صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں:

> ''میں نے کوشش بلیغ کی کہ لکھنؤ میں یا اور کہیں مرزا صاحب مرحوم کی قلمی یا عکسی تصویر مل جائے مگر ناکام رہا۔ دریافت پر جناب مرزا اوج صاحب قبلہ اور بعض معمر اصحاب کی زبانی معلوم ہوا کہ فوٹو کے مسئلہ پر علمائے اسلام میں مختلف ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب نے اپنی تصویر نہیں کھنچوائی۔ حالانکہ شاہی فوٹوگرافر مشکور الدولہ مرحوم مرزا صاحب مرحوم کے فدائی شاگرد نے بہت چاہا۔ مگر مرزا صاحب فوٹو کھنچوانے پر راضی نہ ہوئے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی نے کلکتہ، پٹنہ، بنارس، آرہ، کھجوہ وغیرہ میں ان کی بغیر اجازت فوٹو لے لیا ہو کہ ان مقامات پر مرزا صاحب بعد غدر ۱۸۵۷ء گئے ہیں۔''[3]

سرفراز حسین خبیر کو بھی ''سبع مثانی'' کی اشاعت کے وقت مرزا دبیر کی تصویر دستیاب

---

۱ پیمبران سخن، ص ۴۰-۱۱۹

۲ ایضاً، ص ۱۲۰

۳ حیات دبیر ص ۲۴

نہ ہوسکی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جناب ثابت ''حیات دبیر'' لکھ رہے تھے کہ اس وقت مرزا دبیر مرحوم کی تصویر حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی۔ پچاس روپیہ انعام کا اشتہار دیا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید مرزا دبیر مرحوم نے اپنی تصویر کھنچوائی ہی نہیں۔''[1]

بقول مرزا علی اظہر برلاس مرزا دبیر کی تصویر پہلی دفعہ ''رباعیات مرزا دبیر'' مرحوم کے ایک مختصر مجموعے مرتبہ مولوی سید شبیہ الحسن اثر مطبوعہ شمیم بکڈپو کراچی کے سرورق پر شائع ہوئی ہے۔ اس پر کسی کے ہاتھ سے ''سلامت علی دبیر'' لکھا ہوا ہے۔ دستخط مرزا دبیر کے ہاتھ کے معلوم نہیں ہوتے کیونکہ شان خط مختلف ہے۔ اس تصویر کی اصلیت برلاس صاحب کو بھی معلوم نہ ہوسکی[2] کہ یہ کب اور کہاں سے حاصل ہوسکی۔ راقم الحروف کی نظر سے یہ مجموعہ نہیں گزرا ہے البتہ نظامی پریس لکھنؤ سے جو رباعیات کا مجموعہ سرفراز حسین خبیر نے چھپوایا ہے اس کے سرورق پر بھی یہ تصویر ہے۔ نہ تو اس مجموعہ میں اس تصویر کی کوئی کیفیت درج ہے اور نہ ہی اس کتاب پر سنِ طباعت درج ہے۔ برلاس صاحب نے جس مجموعہ ''رباعیات دبیر مرحوم'' کا ذکر کیا ہے اس کا سن طباعت نہیں بیان کیا ہے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تصویر پہلے کہاں سے شائع ہوئی مگر یہ بات قرین قیاس ہے کہ دونوں کتابوں میں ایک ہی تصویر چھپی ہے۔ بعد میں اس تصویر کو مختلف موقعوں پر لوگوں نے شائع کیا ہے۔ چنانچہ ماہِ نو کے دبیر نمبر ۷۵ء میں بھی یہی تصویر شائع کی گئی ہے۔ راقم الحروف کسی ذریعہ سے اس کی تصدیق نہ کرسکا کہ یہ تصویر مرزا دبیر کی ہی ہے یا نہیں۔ کسی طرح کے تردیدی یا توثیقی دلائل و براہین کی عدم موجودگی میں مرزا دبیر کی تصویر کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مشکوک ہونے کی وجہ سے یہ تصویر اس مقالہ میں شامل نہیں کی گئی۔

غذا

مرزا دبیر صاحب غذا دن میں صرف ایک وقت نو دس بجے تناول کرتے تھے۔ رات

---

۱ سبع مثانی مرتبہ سرفراز حسین خبیر ارشد تلامذہ مرزا اوج ابن مرزا دبیر۔ مطبع نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ مطبوعہ ۱۳۳۹ھ تمہید صفحہ ۵ (فٹ نوٹ)

۲ دبیر نمبر ماہ نو- مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات، مرزا علی اظہر برلاس، ص ۵۶

میں صرف چائے پیتے تھے۔ اس وقت جو احباب اور شاگرد موجود ہوتے ان کو بھی پلاتے تھے۔ آخر عمر میں جب سخت علیل ہوئے اور تپ محرقہ میں سات دن تک بے ہوش رہے تو صحت یاب ہونے پر طبیبوں کی رائے سے دو وقت کی غذا کردی گئی تھی مگر چند روز کے بعد رات کی غذا پھر ختم ہوگئی۔ مرزا اوج[1] نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو مرزا دبیر نے جواب میں فرمایا کہ نماز شب میں دقت ہوتی تھی اس لیے رات کی غذا ترک کردی ہے۔[2]

شاد عظیم آبادی مرزا دبیر کی غذا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمیشہ دن کا کھانا دوپہر بعد کھایا کرتے تھے۔ میٹھے چاولوں اور بالائی سے بہت رغبت تھی۔ ان کا دسترخوان اس سے خالی نہ رہتا تھا۔ دو بجے تک غذا کرنے کے بعد ہی آرام کرتے تھے...... پھر شب کو بارہ بجے غذا کرکے آرام کرتے تھے۔[3]

ان بیانات میں معمولی سا اختلاف ہے۔ اگرچہ شاد نے مرزا دبیر کی غذا کے بارے میں ثابت کے بیان پر اضافہ کردیا ہے مگر ایک الجھن بھی پیدا کردی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دن کا کھانا ہمیشہ دوپہر کے بعد کھاتے تھے اور رات کو بارہ بجے کھانا تناول کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے ثابت کے بیان سے اختلاف کیا ہے۔ ''حیات دبیر'' شاد کی ''پیمبرانِ سخن'' سے پہلے کی تصنیف ہے اور خود شاد نے بھی اس کا مطالعہ کیا تھا مگر مرزا دبیر کے حالات بیان کرتے ہوئے انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ''حیات دبیر'' ان کے پیش نظر نہ تھی۔ اگر ''پیمبرانِ سخن''[4] کی ترتیب کے وقت ان کے پاس یہ کتاب ہوتی تو اس کا حوالہ ہوتا۔ ممکن ہے اسے رد کرتے یا تسلیم۔ چونکہ یہ واقعہ اس سے مختلف ہے اس لیے

---

۱ مرزا محمد جعفر اوج صاحب مرزا دبیر کے فرزند تھے۔ یہ بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کے کلام کا رنگ مرزا دبیر کے رنگ سے مختلف ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ مقیاس الاشعار ہے جو فن عروض پر ایک مکمل کتاب ہے اور بڑے بڑوں سے داد تحسین حاصل کرچکی ہے۔ مرزا اوج کا مفصل ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

۲ حیات دبیر صفحہ ۴۵

۳ پیمبران سخن صفحہ ۱۲۱

۴ اس کا نام شاد نے فکر بلیغ ہی رکھا تھا دراصل فصاحت و بلاغت اور مختلف اصناف سخن پر حصہ اول لکھ چکے تھے پھر بھرپور مثالیں دینے کا خیال آیا اور اس سلسلے میں نظر مرثیہ گو شعراء پر ہی ٹھہری اور کچھ مرثیہ گویوں کے حالات بھی اس کے ساتھ درج کیے (دیباچہ پیمبران سخن)

سردست یہی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں مصنفین نے اپنی اپنی یادداشت کے سہارے اپنے بیانات قلمبند کیے ہیں۔ یہاں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے کہ ان دونوں مصنفین نے مرزا دبیر کو کب اور کس عمر میں دیکھا۔ اس سے بحث نہیں کہ مرزا دبیر کی عمر اس وقت کیا تھی بلکہ اہم بات یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی عمر کیا تھی۔ افضل حسین ثابت ''حیات دبیر'' میں خود لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف چودہ برس تھی یعنی انھوں نے مرزا دبیر کو قریب سے تین چار سال سے زیادہ نہیں دیکھا ہوگا یعنی گیارہ سال کی عمر سے چودہ سال کی عمر تک۔ ظاہر ہے کہ یہ عمر ایسی ہوتی ہے جس میں انسان ہر چیز دھیان سے نہیں دیکھتا اور اگر وہ دیکھتا ہے تو یاد نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس شاد نے مرزا دبیر کو سترہ برس کی عمر میں دیکھا۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کے محرم میں مرزا دبیر اور میر انیس اس شہر میں وارد ہوئے چونکہ مرزا صاحب (مرزا دبیر) سے اور اس خاندان سے بذریعہ مراسلات پہلے سے رسم تھی، مرزا صاحب کے روز ورود کے دوسرے ہی دن بہ شوق تمام اپنے عم بزرگوار کے ہمراہ سید صاحب بھی ملاقات کو گئے۔ مرزا صاحب بڑے تپاک اور حسن خلق سے پیش آئے۔''[1]

پیمبران سخن میں شاد ہی لکھتے ہیں:

''......اصل واقعہ کی خود راقم (شاد عظیم آبادی) کو بھی اطلاع نہیں۔ غالباً ۲۴ر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ (۱۲۶۳ھ)[2] کو شام کے وقت لکھیر شاہ نامی ایک شخص نے حضرت عم محترم کی حضور میں نواب قاسم علی خاں کو آکر خبر دی کہ میر انیس و میر مونس آگئے۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ مرزا دبیر بھی ساتھ ہی آئے ہیں۔ امام باندی بیگم کے مکان دولی گھاٹ میں فرود ہوئے ہیں۔ صبح کو گاڑی میں سوار ہوکر عم محترم تشریف لے جانے لگے اور مجھ کو حکم ہوا کہ جو مرثیہ تو (شاد) نے کہا

---

۱ . شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔ خودنوشت سوانح حیات شاد عظیم آبادی، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ص ۴۵

۲ مرزا دبیر کے عظیم آباد تشریف لے جانے کے بارے میں آئندہ صفحات پر مفصل ذکر ہوگا۔

ہے اس کو بھی ساتھ لے چل۔ یہ ہزار خوشی مرثیہ لے کر میں (شاد) بھی ہمرکاب ہوا۔ مرزا صاحب دالان میں چوکی پر بیٹھے اصلاح بنوا رہے تھے فوراً باشتیاق تمام سیڑھیوں تک آکر بغل گیر ہوئے اور بڑے اخلاق سے بٹھایا۔''[1]

آگے چل کر شاد میر انیس کے باب میں مرزا دبیر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''پہلی ہی تاریخ سے مرزا صاحب کے مجالس میں جانے لگا...... مرزا صاحب کی فرودگاہ پر پہنچ کر مرزا صاحب کی ملاقات میں دو گھنٹے گزرتے تھے۔ اس صحبت کے بعد مجلس شروع ہوتی تھی۔''[2]

بقول شاد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ۱۸۶۳ء میں شروع ہوتا ہے جب شاد کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اس کے بعد مرزا دبیر متواتر عظیم آباد جاتے رہے اور شاد کو مرزا دبیر سے ملنے کا زیادہ وقت ملا اور دوسرے یہ کہ خود شاد سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ اس لیے اغلب ہے کہ ثابت لکھنوی کا بیان مرزا دبیر کے آخر عمر سے متعلق ہوگا۔ مدنظر رہے کہ شاد عظیم آبادی اپنی تحریروں میں خودستائی و خودنمائی کے ذوق و شوق میں اسناد اعتبار سے بے نیاز ہوجاتے ہیں مگر یہ واقعہ اتنا اہم نہیں ہے کہ شاد کو غلط بیانی سے کوئی فائدہ ملتا۔ اختلاف بیان کے بارے میں اتنا مزید کہا جاسکتا ہے کہ مقام صحت، سن، آب و ہوا اور موسم کے لحاظ سے انسان کی غذا کے اوقات بدلتے رہتے ہیں اس لیے ثابت اور شاد کے بیانات پر شک کرنا مناسب نہیں۔

علمی استعداد اور سلسلۂ تلمذ

مرزا دبیر نے تمام کتب درسیہ عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھی۔ علوم معقول و معقول میں تبحر حاصل تھا۔ ابتدائے شباب میں کتب درسیہ صرف ونحو ومنطق و ادب وحکمت وغیرہ

---

۱ پیمبران سخن، ص ۱۲۹

۲ ایضاً ص ۲۰۸

مولوی غلام ضامن[1] سے اور کتب دینیہ حدیث و تفسیر و اصول حدیث و فقہ وغیرہ مولوی مرزا کاظم علی[2] لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ علاوہ ان کے ملا مہدی مجتہد مازندرانی[3] اور مولوی فدا علی اخباری سے بھی مرزا صاحب نے پڑھا۔ مولوی فدا علی اخباری کے ایک شاگرد مولوی گلشن علی[4] اخباری جونپوری نے ایک مجلس میں مرزا صاحب سے فخریہ کہا تھا کہ بھائی صاحب ہم آپ ایک استاد کے شاگرد ہیں اس لیے بھائی بھائی ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ بے شک آپ کا اور میرا فخر ہے کہ آپ نے اور میں نے ایسے محدث کامل (مولوی فدا علی

---

۱ مولوی غلام ضامن رتبے کے فاضل تھے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ایک دن غزل لے کر مرزا فاخر مکین کشمیری (متوفی ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء) کے پاس گئے کہ مجھے شاگرد کیجیے اور اس کی اصلاح فرمائیے۔ مرزا فاخر نے ٹال دیا۔ مولوی صاحب نے کہا ؎

مرزا مکین ما نہ شود چوں مکین! کین است جزو اعظم مرزا مکین!

(آب حیات ص ۱۶۹)

۲ مرزا کاظم علی اردو کے مشہور شاعر مرزا محمد رضا برق لکھنوی کے والد بزرگوار تھے۔ ان کے علم و فضل کی تمام لکھنؤ میں دھاک تھی اور زہد و ورع کا شہرہ تھا۔ جناب غفران مآب سید دلدار علی کے شاگرد رشید تھے۔ شیخ ناسخ اور مرزا جعفر علی فصیح انھیں بہت مانتے تھے۔ فصیح مثنوی نان و نمک میں کہتے ہیں: مالک اقلیم، زہد و اتقا، حکمران کشور علم و حیا، حامی دیں ماحی کفر و ضلال، سرگروہ عالمان باکمال، گلبن شاداب گلزار علی، طالب حق میرزا کاظم علی، ناسخ نے مثنوی ''سراج نظم'' انھیں کے ارشاد پر لکھی ہے۔ ناسخ کے ان سے گہرے مراسم تھے چنانچہ ان کی وفات پر ناسخ نے کئی قطعات نظم کیے ہیں جن میں ایک یہ ہے: جناب میرزا کاظم علی خان، ز دنیا شد سوئے فردوس عازم۔ ہمیشہ بود آں عالی مناقب۔ بہر شب قائم و ہر روز صائم، براہ حیدر کراری رفت۔ ضعیفاں را ہمیشہ بود خادم، نوشتم سال تاریخ وفاتش، باقلیم شریعت بودہ حاکم۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء (ناسخ - شبیہ الحسن) ص ۱۴۸-۱۴۶

۳ ملا مہدی مازندرانی (متوفی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) کثیر التصانیف اور بڑے پایہ کے مجتہد تھے۔ غفران مآب کے امام باڑے میں دفن ہیں۔ تاریخ وفات یہ ہے: استر آباد بود اور اموطن اے وائے بذیقعدہ برفت از عالم۔ شد دفن قریب قبر دلدار۔ ملا مہدی بیافتہ قصر ارم۔ (تذکرۂ بے بہا صفحہ ۳۲۸)

۴ سید گلشن علی جونپوری ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ مادّہ تاریخ ''نوبادہ زباغ اقبال'' ہے۔ مولوی ولی اللہ فرنگی محلی اور مولوی مرزا کاظم علی سے علوم عقلیہ دینیہ فقہ اور اصول کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں بنارس میں انتقال کیا۔ ''پنہاں شدہ بزیر زمیں آسماں دیں'' تاریخ ہے۔ (تذکرۂ بے بہا ص ۳۰۵)

صاحب اخباری) سے پڑھا ہے اور آپ میرے استاد بھائی ہیں [1]

مرزا دبیر صاحب عربی اور فارسی زبان و ادب پر قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ گفتگو میں اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص مختلف زبانوں اور مختلف علوم سے واقف ہو تو وہ غیر شعوری طور پر بھی بات چیت میں ان کے حوالے دیتا ہے یا ان کے الفاظ استعمال کرتا ہے یا ان علوم کی اصطلاحوں کو برتتا ہے۔ البتہ شعوری طور پر اور نامناسب مواقع پر ایسی حرکت وہ لوگ کرتے ہیں جن کو اپنے علم کی نمائش مقصود ہو چنانچہ شاد لکھتے ہیں:

''باتوں میں لغات عربی ضرور استعمال کرتے تھے مگر نہ اتنے جیسے کہ اس زمانے میں رواج شروع ہوا تھا کہ معمولی لفظ ''تکلیف'' کی جگہ تألم و تصدیع بولتے تھے۔ لہجے میں عین اور حائے حطی وغیرہ کا صاف امتیاز رکھتے تھے۔'' [2]

فارسی دانی کا ثبوت تو ملا کاشی [3] کے ہفت بند کی اس تضمین سے ملتا ہے جس کی تعریف میں اس زمانے کے شعراء و علماء و فصحاء رطب اللسان ہیں۔

صاحب گلشن سید علی حسن خان مرزا دبیر کو جانتے ہی نہ تھے اسی وجہ سے انھوں نے مرزا دبیر کو ہندو نژاد لکھا تھا مگر اس مخمس کی شہرت اتنی ہوگئی تھی کہ وہ لکھتے ہیں:

---

۱ حیات دبیر، صفحہ ۲۶-۲۵، اردو مرثیے کا ارتقاء۔ مسیح الزماں ص ۳۷۷

۲ پیمبران سخن، ص ۱۳۲

۳ ملا حسن کاشی مازندران کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ امیروں اور بادشاہوں کی مدح نہیں کرتے تھے۔ حج و زیارت کر چکے تھے۔ تاتاری بادشاہ محمد خدابندہ کے عہد سلطنت (۷۰۵-۱۶/۷۱۶ھ/۱۳۰۵ء-۱۳۱۶ء) میں تھے۔ ان کا ہفت بند در منقبت حضرت علی نہایت مقبول اور مشہور ہوا اور کئی سو برسوں تک اس کے جواب اور پیروی میں فارسی اور اردو شاعر ہفت بند لکھتے رہے، لیکن ملا کاشی کی سی مقبولیت کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ ملا حسن کاشی کے ہفت بند کے جواب میں ملا محتشم کاشی نے بھی ہفت بند کہا جو مشہور مرثیہ محتشم (دوازدہ بند) سے مختلف ہے۔ غالباً اسی وجہ سے مختلف غلط فہمیاں پھیل گئیں مثلاً یہ کہ محتشم کا مرثیہ ہی ہفت بند ہے یا محتشم اور حسن کاشی ایک تھے۔ (حالانکہ حسن کا زمانہ محتشم سے کوئی ڈھائی سو سال قبل کا ہے) مخطوط- ایران میں مرثیہ نگاری، سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۵۷ بعد۔

''......دربار زبان فارسی بمدحت ائمہ آہنگ برمیداشت ہفت بند ملا کاشی را در سلک تضمین کشیدہ......''

(آگے چل کر اس مخمس کے کئی بند درج کیے ہیں۔ راقم مقطع درج کرتا ہے)

چوں دبیر مدح خوانت ای امام دیں پناہ — بندۂ خاص خدا و سایۂ لطف الٰہ

باکمال عجز از تقصیر خدمت عذر خواہ — بندۂ بے چارہ کاشی از دل و جاں سال و ماہ

روز و شب در خطۂ آمل ثناخواں شماست''[1]

مرزا دبیر نے جب یہ مخمس نظم کر کے مفتی محمد عباس صاحب[2] کو دکھایا تو انھوں نے اس کی مدح میں یہ رباعی نظم کی:

از خمسۂ تو کہ طبع شد طوبےٰ لک — شد رونق ہفت بند کاشی بے شک

دارم سر اینکہ سال طبعش گویم — بکشاد ازیں پنجۂ درہفت فلک (۱۲۸۰ھ)

دو اور قطعات تاریخ جو انھوں نے نظم فرمائے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) براں ہفت بندے کہ از کاشی است — کہ در ہفت اقلیم گشتہ شہیر

مخمس ز مرزا سلامت علی — شد از قالب طبع صورت پذیر

عجب ہفت کردہ براں ہفت بند — کہ اے کاش می کشت کاشی خبیر

ثنا خوان ایں خمسہ از چار سو — کلیم و سلیم و منیر و امیر

---

۱ صبح گلشن۔ سید علی حسن خان، ص ۱۶۳ مطبع فیض شاہجہانی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء

۲ مفتی علام مولانا السید محمد عباس الموسوی الشوستری۔ یہ وہی مفتی علام عباس ہیں جن کے نام غالب نے بیشتر خطوط لکھے ہیں۔ غالب انھیں عالم متبحر سمجھتے تھے۔ شنبہ آخر ربیع الاول ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ''خورشید کمال و ادب'' تاریخ ولادت ہے۔ بچپن سے سریع الفہم اور انتہا کے ذکی الطبع تھے۔ لہو ولعب اور کھیل کود سے ہمیشہ نفرت رہی۔ عبادت کا ذوق فطری تھا۔ ان کے اشغال بچپنے میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ یہ تھے کہ سجدہ کیا کرتے تھے اور اس پر اصرار تھا کہ دیکھیں زیادہ سجدے کون کرتا ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ جناب مولوی علی میاں کامل جو آپ کے شاگرد تھے، نے ۲۲ شعر کا قطعۂ تاریخ کہا۔ مادّہ تاریخ یہ ہے:
''برزمیں افتاد رکن اقدس دین آہ آہ'' (تجلیات۔ اسم تاریخی۔ تاریخ عباس مطبوعہ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء ص ۳۲۴-۳۲۳-۳۱۵-۸-۷)

رقم کردہ عید بتاریخ آں   زہے خمسہ از طبع مرزا دبیر
(۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)

(۲) ایں خمسہ کہ در قالب طبع آمدہ امسال   امید چنانست کہ جاوید بماند
عباس بتاریخ و بتشبیہ و دعائش   بنوشت کہ با پنجۂ خورشید بماند[1]

صاحب شمس الضحیٰ لکھتے ہیں:

"ملا حسن کاشی قدس اللہ سرہ در مناقب جناب ولایت مآب امیر المومنین علیہ السلام نظم نمودہ و مشتمل برہفت بند و مشہور بایں اسم است و در شہرت ضرب المثل عالم و مقبول طباع کافۂ امم و اکثر خواص را در مقبولیت آں حرفے نیست و بعض اہل فضل و کمال شروح مبسوط مطولہ برآں نوشتہ اند و مضامین بلاغت آگیں آں اشعار آبدار از کتب تفاسیر و احادیث باثبات رسانیدہ آنجناب (مرزا دبیر) ہر بیتش را مخمس نمودہ و بر ہر دو مصرعہ سر مصرع افزودہ لاریب کہ آں جناب (مرزا دبیر) در فارسی و اردو عربی در ہمہ زبان نظم می فرماید و بہمہ صنائع ید طولیٰ میدارد۔"[2]

صاحب حیات دبیر تحریر کرتے ہیں:

"مرزا صاحب کی فارسی کی نظم بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ خصوصاً ہفت بند ملا کاشی کا مخمس قابل دید ہے کہ ہر بند کے پانچوں مصرع ایک ہی شخص کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک زبان دان کے لیے کمال کی بات یہ ہے کہ وہ اپنا کلام اہل زبان کے کلام سے ملا دے۔"[3]

اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے کہ علم عروض پر پوری دستگاہ رکھتے تھے اور اساتذہ کا کلام ہر وقت سامنے رہتا تھا۔ شاد لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ میر بادشاہ علی[4] صاحب منشی امیر مرحوم کے "معیار" کا ترجمہ

---

۱ تجلیات (تاریخ عباس) صفحہ ۹۳-۱۹۲ مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۴ھ
۲ شمس الضحیٰ ص ۹۹
۳ حیات دبیر ص ۲۷
۴ میر بادشاہ علی صاحب متخلص بہ بقا، میر وزیر علی صبا کے فرزند اور مرزا دبیر کے داماد تھے۔

جو تازہ چھپا تھا پڑھ رہے تھے۔ بحرکامل کا بیان تھا۔ میں نے اتفاقیہ کہا کہ بحر کامل میں بحر رجز کا رکن منقول ہوکر بھی آتا ہے۔ انھوں نے اپنی طبع پر بھروسہ کرکے کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ کہاں متفاعلن اور کہاں مستفعلن۔ مرزا صاحب (مرزا دبیر) نے کہا کہ کیوں انکا کرتے ہو۔ سعدی کا قطعہ دیکھو بلغ العلی بکمالہ کے سب ارکان متفاعلن بحرکامل سالم ہیں۔ چوتھے مصرع صلوا علی میں مستفعلن ہے۔"[1]

اس سے قبل شاد اپنی اسی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ:

"مرزا دبیر نے عربی کی صرف ونحو اور منطق کے چند رسائل طالب العلمانہ پڑھے تھے۔ فارسی میں فرماتے تھے کہ میں جن سے پڑھتا تھا وہ عدیم الفرصت تھے۔ طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ اخباری مسلک تھے۔ اکثر مجتہدین کو سخت سست کہہ دیا کرتے تھے۔ فارسی میں اچھی دستگاہ تھی۔ ایک مولوی صاحب انھیں کے قریب رہتے تھے۔ ان کی نشست گاہ سرراہ تھی۔ وہ مجھ کو آتے جاتے برابر دیکھا کرتے تھے۔ جب میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تو وہ ایک دن پوچھنے لگے کہ تم ادھر کیوں نہیں آتے؟ میں نے ٹال دیا۔ بے حد اصرار کرنے لگے۔ مختصر سا واقعہ کہا۔ انھوں نے کہا تم مجھ سے پڑھا کرو۔ میں فارسی بھی پڑھاؤں گا اور عربی بھی۔ ان سے طاہر وحید اور مذہبی کتاب "زبدۃ الاصول" شروع کی۔ یہ حضرت بڑے سخت اصولی مذہب والے نکلے۔ اخباریوں کو بغیر لعن طعن کے یاد نہ کرتے تھے۔ یہاں سے بھی برداشتہ خاطر ہوگیا۔ فرماتے تھے کہ قصد یہی تھا کہ سلسلۂ درس نظامیہ کو سلسلہ وار ختم کروں...... میں (شاد) جہاں تک واقف ہوسکا ہوں۔ مرزا صاحب عربی کی کیسی ہی کتابی عبارت ہو پڑھ لیتے تھے اور معنی سمجھ لیتے تھے۔ نحویت اور صرفیت ان کے اس سے تمام تر کھلتی تھی کہ اس فن کے مصطلحات کے ادا کرنے کا اکثر موقع آجاتا تھا مثلاً کسی شعر پر کوئی اعتراض ہے یا کسی اعتراض کا جواب دے رہے ہیں تو فاعل، مفعول، مبتدا وخبر اضافت

---

1. پیمبران سخن، ص ۱۳۲

کے اقسام ضمن تقریر میں یوں کہتے تھے کہ بغیر مشاق کے دوسرا نہیں ادا کرسکتا۔
عروض وقوانی کے باریک مسائل زحافات کے ساتھ یاد تھے۔"[1]

میر ضمیر، استادِ دبیر

شاعری میں میر مظفر حسین ضمیر[2] کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کا طوطی بول رہا تھا۔ دور دور تک شہرت تھی۔ اکثر محققین نے صنف مرثیہ کی بعض اہم خصوصیات کی اولیت کا سہرا ان کے سر باندھا ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"(مرزا دبیر) خاندانی شاعر نہ تھے۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا۔"[3]

بقول مولوی صفدر حسین، مرزا دبیر بارہ سال کی عمر میں میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"از سن یازدہ سالگی سالک مسالک رضای ایزای و انشاء اشعار در

---

۱ پیمبران سخن ص ۱۳۲-۱۳۱

۲ میر مظفر حسین نام، ضمیر تخلص، میر ضمیر کے نام سے مشہور ہیں۔ ناصر نے تذکرہ 'خوش معرکہ زیبا' میں ان کے والد کا نام میر قادر حسین لکھا ہے۔ سب سے قدیم تذکرہ جس میں میر ضمیر کا ذکر ہے مصحفی کا مرتب کیا ہوا ہے اس میں والد کا نام قادر حسین خان لکھا ہے۔ محسن اور ناسخ کا کہنا ہے کہ وطن لکھنؤ تھا۔ ثابت لکھنوی کہتے ہیں کہ میر ضمیر پنگھوڑہ کے قریب سلطان پور ضلع گوڑگاؤں کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت معلوم نہیں البتہ فیض آباد سے لکھنؤ دارالخلافہ اودھ کی منتقلی یعنی ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) میں ولادت ہوچکی تھی۔ انتقال لکھنؤ میں ۲۳ رمحرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ راکتوبر ۱۸۵۵ء کو ہوا۔ مرزا دبیر نے ان کی وفات پر یہ رباعی کہی۔

آفاق سے استاد یگانہ اٹھا ۔۔۔ مضموں کے جواہر کا خزانہ اٹھا
انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں ۔۔۔ سرتاج فصیحان زمانہ اٹھا

غزل گو بھی تھے مگر مرثیہ اور مثنوی کے ساتھ زیادہ دلچسپی تھی (میر ضمیر: اکبر حیدری ص ۷۰۵)

۳ آب حیات آزاد صفحہ ۳۶-۳۷۵

مناقب و مصائب مقبولان بارگاہ سرمدی گردید و در مبداء حال و آغاز ایں اشتغال منظومات خود را بزیور اصلاح جناب تقدس مآب تورع انتساب زاہد عدیم النظیر جناب میر مظفر حسین متخلص بضمیر کہ دراں آداں از زمرۂ شعراء اہل ایمان بوفور فضل کمال عرفان ممتاز و درمیان ایں فرقہ علیہ سراپا امتیاز بود رسانید و درسن یازدہ و دوازدہ سالگی آنچناں درنظم ونسق سخن و بندش مضامین نو و کہن یدطولی و دستگاہ تام داشت کہ شاعران بانام ونشان را درسن چاردہ☆ سالگی میسر نہ گشتہ بود...... دراندک مدت وذبان یسیر بسبب جودت طبع وحدت ذہن دراک و صفاء قریحہ وصحت ادراک سرآمد شعراء عالیشان و پیشرو سالکان طریق عرفان شد۔[1]

صاحب حیات دبیر مرزا دبیر کے میر ضمیر شاگرد ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”گیارہ بارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فرما چکے تھے کہ رجحان طبعی دیکھ کر ان کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے۔ یہ ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ کا ذکر ہے اور میر ضمیر کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ بندہ زادہ ہے اس کو مداحی اہل بیتؑ کا شوق ہے۔ میر ضمیر صاحب نے صاحب زادے سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ صاحب زادے، نام آپ کا، عرض کی، سلامت علی کہتے ہیں۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو، جو کچھ پڑھتے تھے، بتلایا۔ جب میر ضمیر صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہوگیا کہ ذی استعداد و ذہین لڑکا ہے۔ دل میں بہت خوش ہوئے۔ فرمایا جو کچھ کہا ہو مجھے سناؤ، مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے   کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ اس میں شام وسحر   کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

---

۱ شمس الضحیٰ ۹۸-۹۷

☆ اس سے مراد چہل سالگی ہے۔

یہ سن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین پھڑک گئے۔ کوئی صاحب بول اٹھے۔ صاحب زادے چشم بددور بلا کی طبیعت پائی ہے...... میر ضمیر صاحب نے پھر پوچھا۔ تخلص کیا کرتے ہو۔ عرض کیا۔ تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرمادیں۔ فرمایا 'دبیر' اور پھر کہا ''بر دبیران روشن ضمیر مخفی و محجب نماند'' اور مسکرا کر بولے۔ ''صاحبزادے، میں نے اپنے نفس و نام پر تم کو مقدم کردیا کہ اس مشہور جملہ میں دبیر اول، ضمیر بعد کو ہے۔ میں تم کو بتاؤں گا، ضرور کہا کرو۔''[1]

لالہ سری رام نے بھی اپنے تذکرہ، تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ خم خانہ جاوید[2] میں یہی حکایت نقل کی ہے مگر شاد لکھتے ہیں:

> ''یاد آتا ہے کہ خود فرماتے تھے کہ کوئی سوزخوان ہم محلہ تھے۔ میر ضمیر کے ایک مرثیہ کا ورق جاتا رہا تھا۔ مرزا صاحب کی عمر بیس اکیس برس کی ہوگی۔ غزلیں، سلام اور مرثیہ بھی کہنے لگے تھے۔ میر لکھو نامی ایک شخص صاحب سخن تھے، انھیں کو دکھایا کرتے تھے۔ ان سوزخوان نے پوچھا کہ فلاں مرثیہ میر ضمیر کا آپ (کے) پاس ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کیوں۔ سوزخوان نے کہا کہ ایک ورق جاتا رہا ہے نقل چاہتا ہوں۔ مرزا صاحب نے مرثیہ مانگ لیا کہ میں پورا کردوں گا چنانچہ خود دس بارہ بند کہہ کر جوڑ ملا دیا جس مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا میر ضمیر بھی تھے۔ ان بندوں کو سن کر بھیانک ہوئے۔ سوزخوان سے پوچھا تو حقیقت سے آگاہ ہوئے اور سوزخوان سے کہا کہ ڈرو نہیں ان صاحبزادے کو میرے پاس ضرور لے آنا۔ یہ دوڑے ہوئے مرزا صاحب کے پاس آئے اور ان کو بلا لے گئے۔ میر ضمیر نے پوچھا صاحبزادے! یہ بند تم نے لگائے ہیں۔ ہاتھ باندھ کے عرض کی کہ قصور تو ہوا۔ پوچھا کس سے اصلاح لیتے ہو۔ ان کے منھ سے نکل گیا کہ اب تو حضور ہی کی کفش برداری چاہتا ہوں۔ یہ تقریب شاگردی کی ہوئی۔''[3]

---

۱ حیات دبیر صفحہ ۲۳-۲۴
۲ خم خانہ جاوید جلد سوم صفحہ ۱۵۲
۳ پیمبران سخن ص ۱۳۱-۱۳۰

شاگرد ہونے کی اس تقریب کے سلسلے میں شاد کے بیان کو اہمیت دی جاسکتی تھی، کیونکہ بقول ان کے یہ مرزا دبیر کا اپنا بیان ہے مگر شاد کے انداز بیان نے اسے مشکوک بنا دیا ہے۔ شاد کے اس جملے "یاد آتا ہے کہ خود فرماتے تھے۔" نے اس روایت کو غیر معتبر بنا دیا ہے مگر اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ مرزا دبیر میر ضمیر کے شاگرد ہوئے اور اس بات پر تو صاحب آب حیات، صاحب شمس الضحیٰ، صاحب تنقید آب حیات، صاحب حیات دبیر، صاحب خم خانۂ جاوید، صاحب پیمبران سخن وغیرہ سب ہی متفق ہیں کہ شاعری میں مرزا دبیر نے استاد یگانہ روزگار میر مظفر حسین ضمیر سے تلمذ کیا اور ایک طرف تو ان کے نقوش قدم مستحکم کیے اور دوسری طرف صنف مرثیہ کے لیے نئے راستے کھول دیے۔

قوت حافظہ

مرزا دبیر کا حافظہ اچھا تھا۔ صاحب حیات دبیر نے حافظے کے متعلق ان کی کئی حکایتیں حیات دبیر میں درج کی ہیں ان میں ایک جس کے راوی ان کے نانا میر رضا ظہیر صاحب ہیں یہ ہے کہ ایک دن مولوی کمال الدین[1] صاحب مرزا اوج کو پڑھا رہے تھے۔ شاید حکمت کا کوئی دقیق مسئلہ تھا۔ مرزا دبیر نے کہا کہ ان کے استاد نے انھیں اس طرح سمجھایا تھا۔ بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی اور اس دوران مرزا اوج کو ایک کتاب لانے کے لیے بھیج دیا تب وہ کتاب لے آئے۔ اس وقت تک مولوی کمال الدین صاحب قائل ہو چکے تھے، جب انھوں نے کتاب کھولی، مرزا دبیر نے حوالہ پیش کیا، دیکھا کہ حاشیہ پر وہی مضامین درج ہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا آپ نے اس کا مطالعہ زمانہ قریب ہی میں کیا ہے، مرزا دبیر نے کہا نہیں جب پڑھا تھا، جبھی کا یاد تھا۔ حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا، چالیس برس گزر چکے تھے۔[2]

ایک اور حکایت ثابت لکھنوی نے بیان کی ہے جس کے راوی مرزا احمد صاحب ظہور[3]

---

۱ مولوی کمال الدین مرحوم مفتی میر عباس کے ہم سبق تھے، لکھنؤ کے چوٹی کے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے اکثر علماء اور مجتہدین ان کے پڑھائے ہوئے ہیں۔ (حیات دبیر ص ۶۱)

۲ حیات دبیر صفحہ ۶۱

۳ مرزا احمد صاحب ظہور مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور حیات دبیر کی تصنیف سے تین سال قبل (یعنی ۱۹۱۰ء) ان کا انتقال ہوا ہے۔ (حیات دبیر ص ۶۳)

ہیں کہ:

ایک دن میر صفدر علی ان کی (ظہور کی) موجودگی میں مرزا دبیر کو ایک مرثیہ سناتے جاتے تھے اور مرزا دبیر تصحیح کرتے جاتے تھے کہ انھوں نے ایک مقام پر تلوار کی تعریف میں یہ ٹیپ پڑھی:

سدِ سکندری کو تپ لرزہ آتی تھی ‏ ‏ ‏ دیوارِ قہقہہ بھی کھڑی تھرتھراتی تھی

مرزا دبیر نے تصحیح کر کے اسے یوں بدلنے کے لیے کہہ دیا:

سدِ سکندری پہ جو بھڑکی گھلا دیا ‏ ‏ ‏ دیوارِ قہقہہ پہ جو کڑکی رلا دیا

ظہور کو یہ دونوں مصرعے یاد ہو گئے اور گھر آ کر لکھ دیے۔ بیس پچیس برس کے بعد انھوں نے صفدر کی کہی ہوئی بیت اپنے ایک مرثیے میں جوڑ دی اور مرزا دبیر کو مرثیہ سنا دیا۔ یہ بیت سن کر مرزا دبیر سوچنے لگے اور کہا کہ یہ بیت انھوں (مرزا دبیر) نے کہیں سنی ہے اور اس کو کٹوا دیا تھا۔[1]

مرزا دبیر کی یادداشت کا اعتراف اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ میر علی (سوز خوان) نے منشی دلگیر کا مرثیہ پڑھا۔ ایک صاحب نے مرزا دبیر سے کہا، دلگیر کا مرثیہ بہت اچھا تھا مگر مل نہیں سکتا! مدنظر رہے کہ دلگیر اپنا کوئی مرثیہ کسی دوسرے کو پڑھنے کے لیے نہیں دیتے تھے جب تک کہ میر علی رضامند نہ ہوں۔ مرزا دبیر نے کہا کہ پندرہ سولہ ہی تو بند ہیں اگر کوئی دو یا تین دفعہ غور سے سنے گا تو خودبخود یاد ہو جائے گا۔ ان کے جواب پر وہ شخص مطمئن نہ ہوا تو مرزا دبیر نے پورا مرثیہ زبانی لکھوا دیا۔[2]

اخلاق

مرزا دبیر بلند اخلاق کے مالک تھے۔ ہر وقت تذکرہ اہل بیت کرتے رہنے سے وہ ان کی تعلیمات کو گویا جذب کر چکے تھے اور اس سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال کر دوسرے لوگوں کے لیے اخلاق حسنہ کی ایک مثال بن چکے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''ان کی سلامت روی، پرہیزگاری، مسافرنوازی اور سخاوت نے صفتِ

---

۱ ‏ حیات دبیر ص ۶۳ ‏ ‏ ‏ ۲ ‏ ایضاً ص ۶۲

کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔[1]

صاحب شمس الضحیٰ تحریر کرتے ہیں:

''مرزا سلامت علی متخلص بہ دبیر را باخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ و خصائل برگزیدہ و فضائل مستحسنہ موفورہ و عادات رضیہ مشکورہ آراستہ و ذات ملکی ملکات آنجناب را باصناف کمالات نفسانی و اقسام تجیات فاضلہ انسانی پیراستہ۔''[2]

ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق و عادات کتاب احادیث و سیر میں دیکھتے دیکھتے اور ان کے مناقب و فضائل نظم کرتے کرتے اخلاق حسنہ نے مرزا صاحب کے دل پر پورا پورا اثر کیا تھا..... محمدؐ و آل محمدؐ کے اخلاق حسنہ نے ان کے دل میں..... اپنا گھر کرلیا تھا وہ آل محمدؐ کے ایسے غلام تھے کہ جس غلام میں آقا کی صحبت کی بدولت آقا کی عادتیں سرایت کر جاتی ہیں۔''[3]

شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب نہایت خوش اخلاق و خوش اعتقاد مذہبی شخص تھے..... مرزا صاحب انیس برس تک ایک ہی وضع ایک ہی ترکیب سے آیا کیے۔ نکتہ چین کو موقع نکتہ چینی کا نہ ملا۔ اپنے معرفوں کے ساتھ تو جس اخلاق سے ملتے تھے اس کا کیا کہنا۔ صاف صاف جو مخالف تھے ان کو بھی موقع شکایت کا نہ دیا۔''[4]

اخلاق حسنہ دراصل کچھ نیک صفتوں کا مجموعہ ہے جن کو نیک نیتی سے اپنایا جائے اور پھر صفتیں عادات بن کر انسان کی طبیعت ثانی کی صورت اختیار کرلیں۔ مثال کے طور پر مہمان نوازی، حاجت روائی، سخاوت، دل جوئی، ایفائے وعدہ، خودداری، غیرت کا خیال،

---

۱ آب حیات، محمد حسین آزاد، ص ۵۳۷

۲ شمس الضحیٰ ص ۱۲۹

۳ حیات دبیر، ص ۷۵

۴ پیمبران سخن ص ۱۴۷-۱۴۶

غیبت نہ کرنا یا سننا، عدالت وغیرہ۔

مہمان نوازی

مرزا دبیر حددرجہ کے مہمان نواز تھے۔غیروں سے بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ اپنوں کی تو بات ہی اور تھی۔ صاحبِ حیات دبیر تحریر کرتے ہیں:

''مہمان نوازی بھی مرزا صاحب کی تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اکثر باہر کے اہل کمال ان کے در دولت پر ٹھہرتے تھے اور مہینوں رہتے تھے۔ مرزا صاحب مہمانوں کے گویا مشتاق رہتے تھے اور آنکھیں بچھاتے تھے۔ جناب سید الطاف حسین عرف نواب منے صاحب[1] ہمشیرزادہ نواب دولہ مرحوم رئیس شمس آباد تحریر فرماتے ہیں کہ اس صفت میں وہ ایسے سرگرم تھے کہ میری دانست میں کوئی مہمانی حیثیت سے بے کھانا کھائے یا بے حصول نقد وجنس ان کے دولت خانہ سے خالی کبھی نہ آیا ہوگا بلکہ علاحدہ ٹھہرنے والوں کو بھی اکثر ان الفاظ سے مدعو کرکے کہ ''کل نان خشک آپ کی خدمت میں پہنچے گی۔'' عمدہ سے عمدہ کھانوں کے خوان بھیجتے تھے اور عموماً پردیسیوں کی وہ عزت و تعظیم فرماتے تھے۔ اگر مجلس میں کوئی صاحب باہر کے ہوتے تھے تو ان کو محبت سے بلاکر عزت سے قریب منبر بٹھاتے تھے جہاں بعض وقت بڑے بڑے لکھنؤ کے امیروں کو جگہ ملنا دشوار ہوتا تھا۔''[2]

شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''جب کوئی مہمان وارد ہوتا علی قدر مراتب کسی کا لب فرش تک استقبال

---

۱ والد منے نواب میر شرف الدین مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ بین بے مثل پڑھتے تھے۔ اب بھی لکھنؤ میں ان کے پڑھنے کی دھوم ہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو نواب منے صاحب ڈھائی برس کے تھے۔ مرزا دبیر نے ان کو شاہ اودھ کے دربار میں لے جاکر ان کے والد کی جگہ ان کا نام سواروں میں لکھوادیا اور ان کے والدہ کے ساتھ شمس آباد جانے کے بعد برسوں تنخواہ شاہی خزانے سے لے کر بھیجا کیے (ثابت، حیات دبیر، ص ۶۹ سبع ثانی دیباچہ ثابت ص ۲۸)

۲ حیات دبیر ص ۶۵

کرتے کسی کے لیے کھڑے ہوکر تعظیم کرتے۔ جھک کر سلام کرتے اور ہاتھ جوڑ کر مزاج پوچھتے، غربا اور اہل حاجت کو بھی بیٹھے بیٹھے سلام نہیں کرتے تھے بلکہ کچھ خمیدہ پشت ضرور ہو جاتے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے اندر دو تین دفعہ خاصدان میں گلوریوں کا دور ہو جاتا تھا۔ تین چار بند گڑگڑیوں کے حقے چاندی کے چمبر کے ساتھ صحبت میں موجود رہتے تھے۔ اکثر عطر دان، الائچیوں اور ڈلیوں کا بھی دور ہو جاتا تھا۔[1]

سخاوت

مرزا دبیر کی سخاوت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی آمدنی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مرزا دبیر کی آمدنی اتنی تھی کہ اگر اس کے ایک حصے کو بھی احتیاط سے بچا کے رکھا جاتا تو کئی نسلیں معاشی لحاظ سے آسودہ رہتیں اور کوئی پریشانی تو کیا اٹھانا پڑتی بلکہ دل کھول کر خرچ کر سکتے تھے۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

> ''ملکہ زمانی زوجہ نصیرالدین حیدر دوئم شاہ اودھ عشرہ محرم میں دس ہزار روپیہ مرزا صاحب (مرزا دبیر) کو نذرانہ پیش کش فرماتی تھیں۔ بادشاہ کے یہاں سے جو ملتا تھا وہ اس سے بدرجہا زیادہ تھا اور محلات اور امراء جو پیش کش کرتے تھے ان تمام نذرانوں پر خیال کیا جائے تو لاکھوں روپیہ سالانہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔''[2]

عظیم آباد سے مرزا صاحب کو کافی رقم مل جاتی تھی۔ راقم الحروف نے پٹنہ (عظیم آباد) میں نواب سید علی جعفری صاحب عرف نواب علن صاحب[3] سے دریافت کیا کہ مرزا

---

١ پیمبران سخن ص ١٢٠

٢ حیات دبیر ص ٦٦-٦٥

٣ نواب سید علی جعفری عرف علن صاحب کا خاندان ابتداء سے مرزا دبیر کا مداح رہا ہے۔ امام باندی بیگم صاحبہ نے مرزا دبیر کو وہاں بلایا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ بیگم صاحبہ کا انتقال تو ١٢٩٤ھ میں ہوا تھا لیکن اس کے بعد بھی مرزا دبیر کے خاندان کے شعراء ہی وہاں پڑھتے ہیں آج کل مرزا صادق صاحب جاتے ہیں۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی۔ (راقم الحروف)

دبیر کو یہاں سے کتنا نذرانہ ملتا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ دو ہزار روپے ایک شال پشمینہ کی اور زادراہ سالانہ ملتا تھا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر مرزا دبیر لکھنؤ پہنچتے پہنچتے یہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور گھر خالی ہاتھ لوٹتے تھے پھر امام باندی بیگم صاحبہ[1] ان کو صرف زاد راہ دیا کرتی تھیں اور نذرانہ لکھنؤ بھجواتی تھیں۔

اس کے علاوہ بھی مرزا دبیر کی ہزاروں کی آمدنی تھی۔ لوگ ان کے نام پر اوروں کو دیتے تھے۔ ان کے مراثی کی نقلیں خریدتے تھے۔ اس طرح مرزا دبیر کو بھی نذرانوں میں نقد و جنس بہت کچھ ملتا تھا۔ اس وقت کی ہزاروں کی آمدنی محض ہزاروں کی بات نہیں قیمتوں کا مقابلہ کیا جائے تو بھی صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ وہ وقت تھا جب دس پندرہ روپیہ مشاہرہ پانے والے اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے تھے۔

اب دیکھیے کہ مرزا دبیر کی سخاوت کا شہرہ کس قدر تھا اور لوگوں نے ان کے اخلاق حسنہ کی اس خصوصیت کے بارے میں کیا لکھا ہے۔

---

۱ نواب امام باندی بیگم صاحبہ مرحومہ بڑی صاحب خیر خاتون تھیں۔ مرحومہ کی کوئی اولاد نہ تھی اور انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی میر علی صاحب مرحوم کے صاحبزادوں سید حیدر اور سید عباس مرتضیٰ کو اولاد سمجھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی انتقال یا تو ان کی اولاد کی تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔ اب صرف یہ دو بھائی سید عباس صاحب اور سید محمد جواد صاحب باقی رہ گئے۔ بیگم صاحبہ مرحومہ نے اپنی کل جائداد وقف کر کے انھیں دو بھائیوں کو متولی قرار دیا۔ نواب سید محمد جواد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔ نواب سید عباس صفوی صاحب نے ۱۵ر نومبر ۱۹۲۱ء کو رحلت فرمائی۔ نواب سید محمد صاحب مرحوم نے جولائی ۱۹۳۲ء میں سفرِ جنت اختیار کیا۔ یہ سب حضرات تاحیات متولی رہے۔ اب خدا کے فضل سے خان بہادر نواب سید علی سجاد صاحب قبلہ متولی وقف گلزار باغ پٹنہ ہیں اور بڑی محنت سے فرائض وقف انجام دے رہے ہیں۔ مرزا دبیر مرحوم کے بعد مرزا اوج مغفور پھر مرزا رفیع مرحوم برابر اس امام باڑے میں عشرہ محرم کی مجالس پڑھنے کے لیے بلوائے گئے۔ مرزا محمد طاہر رفیع کے بعد مرزا محمد صادق صاحب مرثیہ پڑھنے کے لیے بلوائے جاتے ہیں۔ خان بہادر نواب سید علی سجاد صاحب بھی وضع نباہ رہے ہیں اور خاندان دبیر کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں۔ ہر طرح (مثل واقفہ مرحومہ) حامی و معین ہیں۔ حضرت دبیر کی جائداد پر کسٹوڈین کا بہت مطالبہ تھا، نواب صاحب نے صادق صاحب کو روپیہ دیا اور جائداد کسٹوڈین سے نکل آئی۔ رزم نامہ دبیر (خیبر) ص ۱۹-۱۸

صاحب شمس الضحیٰ لکھتے ہیں:

''جناب مرزا سلامت علی المتخلص بہ دبیر سلمہم الحکیم والخبیر منبع جود و سخاو مخزن فیض و عطا است۔ از ظہور کرمش اگر از جہاں صحیفہ ذکر حاتم طی گردد بجااست و از کثرت عطایش اگر رواں جعفر برمکی در غرقاب خجالت غرق شودرواست۔ امیریست سخاکیش و رئیسے ست کرم اندیش بحر عمان جودو احسان است و فرمانروائے کشور فیض و اقتان در بخشش بے دریغ آنچناں مجبول طبیعت بودہ کہ ذات بابرکاتش در عرصہ ہمت گوئی سبقت از کریمان ماضی و حال ربودہ۔''[1]

صاحب حیات دبیر، مرزا دبیر کی سخاوت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب کی سخاوت سے لکھنؤ کا ہرخاندان واقف ہے اور ہندوستان کے ہر حصہ میں آج تک دھوم ہے۔ ان کو جس قدر مال دنیا حاصل ہوا، شاید (ہی) کسی شاعر یا مداح کو آج تک ملا ہو۔ سالانہ لاکھوں روپیہ ملتا تھا۔ سب اہل حاجت کو دے دیتے تھے۔ اپنے واسطے صرف خرچ ضروری رکھ لیتے تھے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء جب پٹنہ (عظیم آباد) جانا ہوا۔ ان کے اکثر ملنے والے نہایت عسرت میں بسر کرتے تھے...... مرزا صاحب بنارس کے پارچہ ریشمی وزریں اکثر لاتے تھے اور ایسے دوستوں کو بطور تحفہ دے دیتے تھے اگر کوئی صاحب دختر ہوتے تو ان سے کہہ دیتے تھے کہ یہ میری بھتیجی کے جہیز کے اسباب میں شامل فرما دیجیے گا۔''[2]

شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''خفیہ سلوک کرنے میں یدطولیٰ تھا۔ نادار اور اہل حاجت گھیرے رہتے تھے۔ بعض سچے لوگوں سے سنا ہے کہ لکھنؤ میں اکثر سونی راتوں کو تنہا گھر سے نکل گئے اور کسی شریف نادار غیرت دار کے گھر پہنچ کر چپکے سے دے آئے۔ کئی اپاہج، نادار بیواؤں کو مشاہرے دیا کرتے تھے...... خاندان والوں کے مشاہرے

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۲۶-۱۲۵ ۲ حیات دبیر ص ۶۶

مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ بھی نقد دیا کرتے تھے۔"[1]

ثابت اور شاد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے خاندان کو پالتے تھے۔ کپڑا خریدتے تو تھانوں کے حساب سے، اس طرح اور اشیاء کا حال بھی تھا۔[2]

ثابت لکھنوی نے اس سلسلہ میں جو کچھ حکایتیں بیان کی ہیں جن سے مرزا دبیر کی سخاوت کا عملی ثبوت ملتا ہے۔ ایک حکایت جس کے راوی ان کے نانا (مصنف تنقیدِ آبِ حیات) ہیں یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے نانا کے ایک ملاقاتی میر محمد جعفر نے ان سے ایک روز کہا کہ ایک جن ان کے والد ماجد کے پاس چاندرات کو آکر پانچ روپے دے جاتا تھا، کل ان کا انتقال ہوگیا اور اب وہ آمدنی گئی۔ انھوں نے (ثابت کے نانا نے) کہہ دیا کہ ممکن ہے وہ جن ان کے انتقال سے بے خبر ہو۔ آج چاند رات ہے جاگتے رہنا، میر محمد جعفر نے انھیں بھی وہیں روک لیا اور شب کو زنجیر ہلانے کے بعد جب ایک ہاتھ اندر کی طرف بڑھا تو ثابت کے نانا نے ہاتھ پکڑ لیا اور وہ شخص گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ مرزا دبیر ہیں۔ مرزا دبیر نے کہا "ہائیں میر محمد رضا (ثابت کے نانا مرزا دبیر کے شاگرد) یہ کیا حرکت تھی۔ انھوں نے سید صاحب (میر جعفر کے والد) کے انتقال کی خبر دی۔ اس کے بعد مرزا دبیر نے دونوں کو قسم دی کہ ان کی زندگی میں اس واقعہ کو کسی سے نقل نہ کیا جائے اور بعد میں میر محمد رضا (ثابت لکھنوی کے نانا) سے کہا کہ میر صاحب (میر جعفر کے والد) بڑے غیور و فاقہ کش تھے اگر ان کی بظاہر مدد کی جاتی تو لینے سے انکار کرتے۔[3]

یہ عادت تو ان کی طبیعت ثانی ہوچکی تھی اور وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان سے سوال کرے جب کسی کو دیکھ کر محسوس کرتے کہ وہ ضرورت مند ہے تو فوراً خود ہی اس کی ضرورت پوری کرتے۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ حکایت مرزا دبیر کے قیام عظیم آباد سے وابستہ ہے۔ ایک دفعہ مولوی امداد امام اثر (مصنف کاشف الحقائق) کے والد ماجد جو اپنے زمانے کے ایک امیر کبیر تھے، دولت کدہ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ

---

۱ پیمبران سخن ص ۲۴-۱۲۳

۲ پیمبران سخن ص ۱۲۳، حیات دبیر ص ۶۶-۶۵

۳ حیات دبیر، ص ۶۷-۶۶

پر مرزا دبیر سے ملنے گئے۔ سردیوں کا موسم تھا اور گرمیوں کا لباس (ایک تنزیب کا کرتہ اور تن زیب کا انگرکھا) پہنے تھے، مرزا صاحب سے ملے لیکن یہ نہیں کہا کہ میں کون ہوں۔ مرزا صاحب نے جب ان کا لباس دیکھا تو خیال کیا کہ ان کے پاس گرم پوشاک نہیں ہوگی یہ دریافت کر کے کہ یہ سید ہیں ان کو الگ لے جا کر لکھنوَ کی فردروئی اور اس پر پانچ روپے رکھ کر کہا کہ میں مغل سادات کا غلام ہوں۔ یہ ہدیہ قبول فرمائیے۔ انھوں نے روپیہ تو یہ کہہ کر لوٹا دیے کہ ضرورت نہیں البتہ رضائی یہ کہہ کر لے لی کہ تبرک ہے اور اپنی اولاد سے وصیت کروں گا کہ میرے کفن کے ساتھ ڈال دی جائے تا کہ خدا بخشش کرے، بعد میں مرزا دبیر کو پتہ چلا کہ امیر کبیر ہیں۔[1]

اگر مرزا دبیر کی سخاوت کے متعلق ان سب حکایتوں اور واقعات کو رقم کیا جائے جو ان کی سخاوت کے متعلق مشہور ہیں یا تحریر میں آچکے ہیں تو ایک الگ کتاب کا مواد اکٹھا ہوگا لیکن اس مقالہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ ان کو مختصر طور پر بھی بیان کیا جائے۔

حاجت روائی

مرزا دبیر دوسروں کی حاجت روائی اس طرح کرتے تھے جیسے یہ ان کا فرض ہو اور کوئی ان کے پاس سے مایوس ہوکر نہیں آتا تھا۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

> ''بندگان خدا کی مطلب برآری (کی)...... عبادت کو مرزا صاحب سب عبادتوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ وہ آدمی نہیں ہے جو دوسرے کے کام نہ آئے۔ شاہی زمانے میں جب کبھی کوئی اہل حاجت ان سے اپنی حاجت بیان کرتا تھا تو وہ اگر خود اس کو روا کر سکتے تھے تو خود دیتے تھے ورنہ کسی بیگم یا شہزادہ یا شاہزادی کو رقعۂ سفارش لکھ دیتے تھے...... کبھی خود پینس میں بیٹھ کر لے جاتے تھے اور سفارش کر کے دلواتے تھے جو حاجت ہوتی تھی روا فرماتے تھے۔''[2]

ا دیباچہ سبع مثانی ص ۲۸ ثابت۔ راقم الحروف نے بھی پٹنہ میں مرزا دبیر کی سخاوت کی بیسیوں کہانیاں سنی ہیں جو اب تک وہاں کے بزرگ یہ کہہ کر دبیر کا نام آتے ہی دہراتے ہیں کہ انھوں نے بزرگوں سے سنی ہیں۔ چنانچہ متذکرہ حکایت تو راقم الحروف نے امداد امام اثر کے خاندان والوں سے بھی سنی ہے۔

۲ حیات دبیر ص ۶۷

اس سلسلہ میں ثابت لکھنوی نے کئی حکایتیں بیان کی ہیں۔ ان میں ایک حکایت یہ ہے:

''زمانہ شاہی میں مرزا صاحب نے یہ مرثیہ کہا تھا:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ تمام مرثیہ بالخصوص اس کا بین مرزا صاحب کو بہت پسند تھا۔ اکثر ان کے شاگردوں اور دوستوں نے مانگا مرزا صاحب نے کسی کو نہ دیا۔ نواب محسن الدولہ مرحوم[1] جو لکھنؤ کے ایک فیاض رئیس اور شاہ اول اودھ غازی الدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ بادشاہ سوم اودھ کے داماد تھے، اس مرثیہ کے بہت مشتاق تھے۔ وہ کسی رئیس کے یہاں مجلس میں نہ جاتے تھے اور کلام مرزا صاحب کے گویا عاشق تھے۔ انھوں نے بارہا اپنے جلسے میں فرمایا کہ جو شخص یہ اعلیٰ مرثیہ مرزا صاحب کا مجھے کسی ترکیب سے لادے میں اس کو پانچ سو روپیہ انعام دوں۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ وہ مرثیوں کو اور خاص کر نئے مرثیوں کو بہت احتیاط سے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء ہوگیا۔ بعد غدر ایک سید صاحب مرزا صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ میں لڑکی کی شادی کروں گا اور پھر کربلائے معلیٰ جاؤں گا۔ آپ پانچ سو روپیہ کسی رئیس سے مجھے دلوا دیجیے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کی تباہی کا تھا۔ اکثر رئیس اپنے حال میں مبتلا تھے مگر نواب محسن الدولہ کے پاس کئی لاکھ روپے

---

[1] (وفات ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء) ان کا شمار نامی گرامی امراء میں ہوتا ہے۔ غازی الدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ کے داماد تھے۔ نصیرالدین حیدر کے ہم سن اور ان کے ساتھ کے کھیلے تھے، اس وجہ سے انتزاع سلطنت اودھ تک مسلسل اہمیت کے مالک رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی انگریزوں سے اچھے مراسم رہے اور شاہ نجف (واقع لکھنؤ) کے مرتے دم تک متولی رہے۔ ناسخ نے متعدد مدحیہ قطعات ان کی شان میں لکھے ہیں۔ جب ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں نصیرالدین نے انھیں غضنفر جنگ کا خطاب دیا تو ناسخ لکھنؤ سے باہر تھے مگر قطعہ تاریخ اس موقعہ پر بھی کہا: جناب محسن الدولہ بہادر، باوج و جاہ بچوں آفتاب است/ ندیم خاص سلطان است بے شک بروئے جملہ اعدا فتح یاب است/ معظم باد اندر ملک عالم غضنفر جنگ آں عالیجناب است/ برائے سال مسعود خطابش، خرد گفتا کہ اعلیٰ ایں خطاب است/ ۱۲۴۵ھ، ۱۸۳۱ء، ناسخ۔ شبیہ الحسن ص ۱۴۲

کے نوٹ اور پنشن معقول تھی۔ مرزا صاحب نے کچھ سوچ کر ان کو اپنا یہی مرثیہ دے دیا اور کہا کہ آپ نواب محسن الدولہ کی ڈیوڑھی پر جاکر اطلاع دیجیے گا کہ میرے پاس یہ مرثیہ ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اور یہ بھی کہیے گا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کا اشتہار ہے کہ جو شخص یہ مرثیہ لادے میں اس کو پانچ سو روپیہ دوں گا۔ اب مجھے پانچ سو روپے دیجیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے تو محسن الدولہ سمجھے کہ صرف وہ مطلع ہے اور کسی نے اور بند کہہ کر لگا دیے ہیں مگر جب ان سید صاحب نے کہا کہ آپ تو ان کے خط کو پہچانتے ہیں اور وہ واقعی خط کو پہچانتے تھے کہ ان کی زوجہ مرزا صاحب کی شاگرد تھیں تو انھوں نے خط پہچان کر مرثیہ کی نقل لے لی اور ۵۰۰ روپے دے دیے اور اصل مرثیہ واپس دے دیا۔"[1]

اس طرح کی کئی حکایتیں صاحب حیات دبیر نے بیان کی ہیں مگر راقم الحروف نے خوف طوالت سے ایک ہی نقل کی۔

ایفائے وعدہ

مرزا دبیر وعدے کے بڑے پابند تھے۔ ایفائے وعدہ کرنا ان کے نزدیک فرض تھا۔ ثابت لکھنوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"آندھی آئے، مینھ آئے، جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ سو کام چھوڑ کر وعدہ ضرور وفا فرماتے تھے۔"[2]

ایفائے وعدہ کے متعلق مرزا دبیر کی کئی حکایتیں ملتی ہیں۔ ثابت لکھنوی نے ایک حکایت یہ بیان کی ہے کہ ایک دفعہ مرزا دبیر نے ایک نیا مرثیہ پڑھا جس کا ایک مصرع تھا:

اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے

---

۱ حیات دبیر ص ۷۱-۷۰

۲ ایضاً ص ۷۴

مجتہد العصر علامہ جائسی مولانا و مقتدانا سید علی حسن صاحب کو بہت پسند آیا۔ انھوں نے مرزا دبیر سے یہ مرثیہ مانگا تو مرزا دبیر نے کہا کہ بروز روانگی وطن مل جائے گا۔ آخر ماہ ذی الحجہ میں جب لکھنؤ سے انھوں نے روانگی کا قصد کیا تو شہر کے ناکے پر اپنے پہنچنے سے قبل ہی مرزا دبیر کی پالکی موجود پائی۔ ملاقات ہوئی تو وہی مرثیہ ہاتھ میں تھا۔[1]

شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

> ''میرے گھر میں ایک صاحب میر رفعت حسین رہتے تھے۔ ان کے ٹخنے میں گھر گھرا (زخم معروف) تھا۔ وہ زخم کھولے بیٹھے تھے۔ مرزا صاحب (مرزا دبیر) جو تشریف لائے تو انھیں کے پاس بیٹھ گئے اور وعدہ کیا کہ ایک مجرب دوا اس کی لکھنؤ سے بھیج دوں گا۔ حسب وعدہ بہت سا مرہم وہاں سے بھیج دیا۔ اس سے وہ اچھے ہو گئے۔[2]

دل آزاری سے بچنا

مرزا دبیر حتی الوسع دوسروں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوست دشمن کا اس صفت میں امتیاز نہ تھا۔ ثابت لکھنوی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کبھی اپنے دشمن کی بھی دل شکنی گوارا نہ فرماتے تھے اور دل آزاری کو بدترین خصائل ذمیمہ سمجھتے تھے اور خلاف حیا و مروت ان سے کوئی بات ظہور میں نہ آتی تھی۔ یہ ان کا شعر بالکل ان کے حسب حال ہے:

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو ۔۔۔ مانندِ غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو[3]

غیرت و مروت

مرزا دبیر کے ابتدائی زمانے میں اکثر مرثیہ گو شعراء سوزخوانوں کے دست نگر تھے اور ایک بڑے کامل سوزخوان میر علی صاحب[4] موجود تھے جن کے در دولت پر بڑے بڑے

---

۱ حیات دبیر ص ۴۷ ۔۔۔ ۲ پیمبران سخن ص ۱۴۱

۳ حیات دبیر ص ۴۷

۴ میر علی صاحب خواجہ میر درد دہلوی کے نواسے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ان کے بارے میں تحریر

شاہزادے اور حکام سننے کو آتے تھے اور وہ کسی کے یہاں نہ جاتے تھے۔ نواب سعادت علی خان انھیں فخر لکھنؤ سمجھتے تھے۔ میر علی صاحب زیادہ منشی دلگیر مرحوم کے سلاموں اور مرثیوں پر سوز رکھتے تھے۔ اس زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ میر علی جس مرثیہ گو کے کلام پر سوز رکھیں وہ مستند مرثیہ گو سمجھا جائے گا۔ مرزا دبیر کی شہرت سن کر میر علی نے ان سے کلام منگوایا۔ تین مرثیے بھیج دیے گئے۔ ایک روز کسی ذاکر نے انھیں میں سے کوئی مرثیہ پڑھا۔ میر علی نے

کرتے ہیں: ''لکھنؤ میں میر علی صاحب ایک مرثیہ خوان تھے کہ علم موسیقی میں انھوں نے حکماء کا مرتبہ حاصل کیا تھا مگر اپنے گھر میں ہی مجلس پڑھتے تھے۔ نواب (سعادت علی خان) نے ان کے شہرہ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا۔ انھوں نے انکار کیا اور کئی پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شاہزادہ ہوں۔ انھیں میرے یہاں آنے سے کیا عار ہے۔ نواب نے کہ کہ سید میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں۔ میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کیا کہ سید تھے اب ڈوم بھی ہو گئے۔ خیر انھیں اختیار ہے۔ میر علی صاحب نے یہ سن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سید انشاء (انشاء اللہ خاں انشاء) جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی ان کے شاگرد ہیں وہ بھی استاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو وہ معاملہ معلوم ہوا۔ اسی وقت کمر باندھ کر پہنچے۔ سعادت علی خان نے متحیر ہو کر پوچھا کہ خیر باشد! پھر کیوں آئے؟ انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا   یارب بنا بنی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا کہ حضور! غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولھا کی دلھن عروس سلطنت کو ذرا دیکھوں۔ حضور! واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جھمکے، وہ کون؟ دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار، وہ کون؟ خان علامہ۔ غرض اسی طرح چند زیورو کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا! نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون؟ کہا 'حضور! نتھ۔ میر علی صاحب' بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دور اندیشیاں بیجا ہیں۔ میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے لیے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپے کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔'' (آب حیات ص ۹۰-۲۸۹)

یہ سن کر مرزا دبیر کو کہلوایا کہ منشی دلگیر جو سلام یا مرثیہ میر علی کو دیتے ہیں وہ کسی اور کو تین برس تک میری اجازت کے بغیر نہیں دیتے۔ میں وہ شخص ہوں کہ جس کا مرثیہ پڑھوں وہ مستند مرثیہ گو سمجھا جائے گا۔ کیا تم مستند مرثیہ گو نہیں بننا چاہتے۔ آئندہ ایسا مت کرنا، مرزا دبیر نے اس کے جواب میں پیغام بھیج دیا کہ ہر طرح تعمیل حکم کو حاضر ہوں مگر یہ جو ارشاد ہوا کہ مستند مرثیہ گو بننا چاہو تو جو مرثیہ مجھے دینا وہ تین سال تک دوسرے کو نہ دینا، اس کا جواب ہے کہ

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است　　　رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

میں اگر مستند مرثیہ گو بننا چاہتا ہوں تو امام حسینؑ کی امداد اور اپنی محنت وطبع خداداد سے۔ اور یہ بات شاید میری مروت سے بھی دور ہوگی کہ کوئی ذاکر مجھ سے مرثیہ مانگے اور میں یہ کہہ کر اس کی دل شکنی کروں کہ میر علی صاحب کا حکم نہیں، اس لیے مرثیہ میں نہیں دے سکتا۔ مجھ سے یہ شرط نبھ نہیں سکتی۔ میں مجبور ہوں۔ میر علی صاحب کو مرزا دبیر کے مراثی بہت پسند تھے لیکن اس کے بعد مرزا دبیر کے مراثی نہ ملنے کی وجہ سے ان کے شاگردوں کے مرثیے جو ان کے اصلاحی ہوتے تھے پڑھتے تھے۔[1]

خودداری

مرزا دبیر نے ساری عمر اپنی وضع داری کو نبھایا۔ کبھی کسی رئیس[2] یا حاکم کی مدح نہیں

۱　حیات دبیر، ص ۸۱-۲۸۰

۲　مرزا دبیر نے عام طور پر رئیسوں کی مدح کرنے سے گریز کیا ہے البتہ جو محب اہل بیت ہوتے تھے اور عزاداری کے فروغ میں جن کا حصہ زیادہ تھا ان کی مدح کارِ ثواب اور حق گوئی جان کر کبھی کبھی کی ہے۔ اس کا مفصل ذکر آئندہ صفحات میں قصیدہ گوئی کے ضمن میں ہوگا۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ ''واقعات انیس'' (جدید ایڈیشن، اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۵ء) میں مہدی حسین احسن لکھنوی) نے بیان کیا ہے کہ مرزا دبیر اور میر انیس ملکہ کشور صاحبہ کے ہاں ایک ہی مجلس میں پڑھے۔ مرزا دبیر درباری لباس میں گئے تھے اور میر انیس معمولی لباس میں۔ مرزا دبیر نے وہاں ملکہ کی مدح کی اور انیس نے مدح نہیں کی بلکہ ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا:

غیر کی مدح کریں شہ کے ثناخواں ہوکر　　　مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر

کی۔ واجد علی شاہ جنھیں سب ہی مصاحب حساب رواج و مرتبہ خداوند کہتے تھے، کے سامنے یہ دو رباعیاں پڑھیں:

سرور (آل احمد) نے بھی یہ شعر انیس سے منسوب کیا ہے جو صحیح نہیں غالباً شبلی کے موازنہ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ (یادگاری مجلّہ ۱۹۷۴ء دبستان انیس راولپنڈی، ص ۷۰) صاحب ''رد واقعات انیس'' نے یہ سلام مونس کا بتایا ہے اور تحقیق سے بھی یہی معلوم ہوا۔ مرثیہ میر مونس جلد اول مطبع نولکشور مطبوعہ ۱۹۱۲ء کے صفحہ ۴۹ پر یہ سلام موجود ہے۔ اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:

مجرئی بہتے ہیں آنسو در غلطاں ہوکر آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہوکر
غیر کی مدح کریں شہ کے ثناخواں ہوکر مجرئی اپنا حشم کھوئیں سلیماں ہوکر

اور مقطع ہے:

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم اے مونس روضۂ شاہ پہ جائیں گے خراساں ہوکر

میر مونس کے سلاموں کا مجموعہ ''دیوان فصاحت عنوان'' کے نام سے ۱۹۱۳ء میں مطبع شاہی سے چھپا ہے۔ اس مجموعہ میں ص ۹۷ پر یہ سلام ۳۸ شعر میں درج ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (مرحوم) کے کتب خانے میں میر مونس کا یہ سلام مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے جس میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی یوں درج ہے: مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر۔ ادیب کے ہی کتب خانے میں ۱۲۹۷ھ کا سلاموں کا ایک مجموعہ (مطبوعہ) ''شمع تعزیت'' ہے اس میں بھی ۱۵۸ صفحے پر میر مونس کا یہ سلام موجود ہے اس میں ۳۵ شعر ہیں اور دوسرے شعر کا مصرع ثانی یوں ہے:

مجرئی اپنا ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مرزا دبیر میں خودداری نہیں تھی اور وہ بادشاہوں کی مدح کرنے میں فخر کرتے تھے۔ سردار مرزا صاحب ''رد واقعات انیس'' (مطبع اصح المطابع لکھنو ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء) میں ص ۱۳-۱۲ پر اس کی تردید کرتے ہیں: ''یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس زمانے کے لوگ زندہ ہیں جو حلفاً بیان کرتے ہیں کہ مرزا صاحب تامدۃ العمر ملکہ کشور صاحبہ کے یہاں کبھی نہیں پڑھے، نہ تنہا نہ کسی کے ساتھ اور جب پڑھنا ثابت نہیں تو جملہ مضامین مخترعہ سراسر غلط ہیں۔ حیرت اس بات کی ہے کہ کلام مجید میں کوئی آیہ درباب کذب نہیں آیا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا صاحب مرحوم تامدۃ العمر کسی بادشاہ کے دربار میں نہ کسی دولت مند کی سرکار میں لباس درباری سے گئے۔ مجلس و منبر کا تو کیا ذکر کہ جہاں سوائے آداب مجلس کے اور کسی کا ادب کرنا مرزا صاحب مرحوم گناہ جانتے تھے۔''

صاحب حیات دبیر نے لکھا ہے کہ میر صاحب نے حیدرآباد دکن میں برسرمنبر یہ رباعیاں پڑھیں جن میں مدح و دعائے نظام و وزیر دکن ہے۔ (۱) اللہ و رسول حق کی امداد رہے۔ سرسبز یہ شہر فیض بنیاد ہے۔ نواب ایسا رئیس اعظم ایسا۔ یارب آباد حیدرآباد رہے (۲) موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں۔ علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں۔ مختار الملک و بندگان عالی۔ رحمت رحمت پہ، نور پر نور ہے یاں۔ (حیات دبیر ص ۱۶-۱۱۵)

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں — یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منھ دکھانا ہے دبیر — بندوں کو میں کس منھ سے خداوند کہوں
حیدر کو غنی سب کو غرض مند کہوں — بے حد ہیں شرف ان کے میں تا چند کہوں
ہے شیرِ خدا میں بخدا شانِ خدا — اس بندے کو سو بار خواوند کہوں

شاہ اول اودھ مرزا غازی الدین حیدر نے جب مرزا دبیر کے کلام کی شہرت سنی تو مرثیہ پڑھنے کے لیے بلوایا۔ مرزا دبیر اپنے معمولی لباس میں پینس میں سوار ہوکر پہنچے، بادشاہ عزاخانے میں تشریف فرما تھے۔ مرثیہ پڑھنے کے لیے کہا۔ مرزا دبیر نے پہلے حمد و نعت میں دو رباعیاں پڑھیں اور اس کے بعد مسدس کا یہ بند پڑھا جو راستے میں فی البدیہہ کہا تھا:

واجب ہے حمد و شکر جنابِ الٰہ میں — فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں — چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرے پہ چشم مہر ہے مہر منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو[1]

یہ مرزا دبیر کی پہلی شاہی مجلس تھی۔ اس میں بادشاہ کی تعریف نہیں بلکہ یہی بتایا کہ خدا کے فضل سے ہی وہ بادشاہ کے دربار میں پہنچے ہیں۔

اس کے بعد یہ مرثیہ پڑھا: داغِ غمِ حسین میں کیا آب و تاب ہے۔[2]

آگے چل کر ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

> "جب مرثیہ پڑھتے پڑھتے اس موقع پر پہنچے کہ جناب سکینہ دختر چار سالہ امام حسین نے یزید کو بادشاہ سمجھ کر اس کے روبرو فریاد کی ہے اور اس کے لشکریوں کے ظلم کی داد چاہی ہے تو بادشاہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بند یہ ہے۔ جناب سکینہ یزید سے کہہ رہی ہے:

جب روز کبریا کی عدالت کا آئے گا — جبار بادشاہوں کو پہلے بلائے گا
انصاف و عدل ان سے بہت پوچھا جائے گا — تو آج داد دینے کی کل داد پائے گا

---

۱ دیباچہ ثابت ۔ سبع مثانی ص ۱۶

۲ ۱۰۲ بند پر مشتمل مرثیہ دفترِ ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے۔

گل کر دیا ہے دونوں جہاں کے چراغ کو
لوٹا ہے تیرے عہد میں زہرا کے باغ کو

بادشاہ نے خواجہ سرا کو اشارہ کیا کہ پھر پڑھواؤ۔ خواجہ صاحب نے مرزا صاحب سے کہہ کر یہ بند دوبارہ پڑھوایا۔ بادشاہ کو اپنا خیال آ گیا۔ یہ بند گویا تازیانہ عبرت ہو گیا۔ مرزا صاحب تو مرثیہ پڑھ کر چلے آئے۔ بادشاہ کو خوفِ خدا سے رات بھر نیند نہ آئی۔ بار بار کہتے تھے: ''خدا نے مجھے بھی بادشاہ کیا ہے۔ مجھ سے بھی بازپرس ہوگی۔ دیکھیے یہ دن غفلت مجھے کیا دکھاتی ہے۔ سویرے معتمد الدولہ آغا میر وزیر کو انصاف و عدل کے باب میں تاکید فرمائی۔''[1]

غیبت سے نفرت

مرزا دبیر کسی کی غیبت نہ کرتے تھے نہ سنتے تھے۔ ان کے شاگردوں اور میر انیس کے شاگردوں کے درمیان معرکے ہوئے مگر مرزا دبیر (اور میر انیس نے بھی) نے کبھی حامی نہ بھری بلکہ ان لوگوں کی باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرتے تھے۔ البتہ اگر دیکھتے کہ کسی نے زیادتی کی تو ٹوک دیتے تھے۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

''حسد اور رشک سے بھی ان کو جلن تھی اور اکثر اپنا یہ شعر پڑھتے تھے:

مذہب میں مرے رشک خفی شرک جلی ہے   واللہ کہ یہ ولولہ حب علی ہے[2]

انیسیوں اور دبیریوں نے ایک سلام کی وجہ سے ایک دوسرے کی مخالفت کی۔ میر مونس[3]

---

1 حیات دبیر، ص ۳۰-۲۹
2 ایضاً ص ۴۷
3 میر محمد نواب تخلص مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اپنے والد میر خلیق کے شاگرد تھے۔ مرثیہ عمدہ کہتے تھے۔ ان کے سلام لاجواب ہیں۔ مجموعہ مراثی اور سلاموں کا ''دیوان فصاحت عنوان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انیس کے انتقال کے ایک سال بعد لکھنؤ میں وفات پائی۔ منیر نے تاریخ کہی ہے:

حضرت مونس وحید عصر نے،   لکھنؤ میں کی قضا افسوس ہائے
وہ فصاحت وہ بلاغت وہ زباں   ہو گئے دم میں فنا افسوس ہائے
میں نے یہ تاریخ پائی اے منیر   ذاکر نامی موا افسوس ہائے

(کلیات منیر ص ۵۴۸)

نے ایک سلام کہا تھا جس کا ایک شعر تھا[1]

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل　　اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

یہ زمین بہت مقبول ہوگئی اور لوگوں نے اس میں سلام کہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے لکھنؤ کے شعراء یا تو انیس کے طرف دار تھے یا دبیر کے۔ یا دونوں کے شاگرد مرزا اوج نے بھی ایک سلام کہا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ چنانچہ مشیر[2] اور میر مونس ایک دوسرے کے مقابلے پر آگئے اور ایک دوسرے کا جواب دینے لگے۔ مشیر کا اس سلسلہ میں ایک شعر یہ ہے:

اساتذہ کی ہیں غزلیں، سلام بھی اکثر　　نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو[3]

یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا دبیر نے اس کے جواب میں کوئی سلام کہا تھا اور یہ بھی درست نہیں ہوسکتا کہ میر انیس نے اس مقابلے کے لیے اس زمین میں کوئی سلام کہا تھا البتہ انیس کے ان اشعار[4] پر:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

۱　شبلی نے اس شعر کو موازنہ انیس و دبیر ص ۲۷ (چمن بکڈپو اردو بازار دہلی) پر میر مونس سے منسوب کیا ہے۔ رسالہ ''شاعر'' ممبئی میں مفتون کوٹری کا ایک مضمون ''مرزا دبیر استاد کی حیثیت سے'' اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں: جس سلام کی ردیف زمینوں کو، آستینوں کو ہے مرزا اوج نے اس زمین میں سلام کہا تھا۔ ان کے بعد میر انیس نے کہا جس کا مشہور مقطع ہے:

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

۲　مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ کے تحت شاگردان دبیر کے تذکرہ میں اسی مقالہ میں مشیر کے حالات ملاحظہ فرمائیں۔

۳　یہ شعر دراصل انیس کے شعر:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے　　چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو

کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے جواب میں دبیریوں نے میر تقی میر کا شعر

ہیں ضعف سے جھریاں بدن پر　　پیری جامہ کو چن رہی ہے

پیش کیا تھا کہ اساتذہ نے ان مضامین کو پہلے ہی نظم کیا ہے۔

۴　ان اشعار میں مضامین ایسے نظم ہوئے ہیں جن سے یہ شک ہوتا ہے کہ کسی کو جواب دیا گیا ہے یا للکارا گیا ہے حتیٰ کہ اس مقابلے سے میر انیس کے سلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

شبلی کو دھوکا ہوا وار انھوں نے میر انیس سے یہ منسوب کیا کہ انھوں نے بھی اس مقابلے میں اشارتاً حصہ لیا اور یہ شعر کہا:

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل　　اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

لیکن یہ شعر میر مونس کا ہے[1] ڈاکٹر مسیح الزماں کی تحقیق بھی یہی ہے[2]

غرض مونس اور مشیر نے تو خوب مقابلہ کیا اور لکھنؤ میں اس کے خوب چرچے ہوئے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا دبیر مشیر سے اور میر انیس مونس سے خفا ہو گئے اور مشیر نے میر انیس سے اور مونس نے مرزا دبیر سے معافی مانگی[3]

اس موقع پر بھی مرزا دبیر خاموش رہے اور کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے حسد اور نفرت کے شعلوں کو ہوا لگتی۔

انصاف پسندی

مرزا دبیر متقی اور پرہیزگار تھے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے معنی ہی خوف کے ہیں۔ یعنی انسان خدا کا خوف دل میں رکھے۔ جو شخص خوف خدا کھائے وہ کسی بندہ سے خوف زدہ نہیں ہوگا اور اس کا ضمیر ہمیشہ صاف اور پاک رہے گا۔ ضمیر کی صفائی اور پاکیزگی انسان کے منھ سے ہر وقت وہی بات کہلوائے گی جو حق اور صداقت پر مبنی ہو۔ یہ ذاکر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صفت عدل سے معمور تھے۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

> ''عدالت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ کبھی کسی غریب کے مقابلے میں کسی امیر کی بدآیند و بداصل طرف داری نہیں کی۔ نہ کبھی کسی بادشاہ یا رئیس کی انھوں نے خوشامد کی۔''[4]

۱　تردید موازنہ ص ۲۱، ۲۰ شیخ محمد جان عروج، تصویر عالم پریس لکھنؤ

۲　معیار و میزان، مسیح الزماں ص ۳۳-۲۳۲ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ رام نرائن بینی مادھوالہ آباد (۱۹۷۶ء)

۳　حیات دبیر جلد ا، ص ۱۲۰-۱۱۹

۴　حیات دبیر جلد ا، ص ۷۱

شادی اور اولاد

صاحبِ حیات دبیر لکھتے ہیں:

"سید انشاء[1] کی جن شرافت نسب و نجابت و سیادت پر تمام تذکرے متفق ہیں..... کی حقیقی نواسی سید معصوم علی مرحوم کی بیٹی مرزا بیر کی زوجہ ہیں جن کے لختِ جگر مرزا محمد جعفر صاحب اوج فخریہ ایک مرثیہ میں فرماتے ہیں:

نانا ہیں مرے سید عالی نسب انشاء　　عاجز ہے خرد ان کے فضائل ہوں کب انشاء[2]

مرزا دبیر کے دو فرزند اور ایک دختر تھی۔ مرزا محمد جعفر اوج[3] سب سے بڑے فرزند تھے (ان کی ولادت 6/ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء ہوئی اور انتقال ۲۵/ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء ہوا) مرزا محمد ہادی عطارد[4] (ان کی ولادت ۵/شعبان ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء ہوئی تھی اور عین شباب میں مرزا دبیر کے انتقال سے دو سال قبل ۱۸۷۳ء میں وفات پائی) دختر (میر بادشاہ علی بقاپسر میروزیر علی صبا کے عقد میں تھیں۔)[5]

ذیل میں صاحب شمس الضحیٰ کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو انھوں نے مرزا دبیر اور ان کی اولاد کی مدح میں کہے ہیں:

۱　مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں انشاء کے حالات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ثابت لکھنوی نے مخزن الغرائب مولفہ مولوی احمد علی کے حوالے سے بعض واقعات کی تردید کی ہے۔ ایک یہ کہ انشاء آخر عمر میں محتاج نہیں ہوئے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ پہلی مرتبہ شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے۔ سعادت علی خان کے عہد میں دوسری مرتبہ ادھیڑ عمر میں لکھنؤ آئے تھے (حیات دبیر ص ۱۷-۱۵) محمد حسین آزاد اس خاندان کی عصمت، پاکیزگی اور پردہ وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ خواتین کے کپڑے دھوبی کے ہاں دھلنے کے لیے نہیں جاتے تھے کہ نامحرموں کے ہاتھ لگیں گے اس لیے یا تو گھر میں دھلتے تھے یا جلائے جاتے تھے۔ (آب حیات ص ۲۵۹)

۲　حیات دبیر ص ۱۶-۱۵

۳　مفصل حالات اس مقالہ میں مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ کے باب میں شاگردانِ دبیر کے تحت دیکھیں۔

۴　مفصل آئندہ صفحات میں دیکھیں۔

۵　شمس الضحیٰ ص ۱۳۶ تفصیل کے لیے اس مقالہ کے ص ۵۱ پر دیا ہوا شجرہ نسب ملاحظہ فرمائیں۔

بلبل نغمہ سنج خوش الحان — رونق افروز باغ ہندوستان

آل سلامت علی دبیر کہ ہست — حامی دین، کامل الایمان

گوہر نظم آں، محیط سخن — ہست چوں اختر فلک رخشان

مادح خاص اہل بیت نبیؐ — ذاکر خاص سرور دو جہان

رونق کار گاہ امکانے — سبط فیض حضرت یزدان

در صفاء دل و عبادت حق — بو ذر عہد و ثانی سلمان

قرۂ عین دانش و بینش — قدوۂ اہل وحدت و عرفان

اختر برج عزت و اقبال — گوہر درج رفعت و احسان

داد او را خدا دو نورالعین — ہر دو ہمچوں پدر بشوکت و شان

بر سپہر جلال و رفعت و جاہ — مثل خورشید و ماہ نور افشان

ہر یکی مثل فرقدین ز نور — بر سماء علو بود، تابان

زاں، دو اول محمد[1] جعفر — ہست نور حق از جبینش عیان

آں گل جعفری سراپا نور — نونہالی ز گلشن عرفان

چوں ملک ہست در لباس بشر — وصف او کے شود بنظم بیان

بہ ششم در جمادی الاولیٰ — شد چو اختر ز برج بطن عیان

شصت و نہ بود و یک ہزار و دو صد — کافریدش خدای ذو الاحسان

چوں دو افزود بر سنین نخست — بود تاریخ پنجم شعبان

کہ ز برج بہار و عز و شرف — گشت طالع ستارہ رخشان

در کمال جمال و حسن و صفا — مشتری طلعت و مہ تابان

ہست ہادی حسین[2] القابش — لیک باشد محمد اول آن

نام اجداد شاں علی الترتیب — اندریں چند بیت گشتہ بیان

جد شان میرزا غلام حسین — بود آں برگزیدۂ یزدان

---

1 مرزا محمد جعفر اوج فرزند اکبر مرزا دبیر

2 مرزا محمد ہادی حسین عطارد فرزند دوم مرزا دبیر۔ مفصل حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

کش غلام محمد است پدر	عمدۂ خاندانِ عالی شان
والدش میرزا رفیع جلیل	در نسب در حسب رفیع الشان
پدرش بود میرزا ہاشم	آں فرشتہ بصورت انسان
بود در نثر آں خلاصۂ عصر	منشی و کامل و وحید زمان
بود شیراز موطن خاصش	غیرت افزائے روضۂ رضوان
بود اہلی، یکی برادر او	شاعرِ بے نظیر و اہل زبان
آنکہ منظوم اوست ''سحر حلال''	در ہمہ عالم است شہرت آن
در مجالس بجلسِ شعراء	وصف آں مومن رفیع مکان
چند اشعار و نبذی از حالش	سیدِ ششتری نمودہ بیان
سیدّہ، صالحہ، عفیفہ، نیک	پاک دامن کہ ہست مادر شان
بعد معصوم چوں شود مرقوم	اسم پاک علی شہ مردان
در کتابت ازاں شود ظاہر	بے کم و بیش اسم والد آن
بود آں سر و گلشنِ تقویٰ	گلبنی از حدیقۂ ایمان
میر انور علی است والد او	سیدِ نیک سیرت و ذی شان
چوں مرکب شود احد بعلی	میرسد اسم والدش بعیان
بود آں صاحب جلال و کمال	از مشاہیر و سرور اقران
والد امّ آں دو نور بصر	کہ نظیرش ندیدہ چشم جہان
بود او زوج دخترِ انشاء	سید و شاعرِ فصیح زبان
بلبل خوش نوای گلشنِ ہند	نغمہ پرداز ہر فن و ہمہ دان
تا بر اوج فلک بود خورشید	باد یارب بقای دولت شان[1]

تہذیبی فضا

مرزا دبیر نے اگرچہ آنکھیں دہلی میں کھولی تھیں مگر نگاہ لکھنؤ میں نصیب ہوئی اور ان

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۵۳-۱۵۱

کی نظر نے بصارت سے لے کر بصیرت تک کا سفر لکھنؤ کی اس تہذیبی فضا میں کیا، جو اپنی مثال آپ ہے۔ بقول عبدالحلیم شرر مشرقی تمدن کا آخری نمونہ گزشتہ لکھنؤ ہی تھا۔ رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب اس کی روح ساتھ لیے ہوئے ہے۔ سرشار کا فسانۂ آزاد اس کی گوناگوں تصویروں کو پیش کر کے ایک مستقل افسانہ بن گیا۔

مرزا دبیر کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ اہل نظر کا مرکز تھا۔ دہلی، آگرہ سے خصوصاً اور ہندوستان کے اور شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے عموماً اہل کمال سمٹ کر لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ بادشاہ سے لے کر امراء بلکہ غرباء، فقراء ایک مذہب تھے، سب ہی یا شیعہ تھے یا صوفی یا سنی ایسے کہ جو عزائے شہدائے کربلا کو اپنا فرض اعتقادی سمجھتے تھے۔[1]

مرزا دبیر صرف گیارہ برس کے تھے جب غازی الدین حیدر[2] تخت نشین ہوئے اور

---

۱ حیات دبیر جلد ۱ ص ۲۸

۲ غازی الدین حیدر نواب سعادت علی خاں کے فرزند تھے۔ ان کی ولادت بمقام موضع بسوہلی ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء میں ہوئی (تاریخ فرخ آباد-قلمی) سعادت علی خان کے انتقال کے بعد ۲۳ر رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء کو تخت نشین ہوئے۔

اودھ کے حکمرانوں میں غازی الدین حیدر غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں نوابیت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ گورنر جنرل کے ہاں سے ایک تحریر آئی تھی جس میں غازی الدین حیدر کو تحریر کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں اور ان کے مقدمات خانگی میں کسی کو کوئی دخل نہیں۔ اس تحریر کو سند مان کر غازی الدین حیدر نواب سے بادشاہ ہوگئے اور ۱۸ر ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء شنبہ کو نوابی کی صورت سلطنت سے مبدل ہوگئی۔ بادشاہ کا لقب ابوالمظفر معزالدین، شاہ زمن غازی الدین حیدر مقرر ہوا اور بزم منعقد ہوئی۔ ناسخ نے اس کی تاریخ کہی ہے:

بحمد للہ کہ با اقبال و دولت ۔۔۔ بہ تخت زر جلوس شاہ گردید
زمین و آسماں یک بزم عیش است ۔۔۔ زماہی خرمی تا ماہ گردید
مبارک باد اے آفاق عالم ۔۔۔ طلوع آفتاب جاہ گردید
ندا آمد بگوشم زود یارب ۔۔۔ کہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید
پے سال ہمایوں جلوسش ۔۔۔ بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

(۱۲۳۴ھ) (تاریخ اودھ ج ۴، ص ۱۴۵-۱۴۱)

جب ان کا انتقال ہوگیا تو مرزا دبیر کی عمر ۲۴ برس کی تھی۔ ان کے عہد حکومت میں

غازی الدین حیدر کا انتقال ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء کو ہوا۔ انتقال کے بعد خطاب "خلد مکان" پایا۔ ناسخ نے تاریخ وفات کہی ہے:

از وفات جناب شاہ ز من (کذا) ہلاک شدہ
گشت تاریخ مصرع استاد اے بسا آرزو کہ خاک شدہ (۱۲۴۳ھ)

(دیوان ناسخ۔ قلمی)

۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں بادشاہ غازی الدین حیدر نے روضۂ حضرت علیؑ واقع نجف اشرف کے نمونہ پر کافی رقم خرچ کر کے لکھنؤ میں شاہ نجف کے نام سے ایک عالیشان اور خوبصورت امام باڑہ تعمیر کروایا۔ لندن سے اس کے لیے گہرے سبز رنگ کے شیشوں اور طلائی پتروں کا ایک بیش بہا تعزیہ منگوایا۔ (Observations on the Mussalmauns of India by Mrs. Meer Hassan Ali-page18)

شاہ نجف کی بنائے تاریخ یہ ہے:

با حسن عقیدت نجف اشرف را فرمود بنا بہند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل ہاتف گفتہ، "عجب نجف شد تعمیر"

(۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء تاریخ نادر العصر ص ۱۴۳)

شاہ نجف کے متصل ہی بادشاہ غازی الدین حیدر نے "قدم رسول" نام کی ایک زیارت گاہ بھی تعمیر کرائی تھی اس کے متعلق حکیم نجم الغنی نے تحریر کیا ہے:

"قدم رسول ایک مذہبی مقام اہل اسلام کا ایک بلند مقام پر بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا اور اس میں سنگ پارہ رکھا تھا جو عرب سے ایک حاجی لایا تھا۔ اس پر آنحضرتؐ کے قدم کا نقش تھا۔ غدر میں سنگ پارہ مذکور گم ہوگیا۔" (تاریخ اودھ ج ۴، ص ۱۹۷) District Gazettier Lucknow by H.R.Neival 1905 p.210

بادشاہ غازی الدین حیدر کا عہد لکھنؤ میں عزاداری کے فروغ کے سلسلے میں نہایت اہم ہے۔ لکھنؤ کی سب سے خوبصورت اور قدیم کربلا تال کٹورے کی کربلا جہاں آفریں علی خان خواجہ سرا نے میر خدا بخش کی معرفت ان ہی کے عہد میں ۱۲۳۳ھ میں تعمیر کی۔ تاریخ بنا یہ ہے: در ایام غازی دستور ہند کہ ہمنام حیدر بجود و عطاست۔ زہے رکن اقبال او ناظرست، جہاں آفرین خان اودا لمحاست۔ بہ دربار او سید باوفا، خدا بخش نامش بفضل خداست بنا کردہ چوں کربلا، بچشم جہاں خاک او طوطیاست۔ ز روئے بشارت خرد سال او، بگفتہ کہ ایں نقشۂ کربلاست۔ (۱۲۳۲ھ) (تاریخ نادر العصر ص ۸۶)

عزاداری، مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو جو ترقی ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ نامی مرثیہ گویوں میں میر خلیق (متوفی ۱۲۶۰ھ) دلگیر (متوفی ۱۲۶۴ھ) فصیح (متوفی ۱۲۶۳ھ تا ۱۲۶۹ھ) میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ھ) کی شہرت کو اس زمانے میں چار چاند لگ گئے۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کی تصنیف کا کام اسی عہد میں شروع ہوا۔

غازی الدین حیدر کی بیگم بادشاہ بیگم[1] نے بھی مراسم عزاداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ

---

۱ بادشاہ بیگم مبشر خان منجم اور تقویم ساز کی بیٹی تھیں اور مبشر خان مشرف خان کے بیٹے اور خیر اللہ رسد بند محمد شاہی کے شاگرد تھے۔ مبشر خان نے بادشاہ بیگم کو درسی علوم سکھانے کے بعد تخریج احکام نجوم کی بھی اچھی طرح تعلیم دی تھی۔ غازی الدین حیدر ان کے حسن و جمال پر عالم صاحبزادگی ہی سے فریفتہ تھے۔ دہلی میں نواب سعادت علی خان نے غازی الدین حیدر کی شادی ان کے ساتھ ۱۲۰۹ھ میں کی۔ اس وقت غازی الدین حیدر کی عمر اکیس برس کی تھی۔ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیاہ بنارس میں ہوا تھا۔ بادشاہ بیگم کی شان و شوکت کا اندازہ ان کی شادی کے حال اور دوسرے واقعات سے ہوتا ہے۔ تاریخ اودھ میں اس شادی کا حال ایک انگریز خاتون کے حوالہ سے اس طرح منقول ہے "رسم شادی کے اختتام پر جواہرات کی بوچھار ہوئی۔ ریزیڈنٹ کی اور میری آستین پر چند جواہرات آپڑے تھے۔ ریزیڈنٹ کو آستین جھٹکتے ہوئے دیکھ کر میں نے بھی اس کی تقلید کی اور جواہرات زمین پر پھینک دیے۔ شاہی خواصوں نے سمیٹ کر باہم تقسیم کر لیے۔ اس بوچھار میں زمرد پکھراج نیلم اور ہیرے تھے۔" خاتون مذکور لکھتی ہے کہ "یہ کیسی لاثانی اور قیمتی اور تعجب خیز بخشش اور فیاضی ہے۔"

(تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۱۶۷) بادشاہ بیگم جس مسہری پر آرام کرتی تھیں وہ لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی تھی۔ (تاریخ اودھ معروف بہ فسانہ عبرت قلمی۔ رجب علی بیگ سرور) اس شان و شوکت سے زندگی گزارنے والی بادشاہ بیگم کا انتقال مسافرت کے عالم میں ۲۳ ماہ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء کو چنارگڑھ میں ہوا۔ (قیصر التواریخ ج ۱ ص ۳۴۷)۔ سید کمال الدین حیدر، مطبع نولکشور ۱۸۹۶ء) رشک لکھنوی نے تاریخ کہی ہے۔ رفت چوں ایں بادشاہ بیگم سوئے جنان، بود زہجری سنین ماہ مصیبت دوم۔ مصرعۂ تاریخ ایں واقعہ گفتہ سروش۔ وائے بماہ صفر آہ خمیس و سوم (دیوان رشک ص ۳۱۸ مطبوعہ ۱۸۴۷ء لکھنؤ)۔ بادشاہ بیگم تمام عمر عزاداری کو فروغ دیتی رہیں اور اس بات کا کافی اہتمام کیا کہ ایام عزا میں کسی قسم کی خوشی کی تقریب نہ ہو۔ تاریخ اودھ میں منقول ہے کہ انھوں نے اپنے شوہر بادشاہ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد حکم نافذ کیا "تمام ساکنان سلطنت سیاہ پوشی اور عزاداری کی رسم عمل میں لائیں اور چہلم تک بیاہ و نکاح اور دیگر لوازم شادی کو ترک کریں ورنہ سزا ہوگی۔" (تاریخ اودھ جلد ۴ ص ۳۶۵)

لیا۔ انھوں نے محل سرا میں ائمہ معصومین کے روضوں کی شبیہیں تعمیر کروائیں اور ہر روضہ کے متصل ایک ایک مسجد تعمیر کروائی۔ ہر روضہ میں ضریح کی نقل عتبات کے دوسرے تبرکات رکھے تھے۔ ایک کربلا تیار کرائی جسے حضرت عباس سے منسوب کیا اور شب و روز مراسم تعزیت ادا کرتی تھیں[1]

نائٹن نے اپنی کتاب ''دی لائف آف این ایسٹرن کنگ'' میں نصیرالدین حیدر کے عہد کے محرم کے چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''محرم بھر روزانہ اس طرح کی مجالس[2] عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ خود بادشاہ سلامت کو بالذات اس قسم کے مذہبی مراسم کے ادا کرنے میں بے حد شغف اور انہماک تھا کیونکہ انھوں نے اپنی صغرسنی میں یہ منت مانی تھی کہ اگر ان کو تخت شاہی نصیب ہوگا تو بجائے معمولی عشرہ کے وہ اربعین تک سوگ منایا کریں گے۔ چنانچہ اس زمانے میں بادشاہ اپنے ذکور اعزاء یا احباب ہی کے مجمع میں رہا کرتے تھے، شراب نہیں پیتے تھے۔ دعوتیں نہیں دیتے تھے اور عیش وعشرت کے جن سامانوں کے بڑے دلدادہ تھے، ان سب کو ترک کیے رہتے تھے۔ اسی طرح انگریزی مذاق کی جتنی باتیں بالطبع ان کو مرغوب تھیں ان کو چھوڑ دیتے تھے۔''[3]

یہ تھا وہ زمانہ جس میں مرزا دبیر کی سوچ اور ان کی نگاہ کو ایک راہ ملی اور ان کی عادتیں پختہ ہوتی گئیں۔ لکھنؤ کی تہذیبی فضا میں عزاداری کی نہ صرف بہت زیادہ اہمیت تھی بلکہ اس تہذیبی فضا کا تصور اس کے بغیر نامکمل ہے۔

شہرت و ترقی

جہاں تک خالص ادبی فضا کا تعلق ہے لکھنؤ کی اپنی خصوصیات تھیں اور دہلی کی اپنی، دونوں کے مزاج میں فرق تھا۔ یہ فرق دو تصانیف میر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ

۱۔ تاریخ اودھ جلد ۴ ص ۳۹۵

۲ اس سے قبل انھوں نے اپنی اس کتاب میں مجلسوں کا ذکر کرتے ہوئے مجلسوں کی رونق، ذاکروں کی عزت افزائی اور ان مجالس میں لوگوں کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔

۳ شباب لکھنؤ، ترجمہ محمد احد علی، پرنٹر و پبلشر منشی سخاوت حسین، الناظر پریس ۱۹۱۲ء، ص ۱۴۸

سرور کی فسانہ عجائب کا موازنہ کرنے سے سامنے آتا ہے۔ میر امن کی سادہ اور سلیس نثر اور سرور کی مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کو ایک نظر دیکھنے سے دونوں دبستانوں کے اختلاف مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ اہل لکھنؤ عالمانہ اور دقیق زبان کو ترجیح دیتے تھے مگر اس کے باوجود اس کا اپنا ایک حسن تھا۔ نثر میں جہاں فسانہ عجائب کی سی پرکاری ہو وہاں نظم کا کیا عالم ہوگا۔ اس کا اندازہ بڑی آسانی سے ہوتا ہے۔

اسی فضا میں مرزا دبیر پلے بڑھے پروان چڑھے اور ان کے کمالات کے جواہر سامنے آئے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

> ''دبیر اگرچہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن سے ہی لکھنؤ میں رہے اور یہیں کے ادبی روایات اور علمی فضا سے انھوں نے فیض اٹھایا۔'' [1]

اسی علمی فضا اور ادبی ماحول اور سب سے بڑھ کر یہاں کی عزاداری نے مرزا دبیر کے کمال فن کو جلا عطا کی اور وہ بہت جلد ترقی کی منزلوں کو طے کر گئے اور کم عمری ہی میں ان کی شہرت لکھنؤ میں بلکہ پورے اودھ میں ہوگئی۔

فسانہ عجائب [2] سے ثابت ہے کہ مرزا دبیر کی شہرت غازی الدین حیدر کے ہی زمانے میں ہوچکی تھی اور وہ مستند شاعر اور مرثیہ گو مانے جاتے تھے۔ سرور نے دلگیر کی وجہ سے دوسرے مرثیہ گو شعراء کا بھی تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر[1]، صاف باطن، نیک ضمیر[2]، خلیق[3]، فصیح[4] مرد مسکین[5]، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ[6] نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم[7] سے ناظم[8] خوب دبیر[9] مرغوب سکندر[10] طالع بصورت گدا[11] بار احسان[12] اہل دول کا نہ اٹھایا عرصہ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔'' [3]

افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

---

۱ اردو مرثیے کا ارتقاء...... ڈاکٹر مسیح الزماں، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۸ء، ص ۳۷۷

۲ فسانہ عجائب- مرزا رجب علی بیگ سرور (متوفی ۱۲۸۶ھ) کے بعہد غازی الدین حیدر لکھنا شروع کیا اور نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں تمام کیا۔

۳ فسانہ عجائب ص ۱۱۷ (صرف بارہ شاعروں کے تخلص تحریر کیے ہیں اور ان میں نویں نمبر پر دبیر کا ذکر ہے۔ یہ اس زمانے میں دبیر کے مستند مرثیہ گو ہونے کی سند ہے۔

''غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہوں کے زمانے میں مرزا صاحب کو بہت شہرت ہوگئی اور یہ استاد مان لیے گئے اور غرباء و امراء سے لے کر شہزادیاں اور بیگمیں تک ان کی شاگرد ہوگئیں۔'' [1]

دور دور سے لوگ مرزا دبیر کا شہرہ سن کر لکھنؤ ان کی مجلسیں سننے کے لیے آتے تھے۔ لکھنؤ والوں کی تو بات ہی نہیں۔ مجلس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ بچے بوڑھے، جوان سب ہی مشتاق تھے۔ صاحب حیات دبیر ایک مجلس کا حال یوں لکھتے ہیں:

''...... یہاں آدمیوں کی کثرت تھی کہ زانو بدلنا مشکل تھا اور نیچے کے تمام مکانات شائقین سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک کنواں جو صحن مکان میں تھا اس پر تخت پڑا ہوا تھا اور اس تخت پر بھی آدمی تھے۔ جب آدمیوں کے بیٹھنے کو جگہ نہ رہی۔ صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر لگا دی تھی۔ اب جو دوسری مجلس سے آدمی آئے انھوں نے باہر سے زور لگایا۔ تڑاق سے زنجیر ٹوٹ گئی۔ اکثر آدمی اندر چلے آئے۔ آدمیوں کے جزر و مد سے ایسا کچھ تلاطم ہوا کہ مرزا صاحب منبر پر اٹھ کھڑے ہوئے ...... مجلس تو برہم ہوچکی تھی مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال ...... بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں کہ مجلس ہمہ تن گوش تھی۔

رباعی ۱

یاں مجھ کو بچھانا تھا ضرور آنکھوں کا ۔۔۔ اس پردے میں تھا عین سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ ۔۔۔ آنکھوں کے عوض بچھاؤں گا نور آنکھوں کا

رباعی ۲

ہر عضو سے سر بلند گو آنکھیں ہیں ۔۔۔ پر فرش کی ہو کمی تو لو آنکھیں ہیں
کس کس کے بزیر پا بچھاؤں میں دبیر ۔۔۔ ہم چشم بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہوگئی تھی اور مہینوں لوگوں میں اس مجلس کے چرچے ہوا کیے۔'' [2]

---

۱ حیات دبیر ص ۳۱

۲ حیات دبیر ص ۹۱-۹۰

مرزا دبیر کی مقبولیت کا ان کی اس رباعی سے بھی اندازہ ہوتا ہے:

کیوں آج یہ انبوہِ کثیر آیا ہے — ہاں حضرت مقبل کا نظیر آیا ہے
ہوگا مہِ چاردہ کا منبر پہ کمال — تاریخ ہے تیرہویں، دبیر آیا ہے[1]

بادشاہ اودھ غازی الدین حیدر نے جب مرزا دبیر کا شہرۂ کمال سنا تو اپنے عزاخانہ خاص میں پڑھنے کے لیے چوبدار بھیج کر بلوایا۔[2]

شہرت لکھنؤ میں تو تھی ہی مگر دہلی آگرہ عظیم آباد وغیرہ میں بھی مرزا دبیر کے شایق موجود تھے۔ عام لوگوں کی تو بات اور ہے، علماء اور فضلا، ادبا اور شعراء ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

مرزا غالب اور مرزا دبیر

مرزا غالب جیسے عظیم شاعر نے مرزا دبیر کی تعریف کی ہے۔ شیخ ریاض الدین امجد ۶ رمحرم ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۶ رجولائی ۱۸۶۰ء کو دلی میں مرزا غالب سے ملنے گئے تھے۔ وہ اپنے سفرنامہ دہلی میں لکھتے ہیں:

> "...... اہل کمال سب کے سب تھے...... مرزا (مرزا غالب) نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دست خاص سے لکھ دیے:

مرثیہ

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو

---

۱ دفتر ماتم جلد ۲۰ مرزا دبیر

۲ حیات دبیر ص ۲۹

گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو　　گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
پھر خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا　　کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا　　ہوگا دل بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

مرزا (غالب) خود فرماتے تھے کہ (یہ) حصہ دبیر کا ہے وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے۔ ہم سے آگے نہ چلا، نا تمام رہ گیا۔"[1]

صفیر[2] بلگرامی نے بھی جلوۂ خضر میں یہ تین بند درج کیے ہیں اور اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ بند مجمع میں پڑھ کر غالب نے کہا:

"واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔"[3]

صفیر غزل میں غالب کے شاگرد تھے انھیں یہ قصہ معلوم تھا اور صاحب سرور ریاض بھی غالب سے ملے تھے۔ ان کے ان مطبوعہ بیانات کے بعد ایسا واقعہ کسی اور کے ساتھ جوڑنا عدم واقفیت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے جبکہ سرور ریاض اس وقت چھپی جب مرزا غالب مرزا دبیر اور میر انیس تینوں بقید حیات تھے۔ جلوۂ خضر مرزا دبیر اور میر انیس کے انتقال کے صرف ۹ سال بعد سامنے آئی۔

حالی کا یہ بیان غالباً کسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ مرزا غالب نے سید محمد مرحوم کی فرمائش پر یہ تین بند کہے اور بھیجتے ہوئے معذرت کی کہ یہ انیس و دبیر کا کام ہے۔ ہندوستان میں ایسے شاعر نہ ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔[4]

۱　سرور ریاض ص ۲۶ ریاض الدین امجد اکبرآبادی مطبع حیدری آگرہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء

۲　صفیر بلگرامی شاگرد دبیر و غالب کا ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا۔

۳　جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۱۵ مطبوعہ ۱۸۸۴ء

۴　یادگار غالب- مولانا الطاف حسین حالی ص ۸۳-۸۲، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حالی نے اس طرح مبہم انداز میں لکھ دیا کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ میر انیس کے لیے کہا گیا ہے یا مرزا دبیر کے لیے۔ حتیٰ کہ سروِ ریاض اس وقت شائع ہوئی جب مرزا غالب میر انیس اور مرزا دبیر تینوں بقیدِ حیات تھے۔ صاحب واقعات انیس کی نظر سے بھی شاید یہ تصنیف نہیں گزری اور انھوں نے یہ واقعہ اس طرح تحریر کیا:

> ''مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہوئی اور مرزا صاحب نے غزل سننے کا شوق ظاہر کیا تو میر انیس مرحوم نے صنف غزل گوئی کا ابتذال ظاہر کر کے اکثر سلاموں کے مطلع اور شعر سنائے جو تغزل کے رنگ میں صنف غزل سے بدر جہا بلند مضمون خیز تھے اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کر دی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا کہ غالب کا سا شاعر بھی مرثیہ کی فکر کر کے دیکھ لے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار گزار ہے۔ چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیہ کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کیے ہیں اور اس کے ساتھ جو خط ہے اس کی عبارت یہ ہے:
>
> ''امتثال امر سے مجبور تھا تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کا ہے کو ہے واسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ کا کام ہے۔'' [1]

سوچنے کی بات ہے واقعات انیس کے چھپنے سے بہت پہلے سرورِ ریاض اور جلوہ خضر منظر عام پر آ چکی تھیں پھر بھی مہدی حسین احسن لکھنوی نے ایسی کہانی پیش کی۔

حیات انیس میں سید امجد علی اشہری نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ دراصل حالی اور احسن کے بیانات لوگ نقل کرتے گئے اور غلط فہمی بڑھتی گئی۔ بقول ثابت لکھنوی ''اشہری صاحب قابل معافی ہیں کیونکہ انھوں نے اعتراف کیا کہ انھوں نے مرزا دبیر کا پورا کلام دیکھا نہیں ہے اور اس کے دیکھے بغیر کوئی رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں۔'' [2]

میر انیس اور غالب کی ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر اکبر حیدری لکھتے ہیں:

---

۱ واقعات انیس- جدید ایڈیشن ص ۹۶

۲ حیات دبیر ص ۳۲۰

"مرزا غالب مقدمہ پنشن کے سلسلے میں جب ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں کلکتہ کے لیے سوار ہوئے تھے تو کچھ عرصے کے لیے انھوں نے لکھنؤ میں بھی قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں میر انیس فیض آباد میں تھے اور ان کی مرثیہ گوئی کی شہرت بھی اتنی نہ ہوئی تھی کہ مرزا غالب ان سے ملاقات کرتے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اس قسم کے بے بنیاد واقعات تراشنے سے میر انیس کے کمال شاعری میں کیا اضافہ ہوسکتا ہے۔ جو باتیں مرزا غالب سے میر انیس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ دراصل انھوں نے مرزا دبیر کے اعتراف کمال میں کہی تھیں۔"[1]

حیات دبیر میں بھی افضل حسین ثابت نے جلوۂ خضر اور سرور یاض کی بنیاد پر اس کی تردید کی ہے:

اسی طرح مفتی میر محمد عباس صاحب بھی مرزا دبیر کے مداح تھے۔ ان کے کمالات کو سعی دل سے مانتے اور داد تحسین دیتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

اے دبیر آسمان نظم و نثر نیست از فرمان تو حذابا

شاعر رنگیں بیان اہل بیت ذاکر بزم شہ گلگوں قبا

ہند با ہنگامۂ نظم تو گرم ورنہ بارد بود مثل ہند با

فکر بکرش در مخمس جلوہ کرد تا کشد شکل عروس دل ربا

طبع را، ایں طبع بخشد تازگی چوں نسیم دل کشا باد صبا

می برند ایں خمسہ را در شش جہت سبعہ سیارہ گوید مرحبا[2]

مرزا ہادی عزیز لکھتے ہیں:

"مفتی صاحب قبلہ بھی مرزا صاحب کی بلاغت کلام و رفعت مضامین کی بہت قدر کرتے تھے اور جس طرح میرانیس صاحب کے کلام کی وقعت مفتی صاحب قبلہ کی نگاہ میں تھی، اسی طرح مرزا صاحب کے کلام کی بھی بہت وقعت تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک سوال بھیجا تھا کہ یہاں لوگوں میں

---

۱ شاعر اعظم ص ۱۰۱

۲ تجلیات ص ۱۹۳ مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ نظامی پریس ۱۳۴۴ھ

> اختلاف ہے کہ میر صاحب کا مرتبہ شعر گوئی ونظم مرثیہ میں زیادہ بلند ہے یا مرزا صاحب کا۔ لہٰذا اس کا آپ فیصلہ کردیں۔ مفتی صاحب قبلہ نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا کہ کلام السید حلو فصیح و کلام المیرزا دقیق ملیح۔''[1]

مفتی میر محمد عباس نے اگر میر انیس کا کلام شیریں اور فصیح قرار دیا تو مرزا صاحب کے کلام کو دقیق ونمکین گردانا اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔

مولوی سید احمد حسن فرقانی[2] مرحوم رئیس میرٹھ نے نظم اور نثر دونوں میں مرزا دبیر کو صاحب کمال مانا ہے۔ مرزا دبیر کے متعلق ان کا ایک شعر ہے:

شنیدہ ایم کہ بر آسماں دبیری ہست   ندیدہ ایم بروئے زمیں ترا ثانی[3]

فرقانی صاحب کے خطوط جو انھوں نے مرزا دبیر کے نام لکھے ہیں، سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے کمال کے اس حد تک قائل تھے کہ عقیدت سی ہوگئی تھی۔ مرزا دبیر کے نام ان کے دو خط ''انشائے علامہ سید احمد حسن فرقانی'' میں چھپے ہیں۔ یہ کتاب ان کے فرزند مفتی سید کرار حسین روحانی نے شائع کروائی تھی۔ کتاب پر سن طباعت تو درج نہیں ہے البتہ اس کے آخر میں منشی سید کفایت علی صاحب کی تاریخ وفات بست چہارم جمادی الآخر سال یک ہزار و دوہست و ہشتاد و شش از ہجرت نبویہ دی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کے بعد چھپی ہے۔ اس میں سب سے پہلے، صفحہ اول سے ہی مرزا دبیر کے نام دو مکتوب ہیں جن کے اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

---

۱   تجلیات ص ۱۹۱ مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی - نظامی پریس ۱۳۴۴ھ

۲   یہ وہ بزرگوار ہیں جن پر ہندوستان کو اس طرح فخر کرنا چاہیے کہ جیسے ایرانی آج قاآنی پر فخر کرتے ہیں۔ فارسی اور اردو زبان میں لاجواب شعر کہتے تھے اور شعر فہمی میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے سخن شناس و قدرداں ہندوستان میں دبیر و غالب تھے اور ان دونوں کے کلام کے سمجھنے اور پرکھنے والے یہ بزرگوار تھے۔ چنانچہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جب کبھی ان دونوں صاحبوں کو اپنا کلام سنایا تو ایسی داد ملی کہ دل نے مزہ اٹھایا (حیات دبیر ص ۳۲۱)

۳   حیات دبیر ص ۲۳۱

نامہ ۱

''اسیر نوائب تخلص غائب احمد حسین سید الفرقانی عصمہ اللہ تعالیٰ بالسبع المثانی بہ شائبہ تکلف و ترسل دعوات بے ریا و تسلیمات باصفا بوقف نیاز سرور سرخیل صاحب کمالاں۔ صدر رو بر انجمن جادو مقالاں مظہر آباد امہات یگانہ عناصر وجہات سلامت علی میرزا المتخلص بہ دبیر دامت بدائع افکارہ ولازالت ضائع اشعارہ میرساند کہ ایں سرگشتہ را بحکم مناسبت ارواح از جملہ شاعران ہند ہموارہ با نام وکلام آں بدر تمام تعلق روحانی وتعشق پنہانی بر زیارت می بود......''[1]

نامہ ۲

''سلامیکہ مشکت و بان و عبیر بر اے صبا از رہے بہ دبیر ...... و ہمای فصاحت آں شہباز قلہ مجد و اعتلا بر تمامی روے زمین سایہ افگندہ پیوستہ آرزوئے ملاقات شریف می بود بعد ہشت سال در دہلی با جمعی پریشان و بداندیشان کہ آیہ سواہ محیاہم ومماتہم ساہ ما یحکمون وصف حال ایشانست، در بارہ افضلیت دار جحیت خدام بر جملہ شعرای ہند و تحسین دقائق ولطائف کہ در طی مراتی اوراج یافتہ مباحثہ و مناظرہ میرفت و عاقبت بحکم ''الحق البلغ'' گرفتہ ہای شان ہم بر ایشان گرفتہ می شد و از ایرادات شان بخوبی جواب دادہ می آمد۔ کہ موجب حیرت و استعجاب ہمکناں می گردید......''[2]

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فرقانی مرزا دبیر کے تئیں کتنی عقیدت و احترام رکھتے تھے۔

شیخ ناسخ اور مرزا دبیر

شیخ امام بخش ناسخ[3] بھی مرزا دبیر کے مداح تھے۔ اکثر مرزا دبیر کی مجلس سنتے تھے۔

---

۱ انشائے فرقانی۔ علامہ سید احمد حسن الفرقانی رئیس شہر میرٹھ، ص ۱

۲ انشائے فرقانی ص ۲

۳ شیخ امام بخش ناسخ کا سن ولادت اب تک معلوم نہیں ہوسکا البتہ خود ہی ایک شعر میں کہا ہے:

میر محمد رضا ظہیر شاگرد دبیر تنقید آب حیات میں لکھتے ہیں:

"میں ایک روز محلہ ٹکسال میں ایک مجلس پڑھنے گیا جو شیخ صاحب (ناسخ) کے پڑوس میں تھی۔ نصیرالدین حیدر کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک سامعین میں سے کوئی نہ آیا تھا۔ میں بانی مجلس سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک صاحب

(پچھلے صفحے سے جاری)

رہے کیونکر نہ دل ہر دم نشانہ ناوک غم کا کہ ہے میرا تولد ہفتم ماہ محرم کا۔ اس سے ۷ محرم تو ظاہر ہے مگر سن ولادت نہیں۔ انتقال ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں کیا۔ ان کے شاگرد رشید نے تاریخ کہی ہے جو کلیات رشک ص ۴۰۷ پر موجود ہے۔

وا دریغا کرد رحلت ناسخ معجز بیاں — انتقالش داد عالم را غم جانکاہ وائے
یک ہزار و دو صد پنجاہ و چارم سال بود — از محرم بود (کذا ۹۱ پنجمیں آں ماہ وائے
رشک روز مرگ و تاریخ و سنین و ماہ گفت — پنجمیں بود بست و چارم پنج شنبہ آہ وائے
(۲۴ رجمادی الاول یوم پنج شنبہ ۱۲۵۴ھ)

رشک کی کہی ہوئی ایک اور تاریخ:

ناسخ استاد رشک حسرت عمر — بود اے ہے بہ سال شصت و ہم
رشک تاریخ انتقال نوشت — مُرد اے ہے بہ سال شصت و ہم

جس میں انتقال کے وقت ناسخ کی عمر دی ہوئی ہے، سے ناسخ کا سن ولادت ۱۱۸۶ھ/۷۲-۱۷۷۲ء قرار پاتا ہے۔ اپنے وقت کے مشہور و مقبول شاعر تھے۔ کئی دواوین ان کی یادگار ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے امام مانے جاتے ہیں۔ دو مرتبہ لکھنؤ سے جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی سے، جن کے بزرگ کشمیری تھے، کسی وجہ سے ان بن رہی۔ ایک دفعہ ان کی ہجو کہی جس کا شعر یہ ہے:

روبہ صفت زہیبت ضیغم گریختہ — کاشو برائے پختن شلغم گریختہ

جب وہ لکھنؤ واپس آئے تو کہا: کاشو برائے خوردن شب دیگ آمدہ۔

ناسخ کو دوبارہ جلاوطنی اختیار کرنا پڑی اور آخر کار وزیر اعظم منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان کے انتقال کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور پھر یہیں انتقال ہوا لیکن مرنے کے بعد بھی حکیم مہدی کا پیچھا نہیں چھوڑا چنانچہ تاریخ کہی:

شب ولادت عیسیٰ بمرد ایں دجال

(ناسخ ج ا ڈاکٹر شبیہ الحسن ص ۹۶-۹۱ ناشر اردو پبلشرز لکھنؤ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء) تفصیل کے لیے اسی مقالہ کا مطالعہ فرمائیے۔

آئے مجھ سے مخاطب ہوکر بولے، تم کو جناب شیخ صاحب یاد فرماتے ہیں۔ میں پہنچا۔ دیکھا جناب شیخ ناسخ ایک کھاردے کی لنگی باندھے ہوئے ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ ادھر ادھر مونڈھوں پر خواجہ وزیر، میر علی، اوسط، رشک وغیرہ شاگرد حاضر ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔ بھئی محمد رضا تم تو مہینوں نظر نہیں آتے۔ میں نے عرض کی۔ کیا عرض کروں فرصت نہیں ہوئی، فرمایا۔ آج یہاں تم اپنے استاد کا کوئی نیا مرثیہ پڑھوگے۔ میں نے عرض کی۔ حضور ایسا ہی ارادہ ہے، فرمایا۔ افسوس گرمی بہت ہے مجلس میں شریک نہیں ہوسکتا، اچھا تم میرے حصہ کے ایک دو بند کسی مقام سراپا چہرہ کے...... میں نے اسی مرثیہ میں سے جو پڑھنے والا تھا، حسب ذیل ایک بند پڑھا:

کیوں مدِ نظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار — پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردم بیمار
ابرو کے قرینے سے کھلا چشم کا اسرار — ہیں نور کے گھوارے میں عیسیٰ خوش اطوار
یاں پنجۂ مریم کہوں پنجے کو پلک کے
گھوارے میں عیسیٰ کو سلاتی ہیں تھپک کے

یہ بند سن کر شیخ ناسخ اچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانے میں چلے گئے تین چار منٹ میں ایک کتاب لے کر آئے۔ فرمایا۔ دیکھو یہ ظہیر فاریابی کا دیوان ہے۔ ظہیر نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا اور پتلی سے عیسیٰ کو تشبیہ دی مگر وہ ثابت نہ کرسکا۔ مرزا نے کمال کیا ہے۔ پنجۂ پلک کو پنجۂ مریم کہہ کر ثابت کردیا۔
ع

گھوارے میں عیسیٰ کو سلاتی ہیں تھپک کے

پھر فرمایا کہ "سلامت علی سا طبیعت دار خلاق مضامین نہ ہوا ہوگا۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ لطیف تخیل یہی ہے کہ شاعر جو دعویٰ کرے اس کو ثابت کردے۔ کیا ثابت کیا ہے۔"[1]

---

1 تنقید آب حیات ص ٦-٥

خواجہ آتش اور مرزا دبیر

شیخ امام بخش ناسخ کے مدمقابل اس زمانے میں خواجہ حیدر علی آتش[1] تھے۔ ناسخ کا مزاج ایک تھا اور آتش کا دوسرا۔ دونوں کے مقابلے بھی ہوئے۔ ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کیا کرتے تھے۔ مگر مرزا دبیر کے کمالات کے دونوں معترف تھے۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

> ''آتش مرحوم تو شیخ ناسخ کی شہرت سن کر فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ ان کا زمانہ شہرت تو مرزا صاحب کے بھی بعد کا ہے۔ گو عمر میں یہ بھی مرزا صاحب سے بڑے تھے مگر ان کا اور مرزا صاحب کا خاندانِ شاعری ایک تھا۔ یہ بھی مرزا صاحب کی بہت قدر و عزت فرماتے تھے۔ ان کی شرکت مجلس کی کیفیت نانا مرحوم (محمد رضا ظہیر) یوں بیان فرماتے تھے کہ جس مجلس میں مرزا صاحب اشتہار دے کر اپنا غیر منقوط مرثیہ پڑھتے تھے، اس میں میر ضمیر مرحوم اور خواجہ آتش مرحوم بھی تشریف لائے تھے۔ سامنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ میں (ظہیر) نے بے نقط سلام پیش خوانی میں پڑھا تھا پھر مرزا صاحب نے یہ مرثیہ پڑھا تھا جس کا مطلع مشہور یہ ہے ''مہر علم سرور اکرم ہوا طالع'' بعد ختم

---

1 خواجہ حیدر علی نام- آتش تخلص تھا- باپ دہلی کے رہنے والے تھے- لکھنؤ میں جا کر سکونت پذیر ہوئے- خاندان خواجہ زادوں کا تھا- خاندان میں مسند فقیر بھی قائم تھی مگر آتش نے پیری مریدی کا سلسلہ چھوڑ کر شاعری کا سلسلہ شروع کیا- استعداد علمی زیادہ نہ تھی مگر مشق سے کلام کو رفعت بخشی اور مسلم الثبوت استاد ہوگئے- ناسخ سے چشمک تھی- خوب معرکے ہوئے مگر ان کے انتقال کے بعد شعر کہنا چھوڑ دیا- غزل کے دو دیوان ہیں- ایک ان کی زندگی میں چھپ کر مقبول ہوا اور دوسرا اس کے بعد مرتب ہوا- ۲۵ محرم ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء کو انتقال ہوا-

ان کا کلام گرمی جذبات اور تاثیر کے لحاظ سے بے مثال ہے- تصوف کے مضامین بھی نظم کیے ہیں- ساری زندگی آزادانہ روش سے کام لیا- کبھی کسی رئیس کی مدح نہیں کی- ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتے تھے اور اپنے حال میں مست تھے (آب حیات ص ۳۸۵-۳۸۷) جب مضامین کہنے میں سخت محنت کی تو خون اگلنے لگے تھے (سبع ثانی دیباچہ ثابت ص ۲۲)

مجلس خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر یہ کلمہ کہا تھا کہ یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ آپ کا حصہ ہے یا فیضی کی تفسیر سنی تھی یا آج یہ مرثیہ سنا۔“ [1]

آتش مرحوم کی قدر دانی کے متعلق ثابت نے ایک اور حکایت نقل کی ہے:

”مرزا احمد صاحب ظہور مغفور مجھ سے ناقل تھے کہ جس مجلس میں مرزا صاحب یہ مرثیہ پڑھے تھے جس کا مطلع یہ ہے: ”سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل“[2] اس میں خواجہ صاحب (خواجہ آتش) بھی تشریف فرما تھے۔ جب مرزا صاحب نے یہ بند اسپ جناب علی اکبرؑ کی شان میں جس کا نام عقاب تھا اور جو جناب رسول خداؐ کی سواری کا گھوڑا تھا، پڑھا:

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال　　　نکہ نکہ سے بدست اور جواں بخت و جواں سال
جادو کی نری آنکھ فقط معجزے کی چال　　　خورشید کے سم، برق کی دم، سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا
سرعت کا بدن، فہم کا دل، عقل کا سر تھا

خواجہ آتش مرحوم نے پکار کر فرمایا کہ بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے۔ کون کہتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو۔ تم سے بہتر زبان بھی کوئی دوسرا شاعر نہیں کہہ سکتا۔“[3]

منیر شکوہ آبادی[4] سنان دلخراش میں تحریر کرتے ہیں[5]:

”یہ اوس (اس) نامی مرثیہ کا مصرعہ[6] ہے جس کے سننے کو ضعف پیری و

۱　حیات دبیر ص ۴۳-۴۴
۲　یہ مرثیہ دفتر ماتم کی چھٹی جلد میں ہے
۳　حیات دبیر ص ۴۴-۴۵
۴　منشی اسماعیل صاحب منیر شاگرد دبیر کے تھے۔ ان کا مفصل حال آئندہ صفحات میں ملے گا۔
۵　منیر شکوہ آبادی نے دبیر و آتش کے بارے میں یہ واقعہ عبدالغفور نساخ کے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اور دلائل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔
۶　سوچے ہے مشقت مالایطاق ہیں (سنان دلخراش منیر شکوہ آبادی ص ۱۹۲) (اس مرثیہ کا مطلع ہے کو و رقیم پر جو علیؑ کا گزر ہوا)۔

نابینائی کے عالم میں حضرت آتش مرحوم نے زحمت گوارا کی تھی۔ ۱۲۵۹ھ میں (عہد ثریا جاہ امجد علی شاہ مذکور ہے) بعض بعض مضامین عالیہ اور نازک خیالیاں سن کر سر محفل آتش مرحوم پکار کے یوں کہتے تھے کہ ارے میاں تم مرجاؤ گے یا لہو تھوکو گے۔ امراء و روٴسا جو ناواقف تھے، یہ کلمہ سن کر تعجب سے کہتے تھے کہ یہ بڈھا آدمی کون ہے جو ایسے کلمات خلاف شان اس بے باکی سے کہتا ہے اور مرزا صاحب منبر پر آواز بلند تسلیم کرتے جاتے ہیں۔ بعد مجلس ایک صاحب دولت و محتشم نے ناچار ہو کر مرزا صاحب سے پوچھا کہ پیر و مرشد یہ شکستہ حال سا کون ہے۔ جب مرزا صاحب نے سمجھا دیا کہ حضرت آتش غزل کے استاد مسلم الثبوت ہیں۔" [۱]

میر ضمیر اور مرزا دبیر

میر ضمیر کی نظر میں بھی مرزا دبیر کا درجہ بہت بلند تھا اور وہ فخراً اپنے آپ کو استاد دبیر کہتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی (مرحوم) لکھتے ہیں:

"ضمیر کو اس پر فخر تھا کہ وہ دبیر کے استاد ہیں۔ چنانچہ ایک رباعی میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے　　اب کہتے ہیں استاد دبیر آیا ہے
کردی مری پیری نے مگر قدر سوا　　اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

مصرع چہارم میں دو معنی پیدا کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بوڑھا ضمیر آیا ہے اور دوسرا یہ کہ سب مرثیہ گو شعراء کا پیر و مرشد آیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دونوں معنی حقیقت پر مبنی ہیں۔ ضمیر سلسلۂ دبیر کے تمام شعراء کے پیر و مرشد ہیں لیکن چونکہ انیس و عشق وغیرہ نے بھی طرز ضمیر کی پیروی کی ہے اس لیے ان سلسلوں کے شعراء بھی ضمیر کو اپنا پیر ماننے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔" [۲]

۱　سنان دلخراش- قلمی منیر شکوہ آبادی ص ۱۹۴

۲　دبستان دبیر ص ۳۶-۱۳۵ ذاکر حسین فاروقی

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل کمال اور اہل علم حضرات مرزا دبیر کے کتنے مداح تھے۔ یہ تو ادبی شخصیتوں کی قدردانی تھی۔ دوسری طرف امراء و رؤساء بھی مرزا دبیر کے کلام پر جان چھڑکتے تھے۔ خود شہنشاہ واجد علی شاہ اختر دھوپ میں آپ کے سر پر سایہ کرنے کے لیے چتر سنبھالے رہے۔ صاحب شمس الضحیٰ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''روزے در مجلس بالای منبر بحضور اعلیٰ حضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتادناگاہ شامیانہ کہ بالای ممبر ہمچوابررحمت سایہ گستربود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسوشد وعکس آفتاب بر روئے آں جناب (مرزا دبیر) افتاد فی الفور ظل اللہ (بادشاہ واجد علی شاہ) چتر خود طلبیدہ و چوبش بدست خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن مانندالحق کہ رتبہ شناسی و تواضع اعلیٰ حضرت مخصوص بجناب ممدوح زائدازاں است۔''[1]

چنانچہ کلکتہ جب مرزا دبیر واجد علی شاہ کی دعوت پر آنکھوں کا علاج کروانے کے لیے تشریف لے گئے تو بادشاہ واجد علی شاہ نے نہ صرف شایان شان استقبال کیا اور ان کے آرام کا خود خیال رکھا بلکہ ان کی مدح میں ایک نظم پڑھی جس کا ایک مشہور شعر ہے:

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں میں کمسنی سے عاشق نظم دبیر ہوں[2]

میر ضمیر سے اختلافات

مرزا دبیر اور ان کے استاد میر ضمیر کے اختلافات کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اس میں یاران طریقت کی کارفرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ہم عصر شعراء نے مرزا دبیر کی شہرت اور ترقی کا حال دیکھا تو ان کے دل میں رشک ہی نہیں جذبۂ حسد پیدا ہوا۔ وہ مرزا دبیر کو زیر کرنے کے درپے ہوگئے۔ جہاں انشاء و مصحفی و آتش و ناسخ کے معرکے ہوئے ہوں وہاں مرزا دبیر کو اوروں سے لڑوانا بھڑوانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۶۶

۲ شمس الضحیٰ ص ۱۶۶ (اس کے جواب میں مرزا دبیر نے کھڑے ہوکر کہا تھا ع "تعظیم کلام کو دبیر اٹھا ہے")

''لوگ گھات میں لگے ہوئے تھے خصوصاً وہ بعض شاگردان میر ضمیر
صاحب جو مرزا صاحب سے پہلے کے شاگرد تھے اور اب پیچھے رہ گئے تھے۔
حسد کا تازیانہ لگا کر اپنے فرس فراست کو آگے نکالنا چاہتے تھے۔'' [1]

مگر مرزا دبیر سنجیدہ متین اور ذہین تھے کامیاب نہ ہونے دیا پھر بھی ان کے استاد میر ضمیر کو مرزا دبیر کے خلاف اس طرح بھڑکایا کہ دونوں میں خلیج پیدا ہوگئی اور تعلقات کچھ وقت کے لیے کم ہوگئے مگر یہ نہیں کہ انشاء اور مصحفی کی روایات کو زندہ کیا جاتا بلکہ بالکل مہذبانہ طور پر خاموش رہے اور اپنے استاد میر ضمیر کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کی۔ کسی تذکرہ نگار نے مرزا دبیر کی نسبت ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے سوائے محمد حسین آزاد کے کہ وہ لکھتے ہیں:

''شاگردان الٰہی کی طبیعت بھی جذبۂ الٰہی کا شوق رکھتی ہے۔ بچپن سے دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر استاد کی اصلاح پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے مگر بوڑھے ہوگئے تھے ان کے پاس چلے گئے وہ اس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ انھوں (مرزادبیر) نے عرض کی کہ حضرت اس شعر میں میں نے تو یہ کہا ہے اور استاد نے یہ اصلاح دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ استاد نے ٹھیک اصلاح دی ہے۔ انھوں نے پھر کہا کہ حضرت کتابوں میں تو اسی طرح آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ جو تمھارے استاد نے بنایا ہے وہی درست ہے۔ انھوں نے پھر عرض کی کہ حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ارے تو کتاب کو کیا جانے! ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے! ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اٹھے یہ بھاگے انھیں بھی ایسا جوش تھا کہ دروازہ تک ان کا تعاقب کیا۔'' [2]

صاحب تنقید آب حیات نے اس کی تردید کی ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ ناسخ تو مرزا دبیر کے مداح تھے اور ان کی معنی آفرینی اور خلاق طبیعت کی

---

۱ حیات دبیر جلد ۱ ص ۲۰۲

۲ آب حیات ص ۵۳۷

تعریف کرتے تھے۔ ان کی مجلس سننے کے لیے آتے تھے۔ اس سلسلہ میں منیر شکوہ آبادی تحریر کرتے ہیں:

''نواب حسین علی خاں[1] اثر بڑے مال دار نواب، قدردان دوست گیر اہل کمال و شعراء تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ اکثر شعراء کو انعام دیتے تھے۔ مجلس عزا زمانۂ چہلم میں بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ مرزا دبیر کو پڑھواتے تھے۔ ناسخ مرحوم صرف ان کے یہاں مرزا مرحوم کو سننے آتے تھے اور ادب سے چپ چاپ سن کر جو مضمون نیا ہوتا اس کی داد بآواز بلند دیتے تھے۔ ناسخ مرحوم کے مرنے کے بعد جب میر انیس مرحوم فیض آباد سے آ کر لکھنؤ میں پڑھے، میر خلیق نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب ایک دن میر انیس دوسرے دن مرزا دبیر چہلم بھر ان کے یہاں پڑھتے تھے، یہ ہزاروں روپیہ نذرانہ دیتے تھے۔''[2]

منیر شکوہ آبادی اور میر محمد رضا ظہیر کے بیانات صاحب آب حیات کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں اور یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ ابتدائے مشق میں مرزا دبیر کو اپنے استاد میر ضمیر سے اختلاف ہوا اور وہ ناسخ کے پاس چلے گئے اور ناسخ ان کے پیچھے لکڑی لے کر دوڑے۔

اس سلسلہ میں دوسری حکایت صاحب آب حیات نے یہ لکھی ہے:

''لکھنؤ کے اڑانے اور چمکانے والے غضب تھے۔ آخر مرزا کا عالم شباب تھا اور کمال بھی عین شباب پر تھا کہ جوانی کا بڑھاپے سے معرکہ ہوا۔ نواب شرف الدولہ[3] میر ضمیر کے بڑے قدرداں تھے۔ ان سے ہزاروں روپے

---

۱ نواب حسین علی خان اثر (نواب مہدی علی خاں وزیر کے برادر عینی تھے جن کے ساتھ ناسخ کا اختلاف تھا)، ناسخ کے شاگرد تھے۔ اگر دبیر اور ناسخ کا آپس میں اختلاف ہوتا تو وہ دبیر کو مجلس پڑھنے کے لیے نہیں بلاتے۔ وہ زمانہ ایسا تھا جبکہ استاد کی خوشنودی کو ہر بات پر مقدم سمجھا جاتا تھا (ناسخ: ڈاکٹر شبیہ الحسن ص ۱۹۲)

۲ سنان دلخراش۔ قلمی، غیر مطبوعہ ص ۸۷

۳ ثابت لکھنوی نے امیر کبیر افتخار الدولہ لکھا ہے جو پہلے ہندو تھے اور راجہ میوہ رام نام تھا بعد میں مسلمان ہو گئے اور شیعہ مذہب اختیار کیا۔ آخر الامر کربلائے معلی میں جا کر روضہ اقدس کے کلید بردار ہو کر وہیں انتقال کیا۔ حیات دبیر ص ۳۲

کے سلوک کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کے سبب سے اور پھر مرزا کے جواہر کمال کے باعث سے ان کی بھی قدردانی کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اول مرزا بعد ان کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے۔ ایک موقع پر مرزا نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے ع

دستِ خدا کا قوت بازو حسین ہے[1]

میر ضمیر کے سامنے جب اصلاح کے لیے پیش کیا تو انھیں اس کے نئے خیالات اور طرز بیان اور ترتیب مضامین پسند آئی۔ اسے توجہ سے بنایا اور اسی اثنا میں نواب کے ہاں ایک مجلس ہونے والی تھی۔ شاگرد رشید سے کہا کہ بھئی اس مرثیہ کو ہم اس مجلس میں پڑھیں گے۔ یہ تسلیم کر کے آداب بجالائے اور مرثیہ انھیں کو دے دیا۔

گھر میں آئے تو بعض احباب سے حال بیان کیا۔ مسودہ پاس تھا۔ وہ بھی سنایا۔ کچھ تو یاروں کا چکانا کچھ اس سبب سے کہ ذوق و شوق کے پھول ہمیشہ شبنم کی تعریف کے پیاسے ہیں اور نواب کو خبر پہنچ گئی تھی ادھر کے اشاروں میں انعام کی ہوا آئی۔ غرض انجام یہ ہوا کہ استاد مرثیہ صاف کر کے لے گئے کہ وہی پڑھیں گے۔

بموجب معمول کے اول مرزا صاحب منبر پر گئے اور وہی مرثیہ پڑھا بڑی تعریفیں ہوئیں اور مرثیہ خوب سرسبز ہوا۔ استاد کہ ہمیشہ شاگرد کے پڑھنے پر باغ باغ ہوا کرتے تھے اور تعریفیں کر کے دل بڑھاتے تھے اب خاموش بیٹھے ہیں، کچھ غصہ بے وفائی زمانہ کا خیال، کچھ اپنی محنتوں کا افسوس اور فکر یہ کہ اب میں پڑھوں گا تو کیا پڑھوں گا اور اس سے بڑھ کر کیا پڑھوں گا جس میں استاد کا رتبہ بڑھے نہیں تو اپنے درجہ سے گرے بھی تو نہیں۔ غرض ان کے بعد یہ پڑھے اور کمال کی دستار صحیح سلامت لے کر منبر سے اترے لیکن اس دن سے دل پھر

---

[1] ثابت لکھنوی لکھتے ہیں کہ اس مرثیہ کا مطلع تھا:

''ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا'' حیات دبیر جلد ۱ ص ۳۳

گیا۔ یار لوگوں نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کر کے بجائے خود استاد بنایا اور وہی صورت ہوگئی کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہوگیا۔ زمانے میں اپنے قاعدے کے بموجب چند روز مقابلوں سے شاگرد کا دل بڑھایا اور آخر بڑھاپے کی سفارش سے استاد کو آرام کی اجازت دی۔" [1]

صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

"وہ (مرزا دبیر) خوش تقریر طرہ دستار میر ضمیر ہے۔ استاد میں اور اس میں جو بے تکلفی ہے ایک بزرگ کی زبانی مختصراً سے بیان کرتا ہوں۔ اس نے یہ مرثیہ کہا 'ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا' اصلاح کے واسطے استاد کی خدمت میں لے گیا کچھ کہیں نہ بنایا اور بہت پسند فرمایا۔ پہلی روایت تو یہ ہے کہ میر صاحب نے اس سے کہا کہ یہ مرثیہ ہمیں دو اور مناسب ہوگا تو راجہ میوہ رام کی مجلس میں دو چار بند اس کے ہم پڑھیں گے۔ دبیر نے اس مرثیہ کی دو نقلیں لیں ایک اپنے پاس رکھی اور ایک بھیج دی۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ میر ضمیر صاحب نے اس سے کہا کہ اس مرثیہ کو (راجہ) میوہ رام کی مجلس میں نہ پڑھنا۔ قصہ کوتاہ جب مجلس کا دن آیا۔ میر صاحب مع دبیر تشریف فرما ہوئے۔ مجلس کے گداز کرنے کو دبیر سے کہا، منبر پر جاؤ اور کچھ پڑھو مگر وہ مرثیہ نہ پڑھنا۔ اس حق ناشناس نے سامعین کو ہمہ تن اشک دیکھ کر وہی مرثیہ شروع کیا۔ میر صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے کہا کہ اس سے کہہ دو کہ کیا حرکت ہے خیر اگر اس مرثیہ کو پڑھا ہے تو علی الترتیب نہ پڑھ وہ بھی نہ مانا، تمام و کمال مرثیہ پڑھا۔ تعریف و رقت ایسی ہوئی کہ کسی کے ہوش بجا نہ رہے اور خاتمہ مجلس کا اسی پر ہوا۔ میر ضمیر نے راجہ کے کہنے سے دو چار بند کسی مرثیہ کے پڑھے اور نہایت بے مزہ منبر سے اترے۔ پڑھنا میوہ رام کی مجلس میں اور ملاقات دبیر کو برابر ترک کیا۔ اس نقل سے تنگ حوصلگی دبیر کی ظاہر ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔" [2]

---

۱ آب حیات۔ محمد حسین آزاد ص ۵۲۸-۵۲۷

۲ تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔ مولفہ سعادت خاں ناصر، مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ ص ۲۸۳-۸۴

مصنف تنقید آب حیات میر محمد رضا مرحوم کے حوالے سے افضل حسین ثابت بیان کرتے ہیں:

''مرزا دبیر کے حاسدوں نے سوچا کہ استاد اور شاگرد میں بگاڑ پیدا کرنا چاہیے تاکہ مرزا دبیر بے اصلاحی کلام پڑھیں اور قلعی کھلے اور ہم کو اعتراض کا موقع ملے۔''[1]

ثابت آگے لکھتے ہیں:

''یہ لوگ مرزا صاحب کے کلام کی تمام خوبیاں میر ضمیر صاحب کی اصلاح کی بدولت سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک دریادل امیر کبیر افتخارالدولہ مرحوم نے جن کے یہاں شبوں کی مجلسوں میں جو ۱۹-۲۰ اور ۲۱رمضان کو ہوتی تھیں اول مرزا دبیر بعد کو میر ضمیر پڑھا کرتے تھے دونوں صاحبوں سے انیسویں کو اصرار بلیغ کیا کہ اکیسویں کو آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہہ کر پڑھیں۔ دونوں صاحبوں نے جواب میں ''انشاء اللہ'' اور ''بشرط فرصت'' کے معمولی الفاظ کہہ کر وعدہ کرلیا۔ مرزا صاحب کی مشق سخن ان کے شباب کی طرح زوروں پر تھی۔ رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع روشن ومشہور یہ ہے ع

ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا

بیسویں کو حسب معمول علی الصباح میر ضمیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا حضور نے کچھ فکر فرمائی۔ فرمایا مجھ کو اتنی فرصت کہاں۔ ایک مرثیہ پہلے کا کہا ہوا ہے یہ اسی میں مطلع اور نئے کچھ بند کہہ کر لگالیے ہیں وہی پڑھوں گا۔ مرزا صاحب نے اپنا نیا مرثیہ پیش کیا۔ اس کی زبان سلیس، بندش چست، بیان دلکش، شوکت الفاظ موثر وغیرہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تعریف کی۔ مرزا صاحب نے عرض کی۔ یہ سب حضور ہی کا فیض اور تصدق ہے۔ اسے آپ پڑھیں۔ میں کچھ عذر کردوں گا۔ میر ضمیر صاحب نے انکار کیا۔ میر عابد علی

---

[1] حیات دبیر ص ۳۲

صاحب بشیر[1] شاگرد میر ضمیر، یہ بزرگوار بھی مرزا صاحب کے حاسدوں میں تھے۔ بولے میں مرزا صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے شک یہ بات نامناسب ہے کہ شاگرد نیا مرثیہ پڑھے اور استاد پرانا۔ میر ضمیر صاحب بولے۔ میرا صاحب[2] ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ خیر تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔ پھر ایک مرتبہ وہ مرثیہ دیکھ کر کہا کہ اچھا اوپر کا ٹکڑا جس میں فضائل ہیں تم پڑھو اور وہاں پر نشان بھی کر دیا۔ اخیر کا حصہ جس میں مصائب ہیں میں پڑھوں گا۔ مرزا صاحب بولے بہت خوب۔ جہاں تک استاد نے حکم دیا تھا وہ ورق پھاڑ لیے باقی مرثیہ وہیں چھوڑ آئے۔ اکیسویں کو دونوں صاحب مجلس موصوف میں شریک ہوئے۔ افتخارالدولہ نے اول مرزا صاحب سے کہا..... نیا مرثیہ پڑھیے۔ انھوں نے کہا کہ جناب استاد قبلہ مدظلہ کا نو تصنیف مرثیہ ہے۔ نصف میں پڑھوں گا۔ نصف جناب استاد پڑھیں گے یہ کہ کر منبر پر گئے۔ حسب معمول دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے ادھر میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر صاحب سے سرگوشی کی اور کہا اول کا ٹکڑا بہت چست اخیر کا سست ہے۔ میں مرزا صاحب کو منع کیے دیتا ہوں کہ یہ مرثیہ نہ پڑھیں اور کوئی مرثیہ پڑھ دیں۔ میر صاحب نے فرمایا۔ اب یہ مناسب نہیں مگر یہ کب مانتے تھے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی آنکھ سے اشارہ کر چکے تھے کہ ذرا ٹھہریئے۔ وہ منبر پر چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجلس تصویر حیرت بنی ہوئی ہے۔ سناٹے کا عالم ہے کہ میر بشیر نے قریب منبر پہنچ کر مرزا صاحب کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جاکر آہستہ آہستہ کہا کہ استاد فرماتے ہیں 'تم کوئی اور مرثیہ پڑھ دو'۔ مرزا صاحب نے کہا میں اور کوئی مرثیہ نہیں لایا۔ بایں ہمہ اگر استاد کی یہی مرضی ہے تو وہ خود

---

۱ میر عابد علی بشیر پہلے میر ضمیر کے شاگرد تھے بعد میں استاد کے کہنے پر دبیر کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ مرزا دبیر کی زندگی کے اس اہم واقعہ یعنی استاد سے اختلاف کے ذمہ دار یہی بشیر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مہکی مرثیے کہتے تھے۔ ادبی خوبیاں ان کے کلام میں کم ہی پائی جاتی ہیں (دبستان دبیر- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم ص ۴۱۵-۴۰۰)۔

۲ حیات دبیر ص ۳۴ ''میرا صاحب میر ضمیر کا سخن تکیہ تھا۔''

مجھے آنکھ سے اشارہ فرمادیں میں رباعیاں پڑھ کر منبر سے اتر آؤں گا تمھارے کہنے کا مجھے اعتبار نہیں۔ انھوں نے میر ضمیر صاحب کے کان میں آ کر کہا سلامت علی کہتے ہیں آج ہی تو مجھ کو استاد کا امتحان منظور ہے۔ دیکھوں میرے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ میر ضمیر صاحب یہ سن کر آگ بگولہ ہوگئے۔ ادھر مرزا دبیر صاحب ناکردہ گناہ بار بار استاد کا منھ دیکھتے ہیں وہاں اشارہ کیسا برافروختگی کی وجہ سے سرزانو پر ہے۔ ناچار مرزا صاحب نے کچھ دیر کے بعد چند رباعیاں پڑھ کر وہی نیا مرثیہ شروع کیا۔ سامعین نے تعریفوں کے پھول نثار کیے۔ سبحان اللہ واہ واہ۔ صل علیٰ ماشاء اللہ کے نعروں سے تمام مجلس گونج اٹھی۔ جہاں تک استاد کا حکم تھا، پڑھے۔ آگے نہ بڑھے۔ منبر سے اترے۔ میر صاحب تشریف لے گئے۔ فاتحہ پڑھ کر یہ فرما کر یہ مرثیہ انھیں کا ہے کسی پرانے مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اتر آئے۔
مجلس کے بعد دو خلعت آئے۔ میر ضمیر صاحب کا غصہ اس وقت تک نہ اترا تھا۔ اپنے خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا۔ اٹھالے جاؤ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب نے یہ کہہ کر جو استاد کے فائدے پر اپنے فائدے کو مقدم رکھے وہ ملعون ہے۔ اپنا خلعت بھی پھیر دیا۔ دوسرے دن صبح کو حسب معمول استاد کی خدمت میں پہنچے کہ حقیقت حال معلوم ہو۔ انھوں نے کم التفاتی فرمائی۔ پھر شب کو میر ضمیر صاحب کے یہاں شریک ہوئے تو وہاں میر عابد علی بشیر اور ان کے ساتھیوں نے آوازے پھینکنا شروع کیے۔ مگر مرزا صاحب نے صبر و تحمل کو کام فرمایا۔ بعد ختم مجلس مع اپنے شاگرد میر ظہیر کے جو اس کے راوی ہیں اپنے گھر چلے۔ راستہ میں میر ظہیر سے کہا۔ بھئی تم نے ان کی باتیں سنیں، ظہیر بولے۔ جناب اگر آپ تھوڑی دیر اور بیٹھے رہتے تو مجھ سے کسی نہ کسی سے تلوار چل جاتی۔ دانتوں کے تلے انگلی دبا کر فرمایا، توبہ کرو۔ استاد کے گھر میں ایسی جسارت تم کو اتنی سی بات پر غصہ آگیا۔" [1]

---

1 حیات دبیر ص ۳۵-۳۶

شاد عظیم آبادی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''بالاتفاق سنا کہ جس مجلس میں میر ضمیر نیا مرثیہ کہہ کر پڑھا کرتے تھے دو مہینے باقی تھے کہ میر ضمیر کی صاحبزادی جن کی عمر چار پانچ برس کی تھی طویل علالت کے بعد قضا کر گئیں۔ میر ضمیر کو اس لڑکی سے غیر معمولی محبت تھی یہاں تک اس کے مرنے کا اثر ہوا کہ گھر چھوڑ کر کسی دوست کے گھر گومتی پار اٹھ گئے۔ ان دنوں مرزا صاحب نے ایک مرثیہ کہنا شروع کیا تھا جس کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ اگر یہ مرثیہ اسی طرح پورا ہوا تو لاجواب ہوگا۔ میر ضمیر نے اس صدمہ تازہ کے سبب سے بجز مرزا صاحب سب کی اصلاحیں بند کردی تھیں۔ جوں جوں مقررہ مجلس کی تاریخ قریب آتی جاتی تھی، میر ضمیر کو نئے مرثیے کے انجام پانے سے مایوسی ہونے لگی۔ آخر سوچے کہ مرزا صاحب کا ہی مرثیہ کسی طرح پورا ہوجائے تو اب کے اسی کو پڑھوں چنانچہ مرزا صاحب پر بھی ظاہر کیا۔ مرزا صاحب کو بھی بے حد خوشی ہوئی۔ مرزا صاحب بھی پہلے سے زیادہ دل لگا کر مرثیہ کہنے لگے۔ میر ضمیر نے بھی کوئی دقیقہ اصلاح کا اٹھا نہ رکھا۔ غرض بہ ہمہ خوبی مرثیہ مرتب ہوگیا۔ مرثیہ کی لکھنؤ بھر میں شہرت ہوگئی کہ اب کے مرزا دبیر نے لاجواب مرثیہ کہا۔ مجلس کی بھی تاریخ آگئی۔ کہا جاتا ہے کہ میر ضمیر نے مرزا صاحب پر تاکید کردی تھی کہ تم یہ مرثیہ لیے مجلس میں موجود رہنا۔ میرے ہمراہ کوئی کلام نہ آئے گا۔ میں صرف اسی مرثیہ کو پڑھوں گا..... الغرض مرزا صاحب مرثیہ لے کر مجلس میں پہنچے ہوئے تھے اور کثرت سامعین سے مجلس میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اتنے میں میر ضمیر فینس میں سوار پہنچے۔ کچھ دیر بعد صاحب خانہ نے ہاتھ باندھ کر آغاز مجلس کی اجازت چاہی۔ خدا جانے سوزخوانی بھی ہوئی[1] یا نہیں مگر پیش خوانی کے لیے میر ضمیر کا حکم پاکر مرزا دبیر منبر پر گئے اور وہی مرثیہ شروع کردیا جس کو خود میر ضمیر پڑھنے والے تھے۔ تعریفوں کے مارے چھتیں پھٹنے لگیں۔ ایک تو لوگوں کا اصرار کہ اور پڑھیے دوسرے اس موقع

---

1. اصل متن میں 'ہونا چاہیے' درج ہے۔

پر ضبط بے حد مشکل۔ غرض کہ پورا مرثیہ ختم کیا۔ گریہ و بکا بھی خاطر خواہ ہوئی اور مجلس میں دم باقی نہ رہا۔

میر ضمیر کی یہ کیفیت کہ سر جھکائے خاموش و متحیر و منزجر بیٹھے ہیں۔ اب چاروں طرف سے یہی اصرار ہونے لگا کہ حضور ہی کے اشتیاق میں ساری مجلس بیٹھی ہے۔ اٹھے اور منبر پر گئے۔ ایک پرچہ تک پاس نہیں، خوش بیان لسان بہت تھے فرمایا کہ صاحب اس دفعہ مجھ پر ایسی سخت مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ میں نیا مرثیہ نہ کہہ سکا۔ پھر اس معصومہ صاحبزادی کی نیک خصالی، بھولی بھالی باتیں، اس کے متعلق دل پذیر حکایتیں، اس کی سخت بیماری میں اس کا استقلال، صبر وغیرہ کی حالت کو ایسے لب ولہجہ میں بیان کرنے لگے کہ لوگ محو حیرت ہو گئے اور مجلس تازہ دم ہوگئی جو شعر مناسب حال تھے ضم کرتے گئے مآل کار مجلس پر نظر کر کے حضرت معصوم سکینہ کا جوڑ لگا دیا۔ ساری مجلس چلانے لگی۔ روتے روتے کسی میں دم باقی نہ رہا۔ آپ اتر آئے اور مارے صدمے کے سیدھے فینس پر سوار ہو گئے۔ میر صفدر علی، میر ضمیر کے داماد تو بہت سخت الفاظ سے اس واقعہ کو دہراتے تھے مگر جو مرزا صاحب کی طبیعت سے آگاہ ہے وہ ہرگز مرزا صاحب پر اس فعل کے عمداً سرزد ہونے کا گمان نہ کرے گا۔"[1]

شاد عظیم آبادی نے یہ واقعہ لکھتے ہوئے اپنی طرف سے کہہ دیا ہے کہ یہ ان کا سنا سنایا واقعہ ہے اور مرزا دبیر کے ساتھ ان کی اس پر کبھی گفتگو نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس ثابت نے اپنے نانا میر محمد رضا ظہیر سے اس کو سنا ہے جو مرزا دبیر کے بہت ہی قریب رہے ہیں۔ اس لیے میر ظہیر کی یہ حکایت صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس مجلس کا انھوں نے حوالہ دیا ہے وہ مجلس اکیسویں رمضان کی تھی اور مرثیہ: ''ذرہ ہے آفتاب[2] در بوتراب کا'' اس شب کے مطابق ہے۔ آزاد کا یہ کہنا بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا دبیر نے اپنے استاد سے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ مرزا دبیر کے حسنِ اخلاق اور احترام استاد کے جذبہ کے منافی ہے۔

---

۱ پیمبران سخن ص ۳۷-۱۳۴

۲ سعادت خان ناصر نے بھی یہی مرثیہ اس سلسلے میں بتایا ہے (تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۸۳)

استاد سے عقیدت

اپنے استاد ضمیر سے انھیں گہری عقیدت تھی چنانچہ ان کی وفات پر مرزا دبیر نے اس حقیقت کا اظہار یہ کہہ کر کیا ہے:

آفاق سے استادِ یگانہ اٹھا ۔۔۔ مضموں کے جواہر کا خزانہ اٹھا
انصاف کا نوحہ ہے یہ بالائے زمیں ۔۔۔ سرتاجِ فصیحانِ زمانہ اٹھا

مرزا دبیر کا ایک اور بند بھی استاد کے متعلق ملاحظہ ہو:

معنی ضمیر اہل زباں سے نہیں اخفا ۔۔۔ روشن ہے دلوں پر شرفِ نام سراپا
ہیں غیر بھی جو پیر و نظم ان کے میں سمجھا ۔۔۔ یعنی کہ سخن سب کو پسند آتا ہے دل کا
شاہِ ضمیر اوج پہ ہے ملکِ سخن میں
جس شکل سے دل حاکمِ اعضاء ہے بدن میں

استاد سے صلح و صفائی

استاد کی برافروختگی جب برابر قائم رہی اور انھوں نے التفات نہ کیا تو مرزا دبیر بغیر اصلاح کے پڑھنے لگے مگر صاحب آب حیات کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ناسخ کے پاس گئے کیونکہ استاد کی ان کے دل میں عظمت اب بھی وہی تھی۔ بقول ثابت لکھنوی میر ضمیر اور ناسخ کی آپس میں چشمک تھی، اس لیے وہ کبھی ناسخ کے پاس نہیں گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کی پیدائش ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) کی ہے اور اس پر سب ہی متفق ہیں کہ گیارہ بارہ برس کی عمر یعنی ۱۲۲۹ھ ۱۲۳۰ھ کا زمانہ تھا کہ مرزا دبیر میر ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ ادھر مشق سخن کرتے رہے اور ادھر تحصیل علوم میں لگے رہے۔ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں نواب اودھ کو شاہ کا خطاب ملا اور نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا دبیر مرثیہ گوئی میں استاد شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ فسانہ عجائب سے یہ ثابت ہے کہ مرزا دبیر کی کافی شہرت اس زمانہ میں ہوچکی تھی۔ ضمیر، خلیق، فصیح، دلگیر وغیرہ کے ساتھ ان کا نام آنا ہی اس کا کافی ثبوت ہے۔ ادھر بقول آزاد، ناسخ خود کہتے ہیں کہ میں میر تقی میر کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے کر گیا مگر اصلاح نہ دی۔ اس

لیے میں غزل کہہ کر چند روز بعد اسے پھر دیکھتا تھا اور خود ہی اصلاح دیتا تھا۔ انشاء جرأت، مصحفی سب کو مشاعرہ میں سنتا تھا مگر خود کچھ نہ کہتا تھا۔ بعد میں جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا تو میں مشاعرے میں پڑھنے لگا۔ یعنی مصحفی کی وفات کے بعد یا ان کے آخری ایام میں ناسخ نے مشاعروں میں غزلیں پڑھنا شروع کیں۔[1] عالم و فاضل تھے۔ فن پر قدرت تھی اور فن شعر سے طبیعت کی مناسبت تھی جلدی شہرت پائی۔ مصحفی کا سال وفات[2] ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کی شہرت کا زمانہ ۱۲۳۵ھ سے ۱۲۴۰ھ تک کا ہے اور یہی زمانہ مرزا دبیر کی شہرت اور ترقی کا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ مرزا دبیر کی عمر اس زمانہ میں ۱۷ سے ۲۲ برس تک کی تھی اور ناسخ کی عمر اس وقت چالیس پچاس برس رہی ہوگی۔ اس لیے آزاد کا یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ ناسخ نے مرزا دبیر کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ ایک صاحب استعداد شاعر اپنے مشہور معاصر شاعر کے ساتھ بلا سبب کیوں ناروا سلوک کرے گا۔[3]

مرزا دبیر کے وہ مرثیے بھی جو انھوں نے بغیر کسی اصلاح کے پڑھے کافی مقبول ہوئے۔ صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں:

> ''چند سال کے بعد مرزا صاحب (مرزا دبیر) کی شہرت کمال کا آفتاب اطراف عالم میں چمک گیا۔ ایک دن وزیر اودھ نواب علی نقی خاں مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نیا مرثیہ پڑھنے کے لیے منبر پر تشریف لے گئے۔ اس مجلس میں بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک تو وزیر اودھ کی مجلس جو مثل شاہ اودھ مرزا صاحب کے قدرشناس و فدائی تھے۔ دوسرے مرزا صاحب کا پڑھنا۔ گویا تمام شہر کے شہزادے، نواب زادے، عمائد، اہل کمال، سخن ور، سخن شناس، سخن سنج لوگوں کا

---

۱ آب حیات ص ۴۶-۳۴۵

۲ ڈاکٹر گیان چند جین نے مصحفی کا سال وفات ۱۸۲۰ء/۱۲۳۶ھ سے ۱۸۲۲ء/ ۱۲۳۸ھ بتایا ہے۔ (اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۳۳۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۹ء) ڈاکٹر اکبر حیدری نے مرزا نظر علی نظر (شاگرد مصحفی کے قطعہ تاریخ وفات سے مصحفی کا سال وفات ۱۲۴۰ھ بتایا ہے۔ (تحقیقی نوادر ص ۱۶۳ ناشر اردو پبلشرز لکھنؤ، ستمبر ۱۹۷۴ء)

۳ حیات دبیر ص ۴۱-۳۹

مجمع تھا۔ جناب میر ضمیر صاحب بھی تشریف لائے تھے جو غالبًا بانی مجلس کی طلب پر تشریف لائے ہوں گے۔ اس مجلس میں تمام شہزادے اور جلیل القدر حکام مع حضور عالم وزیر اودھ شہ نشین پر تھے۔ اول ایک نظر سے مرزا صاحب نے تمام حاضرین کو دیکھا پھر بآواز بلند فرمایا کہ حضرات یہ مجلس کسی بادشاہ دنیا کا دربار نہیں بلکہ شہنشاہ دین و دنیا کا دربار دُربار ہے۔ آپ حضرات جو شہ نشین پر ہیں بے تکلف ہوکر زیرِ منبر تشریف لائیں۔ اب کس میں طاقت تھی جو تعمیلِ حکم نہ کرتا۔ حضور عالم نے سبقت فرمائی۔ ان کے پیچھے پیچھے تمام شہزادے اور عمائد زیرِ منبر آبیٹھے۔ مرزا صاحب نے چند رباعیاں اور چند شعر سلام کے پڑھ کر یہ مرثیہ پڑھنا شروع کیا جس کا مطلع روشن مشہور یہ ہے:

"اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق" [1]

حاضرین نے تعریفوں کے پھول نچھاور کیے۔ حضور عالم نے جب ایک موقع پر بآواز بلند بہت تعریف کی تو مرزا صاحب نے میر ضمیر صاحب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ سب تصدق اور فیض جناب استاد کا ہے۔ مرثیہ ختم ہونے پر مرزا صاحب منبر سے اترے تو میر ضمیر صاحب نے اٹھ کر گلے لگایا وہیں سے مرزا صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ سب اگلی پچھلی باتیں دہرائی گئیں۔ میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب بولے۔ اب یہ شخص اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے۔ مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کی کہ ان کی خطا بھی میری خطا کے ساتھ ہی معاف فرمایئے۔ میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا اور کچھ نادم ہوئے پھر کوئی رنجش باقی نہ رہی۔ [2]

مرزا دبیر کا اندازِ خواندگی

مرزا دبیر کا پڑھنے کا انداز بھی ان کے کلام کی طرح منفرد تھا۔ لوگ جہاں ان کے

---

۱ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی ساتویں جلد میں چھپا ہے۔ پہلا مطلع ہے:
"قرآں سے فضیلت درِ دُرجاں کی عیاں ہے"

۲ حیات دبیر ص ۳۸-۳۷

کلام پر جان چھڑکتے تھے وہاں ان کے طرز ادا پر بھی فدا تھے۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

''جوش معرفت میں سینے کے زور سے پڑھتے تھے اور مجلس میں جب بھی پڑھنے کو جاتے تھے وضو کر کے جاتے تھے۔ اکثر باوضو مرثیہ پڑھتے تھے۔ آواز بھاری اور پاٹ دار تھی۔ فطرتی طور پر کہیں خود بخود ہاتھ اٹھ جاتا تھا تو اٹھ جاتا تھا ورنہ منبر پر بیٹھ کر بتلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے۔ آنکھ اور ابرو کا اشارہ بھی اسی قدر تھا جتنا باتوں میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ارتھ موسیقی میں داخل ہیں۔ مگر سوزخوانی میں بھی بتانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ پس مرثیہ خوانی سے بتانے کو کیا علاقہ ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اس مضمون کو وہ کہہ بھی گئے ہیں:

ناحق کا نہ چیخنا نہ چلانا ہے　　　بیکار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ابنِ شہ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں　　　صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے[1]

افضل حسین ثابت ہی ایک اور جگہ اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کے پڑھنے میں عجب وقار تھا اس کے ساتھ دو ایک نثر کے فقرے سونے میں سہاگہ ہوجاتے تھے۔ بین تو وہ اس طرز سے پڑھتے تھے کہ مجلس میں روتے روتے اکثر آدمی بے ہوش ہوجاتے تھے، کیونکہ بین کے موقع پر بہت بتانے سے اکثر رقت سلب ہوتی تھی۔''[2]

نواب حامد علی خاں[3] مرحوم و مغفور لکھتے ہیں کہ لندن کے زمانہ قیام میں ملٹن اور شیکسپیئر کا کلام میں نے پروفیسر مل سے پڑھا اور شعر پڑھنے کے اصول اور طریقے

۱　حیات دبیر ص ۵۶-۵۵

۲　سبع مثانی ص ۲۶ دیباچہ ثابت

۳　حامد علی خاں صاحب لکھنوی بیرسٹرایٹ لا تھے۔ انھوں نے افضل حسین ثابت کی فرمائش پر ''دبیر اور ملٹن'' کے کلام کا تقابلی مطالعہ پر مبنی ایک مضمون ''ڈومس'' (نزد سورت) کے مقام پر لکھا جہاں وہ اس زمانہ میں تبدیلی آب و ہوا اور علاج کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ثابت نے یہ مضمون حیات دبیر میں باب ۱۵ کے طور پر شامل کیا ہے۔ (حیات دبیر۔ ص ۴۲۸)

پروفیسر ہارٹلی سے سیکھے۔ وہ ہر مقام کو خوب ہی ادا کرتے تھے۔ آواز اور صورت سے گویا بولتی ہوئی تصویر بن جاتے تھے۔ ہاتھ سے زیادہ بتانے کو منع کرتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ سب سے بہتر پڑھنے والا لندن کا بھی مرزا صاحب (مرزا دبیر) سے متفق الرائے تھا۔[1]

شاد عظیم آبادی تحریر کرتے ہیں:

''.....سر اٹھا کر اور نہایت ڈپٹ کے آغاز کرتے۔ یہ بھی ضرور تھا کہ مرثیے کے پہلے رباعیاں، سلام اور بیشتر تضمین یا ہفت بند ملا کاشی کے چند بند کے مصرعے نہایت بلند آواز سے پڑھتے۔ تعریفوں کا زیادہ شور ہوتا تھا تو ہاتھ اٹھا کر اللھم تقبل (یعنی خدایا اسے قبول کر) فرمایا کرتے تھے۔ اہل مجلس کو زیادہ تر مجو یا حضرات کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔ مصرعہ نصف ایک جانب اور نصف دوسری جانب نظر کر کے پڑھتے۔ پڑھتے وقت قریب سے دیکھنے والوں کو ان کے جوش کی حالت پوری محسوس ہوتی تھی۔ بال داڑھی کے نمایاں نہ تھے مگر جوش میں نمایاں ہوجاتے تھے۔ نصف مصرعہ کو ڈپٹ کر اور نصف کو بہت آہستہ ادا کرنا کچھ ان ہی پر ختم ہوگیا.....

..... پڑھنے میں صرف ڈپٹ بڑھی تھی۔ ہاتھ سے یا چہرے سے بتانا مطلق نہ تھا۔ حزن یا بین کی جگہ آواز کو نرم بنا کر سامعین پر اثر ڈالنا بھی چنداں نہ تھا مگر اثر ہو ہی جاتا تھا۔ اکثر اہل مجلس کو روتے روتے غش آجاتے تھے۔ پورا مرثیہ از مطلع تا مقطع مسلسل پڑھتے، میں نے نہیں سنا کبھی یہ بھی ہوا کہ چہرہ پڑھ کر کچھ زبانی فرما کر رخصت یا بین پڑھتے یا محض صف آرائی اور کچھ بند لڑائی کے پڑھ کر شہادت پر مرثیے کو تمام کر کے (ممبر سے) اتر آتے۔ مشکل سے مرثیے کے ایک سو بند پڑھتے ہوں گے متفرقات کے پڑھنے میں زیادہ وقت گزر جاتا تھا۔ آخر میں پسینے سے شرابور ہوجاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے تک پڑھ کر (ممبر سے) اتر آتے تھے۔''[2]

---

۱ (۱) حیات دبیر ص ۳۱-۴۳۰ (۲) سبع مثانی دیباچہ ثابت، ص ۲۶

۲ پیمبران سخن ص ۲۷-۱۲۶

شاد ہی لکھتے ہیں کہ جب سے مرزا دبیر کو ناک کے پروں میں دانوں کے نکلنے کا عارضہ ہوگیا اور ناک کے پرے پھیل گئے اکثر تکلیف رہا کرتی تھی اور سانس لینے میں دقت ہونے کی وجہ سے صدا پھنس کر نکلتی تھی مگر مجلس پڑھنے میں یہ بات ظاہر نہیں ہوتی تھی۔[1]

مرزا دبیر پڑھنے میں لب و لہجہ کا استعمال اس طرح کرتے تھے کہ مصرعوں کا مفہوم بدل جاتا تھا اور وہ ایک مصرعے کو کئی طرح سے ادا کرتے تھے۔ مختلف الفاظ پر زور دے کر وہ اہل مجلس کو محو حیرت کر دیتے تھے۔ اپنے ایک مشہور مرثیہ:

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی[2]

میں ایک مقام نظم کیا ہے کہ حضرت زینبؑ اپنے بچوں پر خفا ہو رہی ہیں کہ تم نے شمر سے بات کیوں کی۔ مصرع یہ ہے: کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔ صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں کہ جب مرزا دبیر مرثیہ پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے تو اس مصرعہ کو تین طریقوں سے ادا کیا۔ ہر مرتبہ مصرع کے ایک نئے معنی سامعین کے سامنے آگئے۔

(۱) عام لہجہ میں — کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔

(۲) استفہامیہ طور پر — کیوں؟ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔

(۳) تاسف و حسرت کے لہجہ میں — کیوں! تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی۔ اس قدر اس مرثیہ پر رقت ہوئی کہ آگے نہ پڑھ سکے۔[3]

ثابت لکھنوی مرزا دبیر کے پڑھنے کے انداز کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''انھوں نے کبھی کسی اپنے شاگرد کو اپنے پڑھنے کا طرز نہیں سکھایا۔ نہ کسی شاگرد

---

۱ پیمبران سخن، ص ۱۲۱

۲ دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے

۳ حیات دبیر ص ۵۹۔ یہ واقعہ اس مجلس کا ہے جو غالباً ۱۸۷۲ء میں داروغہ میر واجد علی صاحب تسخیر کے امام باڑہ واقع گولہ گنج میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مرزا کے پڑھنے کے انداز اور حکایات کو حیات دبیر ص ۶۰-۵۵ پر دیکھیے۔

کو بجز ایک شخص آغا حیدر[1] مرحوم کے ان کا طرز آیا۔"[2]

شاد عظیم آبادی اس پر مزید اضافہ کرتے ہیں:

"مجالس میں ان کے پڑھنے کا انداز میر ضمیر مرحوم کے داماد میر صفدر علی سے بہت ملتا جلتا ہوا تھا۔ اس لیے مجھ کو یقین ہے کہ مرزا صاحب کو بھی تتبع اپنے استاد کا ہو تو عجب نہیں ہے۔"[3]

امیر احمد علوی مرزا دبیر کے انداز مرثیہ خوانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تقاضائے فطرت سے کہیں خود بخود ہاتھ اٹھ جاتا تو اٹھ جاتا ورنہ منبر پر بیٹھ کر "موشنس" دکھانا گناہ سمجھتے تھے۔ چشم و ابرو کا اشارہ بھی اسی قدر ہوتا جتنا باتوں میں ہو جاتا ہے۔"[4]

مہدی حسین احسن کا بیان ہے کہ "میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک تو میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے اور دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مرحوم۔ میر مداری کے جاننے والے تو لکھنؤ میں بہت کم نکلیں گے مگر مرزا صاحب کی شہرت راقم آثم کی تعریف سے بے نیاز ہے۔"[5]

اصلاح دینے کا طریقہ

صاحب حیات دبیر صفیر بلگرامی کے حوالہ (جلوۂ خضر حصہ دوم) سے لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب (مرزا دبیر) شاگرد سے اس کا کلام سنتے جاتے تھے اور جس

---

۱ آغا حیدر مرحوم مرزا دبیر کے شاگرد رشید تھے۔ سنا ہے ان کی آواز بھی مرزا دبیر سے مشابہ تھی اور اسی طرز سے پڑھتے بھی تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ (حیات دبیر ص ۵۶)

۲ حیات دبیر ص ۵۶

۳ پیمبران سخن ص ۱۲۴

۴ یادگار انیس- امیر احمد علوی ص ۸۳-۸۴ "تیسرا ایڈیشن- ہندوستانی کتاب گھر لکھنؤ- سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵۷ء

۵ واقعات انیس- احسن لکھنوی، اردو پبلشرز لکھنؤ (نیا ایڈیشن) ص ۳۲-۳۳

مصرع یا بند پر اصلاح دینا ہوتا تھا تو مرثیہ لے کر اپنے ہاتھ سے بنا دیتے تھے
اور اکثر مرثیے تو خود دیکھ دیکھ کر بناتے تھے اور میں نے ان کے اور شاگردوں
سے سنا ہے کہ جو لفظ کاٹتے یا بناتے تھے اس کی وجہ، اگر وہ شاگرد حاضر ہوتا
تھا تو زبانی بتا دیتے تھے ورنہ حاشیہ پر بطور اشارہ لکھ دیتے تھے۔ ایسے لفظ رکھ
دیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا سادہ کار نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا۔''[1]

میر واجد حسین[2] کو ایک دن مرزا صاحب نے کسی شاگرد کا حضرت عباسؑ کے حال کا مرثیہ صاف کرنے کے لیے دیا۔ حضرت عباسؑ کے خیمے سے باہر آنے کے مقام پر مرزا دبیر نے اصلاحاً یہ ٹیپ لکھی تھی:

آپ آئے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے اقبال سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے

میر واجد حسین نے شرارت میں دوسرا مصرعہ یوں لکھ دیا کہ ہاں فتح سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے۔ مرزا دبیر ٹیپ پڑھ کر ہنسے اور کہہ دیا کہ واہ میر واجد حسین صاحب آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دے دی۔ انھوں نے شرمندگی کا اظہار کیا پھر مرزا دبیر نے سمجھایا کہ جب یہ کہا جائے کہ عورت کوئی سامنے نہ آئے اس کے بعد فتح مناسب نہیں ہے کہ مؤنث ہے اور اقبال مذکر۔ اس کے سوا اقبال کے خود معنی آگے آنے کے ہیں لفظ فتح میں یہ بات کہاں۔[3]

ثابت لکھنوی ہی دیباچہ سبع مثانی میں تحریر کرتے ہیں:

''ان میں یہ بھی کمال تھا کہ جس رنگ کی طبیعت شاگرد کی ہوتی تھی اسی طرز کی
اس کو اصلاح دیتے تھے۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر کے
کلام پر اصلاح دینے میں ویسے الفاظ بنا دیتے تھے جو گویا زبان انیس مغفور کے
سمجھے جاتے تھے اور جن سے خود مرزا صاحب اپنی تصنیف میں بچتے تھے جیسے

---

۱ حیات دبیر ص ۵۳

۲ میر واجد حسین مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ یہ پہلے مرثیہ پڑھتے تھے، پھر نثر پڑھتے تھے۔ میر فدا علی فدا مشہور استاد نثار کے شاگرد تھے۔ اکثر عشرہ محرم میں گوالیار جا کر پڑھتے تھے۔ حیات دبیر ص ۵۳

۳ حیات دبیر ص ۵۴-۵۳

شہ بے پر۔ کڑیل جوان وغیرہ۔ شیخ گوہر علی صاحب مشیر مرحوم کے ہرسیوں میں ویسے بازاری محاورے اور الفاظ رکھتے تھے جو ہرسیوں کی شان کے شایان ہیں۔ آج مزاحیہ کلام ان کا (مرزا دبیر کا) علاحدہ نہیں ملتا۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ ایسا کلام سب مشیر مرحوم کو بخش دیا تھا۔ ہزاروں محاورے ہرسیوں میں ایسے نظم کیے ہیں جو اور کسی شاعر کے کلام میں نہ ملیں گے۔ نواب شہید سید اسد علی صاحب متین کے نوحوں میں ایسے مکھی الفاظ رکھتے تھے جو خاص نوحہ کے واسطے زیبا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متین کے نوحے اپنے طرز میں بے مثل ہیں۔ نواب شہید ممدوح اور مشیر سنا ہے ایک ہی دن میں مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے مگر مشیر کی طبیعت ہرسیہ کے لیے موزوں پائی اور متین مغفور کو نوحہ کے قابل پایا۔ دونوں کو ایک ڈھرّے پر لگا دیا۔"[1]

لکھنو میں مرزا دبیر کے پڑھنے کی اہم مجلسیں

لکھنو میں مرزا دبیر کے پڑھنے کی اہم مجلسیں بقول ثابت لکھنوی مندرجہ ذیل ہیں۔[2]

(۱) ملکہ زمانی[3] کے یہاں مرزا صاحب زمانہ شاہی میں عشرہ محرم میں بڑی شان و

---

[1] سبع مثانی دیباچۂ ثابت ص ۲۴

[2] حیات دبیر ص ۹۶۔ ۸۸

[3] ملکہ زمانیہ بادشاہ نصیرالدین حیدر کی محلات میں تھیں۔ بقول نجم الغنی مصنف تاریخ اودھ، وہ ہزار جان سے فدائے ائمہ معصومین تھیں۔ ہرنوچندی جمعرات کو درگاہ حضرت عباسؑ میں نہایت دھوم دھام سے جاتی تھیں اور دس ہزار روپے صرف نذر و نیاز میں صرف کرتی تھیں۔ ایک وسیع اور عظیم الشان امامباڑہ گولا گنج لکھنو میں تعمیر کیا جو اب تک شکستہ حالت میں موجود ہے۔ یہ امام باڑہ محمد احسن خان کے اہتمام سے ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں بنوایا تھا۔ اس کے مغرب میں ان کی بنوائی ہوئی ایک مسجد بھی اب تک موجود ہے۔ برق نے امام باڑہ کی تاریخ کہی ہے:

جناب ثانی مریم معظمہ، ملکہ — کہ در زمانہ ندارد نظیر خویش اصلا
امام باڑہ بنا کر دیے بدل بے مثل — عیاں بروے زمیں شد بنائے عرش علا
بہ اہتمام جناب محمد احسن خان — بطرز نو شدہ طیار ایں خجستہ بنا
بنائے خلد بگویم اگر روا باشد — چرا کہ ہست مزار امام راہنما

شوکت کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔

(۲) افتخار الدولہ[1] مرحوم کے یہاں جناب میر ضمیر مرحوم اور مرزا صاحب ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ بڑے خوش اعتقاد اور سخی رئیس تھے۔

(۳) حسین علی خان اثر[2] مرحوم خلف مرزا حیدر بیگ نائب آصف الدولہ کے یہاں تمام چہلم کی مجلسیں مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ پھر جب عہد امجد علی شاہ میں میر انیس فیض

امام آنکہ فدا سرنمود بہر امم   قتیل تیغ جفاؤ ذبیح راہ خدا
کلیم فکر رسا گفت سال تاریخش   امام باڑہ بے مثل سید شہدا

(دیوان برق ص ۶۵۳ مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء)

ملکہ زمانیہ کا انتقال ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ واقع گولہ گنج میں دفن ہیں۔ (حیات دبیر ج ۱ ص ۶۸) ان کی فیاضی کا شہرہ سارے لکھنو میں تھا۔ ان کے یہاں مرزا دبیر عشرہ محرم میں بڑی شان و شوکت کی مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ مرزا دبیر کو ان کی سرکار سے ماہوار تنخواہ کے علاوہ دس ہزار روپے انعام ملتے تھے۔ علاوہ برایں مرزا دبیر کی سفارش پر ان کے یہاں سے سالانہ اہل حاجت کو لاکھوں روپیہ ملا کرتا تھا ملکہ زمانیہ کی بیٹی سلطان عالیہ شاعرہ اہل بیت بھی تھیں اور مرزا دبیر کی شاگرد تھیں۔ (حیات دبیر جلد ۱ ص ۸۸)

۱ راجہ میوہ رام کے والد کا نام نول کشن تھا۔ پہلے ہندو تھے جب مسلمان ہوئے تو اسلامی نام ہدایت علی رکھا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر نے افتخار الدولہ کا خطاب دے کر اپنا دیوان مقرر کرلیا اور تین لاکھ روپے کا انعام بھی دیا۔

میوہ رام ایام محرم میں صدق دل سے تعزیہ داری کرتے تھے اور دو تین لاکھ روپے عشرہ محرم اور ائمہ طاہرین کی وفات وغیرہ پر خرچ کرتے تھے۔ ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں کربلائے معلیٰ میں وفات پائی۔ منیر شکوہ آبادی نے تاریخ وفات کہی ہے:

سال مرگ اندر صفاتش نظم کردم اے منیر
دیں پناہ و صالح و زوار امیر و متقی

(کلیات منیر ص ۵۱۵، منظومات میاں دلگیر (۱۲۸۴ھ) مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، ص ۷۔۸)

یہ وہی افتخار الدولہ ہیں جن کی مجلس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر کا آپس میں اختلاف ہوگیا تھا۔
(سبع مثانی۔ دیباچہ ثابت ص ۲۳۔ ۳۲۰)

۲ یہ نواب خود بھی شاعر تھے۔ شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ وہ بھی ان کے یہاں مجلسوں میں کبھی کبھی آتے تھے۔ (حیات دبیر ص ۸۹)

آباد سے لکھنو آئے تو ایک دن میر صاحب اور ایک دن مرزا دبیر ان کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھے۔

(۴) میر باقر[1] تاجر کے امام باڑہ واقع لکھنو چوک میں پہلے تو پچیسویں کی مجلس میں میر ضمیر صاحب پڑھتے رہے۔ پھر عہد محمد علی شاہ مرحوم سے مرزا دبیر نے پڑھنا شروع کیا اور تامدۃ العمر ۲۵ رجب اور ۲۵ ذیقعدہ کی مجلس میں پڑھتے رہے۔ یہ دونوں مجلسیں بڑی شان و شوکت اور مجمع کثیر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ بعد زمانہ غدر میر اعظم علی مرحوم نے ۲۵ رجب کی ایک مجلس مقرر فرمائی۔ جو چوپٹیوں [لکھنو کا ایک محلّہ] میں ہوا کرتی تھی۔ وہ مجلس اس مجلس کے مقابلہ پر میر صاحب کے طرفداروں نے مقرر فرمائی تھی۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے بعد ادھر مرزا اوج اور ادھر میر نفیس پڑھتے تھے۔

(۵) وزیر خان داروغہ دیوان خانہ شاہ اودھ کے یہاں مفتی گنج احاط مرزا علی خان میں ہر مہینہ کی تیئسویں کو عہد واجد علی شاہ مرحوم میں مرزا دبیر اور ان کے مقابلہ پر محمد خان داروغہ فیل خانہ شاہی کے یہاں اسی تاریخ اسی محلّہ میں میر صاحب پڑھتے تھے۔

(۶) جواہر علی خان خواجہ سرائے ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں محلّہ گولاگنج میں ہر مہینہ کی بائیسویں کو اور نواب ناظر فیروز الدولہ خواجہ سرائے شاہی کے یہاں ہر مہینہ کی بارھویں

---

۱ میر محمد باقر سوداگر۔ بادشاہ محمد علی شاہ (متوفی ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء) کے زمانے میں لکھنو کے مشہور و معروف تاجر تھے۔ عزاداری دل و جان سے کرتے تھے اور ایام محرم میں ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے چوک لکھنؤ میں ایک خوبصورت امام باڑہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں تعمیر کیا جو آج تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ اس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ برق نے تاریخ بنا کہی ہے:

میر باقر دُرِ دریائے سخا ' بحر عطا	سید و باقر و عالی نسب و ذی جاہی
تعزیہ خانہ بنا کرد چو برج خورشید	روشن از روزن پُرنور بہ گردد ماہی
از چہ تشبیہ دہم عقل و خرد حیرانست	دیدہ مہر فلک مثل ندیدہ گاہی
بسکہ از بہر زیارت ز فلک می آئند	ے شود بند ز ارواح و ملائک را ہی
کہ ببیند بہ جہاں جن و بشر می گوید	نیست بالائے زمیں مثل چناں درگاہی
گفت تاریخ بنا روح امین فکرم	قبلہ اہل جہاں مسندِ شاہنشاہی

۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء (دیوان برق ص ۶۵۴)

کو مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ یہ مجلسیں بھی عہد واجد علی شاہ مرحوم میں ہوا کرتی تھیں۔

(۷) ہر مہینے کی گیارھویں[1] کو جو مرزا صاحب کی ولادت کا دن ہے' خود مرزا صاحب (دبیر) کے مکان پر برسوں مجلس ہوا کی جس میں مرزا دبیر خود پڑھتے تھے۔

(۸) ہر مہینے کی تیرھویں کو اور ماہِ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علی خان سوزخوان مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے۔ ادھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انہیں تاریخوں میں میر انیس مجلس پڑھتے تھے۔ تیرھویں کی مجلس میں لوگوں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی مرزا دبیر نے خود اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[2]

کیوں آج یہ انبوہ کثیر آیا ہے — ہاں حضرتِ مقبل کا نظیر آیا ہے
ہوگا مہِ چار دہ کا منبر پہ کمال — تاریخ ہے تیرھویں دبیر آیا ہے

(۹) داروغہ میر واجد علی تسخیر[3] مرحوم بھی مرزا صاحب کے ایک معتقد بلکہ فدائی بالواسط اور بلا واسط شاگرد تھے۔ بعد غدر ۱۸۵۷ء ان کے یہاں محلہ گولا گنج میں ہر سال

---

۱ اس مجلس میں مرزا دبیر نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس کی طرف اشارہ یوں کیا ہے:

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر مہ — دبیر اس کو سمجھو مہینہ ہمارا

(حیات دبیر جلد اول ص ۳۵)

۲ تفصیل کے لیے حیات دبیر ص ۹۳۔ ۹۰ ملاحظہ فرمائیں۔

۳ تسخیر کے بزرگ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں یہ خاندان لکھنؤ آ گیا اور غربت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ تسخیر کا ابتدائی زمانہ بھی عسرت میں بسر ہوا مگر بعد میں مرزا دبیر کی توجہ سے ان کی شاعری چمک اٹھی اور دنیاوی ترقی بھی ہوئی۔ نواب سلطان محل کی سرکار میں داروغہ ہوگئے اور بیگم صاحبہ ان پر اتنی مہربان ہوگئیں کہ اپنی ساری جائداد، گولا گنج کا شاندار امام باڑہ اور زرو جواہر ان کے سپرد کرکے دار آخرت کو سدھار گئیں۔ غدر کے زمانے میں دو انگریز خواتین کی جان بچائی اور ۳۸ انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی جس کے صلہ میں انگریزوں نے ان کو ایک لاکھ روپے اور اہامئو کا تعلقہ دے دیا۔ کافی لیاقت کے آدمی تھے۔ اس روپے سے کافی جائداد بنائی اور انگریز سرکار سے اپنے اثر و رسوخ سے کئی بے گناہوں کو پھانسی کے پھندے سے چھڑالیا۔ مرزا دبیر سے کافی عقیدت اور محبت تھی۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا محمد جعفر اوج کی ہمت افزائی کرتے رہے۔ ان کا انتقال ۱۸۷۵ء میں ہوا۔

اکیسویں ماہ رمضان کو مرزا دبیر مجلس پڑھتے تھے۔

(۱۰) خان بہادر شیخ الطاف حسین کے یہاں کنکر کے کنویں پر ۱۸ صفر کو مرزا دبیر اور اسی محلّہ میں اسی وقت داروغہ شیخ محمد عباس کے یہاں میر انیس پڑھا کرتے تھے۔

(۱۱) نواب ممتاز الدولہ[1] مرحوم داماد نصیرالدین حیدر شاہ دوم اودھ بھی مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ ان کے یہاں بھی اربعین میں کبھی ایک کبھی دو مجلسیں مرزا دبیر پڑھا کرتے تھے۔

(۱۲) بابو بنی پرشاد وکیل ہائی کورٹ نے آگرہ سے لکھنؤ جاکر آغا علی خان عرف آغائے صاحب سے درخواست کی تھی کہ انہیں مرزا دبیر کی خواندگی سننے کا اشتیاق ہے۔ وہ بھی مرزا دبیر کے معتقد تھے انہوں نے ایک بہت بڑی مجلس کرکے مرزا دبیر کو پڑھوایا۔

"نوحہ تسخیر" کے نام سے ان کے پندرہ مراثی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئے۔

(دبستان دبیر ص ۴۷۔ ۳۴۵)

اول اول شیخ گوہر علی مشیر کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں خود مشیر نے مرزا دبیر کا شاگرد کرایا۔ مرزا دبیر کو غزل پر اصلاح دینے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اس میں اسیر کے شاگرد ہوئے۔ بعد غدر محلّہ گولا گنج میں ان کے یہاں ہر سال اکیسویں ماہ رمضان کو مرزا دبیر مجلس پڑھتے تھے۔ ان کا امام باڑہ بہت وسیع تھا اور مرزا دبیر کو سننے کے لیے لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ وہ سب آدمیوں سے بھر جاتا تھا۔

(حیات دبیر جلد اول ۹۴۔ ۹۳)

[1] امراء میں صاحب اعزاز فریدوں مرتبت' ممتاز الدولہ مدیر الملک نواب مرزا حسن علی خاں بہادر تہور جنگ خطاب تخلص ممتاز خلف الصدق ناصر الدولہ اصغر علی خاں بہادر ابن محمد علی شاہ بادشاہ۔ امان علی سحر کے توسل سے مرزا محمد رضا برق کے شاگرد ہوئے تھے۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا نمونہ دیا گیا ہے۔ (تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۷۱ء ص ۶۴۵)

غدر کے بعد ممتاز الدولہ حسین آباد امام باڑہ کے متولی ہوگئے تھے۔

(اودھ اخبار مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء مطابق ۲۰ رمضان ۱۲۷۹ھ روز چہار شنبہ' نمبر ۱۰ جلد ۵ تحت عنوان امام باڑہ حسین آباد)

(۱۴) شاہ پنجم اودھ واجد علی شاہ مرحوم کے یہاں مجلس عشرہ محرم میں بھی مرزا دبیر پڑھتے تھے اور شاہ مرحوم وہ عزت افزائی فرماتے تھے جو کسی بادشاہ نے کسی بھی شاعر اہل بیت کی نہ کی ہوگی۔ انہیں مجالس میں سے ایک مجلس میں ہوا سے منبر کے اوپر کا شامیانہ پراگندہ ہونے پر خود بادشاہ قدر شناس و علم دوست نے چتر لگایا تھا[۱] جیسا کہ صاحب شمس الضحیٰ نے تحریر کیا ہے اور اس مقالہ میں بھی اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ بادشاہ کی ان مجالس میں وہ کبھی خوشامد نہیں کرتے تھے۔ کبھی ان کو لفظ ''خداوند'' سے بھی خطاب نہیں کیا حالانکہ ایسے لفظ کو بادشاہ کے لیے اس زمانہ میں کوئی غیر معمولی لفظ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ لفظ تو اہل دربار کا سخن تکیہ تھا۔ مرزا دبیر نے تو خوشامد کرنے والوں کے لیے ہی کہا ہے:

پیش امراء طالب زر جھکتے ہیں ۔۔۔ سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح ۔۔۔ ہو مال سوا جدھر، ادھر جھکتے ہیں

ایک اور رباعی:

سرکار سلاطیں سے سرو کار نہیں ۔۔۔ جز مجلس مولا کوئی در بار نہیں
مداح ہوں میں امامِ بے سر کا دبیر ۔۔۔ سامان کیسا کہ سر بھی در کار نہیں

شاہی مجلسوں میں کبھی درباری لباس سے بھی مرزا دبیر نہیں گئے بلکہ کہتے تھے کہ ہم امام حسینؑ کے درباری ہیں۔ شاہان دنیا کی درباداری اور درباری پوشاک سے ہم کو کیا تعلق۔[۲]

لکھنو سے باہر کی مجلسیں اور مرزا دبیر کے سفر

صاحب حیاتِ دبیر تحریر کرتے ہیں:

> ''جب تک لکھنو کی سلطنت قائم رہی، مرزا صاحب ملک اودھ سے کہیں باہر نہ گئے۔ باہر سے بہتیرے بلاوے آئے مگر ہمیشہ انکار فرماتے رہے۔ جب

---

۱ سبع مثانی۔ دیباچہ ثابت ص ۳۴۔۳۳

۲ سبع مثانی ص ۳۴۔ اس سے قبل یہ حیات دبیر میں بھی ثابت قلمبند کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو حیات دبیر ص ۹۸۔ ۹۷

کوئی اس کا سبب پوچھتا تھا تو فرماتے تھے کہ ہماری زبان کے جاننے والے یا دہلی میں ہیں یا لکھنو میں۔۔۔ تیسری جگہ یہ بات کہاں۔ دہلی ویران ہو چکی تھی، وہاں سے کبھی طلب نہیں آئی یہاں تک کہ زمانہ کی پریشان ہوا نے وہ ورق الٹا۔ اول سلطنت اودھ جاتی رہی۔ برس ڈیڑھ برس کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا مگر اس شہر آشوب زمانہ میں مرزا صاحب نہایت مستقل رہے چنانچہ خود فرماتے ہیں :

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا — گہ عدل، گہے ظلم، گہے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر — کیا غم جو زمین اور، فلک اور ہوا"[1]

سفر سیتا پور

صاحب یادگار انیس اس زمانہ کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غدر کے زمانے (۱۸۵۷ء) میں محرم اگست کے مہینہ میں پڑا اور بھری برسات تھی۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی، مملکت اجڑ گئی تھی اس کا نقشہ انیس نے اس رباعی میں پیش کیا ہے۔[2]

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا — کیوں چرخ کہن نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس — اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

مرزا دبیر نے بردباری اور متانت سے کام لے کر یہ رباعی کہی

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا .... فلک اور ہوا۔

لیکن جب بھگدڑ مچی تو یہ دونوں استاد لکھنو سے نکل گئے۔ مرزا دبیر کچھ دنوں کے لیے سیتا پور گئے اور اس موقع پر مرزا دبیر نے ایک دردناک رباعی کہی :

شطرنج دورنگی سے ہیں ششدر بندے — آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل — تو مالک ملک اور بے گھر بندے

میر انیس کے دل پر اتنا اثر پڑا تھا کہ ؂

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ — انیس ملکِ سخن میں بھی انقلاب آیا[3]

---

۱ حیات دبیر ص ۱۰۰
۲ یادگار انیس۔ امیر احمد علوی ص ۹۵۔۹۴
۳ یادگار انیس ص ۹۵

غدر ۱۸۵۷ء میں ہی مرزا دبیر نے لکھنؤ سے باہر قدم نکالا۔ ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

"لکھنؤ سے مرزا صاحب اس انتشار میں مع اہل و عیال چل کر سیتاپور میں پہنچے اور مولوی حاجی سید سلامت علی صاحب مرحوم نامی اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم ہوئے۔ ایک فقیر نی بڑھیا نے اسی پرآشوب زمانہ میں مجلس کی اور مرزا صاحب اسی بے سروسامانی[1] کے عالم میں مرثیہ پڑھے۔"[2]

لکھنو کی واپسی اور سفرِ کانپور

ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

"لکھنو میں امن ہوجانے پر مع اہل و عیال واپس تشریف لائے اور اکثر اپنے دوستوں کی موت اور بربادی کی خبریں سن سن کر نہایت ملال کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لکھنو میں نہ شاہ اودھ تھے نہ وہ قدرداں امیر۔ اکثر امیر فقیر ہوگئے تھے۔ اکثر سرکاریں مٹ گئی تھیں اور سامان خانہ داری کے ساتھ اکثر مرثیے بھی لوٹ میں تلف ہوگئے تھے۔ پھر شاید ۱۸۵۸ء میں کانپور کے مشہور ذی علم امیر کبیر نواب دولہا صاحب نے بلوایا۔ وہاں تشریف لے گئے اور عشرہ محرم میں پڑھے ایک رباعی اس موقع پر ان نئی نئی صورتوں کو دیکھ کر فرمائی تھی۔۔۔

اس بزم میں ارباب شعور آئے ہیں — یہ شیعہ ہیں یا ارباب نور آئے ہیں
پڑھ مرثیہ لے داد سخن ان سے دبیر — کیا کیا حضرات کانپور آئے ہیں"[3]

---

۱ اس فقیرنی کے گھر میں ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا تھا۔ مرزا دبیر سے معذرت کی کہ کوئی اچھا مونڈھا یا کرسی نہیں ہے۔ مرزا دبیر اس ٹوٹے پھوٹے مونڈھے پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھے۔ (کہاں واجد علی شاہ کا سرچتر لگاکے کھڑا رہتا اور کہاں یہ عالم) مرزا اوج کی روایت کے مطابق وہ فقیرنی بڑھیا بعد غدر اکثر لکھنو آتی تھی اور مرزا دبیر اس سے ہمیشہ سلوک ہوتے رہتے تھے۔ (حیات دبیر ص ۱۰۱۔۱۰۰)

۲ حیات دبیر ص ۱۰۱۔۱۰۰

۳ حیات دبیر ص ۱۰۲۔۱۰۱

بنارس کا سفر

ثابت لکھنوی نے مرزا اوج کے حوالہ سے مرزا دبیر کے بنارس میں ایک مجلس پڑھنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس مجلس کی تاریخ یا سال کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ اتنا لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ایرانی سوداگر نے بنارس میں مرزا دبیر کے پڑھنے کی ایک مجلس کی تھی۔ پیش خوانی میں مرزا اوج پڑھے تھے اور ان کے بعد مرزا دبیر نے اپنے مرثیہ ''پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی'' کا آخری نصف اس مطلع سے پڑھا ''جوشن ہیں دو پر ایک صغیر اک کبیر ہے'' لیکن اس مجلس میں باوجود اس کے کہ لوگ پڑھے لکھے تھے' نہ آہ تھی نہ واہ۔ مگر جب مرزا دبیر نے آخر کے تین بند پڑھے تو سولہ سترہ آدمیوں کو روتے روتے پیٹتے پیٹتے غش آ گیا تھا اور بعد میں کچھ لوگوں نے مرزا دبیر سے یہ کہکر اپنی خطا معاف کروائی تھی کہ انہوں نے پہلے ہی عہد کر رکھا تھا کہ کلام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو نہ تعریف کریں گے اور نہ ہی روئیں گے اور حالت یہ تھی کہ دل وجد کر رہا تھا مگر ہونٹ سی لیے تھے۔ دراصل لوگ زبردست انیسیے تھے لیکن مرزا دبیر نے ان کو معاف کردیا اور کہا کہ انیسیت اور دبیریت کا ایسا خیال ایمان کا بگاڑنے والا ہے۔ آئندہ کبھی کسی ذاکر کے پڑھنے میں کبھی ایسا تعصب نہ کیجیے۔[1]

سفر الہٰ آباد

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر نے الہٰ آباد میں بھی ایک مجلس مرزا علی اکبر مرحوم کے یہاں پڑھی تھی۔ اس کی تصدیق اس خط سے ہوتی ہے جو مرزا علی اکبر مرحوم نے وکٹوریہ گزٹ سہارنپور میں شایع کرنے کی غرض سے اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ مرزا دبیر کی اس مجلس کا مفصل حال لکھا تھا جو ان کے یہاں پڑھی گئی تھی' خط پر ۱۷ ستمبر ۱۸۵۹ء (۱۲۷۶ھ) کی تاریخ ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۹ء سے پہلے مرزا دبیر نے الہٰ آباد میں بھی کم از کم ایک مجلس پڑھی تھی۔ الہٰ آباد کے باشندوں کی مدح میں مرزا دبیر کی ایک

---

۱ حیات دبیر ص ۶۰

۲ ''ادب'' لکھنو۔ مئی ۱۹۳۰ء مضمون آثار ادبیہ۔ مسعود حسن رضوی ادیب ص ۶۷۔ ۶۹

فارسی رباعی بھی ملتی ہے۔[1]

فیض آباد کا سفر

مرزا دبیر نے شاد کے بیان کے مطابق فیض آباد میں بھی مجلس پڑھی ہے :

> ''..... جب فیض آباد سالار جنگ کے خاندان میں طلب (مرزا دبیر کی طلب) ہوئی۔ وہاں سے کامیاب پھرے تو جن بعض بعض قدیم لوگوں کا یہ گمان تھا کہ میر خلیق کے بیٹے میر انیس بھی کم نہیں ہیں وہ بھی اپنی جگہ سرد ہوگئے۔''[2]

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین لکھتے ہیں:

> ''جب غلام عباس نامی ایک شخص نے میر انیس کے ساتھ دشمنی کے سبب ان کو نیچا دکھانے کے لیے فیض آباد میں نواب نادر مرزا نیشا پوری کے یہاں میر انیس کے بجائے مرزا دبیر کو طلب کرایا تو میر انیس بقول شاد عظیم آبادی دو برس تک خانہ نشین رہے اور بقول دیگر انہوں نے فیض آباد چھوڑ کر مرزا دبیر کے شہر لکھنو کی طرف اپنا کوکبۂ اقبال بڑھا دیا۔''[3]

سفر عظیم آباد (پٹنہ)

مرزا دبیر کا عظیم آباد جانا ان کا ایک غیر معمولی اقدام تھا کیونکہ یہ سفر اس کے بعد سے آج تک اس خاندان کے ساتھ ملزوم ہوگیا، جبکہ عظیم آباد لکھنو سے دور تھا اور اس زمانے میں ریل کی سہولیت میسر نہ تھی۔ بنارس تک لوگ خشکی شکرم وغیرہ کی ڈاک پر آتے تھے۔ بنارس سے دانا پور تک سٹیمر میں۔ دانا پور سے سواریوں پر عظیم آباد آنا

---

1 اس محفل عالی کی جناں بنیاد است — دربار رسول و الہ الامجاد است
جمعیت محبان حسین ابن علی — ایں بزم ز خاصان اللہ آباد است
(تلاش دبیر۔ کاظم علی خان ص ۴۹۷)

2 پیمبران سخن، ص ۱۳۸

3 ایضاً، ص ۱۳۹

پڑتا تھا۔ مگر لکھنو لٹ چکا تھا وہ پہلے کی سی آمدنی نہ رہی تھی۔ قدر دان اب بھی تھے مگر انقلاب زمانہ نے انہیں اس قدر تنگ دست کردیا تھا کہ اس کا اظہار بھی نہ کر پاتے تھے۔ عظیم آباد میں اکثر خاندان ایسے آباد ہوگئے تھے جو دہلی سے آئے تھے۔ مرزا دبیر کی زبان و بیان کے مداح تھے۔ بقول شاد عظیم آبادی اس شہر کے اندر اس زمانہ میں بجز مرزا صاحب کے کلام و کمال کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مردِ میدان کوئی دوسرا بھی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب لکھنو سے آئے بعض لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہاں بجز مرزا دبیر کے کسی اور کا نام ہے نہ عظمت تو اپنے آپ کو مرزا دبیر کی شاگردی سے منسوب کیا اور لکھنو سے کسی ذریعہ سے مرزا دبیر کا کلام حاصل کرکے یہاں کے نیک صفت رئیسوں سے منتفع ہوا کیے۔[1]

صاحب حیات دبیر مرزا دبیر کے سفرِ عظیم آباد کے متعلق تحریر کرتے ہیں :

> ''شاید ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ نے اپنے بعض اعزہ کو بھیج کر مرزا صاحب [مرزا دبیر] کو بلوایا...... لکھنو میں مرزا صاحب کی آمدنی صرف سو روپیہ ماہوار وثیقہ حسین آباد اور ۳۰ ماہوار وثیقہ حسینیہ امام باڑہ میر باقر تاجر مرحوم اور ایک گاؤں اور کچھ مکانات کے کرایہ کی رہ گئے تھے [گئی تھی] جو مرزا صاحب ایسے حاتم مزاج کے واسطے کچھ بھی نہ تھی۔ ہر چند پٹنہ عظیم آباد دور جگہ تھی اور شاید اس زمانہ میں مسلسل ریل بھی نہ تھی مگر مرزا صاحب کو اہل عظیم آباد کا خلق کھینچ لے گیا اور بھی بعض رئیسوں کی طلب پر جناب میر انیس مرحوم و میر مونس مغفور و میر ظہیر مبرور [ثابت لکھنوی کے نانا] اسی سال عظیم آباد تشریف لے گئے تھے۔ یہ پہلا سال تھا جو لکھنو کے اتنے باکمال ذاکر لکھنو سے باہر ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ عظیم آباد میں دور دور سے لوگ ان کے سننے کو آئے تھے۔ اکثر کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا کہ نہ لکھنو اجڑتا نہ یہ کامل یہاں آتے۔''[2]

---

۱ پیمبران سخن، ص ۱۲۸۔ ۱۲۷

۲ حیات دبیر، ص ۱۰۳۔ ۱۰۲

ثابت کی طرح شاد کا بیان بھی مرزا دبیر کے پہلے سفر عظیم آباد کے سلسلے میں مبہم ہے۔ شاد کہتے ہیں (جس کا تذکرہ راقم الحروف پہلے بھی کر چکا ہے) :

> ''غالباً ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کو شام کے وقت تکمیر شاہ نامی ایک شخص نے حضرت عم محترم کی حضور میں نواب قاسم علی خاں کو آ کر خبر دی کہ میر انیس و میر مونس آ گئے۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ مرزا دبیر بھی ساتھ ہی آئے تھے۔''[1]

ثابت نے بھی اس سلسلہ میں لفظ 'شاید' کا استعمال کیا ہے اور دو سنین یعنی ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء کا ذکر کیا ہے۔ شاد نے ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) تحریر کیا ہے۔ ان بیانات سے رشک پیدا ہونا ضروری ہے۔ دونوں کے غلط ہونے کا امکان تو ہے مگر دونوں صحیح نہیں ہو سکتے۔ راجہ محمود علی صبا نے اس گتھی کو کسی قدر سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

شاد عظیم آبادی[2]، سید مسعود حسن رضوی[3] ادیب اور راجہ محمود علی صبا[4] اس بات پر متفق ہیں کہ مرزا دبیر عظیم آباد پہلے پہل نواب جعفر حسن خان فیض[5] کی استدعا پر تشریف لائے تھے۔

محمود علی صبا نے اپنے بزرگوں سے بھی یہی سنا تھا کہ مرزا دبیر پہلی دفعہ عظیم آباد فیض ہی کی استدعا پر آئے تھے۔ متذکرہ بالا حضرات کے بیانات سے انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے :

> ''حضرت شاد اور مسعود حسن ادیب کے مضامین پڑھنے کے بعد میرے بزرگوں کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مرزا دبیر عظیم آباد پہلے پہل فیض

---

۱ پیمبران سخن ص ۱۲۹

۲ پیمبران سخن، ص ۱۲۸

۳ ملاحظہ ہو مضمون بعنوان 'آثار ادبیہ' مسعود حسن رضوی ادیب۔ مطبوعہ رسالہ ''ادب'' لکھنؤ مئی ۱۹۳۰ء ص ۷۲۔ ۶۹

۴ ملاحظہ ہو مضمون بعنوان ''مرزا دبیر عظیم آباد میں'' محمود علی صبا۔ مطبوعہ معاصر سہ ماہی پٹنہ ص ۶۰ سال طباعت ۱۹۷۳ء

۵ فیض (۱۸۶۶ء۔ ۱۷۹۹ء) مصحفی کے شاگرد تھے۔ دوبار لکھنؤ آئے تھے ۱۸۳۷ اور ۱۸۴۰ء میں مرزا دبیر سے بھی قیام لکھنؤ کے دوران نیاز حاصل ہوئے تھے۔

(معاصر سہ ماہی ۱۹۷۳ء۔ ''مرزا دبیر عظیم آباد میں'' ص ۶۰)

ہی کی استدعا پر تشریف لائے تھے۔ شاد کے اس بیان سے کہ ''خدا معلوم کیا گول مال ہوا کہ دانا پور تک آ کر مرزا صاحب چھن گئے اور امام باندی مرحومہ کے دولی گھاٹ والے مکان میں اتارے گئے...... مرزا صاحب کے وہاں قیام کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں ہوئیں لیکن اصل واقعہ سے خود راقم [شاد] کو بھی اطلاع نہیں'' (پیمبران سخن ص۲۹ ۱۲۸۷ھ) اس نے حقیقت پر جو پردہ پڑا تھا' اس کو بے پردہ کر دیا۔

پہلی بات تو یہ ...... نواب جعفر حسن خاں اور میرزا دبیر سے ذاتی راہ و رسم نواب صاحب موصوف کے قیام لکھنو ہی کے زمانے میں قائم ہو گئے تھے اور براہ راست خط و کتابت ہوتی تھی۔ دوسری بات یہ ممکن ہے کہ مرزا ابوالحسن نے مرزا دبیر کی خدمت میں زاد راہ کے لیے جو سو روپیہ کی ہنڈی مرزا فضل کے ذریعہ بھیجی تھی وہ انہوں نے مرزا دبیر کو نہ دی ہو۔ (سو روپیہ کی ہنڈی بھیجنے کا ذکر شاد نے پیمبران سخن میں کیا ہے ملاحظ ہو۔ پیمبران سخن ص ۱۲۸) لکھنو والوں کی تنک مزاجی مشہور ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس کی تنک مزاجی کے متعدد واقعات معلوم ہی ہیں۔ دوسری طرف بقول مرزا علی اکبر نواب جعفر حسن خان ''اس قدر حفظ مراتب و خاطر داری کی کہ رفقاء اپنے کئی روز پیشتر باسوار یہائے اقسام واسطے استقبال کے تا بنارس روانہ ہو گئے۔'' [تفصیل کے لیے ملاحظ ہو مضمون ادیب ''آثار ادبیہ'' مطبوعہ ''ادب'' لکھنو مئی ۱۹۳۰ء] اس لیے مرزا دبیر کا نواب جعفر حسن خان کا مہمان ہونا تعجب انگیز بات نہیں...... [آخر میں لکھتے ہیں] حضرت شاد نے مرزا دبیر کے آنے کی تاریخ غالباً ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ لکھی ہے۔ مرزا علی اکبر الہ آبادی کے خط میں جس کو پروفیسر مسعود حسن نے نقل کیا ہے تاریخ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۹ء درج ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ۱۲۷۶ھ والی تاریخ صحیح ہے۔''[1]

''مرزا دبیر عظیم آباد میں امام باندی بیگم کے ہاں دولی گھاٹ میں فرود ہوئے۔''[2]

---

۱ معاصر سہ ماہی ۱۹۷۳ء ص ۶۲۔۶۰

۲ پیمبران سخن ص ۱۲۹

مگر مجلس کا انتظام نواب علی عظیم خان کی گلزار باغ کی حویلی کے امام باڑہ میں کیا گیا تھا۔ موجودہ امام باڑہ کی تعمیر اس وقت نہیں ہوئی تھی۔ بعد کو امام باندی صاحبہ نے باہر کے رہائشی مکان جہاں نواب نورالحسن خان اور جعفر حسن خان رہا کرتے تھے، کو توڑ کر اسی جگہ ایک نہایت شاندار امام باڑہ زر کثیر خرچ کر کے تعمیر کرایا۔[1]

صبا مزید لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر جب تک زندہ رہے اس امام باڑہ میں عشرہ محرم کی مجلیس پڑھا کیے۔ امام باندی صاحبہ نے بھی دل کھول کر مرزا دبیر کی عزت افزائی کی۔ آٹھ ہزار روپیہ نذرانہ کے علاوہ خلعت و زاد راہ علاحدہ عنایت کرتیں۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۹۰ء میں امام باندی صاحب نے امور خیر کے لیے اپنی کل املاک وقف کردی اور وقف نامہ میں مرزا دبیر کے خاندان نسلاً بعد نسل عشرہ محرم کی مجلیس پڑھنے کے لیے مقرر کردیا جو آج تک جاری ہے۔"[2]

عظیم آباد میں مرزا دبیر کے قدر داں بہت تھے۔ صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں کہ عظیم آباد میں اکثر دہلی والوں کے خاندان آ کے آباد ہوگئے تھے جو مرزا دبیر کی زبان کے قدر شناس تھے اور زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کو جو ہر شاعری سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی اتنی خاطر مدارات کی کہ مرزا دبیر نے پھر کسی طرف کا رخ نہ کیا اور عظیم آباد کے لوگوں کے خلق کی ہمیشہ تعریف کی۔ وہاں مرزا دبیر کے قدر شناس رئیسوں میں میر محسن صاحب اور میر عباس صاحب تھے۔ ایسے قدر دانوں کے لیے مرزا دبیر نے یہ رباعی پیش کی ہے:

ایں شہر بخاطر ملولاں شاد است   معمورہ خلق وحلم و عدل و داد است
ہر فرد بشر دفتر خلق ست دبیر   ایں شہر ز اخلاق عظیم آباد ست[3]

---

۱ مضمون "مرزا دبیر عظیم آباد میں" محمود علی صاحب مطبوعہ معاصر ۱۹۷۳ء ص ۶۱

۲ ایضاً، ص ۶۲ (راقم نے بھی ۱۹۷۴ء میں مرزا دبیر کے پڑپوتے مرزا صادق کو اس امام باڑہ میں سنا ہے جو اب تک وہاں جاتے ہیں) اضافہ۔ زندگی کے آخری دو برس نہیں گئے اور ۱۹۸۴ء میں انتقال فرمایا۔

۳ حیات دبیر ص ۱۰۵-۱۰۴

غرض عظیم آباد کا سفر مرزا دبیر کے لیے ہر لحاظ سے اچھا رہا اور کبھی اس سفر سے ناخوش نہ رہے۔ ابتدا میں اس کو جیسا پایا تھا وہی آخر تک رہا۔ بقول صاحب حیات دبیر عظیم آباد کی پہلی مجلس میں یہ دو رباعیاں بھی پڑھی تھیں:

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے — اس دور میں جور آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنو جنت تھا — آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

پہنچا جو کمال کو وطن[1] سے نکلا — قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا[2] چمن سے نکلا[3]

سفر کلکتہ

مرزا دبیر کو آخر عمر میں ضعف بصارت کی تکلیف ہوگئی تھی۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ (متوفی ۱۸۸۷ء) اس زمانہ میں ٹیا برج کلکتہ تشریف لے جاچکے تھے۔ وہاں آنکھوں کے کوئی جرمن ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر ٹیا برج میں بادشاہ کے مہمان تھے۔ واجد علی شاہ بادشاہ کے اشارہ سے ان کے کسی رفیق نے مرزا دبیر کو اطلاع کی کہ وہ اگر آجائیں تو آنکھوں کی تکلیف دور ہوگی۔ صاحب شمس الضحیٰ اس سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

> "واضح باد کہ ہرگاہ جناب مرزا دبیر صاحب مغفور بضرورت قدح چشم بہ کلکتہ تشریف بردند مہمان حضرت بادشاہ جمجاہ اعاد اللہ ملکہ گشتہ بکوٹھی نواب مونس الدولہ مقیم شد ند عرضداشت کہ بحضور سلطان عالم ابلاغ داشتند لوحش بہ ایں

---

۱ یہ رباعی۔ رباعیات دبیر ص ۷۳ پر درج ہے۔ مرتبہ خبیر۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنو

۲ راقم نے عظیم آباد (پٹنہ) میں سنا ہے کہ کسی نے "ثمر" اور "چمن" کو ملانے پر اعتراض کیا تو دوسری طرف کسی صاحب نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھا:

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

یہ سن کر معترض چپ ہوگئے۔ یہ جواب دراصل صفیر بلگرامی نے دیا تھا۔

۳ حیات دبیر ص ۱۰۳

دستخط خاص مزین شد۔
گر بسر و چشم من بیائی بر قلب نہم کہ کیمیائی۔ ۲۹ ذیحجہ ۱۲۹۱ھ فقط واقعی کہ
قدر دانی حضرت بادشاہ جمجاہ بہ نسبت جناب مرزا صاحب زائد ازاں ست کہ
بہ معرض تحریر در آید مثل آنکہ بمقام سلطان خانہ مبارک و بمقام سبطین آباد
مبارک ہنگام ملاقات استقبال جناب ممدوح [مرزا دبیر] فرمودہ ہمراہ خود
بردند و نیز برائے بازدید بجائیکہ جناب ممدوح تشریف آوردند در مجلس بالای
منبر قریب بست پنج بند کہ بتعریف جناب ممدوح نظم فرمودہ بودند بحضور خاص
و عام خواندند۔ دو مصرع ازاں حوالہ قلم

بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہوں   میں کمسنی سے عاشق نظمِ دبیر ہوں

ایں حالی است کہ بعد انتزاع سلطنت بوقوع آمدہ''[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں :

''جناب ممدوح [مرزا دبیر] ہنگام ورود کلکتہ متضمن عود بصارت نظم فرمودہ
برای ملاحظہ ناظرین درج میشود۔

امداد علی گاہ خفی گاہ جلی است   برمن ز ازل عین عنایات وی است

چوں مادہ دفع شد بگفتم تاریخ   چشم بد دور عین اعجاز علی است''[2]

(۱۳۴۱ - ۵۰ = ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)

صاحب حیاتِ دبیر اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں :

''اصل کتاب شمس الضحیٰ میں [جیسا کہ راقم نے اوپر تحریر کیا ہے] ۱۲۹۱ھ ہی
لکھا ہے اس لیے میں نے بھی یہی لکھ دیا مگر میرا خیال اور علم یہ ہے کہ مرزا
صاحب اواخر ۱۲۹۰ھ میں مٹیا برج گئے تھے۔ ۲۹ ذیحجہ ۱۲۹۰ھ کو یہ
عرضداشت مزین ہوئی کہ یہ غالباً ۱۲۹۰ھ کا آخیر دن تھا اور ۱۲۹۱ھ میں
قدح چشم اس ڈاکٹر نے کیا۔ چنانچہ آئندہ جو تاریخ عود بصارت کی مرزا
صاحب کی فرمائی ہوئی ہے اس سے ۱۲۹۱ھ نکلتے ہیں۔ اس سے میرے خیال

---

۱ شمس الضحیٰ ص ۱۶۶۔ ۱۶۵

۲ شمس الضحیٰ ص ۱۶۷

وعلم کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ پس صحیح ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ ہی ہے۔[1]

ثابت لکھنوی کا خیال صحیح ہے کیونکہ مرزا دبیر کی کہی ہوئی تاریخ عود بصارت سے صاف ظاہر ہے کہ آنکھیں ۱۲۹۱ھ میں ٹھیک ہوگئیں لہٰذا ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء بجائے ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء صحیح ہے۔ صاحب شمس الضحیٰ سے سہو ہوگیا ہے۔

سفرِ آخرت

صدمات اواخر عمر انتقال فرزند (محمد ہادی حسین عطارد)

سفرِ آخرت سے دو سال قبل مرزا دبیر کو بہت سخت روحانی صدمے پہنچے۔ مرزا دبیر کے نوجوان فرزند محمد ہادی حسین تخلص عطارد[2] کا انتقال ۲۰ برس کی عمر میں ۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء کو اچانک تخمہ سے ہوگیا۔ مرزا دبیر کو اس کا سخت صدمہ ہوا اس صدمہ عظیم کے بعد مرزا دبیر کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ادھر تو نورنظر کے ساتھ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی، ادھر جو وہ رات میں چند گھنٹہ سورہتے تھے وہ سونا بھی نورنظر کے داغ کی نذر ہوگیا۔ رات کو بارہ بجے دوستوں اور شاگردوں کا مجمع برخاست ہوتا تھا۔ مرزا

---

۱ حیات دبیر ص ۹۹

۲ سال ولادت ۵ شعبان ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء یہ شاعر مبتدی تھے۔ سلام اچھا کہتے تھے۔ مولوی سید علی صاحب کامل عرف علی میاں مرحوم نے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے:

روزگار ست گلشن نیرنگ	از جمال امید و صورت بیم
صبر کن صبر بر جفائے فلک	اے تراطبع و رائے ہر دو سلیم
از علی اکبر حسینؑ شہید	یاد کن در عزائے نجل کریم
بود ہادی حسین رعنا تر	یا کہ فرزند آں امام کظیم
آہ از مرگ نوجوانئے او	پیش روے پدر بحال سقیم
برگزیدت خدا برائے بلا	شکر کر شکر اے نبیہ حلیم
نور چشم ترا نہاد بسر	ایزد از لطف سرمد و بیم
غم ز دفنش مخور کہ بعد رحیل	او بہ کنج لحد نہ ماند مقیم
ہاتفے گفتہ است دوش بمن	شد عطارد مکین بیت نعیم

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، (حیات دبیر ص ۱۰۶۔ ۱۰۵)

دبیر پھر نماز شب اور وظائف پڑھتے تھے۔ اس کے بعد اگر کچھ کہتے تھے تو لکھ نہیں سکتے تھے۔ میر محمد رضا ظہیر راوی ہیں کہ :

''اکثر میں دن میں آٹھ نو بجے جب جاتا تھا تو سوچ میں بیٹھا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ عرض کرتا۔ کیوں جناب کیا فکر فرما رہے ہیں۔ فرماتے۔ بھئی محمد رضا رات کو تین بند کہے تھے۔ کچھ مصرعے یاد رہ گئے کچھ بھول گیا۔ اب بہتیرا سوچتا ہوں نہ وہ مصرعے یاد آتے ہیں نہ ویسے دوسرے مصرعے خیال میں آتے ہیں۔ میں عرض کرتا تھا کہ حضور نے بھائی محمد جعفر کو جگادیا ہوتا' وہ لکھ لیتے تو آبدیدہ ہوکر فرماتے کہ ہاں ایک ہادی حسین کو تو راتوں کو جگا جگا کر ہاتھوں سے کھو چکا، اب خدانخواستہ ان کو جگاؤں تو ان سے بھی ہاتھ دھوؤں۔''[1]

وفاتِ مرزا نظیر برادر عینی مرزا دبیر

دوسرا صدمہ روحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر کی وفات کا ہوا جو اٹھائیسویں صفر ۱۲۹۱ھ کو انتقال کرگئے۔ بڑے بھائی ہوکر بھی یہ مرزا صاحب کے تقدس وکمال کے سبب سے مرزا دبیر کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے ان سے چھوٹے ہوں۔ پہلے یہ بھی میر ضمیر کے شاگرد تھے بعد میں انہیں کے حکم سے مرزا دبیر کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ یہ مشہور ومقبول مرثیہ :

......''ہر آہ علم[2] ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا''[3] نظیر مرحوم کا ہی ہے اس طرح ان

---

۱ حیات دبیر ص ۱۰۶۔ ۱۰۵

۲ اس سلسلے میں کلام دبیر کے تحت آئندہ صفحات میں بحث ہوگی۔

۳ ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا۔ سب ہیں ہمہ تن گوش یہ افسانہ ہے کس کا
۱۶۱ بند کا یہ مرثیہ مراثی دبیر جلد اول نولکشور پریس لکھنو (مارچ ۱۹۳۹ء) میں چوتھے مرثیہ کے بعد غلطی سے دبیر کے نام سے چھپ گیا ہے (حیات دبیر ص ۱۰۶) ب۔ مرزا نظیر کے ایک فرزند مرزا محمد عباس سفیر تھے۔ مرزا نظیر کو خود تو کیمیا کی دھت تھی اسی میں محو رہتے تھے۔ سفیر مرحوم کو خود مرزا دبیر مرحوم نے عروض وغیرہ پڑھایا تھا۔ ان کے علاوہ اور دو فرزند محمد تقی اور محمد

کے کئی مرثیے ایسے ہیں جن کو ناواقف راز مرزا دبیر کا کلام سمجھتے ہیں۔[1]

یہاں تک کہ ایک مرثیہ "سرفراز" ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء کے محرم نمبر میں "نظیر اکبر آبادی کا ایک مرثیہ" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ حقیقت میں وہ بھی مرزا نظیر ہی کا ہے کیونکہ اس میں نظیر اکبر آبادی کی زبان نہیں ملتی اور نہ ہی کوئی اور مرثیہ نظیر اکبر آبادی کا آج تک سامنے آیا ہے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ یہ نظیر برادر مرزا دبیر ہی کا مرثیہ ہے۔[2]

وفاتِ میر انیس برادر دینی مرزا دبیر

ایک اور زبردست صدمہ مرزا دبیر کو میر انیس کی وفات کا ہوا۔ ادھر بروز دوشنبہ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء کو قریب مغرب میر ببر علی انیس کا انتقال ہوا ادھر مرزا دبیر کی زندگی اور شاعری بے مزہ ہوکر رہ گئی۔ اکثر میر صاحب کے کمالات کا ذکر کرکے فرمایا کرتے تھے کہ اب نہ پڑھنے کا لطف ہے نہ کہنے کا مزہ ہے اب ہمیں بھی چراغ سحری سمجھ لو۔ کوئی جھونکا آیا اور خاموش ہوگئے۔

مرزا دبیر نے میر انیس کی تاریخ وصال کہی اور اسے میر باقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھا۔ تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔[3]

یہ قطعہ تاریخ وفات اگرچہ ایک زمانہ میں موضوع بحث بھی بنا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا مگر یہ اس قدر مقبول ہوا کہ مزار انیس پر لگائے جانے والے پتھر پر اسے

کاظم اور ایک دختر تھیں (حیات دبیر ثابت ص ۱۰۷) ج۔ مرزا دبیر نے میر انیس کی تاریخ وصال میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وادریغا عینی و دینی دوبازویم شکست   بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس
(شمس الضحیٰ، ص ۱۷۰)

۱   حیات دبیر ص ۱۰۷

۲   سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۶ھ صفحہ نمبر پڑھا نہیں گیا کیونکہ کاغذ بوسیدہ ہوگیا ہے اور صفحہ نمبر کی جگہ کرم خوردہ ہے۔ مرثیہ ۱۸ بندوں پر مشتمل ہے۔

۳   حیات دبیر ص ۱۰۷

کندہ کروایا گیا۔ راقم الحروف نے اسے سید مسعود حسن رضوی ادیب (مرحوم) کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور پتھر پر خود موصوف کا شعر کندہ کرایا گیا تھا:

چیست ایں ایوان عالی ونفیس　　خواب گاہِ شاعرِ اعظم انیس

اب یہ پتھر مزارِ انیس پر نصب کردیا گیا ہے۔ ''حیات دبیر''[1] میں اس قطعہ کے گیارہ شعر چھپے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی کتاب ''شاعر اعظم''[2] میں تیرہ شعر دیے ہیں۔ شمس الضحیٰ[3] میں چودہ شعر چھپے ہیں جو ذیل میں دیے جاتے ہیں:

داد خواہم یا غیاث المستغیثیں الغیاث　　از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس
عبرۃٌ للناظرین گردید افلاک و زمین　　دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس
وادریغا عینی و دینی دوباز و یم شکست　　بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس
یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں　　چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس
الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوق نظم　　شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس
پوست کندہ موشگافان سخن گو یند حیف　　ہر سرِ مو بررگ جانست نشتر بے انیس
اے ہوس چنداں دل آسودہ درعالم کجاست　　دفتر اجزای معنی گشت ابتر بے انیس
اشک را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما　　رفتہ رفتہ رفت تا دامان محشر بے انیس
بسکہ در برغم بسوز د داغ بر بالاے داغ　　نیست جز طاؤس دل پروانہ دیگر بے انیس
نیست ایام تماشائی چمن اکنوں کہ ہست　　دانہ شبنم سپند و غنچہ مجمر بے انیس
تازہ مضموں نظم میفرمود در ہر بحر شعر　　چشمہ چشم شود ہم چشم کوثر بے انیس
سال تاریخش بزبر وبینہ شد زیب نظم　　طورسینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس (۱۲۹۱ھ)
درسنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف　　گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین　　طورسینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس (۱۸۷۴ء)

۱　ایضاً ص ۱۰۸۔ ۱۰۷

۲　شاعر اعظم ص ۲۲

۳　شمس الضحیٰ ص ۱۷۰

لکھنو میں آخری مجلس

میر انیس کی وفات کے بعد اول تو کسی چیز میں دل نہ لگتا تھا، پھر مرثیہ پڑھنا تو اور بھی مشکل کام تھا۔ لکھنو میں مرزا دبیر نے کوئی مجلس ۱۲۹۲ھ میں نہ پڑھی۔ آخری مجلس ۲۵ ذی قعد ۱۲۹۱ھ کو پڑھی تھی جس کا مطلع تھا: ''انجیل مسیحِ لب شبیر ہیں عباسؑ''۔ یہ مرثیہ ناتمام تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے خاموش ہوگئے تو لوگوں نے عرض کی حضور کچھ اور عنایت ہو تو مرثیہ کا آخری سادہ ورق دکھا کر کہا کہ اتنا ہی کہا ہے۔[1]

عظیم آباد کا آخری سفر

میر انیس کی وفات کے بعد مرزا دبیر تین مہینے اور ایک دن زندہ رہے مگر برابر علیل رہے۔ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اصرار سے محرم ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے مگر عشرہ محرم میں ہر روز مجلس جناب مرزا اوج پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے کہ علیل تھے۔ کچھ سادات و مومنین دور دور کی بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ محرم کی مجالس کو چھوڑ کر مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخر نویں محرم کو بعض مومنین نے مرزا دبیر سے افسوس کے لہجہ میں عرض کیا کہ ہم حضور کے سننے کو آئے تھے اپنے گھر کی مجلسیں بھی چھوڑیں اور حضور کو نہ سنا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ حضور علیل ہیں۔ مرزا دبیر نے جواب دیا کہ انشاء اللہ آج میں پڑھونگا جتنا پڑھا جائے گا۔ خدا جانے پھر عشرہ محرم نصیب ہو یا نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب منبر پر تشریف لے گئے۔ چند رباعیات پڑھ کر چند بند بین کے پڑھے۔ ایسی رقت ہوئی کہ اکثر آدمی بیہوش ہوگئے۔ مرزا دبیر منبر پر رویا کیے۔ طاقت خود سے اترنے کی نہ تھی۔ بڑی دیر کے بعد جب جوش رقت کم ہوا۔ لوگوں نے منبر سے اتارا۔ بعد سویم ۱۲محرم ۱۸۷۵ء کے ایک دو روز راستہ میں آرہ و حسین گنج میں مقام کرتے ہوئے لکھنو تشریف لائے۔ ورم کبد کی شدت تھی۔ علاج ہوتا رہا مگر مرض الموت کا کیا علاج۔ آخر اسی عارضہ ورم کبد میں تیسویں

---

۱ حیات دبیر ص ۱۲۹

ماہ محرم کی رات میں قریب صبحِ صادق یہ آفتاب شاعری مداحی غروب ہوگیا۔

دن میں جنازہ اٹھا۔ دریا پہ غسل میت کے واسطے جنازہ کو لے گئے۔ ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ علماء و صلحاء و شعراء تھے اور اکثر مرحوم کی یہ رباعی پڑھتے ہوئے روتے چلے جاتے تھے:

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں　　منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل　　تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

مولانا سید ابراہیم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے گھر پر دفن ہوئے۔ مقبرہ[1] اس وقت تک برقرار ہے۔[2]

اودھ اخبار لکھنو نے وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

> ''بہتر (۷۲) سال کا سن تھا طاقت جواب دے چکی تھی۔ امسال عظیم آباد تشریف لے گئے اور نویں تاریخ کو شائقین و سامعین بہت جمع تھے۔ مرثیہ طولانی بہت زور و شور سے پڑھا۔ اس وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا۔ ریل پر اپنے گھر آئے اور دس دن تک نہایت علیل رہے۔ ۲۹ محرم کو عاشق حسینؑ نے اس دارِفانی سے کوچ فرمایا اور رونق افزائے دارالبقاء ہوئے۔ گروہ مومنین و مسلمین خواص و عوام جنازے کے ہمراہ تھا۔ گریہ بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔''[3]

جناب مرزا دبیر کی وفات کے متعلق ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء سے ۳۰ جون ۱۸۷۵ء تک اودھ اخبار میں چھپنے والی خبریں اختصار کے ساتھ یوں درج کی جاتی ہیں:

۱　یہ مقبرہ اب منہدم ہوتا چلا جارہا ہے۔ افسوس ایسے عظیم شاعر کے مزار کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ یہ مقبرہ مرزا دبیر کے اس مکان میں ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ نخاس لکھنو میں وہ گلی اب بھی ''کوچہ مرزا دبیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ معمولی آدمیوں کے نام سے آج کل بڑی شاہراہیں یادگار کے طور پر منسوب ہیں مگر افسوس اس کوچہ کا نام لینے والے بھی رفتہ رفتہ کم ہوتے جارہے ہیں۔

۲　حیات دبیر ص ۱۳۰۔ ۱۲۸

۳　بحوالہ ''اودھ اخبار'' لکھنو۔ ۔ ۔ مرزا دبیر نمبر۔ ''ماہِ نو'' راولپنڈی ستمبر/اکتوبر ص ۴۳

"جناب مرزا دبیر کی وفات"

"ہیہات ہیہات ہیہات۔ صد ہزار حیف کہ اقلیم سخن لٹ گئی' آفتاب کمال غروب ہوگیا۔ مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ یعنی افصح الفصحاء ابلغ البلغاء سحبان زمان' طوطی ہندوستان' شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے وقفِ اندوہ انیس ہوکر شمع ساں اپنے جسم ناتواں کو گھلا دیا اور آخرکار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض ورم کبد وغیرہ میں اس عندلیب معانی نے گلزارِ اقدس کا رستہ لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس واقعہ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے ہر کہ و مہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان قلم اندوہ رقم سے نہیں ہوسکتا۔ واضح ہو کہ منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ تمام عمائد و امراء اور ہزار ہا اشخاص لکھنو کے اس خبر وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جناب مغفور کے مکان پر چلے آتے ہیں، روتے ہیں، پیٹتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اللہ تعالی غریق رحمت کرے۔ تجہیز و تکفین کی کیفیت آئندہ رقم ہوگی۔ ایسے شہنشاہ سخنوری کے اٹھ جانے سے کسی کو بھی اس وقت تاب تحریر اور طاقت تقریر نہیں ہے۔ ہائے ہائے کیسا شخص مرگیا۔"[1]

شاد عظیم آبادی کا یہ کہنا صریحاً غلط ہے کہ "مرزا صاحب نے ۱۲۹۲ھ میں ربیع الاول یا ربیع الثانی میں رحلت کی۔"[2]

قطعات تاریخ وفات

وفات پر اہل علم' شعراء و ادباء کے علاوہ عوام نے بھی شدید رنج و ملال کا اظہار کیا۔ ان کے انتقال پر متعدد شعراء نے تاریخہائے رحلت کہیں۔ ذیل میں چند نامور شعراء کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں۔ منیر شکوہ آبادی[3] نے متعدد تاریخیں نکالیں، جن

---

۱ ماہ نو، دبیر نمبر ص ۴۲۔۴۳

۲ پیمبران سخن ص ۱۴۸

۳ منیر کے حالات اس مقالہ کے آخری باب "مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ" میں ملاحظہ کیجیے۔

میں چند یہ ہیں:

"وحید عصر جناب دبیر معجز دم	کہ سر عطارد گردوں بپائے آسودہ
ازیں سرائے سپنجی چورخت خود برداشت	بہ نزد آل نبیؐ در بہشت آسودہ
منیر سال دمہ و روز د وقت و تاریخش	پگاہ و سلخ و سہ شنبہ مہ عزا بودہ[1]

۱۲۹۲

بے اجل مردم ز مرگ حضرت مرزا دبیر	میر سد تا آسماں فریاد ہا ہاہای من
در حریم رحمت و غفران و رضواں آرمید	قبلہ ایمان معنی و خدا وند سخن
سال ہجری و مسیحی نظم کردم اے منیر	بے نظیر دہر یکتا بوداں استاذِ فن[2]

۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ

دریغ ذاکر یکتا' محقق بے مثل	فرید عصر خداوندِ کاملانِ فن آہ
مسیح اوج بلاغت جناب پاک دبیر	کلیم طور منا بر خدیو انجمن آہ
منیر سوگ نشیں نظم کرد تاریخش	بلند فکر مفید ائمہ سخن آہ

(کلیات منیر، ص ۵۴۵) ۱۲۹۲ھ

دو روز ہوئے مرگ دبیر ہمداں کو	آج اس مہ برج ہمدانی کا سوم ہے
جو زندۂ جاوید ہے ارباب سخن میں	اس عیسی اعجاز بیانی کا سوم ہے

تیجے کی بھی تاریخ منیر آئی مرے ہاتھ
روح القدس عرش معانی کا سوم ہے"[3]

(کلیات منیر ص ۵۴۷) ۱۲۹۲ھ

---

۱ کلیات منیر ص ۵۴۵

۲ کلیات منیر ص ۴۶۔ ۵۴۵ (کلیات منیر میں سہوِ کاتب سے استادفن چھپا ہے۔ جسے ڈاکٹر اکبر حیدری نے 'شاعر اعظم' میں اسی طرح نقل کر دیا ہے (راقم)

۳ منیر شکوہ آبادی نے اور تاریخیں بھی اس سانحہ عظیم کی کہی ہیں جو ان کے کلیات میں چھپی ہیں۔ ملاحظہ ہو "کلیات منیر" مطبوعہ ثمر ہند لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ص ۴۷۔ ۵۴۵

مولوی عبدالعلی آسی مدراسی (جو فرقہ احناف کے ایک مشہور و مستند عالم و شاعر تھے) نے بھی لاجواب تاریخ کہی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

چوں داشت ذوق ذکر شہیدان کربلا | سلخ محرم آمدہ روز وصال او[1]

مرزا صاحب کے سویم کی مجلس میں جو میر باقر تاجر کے امام باڑہ میں ہوئی تھی مرزا اوج نے عین انتشار اور کمال رنج میں یہ قطعہ تاریخ پڑھا تھا:

خاک برسر کن صبا در ماتمِ سلطان نظم | حیف شد بر باد اقلیم بلاغت بے دبیر
بنگر اندر بوستان ہر نخل نخل ماتم است | در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر
نیست آں بسم اللہ دیباچہ معنی و لفظ | ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر
غیر ممکن طالب دیدار را شام و سحر | اندر ایں فرقت سرا یک لحظہ راحت بے دبیر
نے دلِ رنجور را آرام بے وصلِ حبیب | نے مذاقِ زندگانی را حلاوت بے دبیر

مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت
آسماں بے مہر و دیہیم فصاحت بے دبیر[2] ۱۲۹۲ھ

آغا حجو شرف نے ایک ہی تعزیتی قطعہ میں میر انیس اور مرزا دبیر کی تاریخیں ایک ہی مصرع میں پیش کیں:

آنکھوں میں میرے ہیں یہ آنسو بھرے ہوئے | لکھتا ہوں واقعہ میں انیس و دبیر کا
روز ازل سے عالمِ ایجاد میں پتا | ان کی نظیر کا ہے نہ ان کی نظیر کا
جنت میں اپنے پہلووں میں اس نے دی جگہ | جنت میں جو امام ہے برنا و پیر کا
آخر غمِ انیس میں بے دم ہوئے دبیر | غم ہم صفیر نے یہ کیا ہم صفیر کا
بے شبہ دونوں خاص یہ بندے خدا کے تھے | دم بھرتے تھے یہ عاشقِ ربّ قدیر کا
جانے کو بارگاہِ خدا و رسولؐ میں | بخشا لقب حسینؑ نے ان کو سفیر کا
دو داغ دونوں کے سن رحلت میں اے شرف | ہے ہے غمِ انیس میں غم ہے دبیر کا[3]

۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

---

۱ حیات دبیر ص ۱۳۰

۲ حیات دبیر ص ۱۳۱ـ۱۳۰

۳ دیوان آغا حجو تخلص شرف۔ مطبع جعفری لکھنؤ ص ۳۶۳

منشی محمد مرزا جان نے بھی ایک مصرع سے میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کی تاریخ نکالی ہے :

فلک کے یاد رہیں گے ہمیں یہ جور وستم　　　که ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ　　　غم انیس میں ہے ہے دیا دبیر کا غم[1]

۱۲۹۲ھ　　　۱۲۹۱ھ

سید حسن لطافت ابن امانت لکھنوی نے بھی تاریخ وفات کہی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے :

ہاں الم سے سر اٹھا کر لکھدے تاریخِ وفات　　　باغ بے بلبل ہے ہندوستاں لطافت بے دبیر[2]

۱۲۹۲ھ

افضل حسین ثابت لکھنوی مصنف حیات دبیر نے بھی تاریخ کہی تھی جس کے دو مصرعے یہ ہیں اور ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے :

آسماں بے ماہ تاباں سدرہ بے روح الامیں　　　طور بے موسیٰ، ادب بے شمع منبر بے دبیر[3]

۱۲۹۲ھ　　　۱۲۹۲ھ

جناب سید احمد حسین فرقانی نے ۱۰۷ اشعار پر مشتمل قطعہ تاریخ وفات کہا ہے جس کے آخر کے چند شعر یہ ہیں:

خضر چنیں گفت بمرگ دبیر　　　خضر بسر چشمہ احساں رسید　　　۱۲۹۲ھ
زونفس الیاس و چہ نیکو نفس　　　تن بہرم روح بجاناں رسید　　　۱۲۹۲ھ
گفت امام فصحائے عرب　　　مور فصاحت بسلیماں رسید　　　۱۲۹۲ھ
گلشن فردوس چنین داد بوے　　　شیفتہ جاں بلبل جاناں رسید　　　۱۲۹۲ھ
واں قلم تعزیتش سفت در　　　بر علم شاہ شہیداں رسید　　　۱۲۹۲ھ
نیز ز فرقانی فانی شنو　　　عاشق صادق بر سلطاں رسید[4]　　　۱۲۹۲ھ

۱　دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی ص ۴۳

۲　ریاض لطافت مطبع شوکت جعفری ۱۳۰۵ھ ص ۳۶۳

۳　حیات دبیر ص ۱۳۱

۴　حیات دبیر ص ۱۳۲۔ ۱۳۱

خوف طوالت سے اور تاریخیں درج نہیں کی جاتی ہیں کہ ضروری بھی نہیں۔ اتنے قطعات منظومہ سے مرزا دبیر کی مقبولیت کا اندازہ کرنا بہت آسان ہے۔ وہ نہ صرف مقبول تھے بلکہ علماء، شعراء اور ادباء کو ان سے عقیدت تھی۔

ان قطعات میں رسمی طور پر سنِ وفات نہیں نکالا گیا ہے بلکہ ان میں شاعر کے خلوص محبت اور عقیدت کا اظہار ہے۔ ان قطعات سے مرزا دبیر کی مقبولیت کے محرکات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مرزا دبیر میں شاعر، فنکار، عالم و فاضل ہونے کے علاوہ اعلیٰ انسانی صفات پائے تھے جن پر ان کے معاصرین فریفتہ رہتے تھے۔ مرزا دبیر کی شخصیت کی خوشبو ان کی وفات کے بعد مشام جان کو معطر کرتی رہتی تھی جس سے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

اس دور کے شعراء، ادباء اور شائقین شعر و ادب کو مرزا دبیر کی رحلت سے دوگنا صدمہ ہوا تھا کیونکہ چند ماہ قبل میر انیس کا انتقال ہوچکا تھا۔ عام احساس تھا کہ مرثیہ گوئی کی بزم سونی ہوگئی ہے۔ میر انیس کی وفات کے بعد انھیں اپنے زخموں کا مداوا مرزا دبیر کی صورت میں حاصل تھا لیکن مختصر مدت کے درمیان ان کا داغ مفارقت دے جانا شائقین مرثیہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا جس کا احساس مذکورہ بالا قطعات یا اس دور کی دیگر تعزیتی نظموں اور قطعات کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

ان قطعات کے مطالعہ سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مفروضہ انیسیوں اور دبیریوں کی جماعتیں باہمی طور پر ہمہ تن کشاکش میں مبتلا نہیں رہتی تھیں بلکہ دونوں بزرگوں کے انتہا پسند معتقدوں کے علاوہ شائقین مرثیہ کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اپنے دونوں عظیم شاعروں سے یکساں طور پر محبت اور عقیدت و خلوص رکھتے تھے۔ دونوں کی فنی بلندی کے معترف اور مداح تھے۔ ان کے یکے بعد دیگرے بزم مرثیہ خوانی سے رخصت ہونے پر کمال رنج و الم کا احساس کرتے تھے جس کی مثالیں متذکرہ بالا قطعات تاریخ ہائے وفات میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

O

باب دوم

شعری کارنامے

غزل گوئی

باب اوّل میں جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر میر ضمیر کے دائرہ تلمذ میں داخل ہونے سے قبل ہی شاعری کی ابتدا کر چکے تھے جب طبیعت میں شعریت موجود ہو اور شعر کہنے کی صلاحیت ہو تو خود بخود اس کا اظہار ہو جاتا ہے۔ پانی زمین کے اندر کہیں بھی چھپا ہوا ہو وہ بہنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ کلی کو کھلنا کون سکھاتا ہے۔ پھول مہکنے کی ادا کس سے سیکھ لیتا ہے۔ مالی کے ہاتھ میں صرف وہ ماحول فراہم کرنا ہے جس میں وہ تر و تازہ رہ سکے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ استاد کی محنت اور ریاضت کی کوئی اہمیت نہیں مگر صلاحیت شرط اوّل ہے، شاگرد میں صلاحیت ہو تو استاد کی محنت کا پھل اچھا ہوسکتا ہے ورنہ سب ضایع ہو جائے گا۔ اگر شاد کی روایت پر یقین کر لیا جائے کہ مرزا دبیر نے میر ضمیر کے مرثیہ میں کچھ بند جوڑے جس سے متاثر ہو کر موصوف نے دبیر کو طلب کیا تو نتیجہ یہی برآمد ہوگا اور اگر ثابت لکھنوی کی روایت پر یقین کر لیا جائے کہ پہلی ملاقات میں مرزا دبیر نے میر ضمیر کے سامنے قطعہ پڑھا جس کو سن کر میر ضمیر اور دوسرے حاضرین پھڑک اٹھے اس صورت میں بھی یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔

مولوی صفدر حسین اور ثابت لکھنوی کے بیانات سے یہ واضح ہے کہ مرزا دبیر گیارہ یا بارہ برس کی عمر میں میر ضمیر کی خدمت میں پہنچے۔ بقول ثابت، مرزا دبیر نے اس وقت ایک قطعہ پڑھا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر شعر گوئی کا آغاز کر چکے تھے۔

مولوی صفدر حسین اس موقع پر تحریر کرتے ہیں کہ مرزا دبیر نے غزلیات و ہزلیات و قصائد سے' اس کے بعد ہاتھ کھینچ لیا[1] اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر اس سے قبل شاعری کا آغاز کر چکے تھے۔

شاد عظیم آبادی کہتے ہیں کہ مرزا دبیر نے ضمیر کے مرثیہ میں بند جوڑے اور انہوں نے خوش ہو کر اپنے پاس بلوالیا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر اس

---

۱ شمس الضحیٰ، ص ۹۷

سے پہلے شعر گوئی کرتے تھے۔

مظفر حسین ملک اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں:

''اودھ اخبار کے شمارہ مورخہ ۱۲مارچ ۱۸۷۵ء سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا(مرزا دبیر) کی شعر گوئی کا آغاز بہت کم یعنی پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے ہو چکا تھا۔ چونکہ مرزا کی ولادت ۱۲۱۸ھ کی ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۲۳۳ھ یا ۱۲۳۴ھ سے ہوا۔''[1]

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب فاضل مقالہ نگار نے شمس الضحیٰ اور حیات دبیر کے بیانات کا حوالہ دیا ہے اور اس بات کو مان لیا ہے کہ مرزا دبیر گیارہ یا بارہ برس کی عمر میں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء یا ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں میر ضمیر کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے یہ کیسے مان لیا کہ مرزا دبیر کی شاعری کا آغاز ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء یا ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں ہوا۔

مولوی صفدر حسین، افضل حسین ثابت لکھنوی اور شاد عظیم آبادی کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کی شاعری کا آغاز کم سنی میں گیارہ یا بارہ برس کی عمر یعنی ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ سے قبل ہو چکا تھا۔ راقم الحروف کو اخبار اودھ کا متذکرہ شمار دستیاب نہ ہوسکا ورنہ ممکن ہے کہ کچھ اس پر اور روشنی پڑتی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا دبیر نے شاعری کی ابتداء کس صنف سخن سے کی۔ مدنظر رہے کہ تمام اہم شاعروں نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا۔''[2]

مولوی صفدر حسین لکھتے ہیں:

''(مرزا سلامت علی دبیر) ......طبع شریف خود را متوجہ انشاء اشعار و

---

۱ ''مرزا دبیر'' ص ۱۲۶ مقالہ برائے پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ۔ کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی سے سید عابد علی عابد کی زیرنگرانی لکھا گیا ہے۔

۲ آب حیات، ص ۵۳۷

تنظیم مضامین آبدار دید از نظم غزلیات و ہزلیات ولغویات بلکہ قصائد مدح
ملوک وسلاطین و حکام و وصف امراء ذوی الاحتشام دست کشید۔"[1]

اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر نے اس سے قبل غزلیں کہی تھیں۔

"تذکرہ بزم سخن" جو ۱۸۸۱ء میں چھپا ہے میں بھی مرزا دبیر کے نمونہ کلام کے طور پر یہ کہہ کر کہ "بیتے از گفتارش دست ندارد"[2] غزل ہی کا ایک شعر مولف نے دیا ہے۔ شعر یہ[3] ہے:

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا
عجب ناز واوا سے اوس نے کاٹا میری گردن کو

تذکرۂ خوش معرکہ زیبا[4] کے مولف نے بھی غزل کا ہی ایک شعر دبیر سے منسوب کرکے دے دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ شعر کہ اکثر دوستوں کی زبان پر اس کا (مرزا دبیر کا) سنا ہے لکھا جاتا ہے:

مے سے توبہ کی ستمگر نے غضب تو دیکھو
جبکہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا"[5]

تذکرۂ نادر میں مرزا دبیر کی ایک غزل کے پانچ شعر درج ہیں۔ یہ وہ غزل ہے جو مرزا دبیر نے مشاعرہ فتح الدولہ برق (متوفی ۱۸۵۷ء) میں بہ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۲۷ء) پڑھی تھی مطلع ہے:[6]

---

۱ شمس الضحیٰ، ص ۹۷

۲۔۳ تذکرہ بزم سخن۔ ابوالنصر سید علی حسن خان مطبع نامی مفید عام آگرہ ۱۸۸۱ء ص ۴۸

۴ بقول مصنف "سراپا سخن" ناصر اپنا تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ھ میں لکھ چکے تھے۔ تذکرہ سراپا سخن جو ۱۸۵۳ء میں تمام ہوا ہے میں ناصر کے پانچ دواوین اور ایک تذکرہ کا ذکر ملتا ہے۔

۵ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا مولفہ سعادت خان ناصر۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ لاٹوش روڈ لکھنو، جولائی ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۴

۶ تفصیل کے لیے راقم کا مضمون "مرزا دبیر کی جذبات نگاری" مطبوعہ "ہمارا ادب" ۱۹۷۴ء، اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سرینگر کشمیر، ملاحظہ فرمایئے۔

اگر وہ غیرت شمشاد جائے سیر گلشن کو
گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن کو

اور مقطع ہے:

دبیر آئے گا کب وہ بھول کر گورغریباں میں
جو اکثر روندتا ہے ناز سے پھولوں کے خرمن کو[1]

بقول ڈاکٹر اکبر حیدری مرزا کلب حسین نادر نے اس غزل کو مخمس کیا اور اسے دیوان غریب جو اس نے ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں تصنیف کیا(دیوان غریب تاریخی نام ہے) میں شامل کیا ہے۔[2]

صاحب حیات دبیر رقم طراز ہیں:

''سنا ہے کہ مرزا صاحب کے تین دیوان مکمل تھے مگر انہوں نے خود مشتہر نہیں کیے۔ جس زمانہ میں ان کے داماد میر بادشاہ علی صاحب بقا مرحوم پسر میر وزیر علی صبا مغفور ابتداء''غزل کہتے تھے مرزا صاحب سے مانگ کر ایک یا دو دیوان وہ لے گئے۔ برسوں ان کے یہاں رہے۔ پھر ایک زمانہ میں ان کے یہاں آگ لگی۔ وہ دیوان بھی سنا ہے کہ اور اسباب کے ساتھ جل گئے۔ بعض غزلیں جو مرزا صاحب کے نام سے ایک آدھ تذکرہ میں پائی جاتی ہیں نہ معلوم ان کی ہیں یا نہیں۔''[3]

اس سے قبل ثابت لکھنوی اپنی اسی تصنیف میں مرزا دبیر کی غزل گوئی سے متعلق مفصل لکھتے ہیں۔ راقم ان کے بیان کو یہاں نقل کرتا ہے:

''غزلیں بھی ابتدا میں مرزا صاحب نے کہیں اور کثرت سے کہیں مگر خود ہی ان کے عدم شہرت کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے ...... مرزا صاحب کی غزلوں کے تین دیوان تھے۔ ان میں سے ایک دو

---

۱ تذکرہ نادر۔ میرزا کلب حسین خان بہادر مبارز جنگ، نادر(متوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء شاگرد شیخ ناسخ) مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ سرفراز پریس لکھنو ۱۹۵۷ء، ص ۶۶

۲ شاعر اعظم، ص ۲۰

۳ حیات دبیر، ۲۸۰

> دیوان میر بادشاہ علی بقا مرحوم اس زمانہ میں مانگ لائے تھے جب وہ مشق سخن کرتے تھے باقی ایک یا دونوں دیوان مرزا صاحب نے تلف کردیے وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب کے یہاں مکان لکھنو شاہ گنج میں جب آگ لگی تو اور اسباب کے ساتھ جل گیا۔ آج تک مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہیں ملی جو میں بالیقین کلام دبیر مرحوم کہہ کر ناظرین کے سامنے پیش کروں۔ ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان کی غزلیں گائی جائیں۔"[1]

اس کے بعد ثابت لکھنوی ایک دلچسپ قصہ رقم کرتے ہیں۔ جس کے راوی بقول ان کے، ان کے نانا[2] ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے قبل وہ ایک شادی میں مرزا دبیر کے ساتھ شریک ہوئے۔ ثقہ حضرات کے لیے مکان کا انتظام علاحدہ تھا۔ باقی لوگ سب محفل رقص و سرود میں تھے۔ رات کو انہوں نے جب دیکھا کہ مرزا دبیر نکات شعر و شاعری پر بات چیت کرنے میں محو ہیں تو وہ اٹھ کر دوسری محفل میں چلے گئے۔ رات کے ایک بجے مرزا دبیر نے بلوا کر فرمایا کہ ہم تم کو جنت کی طرف کھینچتے ہیں اور تم بھاگتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ محفل رقص و سرود میں اگر آپ کی غزل کوئی طوائف گائے تو وہاں بھی بخشش کا سامان ہوسکتا ہے۔ مزید استفسار پر انہوں نے اس غزل کا مطلع سنادیا جو حسین باندی طوائف نے سنائی تھی۔ مرزا دبیر سن کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے روز انہوں نے حسین باندی طوائف کو مرزا دبیر کے پاس دیکھا۔ دل میں شکوک پیدا ہوئے مگر الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ اور اس کے بعد جب حسین باندی سے ان کی ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مرزا دبیر نے اس کو بلایا تھا اور اس کو پانچ سو روپیہ دے کر یہ تاکید کردی کہ ان کی غزل کا کوئی شعر اس کے بعد کبھی نہ گائے۔[3]

---

۱ حیات دبیر، ص ۸۶۔ ۸۵

۲ میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی۔ شاگرد رشید مرزا دبیر جو مصنف تنقید آب حیات ہونے کے علاوہ اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔ مرزا دبیر کے شاگرد ۱۲ یا ۱۳ برس کی عمر میں ہوئے تھے اور ہر معرکہ یا مجلس میں ان کے ساتھ رہے تھے۔ مرزا دبیر نے ہی ان کا تخلص ظہیر یعنی مددگار رکھا تھا۔ وہ نائب رسالہ دار بھی تھے۔ ان کے والد ماجد میر فتح علی زمانہ شاہی میں رسالہ دار تھے۔ (دبستان دبیر، ص ۴۴۔ ۴۴۲)

۳ حیات دبیر، ص ۸۷۔ ۸۶

شاد عظیم آبادی کہتے ہیں:

"ایک دفعہ میں نے گستاخانہ عرض کیا کہ حضور (مرزا دبیر) نے غزلیں تو بہت فرمائی ہوں گی۔ ایسے متاثر ہوئے گویا میں نے کسی گناہ کو یاد دلوا دیا ہو۔"[1]

غرض مرزا دبیر نے خود کوشش کی کہ ارباب نشاط ان کی غزلیں نہ گائیں اور ان کا عاشقانہ کلام لوگوں میں مشہور نہ ہو۔ اس طرح ان کی خواہش پوری ہوئی۔

کاظم علی خاں لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر کی غزلیں ان کے ایام شباب کی یادگار ہیں۔ بعض تذکروں اور کتابوں میں مرزا صاحب کی محض چند مطبوعہ غزلیں ہی ملتی ہیں جو دبیر کے غزلیہ کلام کی کم یابی کی مظہر ہیں...... ان مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک قدیم قلمی بیاض میں مجھے مرزا دبیر کی ایک ایسی غزل بھی ملی ہے جو میری نظر سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزری ہے۔"[2]

متذکرہ غزل کا مطلع اور مقطع یہاں درج کیا جاتا ہے:

تل نمایاں نہیں ہے عارضِ جاناں کے تلے — ہے ستارہ کہیں روشن مہ تاباں کے تلے
اس کو مت برق سمجھ یہ جو فلک پر ہے چمک — ہے دبیر آہ تری گردشِ دوراں کے تلے

اس طرح مختلف تذکروں سے جو ان کی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں اور اب مطبوعہ قرار دی جاسکتی ہیں وہ ذیل میں تبرکاً پیش کی جاتی ہیں:

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں — قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزو ہوں غلام — چاہے مجھ کو بیچ لے بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا — پھل لگا ہے آج نخلِ دار میں

---

1. پیمبران سخن، ص ۱۳۳
2. آج کل دہلی۔ مضمون، مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار۔ کاظم علی خاں ص ۳۸
یہی مضمون بعض اضافوں کے ساتھ سرفراز لکھنو کے دبیر نمبر دسمبر ۱۹۷۶ء میں ص ۸۱۔ ۷۶ پر شائع ہوا ہے۔

سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں　　خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں

قبر میں روزن مری رکھنا ضرور　　مر گیا ہوں انتظار یار میں

میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی　　خون کے چھاپے لگے دیوار میں

گرمی خوں کی مرے تاثیر دیکھ　　پڑ گئے چھالے تری تلوار میں

بعد مردن میرے لاشے کو دبیر[1]

جا کے رکھنا کوچۂ دلدار میں

اگر وہ غیرتِ شمشاد جائے سیر گلشن کو

گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن[2] کو

گلوں[3] کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے

تو کیا روتی ہے شبنم منھ پہ رکھ کر گل کے دامن کو

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا

عجب ناز و ادا سے اس نے کاٹا میری گردن کو

میں کشتہ ہوں کسی گل کے مسی آلودہ دنداں کا

چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگِ سوسن[4] کو

۱　بہار گلشن حصہ دوم۔ مولفہ حافظ برکت اللہ رضا لکھنوی فرنگی محلی۔ مطبع مجتبائی ۱۹۰۵ء، ص ۱۸۔ یہ غزل لالہ سری رام نے بھی خمخانۂ جاوید ص ۱۶۰ میں درج کی ہے۔ صرف ترتیب کا فرق ہے اشعار کی تعداد یہی ہے۔ مرزا دبیر کی یہ غزل اتنی مقبول ہے کہ راقم الحروف نے بعض لوگوں کو سرینگر میں اسے مقطع کے ساتھ گاتے سنا ہے۔ افضل حسین ثابت نے دیباچہ سبع مثانی میں لکھا ہے کہ یہ غزل مرزا دبیر نے مرزا محمد رضا صاحب برق ابن مرزا کاظم علی صاحب استاد دبیرؔ کے بلائے گئے مشاعرے کے لیے ان کے اصرار پر کہی اور مشاعرے میں پڑھی۔ دیباچہ سبع مثانی ص ۲۳ کاظم علی خاں کو اس غزل کے مزید چار شعر ملے ہیں (تلاش دبیر ص ۳۹۸)

۲　یہی غزل مرزا دبیر نے بقول نادر مشاعرۂ فتح الدولہ میں پڑھی تھی۔

۳　خمخانۂ جاوید میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

چمن کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے　　تو کیا روتی ہے شبنم منھ پہ رکھ کے گل کے دامن کو

ص ۱۶۱

۴　ڈاکٹر اکبر حیدری نے (شاعر اعظم ص ۲۰) ''دیوان غریب'' کے حوالہ سے اس غزل کے چھ شعر

دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشم مہر تو رکھیو
کسی کے حال پر روتا[1] نہ دیکھا چشم سوزن کو

سوادِ نامۂ اعمال کیا یہ اشک دھوئیں گے
نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگِ برگ سوسن کو

دبیر آئے گا کب وہ بھول کے گور غریباں پر[2]
جو اکثر روندتا تھا ناز سے پھولوں کے خرمن کو

تل نمایاں نہیں ہے عارضِ جاناں کے تلے — ہے ستارا کہیں روشن مہِ تاباں کے تلے[3]
کیا ہی بے چین ہوئے نالۂ بلبل سن کر — ٹھہرے اک دم جو کبھی نخلِ گلستاں کے تلے
چاک سینہ کو مرے دیکھ کے ناصح بولا — لاکھوں ہی داغ ہیں یاں تیرے گریباں کے تلے
ہم تو چھٹنے کے نہیں ہدہو اس دام سے آہ — اب تو دل چاہے پھنسا زلفِ پریشاں کے تلے
ہاتھ چھاتی پہ مری رکھ کے یہ حکما[4] نے کہا — دل نہیں آگ ہے یاں سینۂ سوزاں کے تلے

نقل کیے ہیں۔ یہ شعر ان میں نہیں ہے۔ خم خانۂ جاوید (ص ۱۶۱) میں یہ شعر درج ہے۔ اغلب ہے کہ قافیہ دہرائے جانے کی وجہ سے نادر نے اس کو تضمین نہیں کیا۔

۱ ''شاعر اعظم'' میں بجائے ''روتا'' کے ''روئے'' لکھا ہے۔

۲ ''شاعر اعظم'' میں ''پر'' کے بجائے ''میں'' لکھا ہے۔

۳ دبیر کی یہ غزل ٹیگور لائبریری لکھنو یونیورسٹی میں موجود ایک قدیم قلمی بیاض کے صفحہ ۱۷۱-۱۷۰ پر درج ہے۔ جس کا نام ''غزلیات'' ہے اور وہاں نمبر ۴۳۱۸۱ء ۸۹۱ کے تحت محفوظ ہے۔ اس بیاض میں میر، مصحفی، لطف، ترقی وغیرہ کا کلام بھی درج ہے۔ کاظم علی خاں نے مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار (مطبوعہ آج کل ستمبر ۱۹۷۶ء سرفراز دبیر نمبر دسمبر ۱۹۷۶ء) میں جو نو دریافت غزل پیش کی ہے وہ یہی غزل ہے۔ اس مخطوطہ کی ابتداء میں جو شعراء کی فہرست دی ہے اس میں کئی اور شاعروں کی طرح دبیر کا تخلص بھی نہیں دیا ہے۔ دبیر کی غزل سے قبل ضبط کی چھ غزلیں ہیں اور اس کے بعد نازک کی غزلیں ہیں۔ مرزا دبیر کی صرف یہی ایک غزل ہے۔ اس کے بعد نازک کا یہ مطلع ہے:

کہتے ہیں بار بار یہ اوس کو سنا کے ہم — جائیں گے کسی پہ کبھی زہر کھا کے ہم

۴ یہ لفظ مشکوک ہے۔

اس کو مت برق سمجھ یہ جو فلک پر ہے چمک
ہے دبیر آہ تری گردش دوراں کے تلے

اس کے علاوہ غزل کا ایک مطبوعہ شعر اور ملتا ہے جو یہ ہے:

مے سے توبہ کی ستمگر نے غضب تو دیکھو
جبکہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا[1]

راقم کو مرزا محمد صادق صاحب (جانشین مرزا محمد طاہر رفیع ابن مرزا محمد جعفر اوج ابن مرزا سلامت علی دبیر) کے پاس ایک ایسا مخطوطہ ملا جس میں قصائد و غزلیات و قطعات وغیرہ ہیں، اس میں مرزا دبیر کی بہت ساری غزلیات موجود ہیں مگر مقطع بہت کم غزلوں میں ملتا ہے اور اکثر غزلوں میں مقطع کہا ہی نہیں ہے۔ بعض غزلیں ایسی ہیں جن کے مقطعوں میں تخلص کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے اگر اس جگہ تخلص "دبیر" لکھا جائے تو مقطع موزوں بھی ہوتا ہے اور بامعنی بھی۔ مگر انھوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے جس کی وجہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ فرصت پاکر نمایاں طور پر یا سرخی سے تخلص لکھ دیا جائے یا یہ کہ ان کے ساتھ وہ غزلیں منسوب نہ ہوں۔ اس لیے راقم نے ان ہی غزلوں میں سے جن میں مقطعے دیے ہیں، بعض کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے مطبوعہ ہونے کی بھی شہادت اب تک نہیں ملتی۔ اس لیے ان کو ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے:

زخم جو سینہ و جگر کے ہیں — انہیں ہاتھوں کے سب یہ چرکے ہیں
زلف سے سانپ کو ہے کیا نسبت — ایسے کالے غلام گھر کے ہیں
اہل دنیا سے لے کے تا فقراء — سب یہ طالب مزید زر کے ہیں
لختِ دل جو ترے ہیں دامن پر — گل کھلے اپنے چشم تر کے ہیں
چشم بر راہ گوش بر آواز — منتظر بیٹھے نامہ بر کے ہیں
قیس و فرہاد اور جناب دبیر — دشت اور کوہ ان کے گھر کے ہیں
وہ جو تم نے سنا ہے کوئے عشق — رہنے والے یہ اس نگر کے ہیں[2]

---

۱ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا ص ۳۸۴ مولفہ سعادت خاں ناصر مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو لکھنو۔ ۱۹۷۱ء

۲ اس غزل کے بھی سات شعر ہیں۔

یہ مانا [فلک] پر ستارے بہت ہیں — مگر داغ دل اپنے پیارے بہت ہیں
یہاں لوگ تھوڑے سے کچھ بڑھ گئے ہیں — عدم کی طرف کو سدھارے بہت ہیں
اسی واسطے ہے مزاروں پہ سنبل — کہ یہاں اوسکی زلفوں کے مارے بہت ہیں
نہ بولو جو غیروں میں صاحب نہ بولو — تسلی کو میری اشارے بہت ہیں
کسی ماہ کی مشتری ہم بھی ہوتے — میں اوس ڈھب کے سمجھو اتارے بہت ہیں

دبیر اب بھی مانو میں کہتا ہوں تم سے
وہاں لوگ دشمن تمہارے بہت ہیں[1]

آشکارہ زلف کے حلقے سے خالِ یار ہے — حلقۂ پرکار میں یا نقطۂ پرکار ہے[2]
طائر ان ارض ماہ نو سمجھتے ہیں جسے — بیضۂ گردوں سے پیدا ہنس کی منقار ہے
رحم ہے یہ اس صنم کے ہاتھ کا اے بخیہ گر — رشتۂ زناریاں بہر رفو درکار ہے
دیکھ کر بیمار کو میرے یہ کہتے ہیں طبیب — جو کہ مجنوں کو ہوا تھا یہ وہی آزار ہے
مرحبا العشق تجھ کو عدل یوں ہی چاہیے — واہ ری انصاف پرور کیا تری سرکار ہے
میں نے پوچھا آپ واقف ہیں دبیر[3] (ق) — سن کے فرمایا کہ ہاں پر ایسا بداطوار ہے
آنکھ اٹھا کر اوس طرف دیکھا نہ میں نے آج تک — گو کہ اک مدت سے روز و شب پسِ دیوار ہے

پہنا جس دن سے اس نے مالا ہے — چرخ میں ماہ نو نے ڈالا ہے[4]
رات دن کچھ جلن سی رہتی ہے — دل ہے پہلو میں یا کہ چھالا ہے
کھلے ہاتھوں میں ہائے ری وہ زلف (ق) — چونکتا دیکھ جس کو کالا ہے
ہم سے پوچھو تو ہم یہی بولیں — سانپ ہے پر کسی کا پالا ہے
بے وفائی کا تو نے اوس کی دبیر — کس لیے ذکر یہ نکالا ہے

---

۱ اس غزل کے بھی چھ شعر ہیں۔
۲ اس غزل کے دو مطلعے ہیں۔ یہاں مطلع ثانی دیا گیا ہے۔ مطلع اول کو چھوڑ کر پوری غزل ان ہی سات اشعار پر مشتمل ہے۔
۳ مخطوطہ میں یہ نامکمل مصرع اسی طرح لکھا ہے۔
۴ اس غزل کے مرزا صادق صاحب کے مخطوطہ میں نو شعر ہیں۔ یہاں چھ شعر ہدیہ ناظرین ہیں۔

اس نے چاہا رکھا رکھا نہ رکھا　　دوستی کا یہاں قبالہ ہے

قاصد جو نامہ لے کے پھرا کوئے یار سے　　رویا لپٹ کے خوب ہمارے مزار سے
جاری کفن میں اشک جو تھے چشمِ زار سے　　رویا لپٹ کے ابر ہمارے مزار سے
عارض پہ اوسکے دیکھ خطِ سبز کی نمود　　وصلی لکھی کسی نے تھی خطِ غبار سے
حیراں ہوں اوسکے کشتۂ لوحِ جبیں کو دیکھ　　آئینہ صاف کرتے ہیں جس کے غبار سے
وا حسرتا رہی یہ تمنا، تمام عمر　　اک دن دبیر کہہ کے پکارا نہ پیار سے[1]

دل اوس زلف کا جو دیوانہ ہوا ہے　　تو پھر رات سے درد شانہ ہوا ہے
کسی کی کہیں زلف شاید کھلی ہے　　جو تاریک سارا زمانہ ہوا ہے
عجب حسن دلکش ہے زلفوں کا اوسکی　　گرفتار جس کا زمانہ ہوا ہے
وہ ہنس ہنس کے کل مجھ سے یوں پوچھتا تھا　　تجھے کیا ہوا کیوں دیوانہ ہوا ہے
یہ بے وقت اس دھوپ میں دوپہر کو　　کدھر سے دبیر آج آنا ہوا ہے[2]

ہجر میں کس طرح سے جیتے ہم　　منھ ہمیں یار کو دکھانا تھا
اب تم آتے نہ یاں تو کیا کرتے　　کوئی باقی بھلا بہانا تھا
مفت میں غیر ہوگیا جو رنگ　　ہم پہ ہاتھ اس کو آزمانا تھا
اس طرف منتیں تھیں زاری تھی　　اس طرف عذر تھا بہانہ تھا
یاد وہ صحبتیں دلا نہ دبیر　　خواب تھا وہم تھا فسانہ تھا[3]

۱　اس غزل کے مرزا صادق کے پاس سات شعر ہیں جس میں سے پانچ یہاں دیے گئے ہیں۔
۲　اس غزل کے بھی مرزا صادق صاحب کے پاس ان پانچ اشعار سے زائد شعر ہیں۔
۳　اس غزل کا مطلع مرزا صادق صاحب کے پاس نہیں ملا۔ البتہ ان پانچ اشعار سے زائد شعر اس غزل کے ہیں۔ یہاں صرف پانچ شعر نمونہ کے لیے دیے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں انہوں نے ابتدا میں کہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تخلص موجود ہے اور جن میں تخلص نہیں دیا ہے وہ ممکن ہے اس زمانہ میں کہی ہوں جب ان کا مذاق بدل چکا ہو اور وہ مرثیہ گوئی کو ہی اپنا سرمایۂ شہرت اور سرمایۂ نجات سمجھنے لگے تھے۔ ایسی جو غزلیں مرزا صادق صاحب کے پاس ہیں اگر وہ واقعاً سب مرزا دبیر کی ہیں تو اب بھی ایک دیوان مرتب ہوسکتا ہے۔

رباعیات

مرثیہ گو شعراء نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعی کو بھی ترقی دی۔ ان میں میر انیس اور مرزا دبیر نے بہت اہم رول ادا کیا۔ بقول امداد امام اثر صاحب کاشف الحقائق: انیس و دبیر نے اردو رباعی نگاری کی شرم رکھ لی۔ رباعی جتنی مختصر صنف نظم ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی ہے۔ جب تک شاعر کا ذہن صاف نہ ہو خیال پختہ نہ ہو اور نظم کرنے کی بھرپور صلاحیت نہ ہو اس وقت تک رباعی نظم کرنا ممکن ہی نہیں۔ اب سو دو سو کی بات ہو تو کہیں کی ریاضت و مشقت سے یہ کام ہوسکتا ہے بشرطیکہ کوئی اور فکر نہ ہو مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ شب بھر میں ایک طویل مرثیہ نظم ہوتا ہے اور رباعیاں الگ۔ مرثیہ میں جہاں الفاظ کی جادوگری، صنائع کی جلوہ گری، طرز ادائیگی مضامین، اور روانی کی گنجائش ہے وہاں رباعی سے بہتر صنف سخن طرفگی مضامین کے لیے موجود نہیں۔ یوں تو رباعیاں بہت سے اردو شاعروں نے انیس و دبیر سے پہلے بھی کہی ہیں اور اس زمانہ میں بھی کہتے تھے مگر رباعی کی سنجیدگی اور مضامین کی پختگی جو اس صنف کی خاص خصوصیت ہے وہ اردو میں اس صنف کو انہیں شاعروں کے یہاں ملی۔ خبیر لکھنوی تحریر کرتے ہیں:

> ''اردو رباعیاں بہت سے شعراء نے کہیں .... مگر افسوس ان اساتذہ کی رباعیوں میں مضامینِ عالیہ کا فقدان ہے۔ کسی نے ہجو کہی کسی نے خوشامدانہ مضامین نظم کیے۔ اخلاقی مضامین خال خال ہیں۔''[1]

---

1 رباعیات دبیر مرتبہ خبیر ص ۶ نظامی پریس لکھنو

صنف رباعی کی متانت کو برقرار رکھنے اور اس کو مختلف النوع مضامین عطا کرنے میں میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعی گوئی کا بڑا حصہ ہے۔ فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''انیس کے مجموعۂ کلام میں تقریباً ساڑھے پانچ سو اور دبیر کے یہاں دو[1] سو کے قریب رباعیاں ہیں۔ اکثر رباعیاں مخصوص مذہبی معتقدات تعلّی بشاعرانہ تعلّی کے اظہار اور مجلسی داد و تحسین حاصل کرنے کے لیے کہی گئی ہوں گی[2] اور جب تک ان کے مذہبی عقائد مجلسی لوازم اور رباعی کے شان نزول، ان کے مواقع اور پس منظر سے واقفیت نہ ہو ان کی رباعیوں سے لذت اندوز ہونا مشکل ہے لیکن جن رباعیوں میں صداقت عامہ اور مصلحانہ جذبات کو شاعرانہ طرزِ بیان کے ساتھ نظم کیا گیا ہے وہ اپنے زور اثر، برجستگی سلاست اور روانی کے اعتبار سے آپ اپنا جواب ہیں۔''[3]

صاحب المیز ان تحریر کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کی بھی بکثرت رباعیاں ہیں جن میں انھوں نے نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ نفیس اور دلکش مضامین اور عقیدت و معرفت و اخلاق کے مطالب نظم کیے ہیں ہر ایک رباعی میں علاوہ خوبی مضمون کے صفائی' شگفتگی' گرمی اور تاثیر پائی جاتی ہے۔''[4]

مرزا دبیر نے رباعیات میں جہاں مذہبی تصورات اور عقائد کو نظم کیا ہے وہاں عام زندگی سے متعلق مضامین کی کمی نہیں۔ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

---

۱ یہ تعداد صحیح نہیں۔ صرف رباعیات دبیر مرتبہ خبیر میں ہی ایک سو ستانوے رباعیاں شائع ہوئی ہیں جو محض ایک انتخاب ہے۔ شاید ان کی نظر سے وہی مجموعہ گزرا ہے ورنہ دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں ۱۳۵۳ رباعیاں شائع ہوئی ہیں اور غیر مطبوعہ رباعیاں اب بھی ملتی ہیں۔

۲ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دونوں شاعروں کے موضوعات مذہبی ہی تھے مگر اس میں بھی انھوں نے زندگی کے گوناگوں پہلو پیش کیے ہیں۔ آگے اس پر تفصیل سے بحث ہوگی۔

۳ نگار۔ اصناف سخن نمبر جنوری فروری ۱۹۵۷ء ص ۸۹ مضمون اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقاء از فرمان فتح پوری۔

۴ المیز ان ص ۴۹۳ مولفہ مولوی چودھری سید نظیر الحسن فوق مہانی۔ مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۹۱۴ء

"دبیر کی جو رباعیات[1] پیش نظر ہیں ان کے مطالعے سے جو بات سب سے پہلے اور بڑے واضح انداز میں سامنے آتی ہے وہ ان کے مضامین کا تنوع ہے۔ ان رباعیوں میں حمد و مناجات، نعت و منقبت، استحقاق جنت برأت، دوزخ اور کعبہ و نجف سے تعلق رکھنے والے کثیر اور متنوع مضامین کے علاوہ جن خیالات کو نظم کی صورت ملی ہے اس کی قسم بندی کے بغیر کوئی فہرست مرتب کی جائے تو ذیل کے عنوانات اس میں شامل ہوں گے: ناموافقت زمانہ، بے اعتباری دنیا، شکایات فلک، ناقدری اہل کمال، سفر، عصائے پیری، فرقت احباب، صحبت احباب، عفو و درگزر، خلوص، قرب الٰہی، توکل، سفر آخرت، قبر، حیات بعد الممات، صفائے قلب، انکسار، تواضع، آفتاب، لوح و قلم، سنگِ اسود، زمزم و ستون کعبہ، لباس ماتمی، مجلس عزا، اشک عزاء امام حسینؑ، حرؑ، عونؑ و محمدؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت علی اصغرؑ، حضرت عابدؑ، پسران مسلم بن عقیلؑ، جناب شہر بانو اور اہل بیتؑ کی محترم شخصیتوں سے تعلق رکھنے والے واقعات ہند بنت عبداللہ عامر اور شیریں کنیز، شاعرانہ تعلّی کے مضامین اور خوشامد، عیب جوئی، ریاکاری اور خود بینی کی ہجو میں کہے ہوئے مضامین ان کے علاوہ ہیں۔"[2]

آگے چل کر اس مضمون میں پروفیسر وقار عظیم رباعیات دبیر میں معنی و بیان کی[2] ہم آہنگی الفاظ و مضامین کی مناسبت اور اثر آفرینی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"دبیر نے معنی و بیان کے باہمی رشتے کی اہمیت کے احساس کو نئے مضامین کی تخلیق اور اس تخلیق کو نئے پیرائے میں عطا کرنے کی تدبیر کو اپنی رباعیوں میں عملی صورت دی ہے۔ رباعیوں کی اس عملی صورت میں پڑھنے والے کے لیے مختلف طرح کی کششیں ہیں۔ یہ رباعیاں ہمارے احساس

---

1 اس سے یہ مطلب ہے کہ وقار عظیم کے سامنے ساری رباعیاں نہیں تھیں۔ اس کے باوجود ان کو یہ محاسن نظر آئے۔ اس لیے تمام رباعیات میں اس سے زیادہ محاسن کا تو امکان ہے مگر یہ کسی طرح کم نہیں ہوسکتے۔

2 ماہ نو۔ دبیر نمبر ص ۱۱۶

عقیدت کو جلا بخشتی ہیں۔ ان رباعیوں میں قدم قدم پر طبیعتوں میں نرمی اور گداز پیدا کرنے کے سامان موجود ہیں۔ انھوں نے پیہم خیر و شر کے امتیاز کو ابھارنے اور اسے ہماری اخلاقی زندگی کی ایک مستقل حقیقت بنانے کی خدمت انجام دی ہے لیکن یہ سب کرتے ہوئے بھی یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ مضمون کو دل نشینی صرف اس وقت میسر آتی ہے جب بیان کے وسائل اس کے رفیق و دمساز ہوں۔ یہ وسائل دبیر کے یہاں تشبیہ، کنایہ اور حسن تعلیل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں لیکن ان کی جلوہ گری کی بہترین صورت وہ ہے جہاں محاورے اور روزمرہ کی بے تکلفی اور بے ساختگی خیال کے اظہار کی خدمت انجام دیتی ہے۔"[1]

مرزا دبیر کی رباعیوں کی ان خوبیوں کو مندرجہ ذیل رباعیوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

(۱) مرزا دبیر نے بلاغت معانی، حسن بیان اور شیرینی کلام برقرار رکھتے ہوئے اپنی رباعیوں میں ایثار، قناعت، انکسار، خیر برائے خیر کی اقدار کی ترجمانی کی ہے۔

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے　　جو خلق سے بہرہ ور ہو دریا وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر　　سمجھے جو برا آپ کو اچھا وہ ہے

---

(۲) اخلاق کی پسندیدہ قدروں کی تعریف اور اخلاق مذمومہ عیب جوئی، خوشامد، تکبر، وغیرہ کی تنقیص اس رباعی میں ملاحظ کیجیے۔

مغروروں کا خاک کر و فر چشم میں ہے　　انداز فروتنوں کا ہر چشم میں ہے
رتبہ روشن ہے خاکساری کا دبیر　　سرمہ جو ہوا سنگ تو گھر چشم میں ہے

---

(۳) پیری، عصائے پیری اور ملکِ عدم کی رہروی جیسے مضامین ملاحظ ہوں:

پیری سے جو دالِ قد میں خم اور ہوا　　دم تیز روِ ملکِ عدم اور ہوا

---

[1] ماہِ نو۔ دبیر نمبر ص ۲۳۔۱۲۲

سمجھو نہ عصا سوئے عدم جانے کو　　دو پاؤں تھے تو ایک قدم اور ہوا

---

(۴) شکایتِ زمانہ، بے ثباتی عالم اور گردشِ چرخ کے مضامین ملاحظہ ہوں:

یارانِ گزشتہ کی خبر خاک نہیں　　ایسے ہی گئے کہ اب اثر خاک نہیں
چن چن کے کیا خاک ہنر مندوں کو　　اے چرخ! تجھے قدر ہنر خاک نہیں

---

(۵) شاعرانہ تعلّی کا رواج ہر زمانے میں رہا ہے۔ سودا، میر، ناسخ، آتش، غالب، مومن سب ہی شاعروں نے اس سے کام لیا ہے۔ ایسے موقعوں پر شعراء اکثر مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر آتا ہے۔ دبیر نے ایسے موقع پر توازن یوں قائم رکھا ہے:

شیریں سخنی ہمیشہ کام اپنا ہے　　حق کہنے سے ہاں تلخ کام اپنا ہے
گو مرثیہ خوب نظم کرتے ہیں دبیر　　پر کبر و غرور کو سلام اپنا ہے

---

(۶) رباعیات میں جہاں مرزا دبیر نے منطقی دلائل سے کام لیتے ہوئے معنوی حسن اور خوبیوں سے اپنے کلام کی تاثیر اور کشش کو دوبالا کر دیا ہے وہاں صنائع لفظی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ صنعت معطلہ (بے نقط) کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:[1]

اعدا کو ادھر حرام کا مال ملا　　حر کو اسداللہ کا ادھر لال ملا
واللہ کلاہ سرِ عالم ہوا حر　　حلّہ ملا معصومہ کا رومال ملا

آرام دل حرم کا معدوم ہوا　　کم عمر کا حال مرگ معلوم ہوا
دودھ اگلا، لہو ڈالا، ڈرا کھا کر سہم[2]　　اور سرد وہ معصوم کا معصوم ہوا

گر مہر امام دوسرا حاصل ہو　　گر درد ہو لا دوا دوا حاصل ہو

۱　مرزا دبیر کے بے نقط سلام اور مرثیہ کا ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا۔
۲　سہم بمعنی تیر

اس دم ہو مددگار گر احمد کا لال   واللہ کہ درِ مدعا حاصل ہو

---

(۷) اس کے مقابلہ میں صنعت منقوط میں بھی ایک رباعی دیکھیے:

جب بختِ بنِ قین نے زینت بخشی   زینب نے تشفی تب بشفقت بخشی
تیغین جزتن، جبین شق، جی بے چین   جنت بخشی نبیؐ نے جنت بخشی

---

(۸) لفظی مناسبت سے مضامین پیدا کرنا مرزا دبیر کی ایک خاص خصوصیت[۱] ہے۔ رباعیوں میں بھی مرزا دبیر نے اس سے کام لیا ہے۔ چند مثالیں یہ ہیں:

محروم کسی کو نہ سخی نے رکھا   نے مال نہ زرحق کے ولی نے رکھا[۲]
کیا زہد ہے کیا فیض کہ رغبت سے کبھی   روزے کے سوا کچھ نہ علیؑ نے رکھا

بن بن کے ہزار بار آئی دنیا   پرچشمِ علیؑ میں نہ سمائی دنیا
جس طرح گرایا تھا درِ خیبر کو   نظروں سے اسی طرح گرائی دنیا

اس کے علاوہ مجالس عزا، عزاداری، دین اسلام، اخلاق ائمہ معصومین، واقعات ائمہ طاہرین پر مشتمل مضامین میں تنوع بیان رباعیات دبیر کی خصوصیات ہیں۔ مرزا دبیر خواندگی میں مرثیہ سے پہلے رباعیاں ضرور پڑھتے تھے۔ اس طرح حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے جس سے ذہنی طور پر حاضرین مرثیہ سننے کے لیے تیار ہوجاتے تھے۔ مدِ نظر رہے کہ جس شاعر نے ایک ہزار کے قریب مرثیے کہے ہوں اس کی رباعیوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی مگر یہ سب شائع نہ ہوسکیں۔ دفتر ماتم کی بیسویں جلد

---

۱ ایسی خصوصیات کی تفصیل ''مرثیہ گوئی'' کے ضمن میں آئندہ صفحات میں پیش ہوگی۔

۲ وقار عظیم نے اپنے مضمون رباعیات دبیر (ماہ نو دبیر نمبر) ص ۱۲۱ میں اس رباعی کے مصرع اول میں ''سخی'' کے بجائے ''علی'' تحریر کیا ہے۔ مرزا دبیر سے اس طرح کی غیر ضروری تکرار قافیہ کی توقع رکھنا بعید از قیاس ہے۔

میں قطعات اور سلاموں کے ساتھ ۱۳۵۳ رباعیاں چھپی ہیں۔ ایک مجموعہ "رباعیات دبیر" کے نام سے سرفراز حسین خبیر نے شائع کرایا ہے جس میں ایک سو ستانوے رباعیاں ہیں۔ اس کے علاوہ جب مراثی چھپے رباعیاں بھی ساتھ میں چھپتی رہیں۔ سرِ دست رباعیوں کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رباعیوں کی تعداد مراثی کی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

مرزا دبیر کی رباعیات اور میر انیس کی رباعیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے جواب میں بھی رباعیاں کہی ہیں مگر بیشتر رباعیوں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اولیت ان میں کس کو حاصل ہے۔ مثال ملاحظ کیجیے:

کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں — شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں[1] — خلاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن

سلام

مرثیہ گو شعراء نے جس طرح رباعی کو فروغ دیا ہے اسی طرح سلام کو بھی ترقی دی۔ عام طور پر مرثیہ گویوں نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی ہے۔ انیس دبیر، عشق تعشق اور ان کے دیگر معاصرین نے کافی تعداد میں مرثیے کہے۔ ان نامی گرامی مرثیہ گویوں میں ہر ایک نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ مرزا دبیر کے معاصرین میں دبستان عشق نے خصوصیت سے غزلیت کو مرثیہ میں اظہار کا ذریعہ بنایا، اس پر یہاں اظہار خیال کا موقع نہیں، لیکن اس سے لکھنو میں غزل اور تغزل کے عمومی رجحان کا اندازہ ہوتا ہے[2]۔ مرزا دبیر نے مرثیہ میں غزلیہ مضامین پیش کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ اس میں حسن و عشق، زلف و کاکل اور گل و بلبل کے قصے زیادہ بیان

---

۱ مرزا دبیر کی رباعیات کی حیثیت ایک علاحدہ موضوع کی سی ہے۔ اس مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاسکے۔

۲ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ص ۱۴۴

ہوتے تھے مگر جس چیز کا شوق دل میں ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے وہ چیز آسانی سے انسان سے جدا نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ عام مذاق و مزاج کو نظرانداز کرکے زادِ سخن حاصل کرنا محال تھا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ نظم کا انشائیہ ہے۔ اس کی حیثیت ایک آزاد مکالمہ کی ہے جس کے لیے کسی موضوع کی قید نہ ہو۔ سلام چونکہ غزل سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس میں بھی مختلف مضامین ادا ہوتے ہیں۔ ایک شعر کا تعلق دوسرے سے ہونا ضروری نہیں۔ صرف ایک پابندی اس میں ہے کہ معیارِ اخلاق سے گرے ہوئے جذبات کو غلط انداز میں برانگیختہ کرنے والے اور مبتذل مضامین نہیں لائے جاسکتے۔ مرثیہ گو حبِ اہل بیت کو سرمایہ حیات قرار دیتے تھے تو وہ حسن وعشق کی خیالی دنیا میں محو ہوکر اپنے دور کی مصنوعی غزل سرائی کے بجائے مولائے کائنات کے جگر گوشوں کے فضائل و مصائب بیان کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ بھی خواہش رہی ہوگی کہ غزل نے چونکہ اپنا ایک مقام لوگوں کے دلوں میں بنالیا ہے اور ایک خاص لباس کے عوام و خواص عادی ہوگئے ہیں اس اگر اس لباس میں نیک خیالات پاکیزہ جذبات اور روحانی احساسات ابھارنے والے پیکر پیش کیے جائیں تو دوہری خدمت ہوگی۔ اس غرض سے وہ سلام کہتے رہے۔ اگر مرزا دبیر کے سلاموں کا موازنہ کسی بھی اچھے غزل گو کے کلام[1] سے کیا جائے تو ان کی شاعرانہ خوبیاں ایک اور انداز میں سامنے آئیں گی۔ فوق مہابنی لکھتے ہیں:

> ''سلاموں میں مرثیت سے علیحدہ ہوکر مختلف جذباتِ انسانی مثلاً حسرت و غم، صبر و رضا، قناعت و توکل، یاس و ناامیدی، حب وطن، قومی ہمدردی، بے ثباتی دنیا، شکایت اربابِ زمانہ، یادِ ایامِ شباب، اور اس کے سوا دیگر مختلف مضامین کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، جن کو اگر سلام سے علاحدہ کردیں تو غزل کے اشعار میں مل سکتے ہیں۔''[2]

سلام نہ صرف عام لوگوں کے مذاق بدلنے میں مد ہوئے ہیں بلکہ پاکیزہ خیالات

---

۱ اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲ المیزان۔ چودھری نظیر الحسن فوق مہابنی ص ۴۸۵

رکھنے والے لوگوں کے لیے ان کے ذریعہ اس جستجو اور شوق کی تسکین کا سامان بھی میسر ہوا ہے جو غزل نے ان کے مزاج میں پیدا کر دیا تھا۔ اگر بقول حالی شاعری سے کام لینا ضروری ہے اور غزل کا شعری دنیا میں کوئی کارنامہ نہیں ہے تو سلام کو سامنے رکھا جائے۔ غزل کی ہیئت اور تکنیک نے سلام کے روپ میں روح پائی ہے اور زندہ جاوید ہوگئی ہے۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ سلام سب سے پہلے کس نے کہا۔ البتہ مرثیہ گویوں نے اس کو خوب ترقی دی۔ مرزا دبیر نے رباعیوں کی طرح سلام بھی کثرت سے کہے اس لیے کہ مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعی اور سلام کو بھی مجالس میں خاص اہمیت ہے۔ خبیر صاحب لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر جب منبر پر جاتے تھے تو فاتحہ کے بعد چند رباعیاں پھر سلام اور آخر میں مرثیہ شروع کرتے تھے۔"[1]

خبیر کے اس بیان سے جس کی تصدیق "حیات دبیر" "واقعات انیس" وغیرہ کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا دبیر نے رباعیوں کی طرح سلام بھی بہت کہے۔ آج بھی لکھنو وغیرہ میں اگرچہ نثری مجلسوں کا رواج زیادہ ہے اور سوائے مخصوص مجالس کے مرثیہ خوانی انیسویں صدی کی طرح کی نہیں ہوتی۔ مگر مجلس باقاعدہ طور پر شروع ہونے سے قبل کوئی شاعر یا ذاکر سلام ضرور پڑھتا ہے اور اسے مجلس کا لازمی جز خیال کیا جاتا ہے۔

مرزا دبیر کے سلام ان کے دوسرے کلام کی طرح ایک منفرد مزاج کا عکس پیش کرتے ہیں ان کی طبیعت پر چونکہ مرثیت غالب تھی جس کی وجہ سے ان کا کلام بہت مبکی ہوتا تھا۔ ان کے سلام بھی ایک خاص رنگ رکھتے ہیں اور ان میں مرثیت کافی جھلکتی ہے۔

فوق مہابی لکھتے ہیں:

"بعض شعراء کے کلام میں سلام کے اشعار ایسے رنگین اور دلچسپ ہوتے ہیں

---

1. رباعیات دبیر۔ مرتبہ خبیر ص ۱۱۔ عموماً مرثیہ خوان پہلے رباعیاں پھر سلام اور اس کے بعد مرثیہ شروع کرتے تھے۔

کہ غزل کا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ میر مونس صاحب کو اس طرز خاص میں شہرت حاصل ہے۔ میر انیس صاحب مرحوم کے سلاموں میں بھی ایسے دلچسپ اور رنگین اشعار پائے جاتے ہیں لیکن مرزا صاحب کے کلام پر از بسکہ مرثیت کا رنگ ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ اس لیے سلاموں میں ان کی توجہ فقط الفاظ کی سادگی و صفائی اور مضمون کی درد انگیزی پر رہتی ہے اور مرثیت کے مضامین کے علاوہ عام رنگین مضامین کے اشعار ان کے سلاموں میں کم ملتے ہیں۔"[1]

دفتر ماتم کی سولھویں، سترہویں اور اٹھارویں جلدوں میں بالترتیب ایک سو دس، ایک سو چوبیس اور اٹھانوے یعنی کل ملاکر ۳۳۲ مسلسل ردیف وار سلام ہیں۔ ان میں مرزا دبیر کے بعض شاگردوں کے سلام بھی ہیں جیسا کہ مقطعوں سے ظاہر ہے۔ البتہ چند سلام ایسے بھی ہیں جن میں مقطع نہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کس کے تصنیف کیے ہوئے ہیں۔ دفتر ماتم کی انیسویں جلد میں چونسٹھ مخمس ہیں۔ ان میں وہ مخمس بھی ہے جو ہفت بند ملا کاشی پر فارسی میں مصرع لگا کر مرزا دبیر نے مخمس کیا ہے اور جو اس سے پہلے شمس المشرقین کے نام سے چھپ چکا تھا۔ اس تضمین کی تعریف بڑے بڑے علمائے دین شعراء اور ادباء نے کی ہے کہ اپنی جگہ بے مثال اور لاجواب ہونے کے علاوہ مرزا دبیر کی فارسی دانی اور فارسی میں نظم کرنے کی قدرت پر دال ہے۔[2]

اس کے علاوہ بھی کہیں کہیں مرزا دبیر کے سلام شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک مجموعہ (مختصر سا جو صرف ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے) نظامی پریس لکھنو سے شائع ہوا ہے۔ مرزا دبیر کے مراثی کی طرح ان کے سلاموں کے بارے میں بھی ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سب کے سب شائع ہو چکے ہوں گے۔ نمونے کے لیے چند سلاموں کے مطلع درج کیے جاتے ہیں:

خنجر تھا جب گلے پہ وہ شکر خدا میں تھا ‏ ‏ مجرا اسے مدام جو راہِ رضا میں تھا[3]

---

۱ المیزان ص ۸۲۔ ۴۸۵

۲ اس کا مفصل ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

۳ دفتر ماتم جلد ۱۶

سلامی خاک ہوا خاک سے غبار ہوا　　ابوترابؑ کی تربت پہ یوں نثار ہوا[1]

ہے عکسِ گیسو و رخِ اکبر کہاں کہاں　　سنبل کہاں کہاں ہے گلِ تر کہاں کہاں[2]

مجرائی قحط آب بھی تھا اور غذا نہ تھی　　پر بے حواس فاقے میں فوج خدا نہ تھی[3]

حشر میں جوہری اشک عزا دار ملے　　مجرئی مول میں قصرِ درِ شہوار ملے[4]

مجرئی ہے سوگوارِ ماہِ حیدر چاندنی　　اشک ہیں شبنم بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی[5]

مندرجہ ذیل سلام[6] حیات دبیر جلد دوم میں چھپا ہے۔ بقول ثابت اس پر ان (مرزا دبیر) کے برادر عینی مرزا غلام محمد نظیر نے مصرعے لگا کر مخمس کیا ہے۔[7]

ایک بند ملاحظ ہو:

دکھ پہ دکھ ایوب بھی گو دمبدم دیکھا کیے　　نوح بھی امت سے روز و شب ستم دیکھا کیے
اس خوشی سے پر کہاں رنج و الم دیکھا کیے　　مجرئی ہنستے رہے شہ اور غم دیکھا کیے
زخم تن میں سر گلزار ارم دیکھا کیے[8]

۱　دفتر ماتم جلد ۱۶

۲　دفتر ماتم جلد ۱۷۔ یہ سلام حیات دبیر جلد دوم ص۱۱۴(تعداد اشعار ۱۴) پر بھی چھپا ہے۔ ثابت کہتے ہیں، مرزا دبیر کا یہ سلام ان کے نانا محمد رضا صاحب ظہیر نے اس مجلس میں پیش خوانی میں پڑھا تھا جس مجلس میں مرزا دبیر نے اپنا بے نقط مرثیہ ''مہر علم سرور اکرم ہوا طالع'' پڑھا تھا (حیات دبیر جلد دوم ۱۱۴۔ ۱۱۳)

۵،۴،۳　دفتر ماتم۔ جلد ۱۷

۶　دفتر ماتم میں نہیں چھپا ہے۔

۷　حیات دبیر جلد دوم ص ۱۰۷

۸　حیات دبیر جلد دوم ص ۱۰۹۔ ۱۰۸

قصیدہ گوئی

مرزا دبیر کے اکثر و بیشتر مراثی میں قصائد کا زور و شور اور شان وشکوہ نظر آتا ہے جس طرح کی شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی سے قصائد میں بلندی وعظمت پیدا ہوتی ہے مرزا دبیر کی طبیعت اس کے لیے نہایت مناسب تھی۔ قصیدہ میں شاعر اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھا سکتا ہے۔ اس میں مختلف علوم اور عالی مضامین نظم ہوسکتے ہیں۔ صنائع بدائع کا زور دکھایا جاسکتا ہے۔ قصیدے کے لیے جس زور طبیعت اور خلاقی مضامین کی ضرورت ہے اس کی صلاحیتیں مرزا دبیر میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مراثی میں فضائل کے بیان میں مرزا دبیر نے باکمال قصیدہ گوئی کا ثبوت دیا ہے۔ مبالغہ قصیدہ کی جان ہے اور اس پر خلاق ذہن کی پیش کی ہوئی دلیل سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ مرزا دبیر دونوں خصوصیات سے بہرہ ور تھے۔ فضائل و مناقب کے بیان میں انہوں نے زور کلام کی نادر مثالیں پیش کردی ہیں۔ ایسے موقعوں پر نہ صرف گرمی کلام قیامت ڈھاتی ہے جس سے سامعین کا قلب جذبۂ محبت و مودت میں سرشار ہوکر روحانی انبساط حاصل کرتا ہے بلکہ ان کے آئینۂ فکر و نظر پر دقت فن کی بدولت جلا ہوجاتی ہے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح سودا اور غالب کے اشعار بار بار پڑھ کر ہر دفعہ ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہی حال مرزا دبیر کے کلام کے ان حصوں کا ہے جو انہوں نے ائمہؑ کی مدح، فضائل اور مناقب کے بیان میں نظم کیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شاداب کوہسار سے کئی چشمے بہہ رہے ہیں جس طرف نگاہ جاتی ہے ایک نیا منظر ابھرتا ہے اگر کسی دوسری طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے تو دوسرا منظر لطف کا سامان فراہم کرتا ہے اور جب ادھر ادھر سے نگاہ پھیر کر انسان اپنے قلب و روح کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے تو کئی طرح کے روح پرور انبساط آفرین جذبات سے ہم کنار ہوجاتا ہے، جسے براہ راست تزکیہ نفس کی منزل قرار دیا جاسکتا ہے۔

تلوار اور گھوڑے وغیرہ کی تعریف میں جو مضامین مرزا دبیر نے نظم کیے ہیں ان سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مرزا دبیر قصیدہ گوئی سے خصوصی طور ذہنی ارتباط رکھتے تھے۔

صاحب ''المیزان'' تحریر کرتے ہیں:

''پہلے (گزشتہ) نامی و گرامی شعراء جن کا نام اب تک اقلیم سخن میں گونج رہا ہے خاص خاص اصناف سخن پر قادر رہے ہیں۔ کوئی غزل گو تھا کوئی قصیدہ گو، کوئی رزم کا دھنی تھا کوئی بزم کا۔ کوئی بہاریہ شعر اچھے لکھتا تھا کسی کو دردانگیز مضامین تحریر کرنے میں یدطولیٰ حاصل تھا مگر مرثیہ گویوں نے ہر ایک صنف سخن پر اپنی قادر الکلامی کے ایسے بیّن ثبوت دیے ہیں کہ اردو شاعری جس قدر ان کی ذات پر ناز کرے کم ہے، مرثیوں کو دیکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اصناف سخن میں سے کوئی صنف باقی نہیں رہی جس میں مداحان اہل بیتؑ نے اپنی جادو بیانی کے جوہر نہیں دکھائے۔''[1]

مرزا دبیر کے مراثی میں فضائل اہل بیتؑ کا بیان عام قصائد کی مدح سرائی سے معنوی و اخلاقی معیاروں پر مختلف خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ قصیدہ گو کی تمام کوششیں اپنے ممدوح کو خوش کرنے اور اس سے صلے کی توقع میں صرف ہوتی ہیں۔ اس کی خوشامد میں قصیدہ گو آسمان و زمین کے قلابے ملانے کے باوجود اپنی نظر میں سبک و کم تر ہوجاتا ہے مگر بزرگان دین[2] کی مدح کرنے میں وہ اور سامعین یکساں طور پر مسرت حاصل کرتے ہیں اور شاعر کا وقار ان کی نظروں میں بلند ہوجاتا ہے۔

راقم الحروف پہلے ہی عرض کرچکا ہے کہ مرزا دبیر اس قسم کے مبالغہ آمیز اعلیٰ اور ارفع مضامین، پرشکوہ زبان میں نظم کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ خم خانہ جاوید میں لکھا ہے:

''شمس العلماء مولانا حامد حسین نے ایک مجمع میں مرزا صاحب کی مندرجہ ذیل ٹیپ: ''طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ تھی — رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ تھی'' سن کر فرمایا کہ کسی عرب و عجم نے بھی آج تک یہ مضمون اس

---

۱ المیزان ص ۲۔ ۱

۲ قصیدہ گو شعراء کی قدر و منزلت کی تفصیل کے لیے ملاحظ ہو شعر العجم حصہ چہارم مصنفہ مولانا شبلی نعمانی۔ عرب اور عجم کے شعراء میں بھی یہی فرق مولانا شبلی نے بتایا ہے کہ معمولی بادشاہوں اور امیروں کی مدح کرنے سے ان کی اہمیت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ عرب والے مدح کرتے ہیں یا عجم والے۔

خوبی سے نہیں باندھا۔"[1]

محمد احسن فاروقی تحریر کرتے ہیں:

"میر صاحب (میر انیس) کی طبیعت قصیدے کے لیے اس قدر موزوں نہ تھی جتنی مرزا صاحب (مرزا دبیر) کی اسی لیے مداحی کو عروج پر پہنچانے والے مرزا دبیر تھے۔"[2]

آگے چل کر موصوف اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"میر انیس کے یہاں عام طور پر مبالغوں میں وہ پرواز نہیں جو قصیدہ گویوں کے یہاں یا ان کے حریف مرزا دبیر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی قصیدہ گوئی بھی کچھ کمزور ہی سی ہے ...... ہمارے پرانے شاعروں میں مرزا سودا اور مرزا دبیر اس فن کے لیے خاص فطرت اور خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے فن مداحی کو کمال پر پہونچا دیا۔"[3]

قصیدہ کی لازمی خصوصیت ایک یہ ہے کہ ممدوح کے کمالات اور ان کمالات کے متعلق مشہور روایات کو زور و روانی کے ساتھ باحشمت انداز میں نظم کیا جائے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

"مرثیہ میں ایسے مواقع کے لیے مرزا دبیر کا ذہن خاص طور پر کار آمد ہوجاتا ہے۔ بڑے شد و مد کے ساتھ معجزات و روایات وہ نظم کرتے ہیں اور انتہائی کوشش سے زبان و بیان کی چاشنی دے کر پرلطف بنانے کی فکر کرتے ہیں۔"[4]

---

۱ خم خانہ جاوید جلد سوم ص ۵۷۔ ۱۵۶۔ گھوڑے کی رفتار کی تعریف میں یہ تو سنا تھا کہ ع "جو "چ" نکلے زباں سے چین میں تو "ل" لندن میں" مگر نعل کی خوبصورت تشبیہ اور فاصلے کا تعین نہ کرنا مرزا دبیر کا کمال ہے۔ (راقم الحروف)

۲ ضمیمہ نگار نومبر ۱۹۴۸ء مضمون "مرثیہ نگاری اور میر انیس" قسط دوم ص ۱۶۔ محمد احسن فاروقی۔

۳ ضمیمہ نگار نومبر ۱۹۴۸ء۔ مضمون "مرثیہ نگاری اور میر انیس" قسط دوم ص ۲۲۔ ۲۱۔ محمد احسن فاروقی

۴ مذہب اور شاعری۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ ۱۹۵۵ء ص ۲۸۷

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم لکھتے ہیں :

''اردو کو فارسی کا ہم پلہ ثابت کرنے کا کارنامہ دبیر ہی نے انجام دیا۔ انھوں نے مدح میں خاقانی و انوری سے ٹکر لی۔ مبالغہ میں ظہیر فاریابی کا پہلو دبایا۔ شکوہ الفاظ و طنطنہ بیان میں فردوسی کے کمال کا مظاہرہ کیا۔ اخلاق و موعظت میں سعدی و رومی کی سنت کی تجدید کی۔ دقت پسندی و مضمون آفرینی میں صائب و بیدل کا مقابلہ کیا اور ان تمام میدانوں میں اپنی پرواز فکر کے جوہر دکھائے جو ابھی تک ایرانی سخن آفرینیوں کی جولانگاہ تصور کیے جاتے تھے۔''[1]

اس خصوصیت کے باوجود کہ مرزا دبیر قصیدہ کہنے کے لیے ایک زور دار طبیعت، عالمانہ زبان، خلاق ذہن اور طبع رسا رکھتے تھے۔ انھوں نے اس قوت کو مرثیہ ہی میں صرف کیا اور مرثیہ میں اس کی گنجائش پاکر اس کی طرف اپنی طبیعت کو مائل کردیا۔ صاحب شمس الضحیٰ[2] کے مطابق ابتدائی زندگی میں ہی دوسری اصناف سخن سے ہاتھ کھینچ لیا اور مرثیہ گوئی کی طرف اپنی توجہ کو پوری طرح مرکوز کیا۔ علاحدہ سے اسی وجہ سے مرزا دبیر کے قصیدے نہیں ملتے۔ دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں میں ان کا کوئی قصیدہ نہیں چھپا ہے۔ البتہ جناب مرزا اوج نے علم عروض پر اپنی کتاب ''مقیاس الاشعار''[3] میں قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے مثال دینے کے لیے ایک قصیدہ مرزا دبیر کا شائع کیا ہے جو

---

۱ دبستان دبیر ص ۱۵۴ ۲ شمس الضحیٰ ص ۹۷

۳ مقیاس الاشعار ص ۱۹۔ ۱۶ مرزا اوج۔ باہتمام مولوی مرزا محمد علی (نام تاریخی ارمغان ۱۲۹۲ھ) مطبع جعفری نخاس جدید لکھنو

۴ رشید الدین محمد بن عبدالجلیل بلخی ملقب بہ وطواط ۴۸۰ھ کے قریب بلخ میں پیدا ہوئے۔ خوارزم شاہوں کے درباری شاعر تھے۔ خوارزم کے بادشاہ اتسز کے عہد میں بڑی شہرت ہوئی اور عمر بھر اسی بادشاہ سے وابستہ رہے۔ ان کے دیوان میں زیادہ تر قصیدے ہیں جن میں محسنات شعر کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ دبلے پتلے اور پستہ قد ہونے کی وجہ سے لوگ مزاحا وطواط (ابابیل) کہتے تھے۔
(تاریخ ادبیات ایران۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق۔ مترجم سید مبارزالدین رفعت۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ چوتھا ایڈیشن۔ جنوری ۱۹۶۹ء)

انھوں نے قصیدہ رشید و طواط[۱] کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ قصیدہ اوسط درجے کا ہے مگر انھوں نے چونکہ اس صنف کی طرف علاحدہ صنف سخن کے طور پر توجہ ہی نہیں کی اس لیے اس قصیدہ سے ان کی قوت قصیدہ گوئی پر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی بلکہ مرثیے میں جہاں ایسے مقامات آتے ہیں ان ہی کو سامنے رکھ کر ان کی اس خصوصیت کو سراہا جاسکتا ہے۔

قصیدہ کے ساتھ ساتھ ہجو بھی ایسے شاعروں (قصیدہ گویوں) کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ جب مرزا دبیر کے مراثی میں دشمنانِ اہل بیت کا ذکر آتا ہے تو ایسے مقامات پر وہ اپنی اس خصوصیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں محمد احسن فاروقی تحریر کرتے ہیں:

> ''...... مرزا دبیر کی فطرت سودا کی سی (ہے) اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ذم مدح کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور سودا کی طرح دبیر قصیدہ گو ہی نہیں بلکہ ہجو گو بھی تھے۔ ان کے مرثیوں میں امام حسینؑ کے مخالفین کی ذم میں کافی چیزیں ملتی ہیں۔''[۱]

ایک غیر مطبوعہ قصیدہ

راقم کو مرزا صادق (جانشین مرزا محمد طاہر ابن مرزا محمد جعفر اوج ابن مرزا سلامت علی دبیر) کے پاس مرزا دبیر کا ایک ایسا قصیدہ ملا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اب تک، مرزا دبیر کے محقق اور تذکرہ نگاروں کی دسترس سے باہر تھا۔ نہ تو اس کا کہیں حوالہ ملتا ہے اور نہ کلام کے ساتھ کہیں چھپا ہے۔ یہ قصیدہ فارسی میں ہے اور منتظم الدولہ[۲] کی مدح میں کہا گیا ہے۔

یہ ۶۷ اشعار پر مشتمل ہے اور مخطوطہ ۱۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسے اچھے خط

---

۱ نگار (ضمیمہ) نومبر ۱۹۴۸ء۔ 'مرثیہ نگاری اور میر انیس' محمد احسن فاروقی۔ ص ۲۲

۲ یہ وہی حکیم مہدی علی خاں منتظم الدولہ وزیر اعظم ہیں جن کے خوف سے ناسخ کو لکھنو سے باہر جانا پڑا مگر ناسخ نے بھی عمر بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا چنانچہ ان کے انتقال پر یہ تاریخ کہی: ''شب ولادت عیسیٰ بمرد ایں دجال'' (ناسخ ۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن)

میں مزین حاشیوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ حاشیوں پر سنہری کام کیا ہوا ہے۔ اس میں نقل ہونے کی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے مگر منتظم الدولہ کی شان میں ہونے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کے عہدِ وزارت کا ہے۔ مخطوطہ کا سائز ۵ء۵x ۷ء۸ ہے۔

ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اے عیش جاں بیا کہ نوید اماں رسید — اے خار غم برو کہ گل بے خزاں رسید

ای روزگارِ مژدہ کہ شب ہائے گریہ رفت — صبح سعید عید طرب در جہاں رسید

اے لب تبسمی کہ گل آرزو دمید — اے دل ترنمی کہ صبا شادماں رسید

والا تبار منتظم الدولہ نامدار — در بیت سلطنت بدلِ شادماں رسید

اس میں ایک قطعہ در ثنائے عدل و انصاف بھی شامل ہے:

آں منصف زماں کہ ز سہم قصاص او — از راہ تیر جستہ بسوئے کماں رسید

از رعشہ ہائے شرم عطارد قلم فکند[1] — چوں خامہ تو بہر رقم در بناں رسید

اقبال یار و بخت معین و فلک مطیع — بہرِ تو ایں دعا بلب قدسیاں رسید

دیگر غیر مطبوعہ قصیدہ

مرزا دبیر کا ایک اردو قصیدہ بھی ملتا ہے جو ۵۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں مہاراج چندولعل[2] کی مدح کی ہے۔ یہ قصیدہ چھ صفحات کے ایک مخطوطہ کی شکل میں مرزا صادق صاحب کے پاس موجود ہے۔ مخطوط کا سائز ۲ء۶x۲ء۹ ہے۔ مخطوطہ کچھ اور مخطوطات کے ساتھ ایک ہی جلد میں محفوظ ہے۔

اس قصیدہ کے بارے میں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ انہوں نے مہاراج چندولعل کے پاس بھیجا تھا یا یوں ہی کہہ کر رکھدیا تھا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہاں نقل کیے

---

۱ اس میں اپنا تخلص عطارد نظم کیا ہے۔

۲ یہ وہی مہاراج چندولعل ہیں جن کی دھوم نہ صرف حیدر آباد دکن میں تھی بلکہ پورے ہندوستان کے شعراء ان کی تعریف کرتے تھے۔ ناسخ نے غالب کو ان سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر غالب نے ان کو اس لائق نہیں سمجھا اور اپنے خط میں ان کو برا بھلا کہا۔ ناسخ کے لیے چندولعل نے زادراہ بھیجا تھا مگر وہ نہیں جاسکے (ناسخ۔ ص ۱۵۸)

جاتے ہیں:

آج گلشن میں ہے بادِ سحری نافہ کشا　　دمِ عیسیٰ سے فزوں تر ہے دمِ بادِ صبا

رخ پہ گر باد بہاری کے اٹھے دستِ نگار　　سبز ہوجائے وہی پنجہ گلگوں پہ ہوا

مدحِ غائب سے مرے دل کو نہیں ہے تسکین　　مدح حاضر میں اسی واسطے اب ہوں لکھتا[1]

لائی ہے خوبیِ طالع مجھے تیرے در تک　　آرزو ہے کہ نہ ہوں دامن دولت سے جدا[2]

ختم کرتا ہوں قصیدے کو دعا پر میں دبیر　　کہیں آمین ملک باب اجابت ہے کھلا

مندرجہ بالا قصائد سے ظاہر ہے کہ مرزا دبیر میں قصیدہ گوئی کی قوت ضرور موجود تھی۔ ان کی فطرت مدح اور ہجو کہنے میں سودا[3] سے ملتی جلتی تھی۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ وہ اگر چاہتے تو اس قوت سے کام لے کر بھی تونگر ہوسکتے تھے مگر اپنے آپ کو اہل بیتؑ کا غلام سمجھتے تھے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو صرف اہل بیتؑ ہی کی مدح اور ان ہی کے مصائب کے بیان کے لیے گویا وقف کردیا۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیر باوجود یکہ فرشتہ صفت تھے اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور مذہبی عقائد کا انہیں سب سے زیادہ لحاظ تھا پھر بھی ایک انسان تھے اور میر انیس کی طرح انھوں نے بھی بعض

۱　اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا دبیر نے یہ قصیدہ چندو لال کے سامنے پڑھا ہوگا مگر اس بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ممکن ہے قصیدہ اسی غرض سے کہا ہو مگر بعد میں اس کی نوبت نہ آئی ہو۔

۲　اس شعر سے بھی یہی بات پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار حاشیہ ۳ میں کیا گیا۔

۳　لکھنو میں آغا محمد باقر کے امام باڑے میں دفن ہیں۔ ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء اور ۱۱۱۸ء مطابق ۱۷۰۴ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ ۴ رجب ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں انتقال ہوا۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ قصیدے کے بادشاہ قرار پائے مگر مرثیہ میں بھی کامیاب تجربے کیے، ہجویں بھی خوب کہی ہیں۔ (سودا ص ۳۵ شیخ چاند۔ ناشر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء)

دنیاوی ہستیوں کی مدح کی ہے مگر ایسا کرنے میں دونوں بزرگوں کو کوئی دنیا وی طمع نہیں تھی اور مرثیہ کہنے سے بھی انہیں مولانے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تونگری بخشی تھی۔

مثنوی نگاری

صنف مرثیہ میں تمام اصناف سخن کے آثار ملتے ہیں جس کا ذکر راقم پہلے کر چکا ہے۔ جہاں اس میں قصیدے کے نشان پائے جاتے ہیں وہاں اس میں مثنوی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ عام طور پر جہاں تک بیانیہ مثنوی کی معنوی خصوصیات کا تعلق ہے کہ اس میں ایک قصہ بیان ہو۔ باقاعدہ ایک پلاٹ ہو، کردار نگاری کی گئی ہو، منظر نگاری اور واقعہ نگاری سے کام لیا گیا ہو، قصہ کا ایک تدریجی ارتقاء ہو اور تسلسل ہو کہ قاری ابتدا سے آخر تک پڑھتا چلا جائے اور کہیں اسے اس کا سلسلہ ٹوٹتا نظر نہ آئے۔ مرثیہ میں بھی یہ تمام خصوصیات تمام و کمال پائی جاتی ہیں اس لیے مرثیہ گو کے لیے مثنوی کہنا چنداں مشکل نہیں ہے بلکہ مرثیہ نگار کو مزید سہولت حاصل ہے کہ مثنوی کے ہر شعر کا قافیہ الگ ہوتا ہے جبکہ مرزا دبیر کے زمانے میں مرثیہ کے لیے مسدس کی تخصیص ہوگئی تھی۔ ایک اور پابندی مرثیہ کے لیے یہ رہی ہے کہ اسے مجمع میں سنانا پڑتا تھا اور مجمع میں نہ صرف ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں بلکہ وہ مختلف المذاق بھی ہوتے ہیں۔ پورے مجمع پر قابو رکھنا اور اول سے آخر تک دلچسپی قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے جبکہ مثنوی کا مطالعہ عوام و خواص اپنے مذاق کے مطابق فرصت کے اوقات میں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مرثیہ گویوں نے مثنویاں بھی کہی ہیں چنانچہ مرزا دبیر نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

اب تک ان کی دو مثنویاں طبع ہوئی ہیں جو دفتر ماتم کی پندرھویں جلد میں شامل ہیں۔ ان کے نام ہیں ''احسن القصص'' اور ''مثنوی معراج نامہ''۔

افضل حسین ثابت ''مثنوی احسن القصص'' کے بارے میں صرف اتنا لکھتے ہیں:

> ''دفتر ماتم'' کی پندرھویں جلد میں مثنوی ہے جس کا نام احسن القصص ہے اس میں چہار دہ معصومین علیہم السلام کے حالات ولادت و فضائل و

معجزات کو نظم کیا ہے۔''[1]

ذاکر حسین فاروقی مرحوم اس مثنوی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''مرزا صاحب نے چار ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل مثنوی ''احسن القصص'' تیار کی جس میں ہر معصوم کی ولادت کا حال نظم کیا ہے اور ساتھ ساتھ معصومین کے معجزات بیان کیے ہیں۔ کتاب اکیس سطری مسطر کے ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سبب تالیف یہ تھا کہ مراثی تو محض شہادت کی تاریخوں میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ ولادت کی محافل میں پڑھنے کے لیے میلاد ناموں کی ضرورت تھی جو مرزا صاحب (نے) مثنوی کی شکل میں تیار کردیے۔''[2]

مثنوی ''احسن القصص'' ایک طویل مثنوی ہے جس کے نظم کرنے کی غرض یہی ہوسکتی ہے کہ ولادت ائمہ معصومینؑ کے موقع پر ذاکرین کو پڑھنے کے لیے میلادنامے بہم ہوں تاکہ ذکر اہل بیتؑ صرف مجالس عزا میں نہ ہو بلکہ محافلِ تہنیت میں بھی لوگ اسی ذوق و شوق سے شرکت کرسکیں جس کا اظہار وہ مجالسِ عزا میں کرتے ہیں۔ ۳۳۴۵ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ۱۹۵ صفحات پر چھپی ہے۔

اس مثنوی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کب تصنیف کیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے:

یہ مثنوی مختلف حصوں میں منقسم ہے جنھیں مختلف عنوانات سے موسوم کیا گیا ہے۔ ابتدائی حصے کا کوئی عنوان نہیں ہے بلکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد مثنوی شروع ہوجاتی ہے۔ یہ حصہ ۲۱۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا حال نظم کیا گیا ہے۔ ابتدا کے چند شعر یہ ہیں:

جسے حق نے بخشی ہے قدرِ رفیع وہ برحق یہ پہلا ہے ماہِ ربیع
خصوص آج کا روز کیا روز ہے کہ شاہد ہے ہفتہ یہ نوروز ہے

اور مقطع یوں ہے:

---

۱ حیات دبیر جلد ۱ ص ۲۷۷

۲ دبستان دبیر ص ۱۶۵

دبیر اب کمیت قلم روک لے　　نظامی کو اس نظم میں ٹوک لے[1]

اس کے بعد حضرت ابوطالب کا خواب دیکھ کر کعبہ کی طرف جانا بیان کیا گیا۔ ان کا کاہن کو خواب سنانا اور اس کا خواب کی تعبیر بتانا کہ ایک نبیؐ پیدا ہوگا اور آخری اشعار میں جناب رسالتمآبؐ کا اعلان نبوت کرنا بھی نظم کیا ہے۔ چند شعر ملاحظ فرمایئے:

کدھر ہے تو اے ساقیِ ماہ رو[2]　　شرابِ مسرت سے بھردے سبو

عیاں بست و ہفتم رجب کی ہوئی　　مہیا مراد آج سب کی ہوئی

خوشی کی ہمیں آج تاکید ہے　　ارے عید ہے، عید ہے، عید ہے

مئے عیش سے مست ہیں حیدری　　نبیؐ کو ملی آج پیغمبری!

اس دعائیہ شعر پر اس حصہ کا خاتمہ ہوتا ہے:

یہ ہے آرزوئے دبیر اے خدا　　بنا مجھ کو زوار موسیٰ رضاؑ

۱　اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں نظامی کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲　پوری مثنوی میں ساقی نامہ کا اہتمام کیا گیا ہے اور بیشتر حصے اور ضمنی واقعات ساقی نامہ سے ہی شروع ہوتے ہیں مثلاً

کہاں ہے تو اے ساقی بزم دیں　　پلا جام حب شہ مرسلینؐ　　حال ولادت پیغمبر

بیاں کرتا ہے راوی خوش مقال　　امام رسل کی ولادت کا حال　　آخر الزماںؐ

کہاں ہے تو اے ساقی نیک نام　　شرابا طہورا کے دے بھر کے جام　　حال حضرت

سناؤں میں اب معجزات رسولؐ　　کہ شیعوں کو تازہ ہو فرحت حصول　　فاطمہؑ

بیا ساقی بزم ایماں بیا　　بدہ ساغر حب خیر النساء　　حال حضرت

اٹھو ساقیو صبح صادق ہوئی　　صبوحی پہ راغب خلائق ہوئی　　جعفر صادقؑ

ادھر آ ادھر ساقی غنچہ لب　　پلا آب شیریں نہر رجب　　حال حضرت

لبالب وہ دے جامِ آبِ زلال　　کہ پیتے ہی زائل ہو گرد ملال　　علی نقیؑ

اس کے بعد حالات ولادت با سعادت حضرت فاطمہؑ زہراؑ کے عنوان سے خاتونِ جنتؑ کی ولادت کا حال نظم کیا ہے۔ مثنوی کا یہ حصہ ۲۱۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ نمونہ کے لیے اس حصہ سے ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

زمیں پر کھڑی ہیں صفیں حور کی   زمانے میں آمد ہے کس نور کی
نثار اس تجلی پہ جبریلؑ ہے   درِ عرشِ اعظم کی قندیل ہے

اس کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے :

ہر اک شیعہ سے ہوں میں امیدوار   کہ آمیں کہیں بے ریا ایک بار

تیسرا حصہ حالِ ولادتِ باسعادت حضرت امیر المومنینؑ پر مبنی ہے اور یہی اس کا عنوان ہے۔ یہ حصہ طویل ہے اور ۸۱۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے طویل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عید نوروز پر ''بہ تہنیت نو روز'' کے عنوان کے تحت ۵۹ شعر ''نوید عید غدیر'' کے عنوان سے ۱۰۱ شعر اور ''تہنیت روز بست و پنجم ذی حجہ عید مباہلہ'' کے عنوان سے عید مباہلہ پر بھی کچھ شعر شامل ہیں۔ عید نوروز کے بارے میں جو شعر نظم کیے ہیں ان میں پہلا اور آخری شعر یہ ہے :

فلک پر دماغ سریر آج ہے   جلوسِ جنابِ امیرؑ آج ہے
ہر اک سال جب تک ہو تحویل مہر   رہے اس پہ بارہ اماموں کی مہر

نوید عید غدیر کے عنوان سے پیش کیے گئے اشعار میں سے پہلا اور آخری شعر اس طرح ہے۔

پلا ساقیا جام خمِ غدیر   کہ حیدر ہوئے آج و کل کے امیر
عطا کر زیارت کا مجھ کو ثواب   دکھا تربتِ نائبِ بو ترابؑ

اس میں اپنے فرزند مرزا اوج کے لیے دعا کی ہے :

اوٹھاتا ہے تو اپنے بندوں کے ناز   عنایت سے کر اوج کو سرفراز
زرو دولت و مال اولاد و آل   ہر اک شے اسے بخش اے ذوالجلال

تہنیت روز بست و پنجم ذی حجہ عید مباہلہ کے تحت جو اشعار اس میں دیے گئے ہیں ان میں سے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

عیاں شش‌جہت میں خوشی کیوں نہ ہو   کہ تیری عنایت سے عیدیں ہیں دو

ہے اک تو یہ عید مسرت فزا نصارا پہ غالب ہوئے مصطفیٰؐ
دوم عید ہے عید آلِ رسولؐ ہوا سورہ ہل اتٰی کا نزول

اس کے بعد حال ولادت امام حسن علیہ السلام شروع ہوتا ہے اس کا عنوان تہنیت ولادتِ امام حسنؑ ہے اور ۱۵۸ اشعار پر مشتمل ہے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

زہے قدرتِ احسن الخالقین کہ پیدا کیے اس نے کیا کیا حسیں
خصوصاً عیاں حسنِ قدرت ہے آج جناب حسنؑ کی ولادت ہے آج
ہویدا ہے حسن کمالِ الٰہ کہ وجہِ حسن سے حسنؑ ہیں گواہ
شب نیمۂ ماہِ پروردگار ہوا ماہ برج شرف آشکار
ولادت کا یہ فیض بیشک ہوا کہ یہ ماہ ماہِ مبارک ہوا
یہ رونق کی صورت ہے کس ماہ میں یہ قرآن آیا ہے اس ماہ میں
عجب حسن نامِ شہِ نیک ہے کہ لکھنے میں حسن و حسنؑ ایک ہے

اس حصہ کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے:

پڑیرا دعا کر برائے حسینؑ بنا زائرِ کربلائے حسینؑ

بعد ازاں ولادت امام حسینؑ کے حال میں بعنوان ''در تہنیت ولادت امام حسینؑ'' ۱۶۹ شعر ملتے ہیں۔ چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

عجب مژدہ لائی ہے بادِ صبا کہ غل ہے چمن در چمن مرحبا
جواں ہو کے تنتے ہیں نخل کہن 'گلستاں' کا ہے بابِ پنجم چمن
جدا گل سے کانٹا ہے لالہ سے داغ بہم رقص کرتے ہیں طاؤس باغ
چٹکنے سے غنچہ کی ہے یہ صدا بجاتا ہے طبل خوشی کا بجا
نئے باغ ایماں میں ہے زیب و زین کہ پیدا ہوئے ہیں جناب حسینؑ

خاتمہ اس شعر پہ ہوتا ہے:

یا وہ داغ مرض دم میں بس مسیحا سے ہوتا نہ یہ سو برس

اس کے بعد ۲۹۴ اشعار میں امام چہارم سید الساجدینؑ کی ولادت کا حال بیان ہوا ہے۔ ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہوا تازہ کس گل سے دنیا کا باغ　　زمیں کا ہے چوتھے فلک پر دماغ

اور اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

ترقی میں شیعوں پہ ایماں رہے　　ترا فضل ان کا نگہباں رہے

حال ولادت امام چہارمؑ کے بعد پانچویں امام جناب محمد باقرؑ کی ولادت کا حال ۱۱۲ شعر میں پیش کیا گیا ہے اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

کدھر ہے تو اے ساقی نیک نام　　مئے حب حیدر کا دے بھر کے جام

اور اختتام اس شعر پر ہوتا ہے

یہ عمر دراز اس کو دے اے غیور　　کہ دیکھے امامِ زماںؑ کا ظہور

آپ کے بعد حال ولادت امام ششم حضرت جعفر صادقؑ ۱۲۱ اشعار میں بیان کیا ہے۔ پہلا اور آخری شعر درج ذیل ہے۔

اٹھو ساتھیو صبح صادق ہوئی　　صبوحی پہ راغب خلائق ہوئی

اماں بخش خضر و سکندر ہے تو　　تر و خشک میں میرا رہبر ہے تو

حال ولادت امام جعفر صادقؑ کے بعد حال ولادت امام ہفتم حضرت موسی کاظمؑ ۱۰۲ اشعار میں نظم کیا ہے اس کا پہلا اور آخری شعر اس طرح ہے:

خوشی حق نے شیعوں پہ لازم کی آج　　ولادت ہے موسی کاظمؑ کی آج

بصحت، بعشرت میان جہاں　　محبانِ حیدرؑ رہیں شادماں

امام موسی کاظمؑ کے بعد حال ولادت امام ہشتم حضرت امام موسی رضاؑ ۲۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا اور آخری شعر اس طرح ہے۔

فلک پر نہ ہو کیوں دماغ زمیں　　کہ ذیقعدہ کی آج ہے بارھویں

ترقی اقبال و طولِ حیات　　سرورِ دل و تندرستیِ ذات

امام ہشتم کا حال بیان کرنے کے بعد امام نہم حضرت محمد تقی علیہ السلام کی ولادت کا حال ۱۵۴ اشعار میں نظم کیا ہے۔ ابتداء اور آخر کا شعر یوں ہے:

سبب کیا کہ قدسی فرحناک ہیں　　تر و تازہ نہ باغِ اخلاق ہیں

باقبال و دولت بجاہ و حشم　　یہ مہدی ہادی کے جو ہیں قدم

اس کے بعد درتہنیت ولادت باسعادت امام دہم حضرت علی النقیؑ ۱۱۶ شعر دیے ہیں

جن میں پہلے دو شعر اور آخری شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ادھر آ ادھر ساقیِ غنچہ لب　　پلا آبِ شیریں نہر رجب
لبا لب وہ دے جام آب زلال　　کہ پیتے ہی زائل ہو گردِ ملال
ہر اک حیدری کو سر افراز کر　　کہ تکمیل ایماں سے ممتاز کر

اس کے بعد تہنیت ولادت امام یازدہم حضرت امام حسن عسکریؑ کے حال میں ۲۵۵ اشعار شامل ہیں جس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ندا دے رہا ہے نقیب ادب　　کہ ہاں فوجِ انجم صف آرا ہو سب
نظر آئے ہرجا خوشی کا سماں　　بجیں ہفت نقارۂ آسماں
مہ و مہر حکم خدا سے بہم　　بنائیں رو پہلے سنہرے علم
جھکے بہر تسلیم ہر لشکری　　ہے پیدائشِ حضرتِ عسکریؑ
ہوئی برج دیں کی دو چند آب و تاب　　کہ طالع ہوا گیارھواں آفتاب
چراغِ حریم رسولِ زمنؐ　　بوجہ حسن جانشین حسنؑ
زمیں کے شکوہ آسماں کا شرف　　جناب علی نقیؑ کے خلف
پدر مہدیِ دیں کے شاہِ انام　　امام الزماںؑ ان کے قائم مقام

اس کے آخری اشعار میں مرزا دبیر نے اپنے لیے تفصیل سے دعا کی ہے۔

آخر میں بارھویں امام حضرت مہدیؑ کے حالِ ولادت میں ۳۷۶ اشعار کہے ہیں۔ اس کے کچھ شعر درج ذیل ہیں:

پلا ساقیا وہ مئے مشک فام　　ہرن جس سے خورشید ہو وقت شام
سرور بشارت کی شب آج ہے　　جدا دل سے رنج و تعب آج ہے
ارے نیمہ ماہِ شعباں ہے آج　　ہدایت کا خورشیدِ تاباں ہے آج
امام الزماںؑ آج پیدا ہوئے　　شہِ انس و جاں آج پیدا ہوئے

آخر کے ان اشعار پر مثنوی کا اختتام ہوتا ہے۔

اسی شخص نے پھر اشارا کیا　　کہ یہ ہیں وصیِ حبیبِ خدا
نظر کی جو میں نے بشوقِ تمام　　تو تھا گندمی رنگ روئے امامؑ

پوری مثنوی کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ اس میں تاریخی مواد بھی کافی پایا جاتا ہے۔

مختلف روایتیں اس میں نظم ہوئی ہیں۔ تاریخ ہائے ولادت میں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے اسے بھی مرزا دبیر نے نظم کیا ہے۔ معجزات کے نظم کرنے میں خوب زور دکھایا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی قسم کی پہلی مثنوی ہے۔

اس کے بعد ہی مثنوی معراج نامہ ملتی ہے۔ یہ ۶۸۳ اشعار پر مشتمل ہے اس میں معراج کے واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ افضل حسین ثابت اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''معراج نامہ بھی اس میں[دفتر ماتم جلد ۱۵ میں] ہے۔ اس مثنوی کی نسبت میری یہ رائے ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نے بہت روارَوی میں کہی ہے اور بندش و زبان سے ابتدائی مشق کی تصنیف پائی جاتی ہے کہ جو شان ان کے اعلیٰ درجہ کے مرثیوں میں ہے وہ اس مثنوی میں نہیں نظر آتی اور میری رائے میں ان کے شاگرد رشید منشی سید اسمٰعیل صاحب منیر مرحوم کی مثنوی معراج المضامین مرزا صاحب کی مثنوی سے بہتر ہے۔''[1]

مثنوی ''معراج نامہ'' ایک مختصر سی مثنوی ہے جس میں بقول ذاکر حسین فاروقی مرحوم ۲۷۷ اشعار ہیں۔ اس کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''مرزا صاحب کی جو مثنویاں زیور اشاعت سے محروم رہیں ان میں ۲۷۷ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ''ممتاز نامہ'' ہے جس میں انہوں نے حضرت ختمی مرتبتؐ کی معراج کا حال نظم کیا ہے۔''[2]

دراصل یہی مثنوی معراج نامہ کے نام سے دفتر ماتم کی جلد ۱۵ میں شائع ہوئی ہے البتہ اشعار کی تعداد میں فرق ہے۔ جو مخطوطہ ذاکر حسین فاروقی مرحوم کو ملا تھا اس میں نواسی ۸۹ شعر زیادہ ہیں جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ مثنوی چونکہ مرزا دبیر اور ملکہ زمانیہ جس کا ابتدائی خطاب ممتاز الدہر تھا، دونوں کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، اس لیے اس وقت وہ اشعار جو ممتاز الدہر ملکہ زمانیہ کی تعریف میں اس میں شامل تھے

---

۱ حیات دبیر ج ۱ ص ۲۷۷

۲ کاروانِ حیات بمبئی ''مولا علی نمبر'' ج ۲ ش ۱۴۔۱۳ مضمون ''مرزا دبیر صاحب کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی۔ ممتاز نامہ'' ص ۳۳

نکال دیے گئے۔ اگر ذاکر حسین فاروقی مرحوم کی نظر سے یہ مثنوی مطبوعہ صورت میں گزری ہوتی تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس مثنوی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں فاروقی مرحوم لکھتے ہیں:

> "اس مثنوی کا نام "ممتاز نامہ" اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ یہ مثنوی مرزا صاحب نے نصیر الدین حیدر کی چہیتی بیگم ملکہ زمانیہ کی فرمائش پر کہی ہے۔ ملکہ زمانیہ کا ابتدائی خطاب ممتاز الدہر تھا اور بعد میں انھیں ملکہ زمانیہ کا خطاب عطا ہوا۔ اس فرمائش کا ذکر خود مثنوی کے آخر میں یوں موجود ہے:

بفرمودہ بیگم خوش خصال کہا تو نے معراج مولا کا حال
ہے ملکہ زمانیہ ممتاز دہر یہ نام مبارک ہے مشہور شہر
یہی ہے زمانہ میں اس کا خطاب اسی نام سے چن لے نامِ کتاب
ہے ممتاز دہر اس کا نامِ شریف لطیفہ بتاؤں میں تجھ کو لطیف
ہے یہ نظم فرمائش اس کی تمام سو 'ممتاز نامہ' ہے خوب اس کا نام[1]

اس کے سنِ تصنیف کا تعین کرنے میں اس سے مدد ملتی ہے کہ یہ مثنوی ملکہ زمانیہ کی فرمائش پر کہی گئی۔ چنانچہ فاروقی مرحوم لکھتے ہیں:

> "یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مرزا صاحب نے یہ مثنوی کس سن میں کہی ہے لیکن یہ طے ہے کہ یہ مثنوی نصیر الدین حیدر کے زمانہ حکومت میں کہی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مثنوی ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے مابین کسی سال میں کہی گئی ہے۔۔۔۔۔۔"ممتاز نامہ" ان کے ابتدائی عمر کی مثنوی ہے۔"[2]

اس مثنوی میں بھی مرزا دبیر نے مذاقِ زمانہ کے مطابق حمد و نعت و منقبت کے مضامین نظم کیے ہیں۔ اس میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ اس کے علاوہ حسنِ بندش اور صنائع و بدائع کا استعمال بھی اس میں ملتا

---

۱ کاروانِ حیات مولا علی نمبر ص ۳۳

۲ ایضاً ۳۳

ہے۔ افضل حسین ثابت نے اس مثنوی کا موازنہ منیر شکوہ آبادی کی مثنوی معراج[1] المضامین سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے کم درجہ کی ہے اور مرزا دبیر نے اسے روا روی میں کہا ہے۔ راقم کے خیال میں اس مثنوی کا موازنہ منیر کی معراج المضامین سے کرنا مناسب نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک طویل مثنوی ہے جسے منیر شکوہ آبادی کا ایک شاہکار خیال کیا جاتا ہے البتہ اگر اس کا موازنہ میر ضمیر مرحوم کی مثنوی معراج نامہ موسوم بہ ''ریحان معراج'' سے کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس مناسبت کے اسباب یہ ہیں:

۱۔ دونوں مثنویاں تقریباً اک ہی زمانے میں کہی گئی ہیں۔[2]

۲۔ دونوں کا موضوع ایک ہے۔

---

۱ منیر شکوہ آبادی کی یہ مثنوی ۱۲۹۱ھ/۷۴-۱۸۷۳ء میں مطبع خزینۃ الدرر واقع امام باڑہ غفران مآبؒ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحات ۳۰۵ ہیں مسطر ۲۱ سطری ہے اور ہر سطر میں دو دو شعر ہیں۔ تقریباً گیارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر کے ۱۵ صفحوں پر قطعات تاریخ مثنوی جو مختلف شعراء کے کہے ہوئے ہیں درج ہیں۔ اس سے قبل منیر نے اس کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

مئے الہام کا دے ساقیا جام ۔۔۔ کہوں اس نظم کا تاریخ میں نام
اگر تو جامِ مے دے بے کدورت ۔۔۔ تو نکلے مادّہ بھی خوب صورت
منیر خوش بیاں نے اے نکو نام ۔۔۔ خدا کے فضل سے پائے یہ دو نام
مدد دل کی نہ کچھ ہمت کا ہے فیض ۔۔۔ سنین ہجری حضرتؑ کا ہے فیض
ہے ان میں ایک تو 'نظمِ منورؔ' ۔۔۔ پھر 'اخبار امامتؑ' اوس سے بہتر
۱۲۸۶ھ
کہا ہاتف نے اب یوں بعد تحسین ۔۔۔ کہ نام اس کا ہے 'معراج المضامین'
۱۲۸۶ھ[۱۸۶۹ء]

۲ 'معراج نامہ' یا ''ممتاز نامہ'' کے سنِ تصنیف کا تذکرہ تو گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ 'ریحان معراج' میں میر ضمیر نے یہ تاریخ کہی ہے:

ندا آئی ہاتف کی بے اشتباہ
لکھو اس کی تاریخ 'فیضان شاہ' (۱۲۴۷ھ[۱۸۳۱ء]

ڈاکٹر اشپرنگر (اودھ کیٹلاگ ص ۶۰۵) اور ڈاکٹر گیان چند جین (اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۴۲۹) نے اس کا سن تصنیف ۱۲۲۷ھ بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۳۔ دونوں میں اختصار کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔
۴۔ دونوں ایک ہی دربار کی فرمائش پر نظم ہوئی ہیں۔[1]
۵۔ مرزا دبیر میر ضمیر کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی اس زمانہ میں ان کے مدِ مقابل سمجھے جاتے تھے اور ایک موقع پر جیسا کہ اس مقالہ کے پہلے باب میں مذکور ہوا ہے استاد اور شاگرد کے تعلقات خراب بھی ہوگئے تھے۔

راقم نے ریحان معراج کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر اکبر حیدری کے پاس دیکھا ہے جس کا سائز ۵ء ۱۱ × ۵ء ۷ اور ۸۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی تفصیل انہوں نے بھی اپنی کتاب ''میر ضمیر'' میں دی ہے۔

مرزا دبیر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ افضل حسین ثابت نے حیات دبیر میں صرف دو مطبوعہ مثنویوں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا ذکر کیا ہے۔[2] ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''دبستان دبیر'' میں ایک مثنوی ''احسن القصص'' کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے بعد میں ''مرزا دبیر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی: ممتاز نامہ'' دریافت کی جس کی اصل حقیقت راقم گزشتہ صفحوں میں بیان کرچکا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کا خیال ہے کہ مرزا دبیر کی کچھ اور مثنویاں ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں مگر موصوف نے کسی مثنوی کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب کی جو مثنویاں زیور اشاعت سے محروم رہیں ان میں ۲۷۷ اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ''ممتاز نامہ'' ہے۔[3]

راقم کو مرزا صادق صاحب (ابن مرزا طاہر رفیع ابن مرزا اوج ابن مرزا دبیر) کے پاس ایک ایسی غیر مطبوعہ مثنوی ملی جس پر کوئی عنوان نہیں دیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۳۲

---

۱ ''میر ضمیر'' اکبر حیدری ص ۴۸، آج کل دہلی جنوری ۱۹۷۷ء ص ۱۷ ''میر ضمیر اور مرزا دبیر کے دو معراج نامے'' مصنفہ سبط محمد نقوی۔
۲ حیات دبیر جلد ا ص ۲۷۷
۳ کاروان حیات مولا علی نمبر ص ۳۳

صفحات پر مشتمل ہے جس کا پہلا صفحہ خالی ہے۔ مخطوطہ کا سائز "٦x٩" ہے۔ اشعار کی تعداد ۵۳۰ ہے۔ اکثر صفحات پر ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن پر خط کھینچ کے انہیں رد کیا گیا ہے۔ ۵۳۰ کی تعداد میں وہ اشعار شامل نہیں ہیں۔ اس کے شروع میں یہ عبارت تحریر ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم"

''الحمد اللہ رب العالمین۔ وصل اللہ علیٰ محمد و آلہ اجمعین الیٰ یوم الدین'' اور آخر میں تحریر ہے:

''الحمد اللہ رب العالمین وصلواۃ اللہ علیٰ محمد و آلہ الطاہرین ولعنتہ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین۔''

یہ ایک عجیب و غریب مثنوی ہے اگرچہ اس سے یہ ظاہر ہے کہ مرزا دبیر نے اسے اپنی شاعری کے ابتدائی ایام میں نظم کیا ہوگا مگر اس سے جس تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیر کو نہ صرف اسلامی تاریخ اور اس کے واقعات سے دلچسپی تھی بلکہ عام سیاسی تاریخ سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس مثنوی میں دہلی کے تاریخی حالات ملتے ہیں۔ شیر شاہ کا غلبہ، ہمایوں کی جلاوطنی، اس کا شاہ ایران سے مدد طلب کرنا، نادر شاہ کا دہلی آنا، اور عہد محمد شاہ کے حالات، شہنشاہ دہلی اور شہنشاہ ایران میں خط و کتابت وغیرہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ راقم یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو تاریخی حالات اور واقعات اس میں نظم ہوئے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں البتہ مرزا دبیر کی تاریخ سے دلچسپی کا اس سے ضرور پتہ چلتا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ یہ کسی نثری قصہ کو نظم کی صورت دی گئی ہے یا کسی منظوم مثنوی کا ترجمہ ہے۔ اغلب ہے کہ یہ ماخذ کوئی فارسی کی کتاب رہی ہوگی۔ اس کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے:

وہ ٹیڑھی کلاہ اور ترچھی نگہ — یہ چاہا کہ سیدھا کروں اب جغہ
نظر کی سوئے افسران سپاہ — کہ دیکھوں انہیں کیا ہے حد نگہ
نگہ افسروں نے بھی کی تند و تیز — سروہی چلے جیسے وقت ستیز
نگہ اون سبھوں کی تھی گویا زباں — کیا عین مطلب یہ فر فر بیاں
کہ سیدھا کرے گا جغہ کو اگر — تو پھر یہ جغہ ہے نہ تو ہے نہ سر

یہاں ہم ہیں جتنے صغار و کبار ہیں اولاد شاہ صفی پر نثار

اور اختتام کے چند شعر یہ ہیں:

ہوئے شاہزادوں سے وہ[1] ہمکنار کیا اس نے والد کی طرح سے پیار

کرم سے دیا ہاتھ میں اوس کے ہاتھ چلا چاہ سے بحر قطرے کے ساتھ

درِ خیمہ پر جلد حاضر ہوا بغلگیر شرما کے نادر ہوا

دو چنداں ہوئی چشم کی آب و تاب کہ اک برج میں آئے دو آفتاب

اس میں نادر شاہ کی کافی تعریف و توصیف ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہوئی سلطنت جب خوزادیکے نام قزلباش نادر کے پھر تھے غلام

ہوئے شاہ ایراں یہ بچپن میں جب تو نادر سے راضی ہوئی فوج سب

جو سکّہ تھا نادر نے رہنے دیا مگر سکّۂ حکم جاری کیا

دلوں پر پڑا حکمِ نادر کا ٹھن اسی سکّہ کا ہر طرف تھا چلن

سلطنت دہلی کا حال بھی اکثر اشعار میں نظم کیا ہے۔ نامہ بر جو ایران سے دہلی آجاتا ہے اس کا حال اور تاریخ ہجرت کی تاریخ بھی کہی ہے:

کہا پھر بلا سے جو ہولے وہ ہو لکھا نامہ اس نے شہِ ہند کو

کتابت دی اک مردِ ہشیار کو روانہ ہوا آپ قندھار کو

صحیفہ کیا نامہ بر نے حصول چلا جانبِ ہند بن کر رسول

لیے خط و سوغات ایران سے وہ دلی میں آیا بڑی شان سے

مورخ نے ہجرت کے سن برمحل لکھے گیارہ سے اور ہفت و چہل

لکھا ہے کہ دلی میں باعز و جاہ محمد شاہ اون روزں تھا بادشاہ

---

[1] ''وہ سے مراد نادر شاہ ہے جن کو بلاکر وہ سلوک کرتا ہے۔ ان شہزادوں کی تفصیل اس مثنوی میں اس طرح دی گئی ہے:

تھے اک شیخ توران سے انتخاب کہیں شیخ عالم جنہیں شیخ و شاب

بزرگی تھی آباء و اجداد سے یہ تھے سہروردی کی اولاد سے

آگے چل کر یہ شعر ہے:

غرض خسروِ ہند کے رو برو گئے اور دہرائی سب گفتگو

دہلی میں خط کے تاثر اور نادر کی وقعت کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

سبک تھا وہ خط پیشِ خورد و کلاں　　حسینوں میں جیسے خطِ عاشقاں
امیرانِ دہلی تھے یوں ہم کلام　　یہ نادر ہے کس بے لیاقت کا نام

پڑھے لکھے سے کب یہ ہوئے خطا　　برابر کا خط بادشہ کو لکھا
کتابت میں طور مساوات ہے　　یہی چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے

فلک کے مقابل ہوئی ہے زمیں　　کوئی اس کا سمجھانے والا نہیں
کہ بابا کہاں تو کہاں بادشاہ　　یہ کوہ شکوہ اور تو اک برگِ کاہ

غرض مثل مکتوب تھا پیچ و تاب　　اڑھائی برس بعد لکھا جواب

اڑھائی برس کے بعد خط کا جواب پانے پر نادر کے تاثرات اس طرح نظم کیے ہیں:

پڑھا نامہ نادر نے جو ایک بار　　بڑھا اور اس خط سے دل کا غبار
نگاہ غضب سطروں میں گڑ گئی　　جبیں پر شکن قہر کی، پڑ گئی
سوئے ہند فی الفور راہی ہوا　　نزول عتاب الٰہی ہوا

سلطنت دہلی کا بعض اشعار میں خوب نقشہ کھینچا ہے کہ بادشاہ کس طرح لہو و لعب میں مشغول تھا اور اس کے جاں نثار بے دست و پا ہورہے تھے۔ جب نادر حملہ آور ہوا تو کابل کے صوبہ دار نے کمک کے لیے عریضہ بھیجا اس کا نتیجہ کیا نکلا، مرزا دبیر کے اشعار میں اس کو ملاحظ فرمائیں:

لکھا ہے کہ زمان رفیع المقام　　قوانین میں جس کا ناصر ہے نام
شہِ ہند کا ناصر و جاں نثار　　ہمیشہ سے کابل کے تھے صوبہ دار
شہِ ہند کو اوسنے کی عرضداشت　　نہ کوئی دقیقہ کیا وا گذاشت
لکھا یہ ہے تشویش بے حد ہوئی　　خبردار نادر کی آمد ہوئی
سمجھ کر کچھ ارشاد فرمایئے　　کمک کے لیے فوج بھجوایئے
لڑ و نگا میں حضرت کے اقبال سے　　بھگاؤں گا اس کو برے حال سے

نہ تھا عیش سے بادشاہ کو فراغ　　جواب عرائض کا کس کو دماغ

عجب حشر دلی میں بر پا ہوا　　شہِ ہند چونکا ارے کیا ہوا

اس مثنوی میں اکثر جگہوں اور شخصیتوں کے نام آئے ہیں جن میں سے بعض کو نظم کرنا آسان نہیں تھا چنانچہ مرزا دبیر نے بھی اس مشکل کا اعتراف کیا ہے :

دبیر اب تردد کا ہے سامنا　　ٹھہرنا، سنبھلنا، قلم تھامنا

یہ منزل وہ تاریک و باریک ہے　　کہ بے مشعلِ عذر ہوگی نہ طے

یہ ہے گو کہ بحر تقارب مگر　　کئی نام ہیں وزن سے دور تر

تکلف سے داخل کیے ہیں وہ نام　　کلام اون کی صحت میں ہی لا کلام

ولے شاعروں کا یہ ہے امتیاز　　ہے مالا یجوز ان کی خاطر جواز

ہے اس قول سے تو غلط ہی صحیح　　کہ ہے مذہب شاعرانِ فصیح

بہر حال سب سے یہ ہے التجا　　چھپانا خطا کو بچشمِ عطا

دبیر اس قدر عذر بس بس خموش　　خدا نے دیے ہیں تجھے چشم و گوش

جو نام اس مثنوی میں آئے ہیں ان میں کچھ یہ ہیں :

ہند۔ ایران۔ کابل۔ قندھار۔ اٹک۔ ہمسہ۔ نادر شاہ۔ طماس۔ شاہ صفی محمد شاہ۔ صمد خان۔ ناصر۔ دارا شکوہ۔ مظفر خان۔ علی خان قزلباش۔ خان معظم، مہر النساء وغیرہ۔

اس مثنوی کا مقصد واضح نہیں، ممکن ہے محض تفنن طبع کے لیے کہی ہو۔ اس مثنوی کا قصہ تاریخی واقعہ پر مبنی ہے۔ منظر نگاری نہ ہونے کے برابر ہے البتہ بعض کرداروں کی خصوصیات کی طرف اس خوبی سے اشارے کیے گئے ہیں کہ قاری کے ذہن پر دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان میں نادر شاہ کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ زبان و بیان میں دلکشی ہے مگر یہ مرزا دبیر کا ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے۔ اس کی کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود بھی انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ مسودہ نقل بھی نہیں ہوا ہے بلکہ ہنوز مسودہ کی شکل میں ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس مثنوی کی نشاندہی نہ کرسکا۔ اس مثنوی کے متذکرہ مخطوطہ کے آخری صفحہ کا عکس اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں، جس کے بارے میں گمان غالب ہے کہ

یہ بخطِ مرزا دبیر ہے۔

مجموعی طور پر مرزا دبیر کی مثنوی نگاری کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی اور اس میں بھی کامیاب نمونے یادگار چھوڑے۔

تاریخ گوئی

تاریخ گوئی کا فن بہت مشکل ہے مگر مرزا دبیر اس میں کافی مہارت رکھتے تھے اور بڑی آسانی سے تاریخ کہہ دیتے تھے۔ ثابت لکھنوی تحریر کرتے ہیں:

> ''تاریخ گوئی میں بھی مرزا صاحب کو کمال حاصل تھا۔ چند منٹ میں اکثر تاریخ کہہ دیتے تھے۔ ہزاروں تاریخیں کہی ہیں۔''[1]

مرزا دبیر ایک تاریخ کے کئی مادّے تلاش کرکے بڑی خوبی سے نظم کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ تاریخ راقم نے مرزا صادق کے پاس دیکھا ہے جس میں کسی ولادت کی تاریخ کہی گئی ہے اس کے ساتھ ایک اور قطعہ ہے جس میں عربی میں بھی تاریخ نکالی ہے۔ قطعہ اوّل میں علاحدہ علاحدہ ۱۲ مصرعوں میں تاریخ کہی ہے اور قطعہ ثانی میں تین تاریخیں ہیں۔ قطعہ اوّل اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

شکر لِلّٰہ چہ بہار است دبیر   گُلِ مقصد بکنار است دبیر

فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے مرزا دبیر تاریخ گوئی کے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ افضل حسین ثابت کے اس بیان میں کہ چند منٹ میں اکثر تاریخ کہہ دیتے تھے کوئی مبالغہ نہیں۔ فارسی میں تو تاریخ کہنے کا رواج اس زمانے میں عام تھا مگر عربی میں اتنی تاریخیں نہیں کہی جاتی تھیں۔ مرزا دبیر فارسی ہی کی طرح عربی میں بھی بڑی آسانی سے تاریخ کہہ دیتے تھے۔ مثال کے لیے یہ مصرعہ ملاحظہ ہو:

افوّض امری الی اللہ ١٢٤٦ھ

اس طرح مرزا دبیر کی عربی تاریخ گوئی کی مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں سے ایک نمونہ مشتے از خروارے پیش کیا گیا۔ ہمارے مقصد کی وضاحت کے لیے یہی

---

[1] حیات دبیر ص ۲۸۰

ایک عربی تاریخ کافی ہے۔

میر انیس کی وفات پر جو قطعہ تاریخ مرزا دبیر نے نظم کیا ہے اس پر کافی بحث ہوچکی۔ مرزا دبیر نے اس میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ثابت لکھتے ہیں:

قطعہ تاریخ

(۱) داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث	از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس
(۲) عبرۃ للناظرین گردید افلاک و زمین	دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس[1]

....

(۱۱) سال تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم	طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس
	زبر و بینہ میں زبر میں زبر و بینہ میں زبر میں
	۱۲۱ ۴۱۴ ۱۸۴ ۵۷۲
	میزان ۱۲۹۱ سنہ بارہ سو اکیانوے ہجری نکلے
(۱۲) در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف	گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین	طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس"

۹۴۵ — ۹۲۹

۱۸۷۴ء

مولوی صفدر حسین نے شمس الضحیٰ کے ضمیمے میں متذکرہ بالا قطعہ تاریخ کے دونوں شعر شائع کیے تھے جن سے وفات کا عیسوی سن نکلتا ہے۔ صاحبِ حیاتِ دبیر[2] نے اس تاریخ میں زبر و بینہ[3] پر بحث کی ہے جس میں ہجری اور عیسوی دونوں طرح کی

---

۱ وفات انیس کے تحت پورا قطعہ تاریخ پیش کیا جاچکا ہے۔

۲ حیات دبیر ص ۱۱۰۔ ۱۰۷

۳ زبر و بینہ میں دو لفظ ہوتے ہیں۔ زبر میں اسم حرف کے ساتھ پہلے حرف کا عدد لیا جاتا ہے اور بینہ میں اسم حرف کے بعد کے حروف لیے جاتے ہیں۔ زبر و بینہ میں ابتدائی حرف کے بعد اور باقی حروف کے عدد دونوں لیے جاتے ہیں مثلاً الف میں تین حرف ہوتے ہیں۔[ا، ل، ف] زبر میں [الف] لیا جائے گا۔ بینہ میں "ل" اور "ف" [۱۱۰] لیے جائیں گے اور زبر و بینہ میں ا،ل،ف(۱۱۱) تینوں حروف لیے جائیں گے۔ علمائے فن نے تاریخ اور معمے میں تمام حروف کے

تاریخوں کی بیک وقت موجودگی مرزا دبیر کے قدرت بیان کی مظہر ہے۔ ایک طرف وہی مصرع ہجری سن کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسری طرف ایک اور مصرع کے ساتھ شامل ہوکر وہی مصرع عیسوی سن کی نشاندہی کرتا ہے۔

بھاکا کی شاعری

مرزا دبیر کی پرگوئی بھاکا میں شاعری سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ انہوں نے بھاکا میں بھی شاعری کی اور نواب نصیر الدین حیدر کی فرمائش پر مرزا دبیر نے بھاکا زبان میں ٹھمریاں کہیں۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

> ''جناب مرزا اوج مرحوم فرماتے تھے کہ نواب نصیر الدین حیدر شاہ دوم اودھ نے جو ٹھمریاں وغیرہ بھاکا زبان میں میرزا دبیر مرحوم سے کہوائی تھیں وہ اب تک مسودوں میں موجود ہیں۔ مرزا صاحب بھاکا زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔''[1]

دوسری جگہ موصوف نے سبع مثانی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مرزا دبیر اردو کے علاوہ بھاکا کے بھی شاعر تھے۔ بھاکا کی چند ٹھمریاں وغیرہ جو مرزا نصیر الدین حیدر مرحوم شاہ اودھ کی فرمائش پر انہوں نے کہی تھیں وہ، مرزا اوج صاحب فرماتے تھے کہ محفوظ ہیں مگر چھپی نہیں ہیں۔[2]

راقم نے ایسے کلام کی کافی تلاش کی مگر حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔

○

اعداد بحساب زبر، بحساب بینہ اور بحساب زبر و بینات تینوں صورتوں میں جائز رکھا ہے لیکن اسے چیستاں بننے سے محفوظ رکھنے کے لیے شرط لگائی ہے کہ شاعر کو اشارہ کردینا چاہیے تاکہ سامعین خلاف مقصود اعداد کا شمار نہ کریں۔

۱ دربار حسین ص ۱۰۷ ثابت نے دربار حسین میں یہ انکشاف نواب والا قدر شہزادہ نواب وزیر مرزا صاحب مرحوم کی ٹھمریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ وہ بھی مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ ان کی ٹھمریاں بہت مشہور ہیں۔

۲ سبع مثانی دیباچہ ثابت ص ۲۳

باب سوم

مرثیہ اور اس کی روایت

مرثیہ ''رثا'' سے مشتق ہے۔ رثا ''بین'' کو کہتے ہیں۔ سید عابد علی عابد زین العابدین مصنف شعر و ادب فارسی مطبع تابش لالہ زار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''رثا ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے''[1]

ادبی اصطلاح کے اعتبار سے مرثیے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''ادبی اصطلاح کے طور پر مرثیہ اس صنف شعر کو کہتے ہیں جس میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ یا ان کے رفیقوں کے سفر کربلا، مصائب، شجاعت اور شہادت کا بیان کیا جائے اس ضمن میں کئی اور چیزیں بھی آ جاتی ہیں لیکن اصلاً اردو مرثیے کی بنیاد انہیں باتوں پر قائم ہے''[2]

مسعود حسن رضوی ادیب کی رائے اس سلسلے میں واضح اور جامع ہے وہ تحریر کرتے ہیں:

''مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسینؑ کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جائے یعنی مرثیے کا ایک مفہوم عام ہے اور دوسرا خاص۔ لفظ مرثیہ جب بغیر کسی تخصیص کے استعمال ہوتا ہے تو اس سے اکثر یہی خاص مفہوم مراد ہوتا ہے ''مرثیہ گو'' اور ''مرثیہ خوان'' کی ترکیبوں میں بھی خاص مفہوم مقصود ہوتا ہے''[3]

شاد عظیم آبادی نے مرثیہ کی اصطلاح پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''بالفعل اصطلاح مرثیہ کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں عموماً بزرگان دین اور خصوصاً سید الشہداء حضرت امام حسین اور ان کے اصحاب و اولاد کے مناقب و مصائب نظم ہوا کرتے ہیں اس کی توضیح کی چنداں ضرورت

---

۱ اصول انتقاد ادبیات ص ۶۴۵ سید عابد علی عابد، ناشر کریم احمد خان معتمد مجلس ترقی اردو لاہور ۱۹۶۰ء

۲ اصول انتقاد ادبیات ص ۶۴۶

۳ روح انیس ص ۱۹

نہیں گو شعرائے عرب و عجم نے اپنے خاص لوگوں کی موت پر بھی مرثیے
کہے ہیں مگر انکی اہمیت شخصی نوحہ و ماتم سے زیادہ نہیں ہے حضرت علی بن
طالب نے رسول اللہ کی وفات پر کئی موثر مرثیے کہے ہیں مگر نظم مسدس کا
رواج اسی ہندوستان میں ہوا۔ ابتدا میں بعض دکنی شعرا نے بھی چو بولے بطور
مرثیہ نظم کیے ہیں مگر وہ ہمارے احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ میرا مطلب جدید
مراثی سے ہے جس کی بھرپور ابتدا شہر لکھنو میں میرزادلگیر سے ہوتی ہے اور
جس میں بعد کو میر ضمیر و مرزا فصیح نے اضافہ کیا ہے''۔[1]

ہندوستان میں عزا داری اور مرثیہ گوئی کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں اس حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے اردو شاعری میں اس کی ابتداء ایرانی اثرات سے ہوئی۔ دکن میں جب مسلمانوں کی خود مختار بادشاہت (۱۳۴۷ء/۷۴۷ھ) قائم ہوئی اور محمد شاہ نے علاؤ الدین حسن گنگو بہمن کے بعد اس سلطنت کو نہ صرف مضبوط و مستحکم بنایا بلکہ اس کو وسعت بخشی۔ تو اس کے نتیجے میں غیر ملکیوں کو یہاں آنے کی کشش پیدا ہوگئی اور ایرانیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا۔ ابتدا سے ہی سرکردہ ہستیوں میں دوسروں کے مقابلے میں ایرانیوں کی تعداد زیادہ تھی یہی وجہ ہے کہ دکن کی اس وقت کی تہذیبی زندگی پر ایرانیوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ احمد شاہ بہمنی کے وقت میں تو ایرانیوں کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اور ایک موقع ایسا آ گیا کہ ملکی اور غیر ملکی سیاست کی ابتدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں معرکہ آرائیاں ہوئیں غرض ایرانی زندگی میں اتنے دخیل ہوگئے کہ نہ صرف انتظامی امور اور سیاسی شعور پر ان کی چھاپ پڑگئی بلکہ تہذیبی زندگی پر بھی ان کا نمایاں اثر پڑا۔ فن تعمیر اور دوسرے فنون لطیفہ بھی اس اثر کی گرفت میں آ گئے بلکہ فیروز کے مقبرے کی جو گلبرگہ میں ہے خصوصیت یہ ہے کہ یہ وقیع عمارت ہندوی دہلوی اور ایرانی طرز تعمیر کا ایک کامیاب امتزاج ہے۔ اس طرح ایرانیوں نے وہاں کی تہذیبی زندگی میں آہستہ آہستہ اپنے رسم و رواج اپنی تہذیبی روایتیں، اپنے عقائد و نظریات کو داخل کردیا۔ ایرانیوں میں عزاداری کی انتہائی اہمیت ہے۔ محرم کے مہینے میں یا اس کے

---

[1] فکر بلیغ حصہ دوم۔ شاد عظیم آبادی نسیم بکڈپو لکھنو ۲۱۔۲۰

عشرہ اول میں یہ لوگ ضرور کہیں نہ کہیں جمع ہوکر اپنے عقیدہ کے مطابق عزاداری کرتے رہے اور وقت کے ساتھ رواج بڑھتا گیا۔ اورنگ زیب نے حیدرآباد کے متعلق لکھا کہ یہاں کی ہر اینٹ رافضی ہے۔[1]

بہمنی سلطنت کا اثر و اقتدار جب کم ہوا تو ایرانیوں کے ایماء پر بیجاپور، احمد نگر اور گول کنڈہ کی حکومتیں خود مختار ہوگئیں۔ ایرانیوں کو یہاں کی ہر چیز کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ نہ تو واپس جانا چاہتے تھے اور نہ یہاں اجنبیوں کی طرح رہنا چاہتے تھے چنانچہ اس طرح ایک ملے جلے سماج اور ایک ملی جلی تہذیب کی بنیاد پڑی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کافی ہردلعزیز تھے وہ مقامی تہواروں، مقامی زبان اور مقامی تہذیب میں بے حد دلچسپی رکھنے کے باوجود ایرانی تہذیب اور ایرانی عقائد کے دلدادہ تھے چنانچہ محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام عیش و عشرت اور رنگینیوں کو خیر باد کہہ دیتے۔ شیشہ و جام سے تعلق نہ رکھتے اور سیاہ لباس پہن کر بغیر کسی سواری کے عزاخانے کا رخ کرتے اور ان کی رعایا جو انہیں دل سے پسند کرتی تھی ان کے ساتھ چلی جاتی اور اس طرح عزاداری کو شاہی سرپرستی اور عوامی مقبولیت دونوں حاصل ہوگئیں[2]۔ ظاہر ہے کہ عزاداری کی ان مجلسوں میں ذکر مصائب اہل بیت کی بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور اس طرح مقامی لوگوں کی دلچسپی کی وجہ سے ایک ایسی فضا تیار ہوگئی کہ جس کا تقاضا یہ تھا کہ مقامی زبان میں مرثیہ کہا جائے اور اس کو پڑھا جائے تاکہ لوگوں کے جذبات کی تسکین کا سامان بھی ہو اور وہ اپنے اس فعل سے واقفیت بھی رکھیں۔ اس کا مقصد تعلیمی تھا اور ضرورت تہذیبی تھی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور تحریر کرتے ہیں:

> ''[محمد قلی قطب شاہ] نے نہ صرف اپنے ہم خیالوں بلکہ تمام اہل ملک کو محرم کی تعظیم و تکریم اور شہدائے کرام کے غم و الم میں حصہ لینے کی طرف راغب کردیا۔''[3]

---

۱ اردو مرثیے کی روایت۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ص ۱۸

۲ سلطان محمد قلی قطب شاہ ص ۱۴۴

۳ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۱۵۴

ڈاکٹر زور سلطان قلی قطب کے مراثی کو اولیت عطا کرتے ہیں[1] لیکن نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' میں 'نوسرہار' کے مصنف اشرف کو اردو کا پہلا مرثیہ گو قرار دیتے ہیں[2] مگر نوسرہار ایک شہادت نامہ ہے اور بقول ڈاکٹر مسیح الزمان مرحوم ''شہادت نامہ'' کو مرثیہ قرار دینا درست نہیں[3]۔ ڈاکٹر رشید موسوی بھی ''شہادت نامہ'' اور ''مرثیہ'' کو دو مختلف اصناف نظم کہہ کر اشرف کے شرف اولیت کو خارج از امکان قرار دیتی ہیں[4]۔

اس طرح مراثی کے ابتدائی نمونے قلی قطب شاہ اور وجہی کے یہاں ملتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب نے بیسیوں مرثیے لکھے تھے مگر چند ہی مرثیے اب تک مل سکے ہیں۔[5] چنانچہ ان کے کلیات میں دو مکمل اور تین نامکمل مرثیے موجود ہیں[6]۔ ان مراثی سے محمد قلی قطب شاہ کی عقیدت، شاعرانہ مضمون آفرینی اور طرز بیان کی نزاکت کا پتہ چلتا ہے اس کے مقابلے میں وجہی[7] کے مرثیے اس زورِ بیان کے حامل نہیں۔

---

۱ ایضاً

۲ دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی ص ۹۰۔۲۸۹

۳ اردو مرثیے کی روایت ص ۲۰

۴ دکن میں مراسم عزاداری اور مرثیہ نگاری۔ مجلّہ عثمانیہ دکنی ادب نمبر ۱۱۸

۵ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۴۳

۶ کلیات سلطان قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور ص ۶۰۔۵۶

۷ یہ گولکنڈہ کے قطب شاہی دور میں عبداللہ قلی قطب شاہ کے درباری شاعر تھے (سب رس مرتبہ شمیم انہونوی۔ ناشر مکتبہ کلیاں لکھنو فروری ۱۹۶۲ء ص ۳) ان کی تین کتابیں اب تک سامنے آئی ہیں۔ تاج الحقائق، قطب مشتری اور سب رس۔ قطب مشتری ایک مثنوی ہے جس میں درپردہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ تاج الحقائق تصوف پر مبنی ایک نثری رسالہ ہے اور سب رس بھی ایک نثری داستان ہے جو تمثیلی پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ قطب مشتری ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں تصنیف ہوئی ہے اسے وجہی نے صرف بارہ دن میں تصنیف کیا اس کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

تمام اس کیا دیس بار اپنے   سنہ ایک ہزار ہور اٹھارہ بنے

سب رس اس مثنوی کے ستائیس یا اٹھائیس سال بعد ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی۔

(قطب مشتری مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص ۳۔۱ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۳۹ء)

عادل شاہی ریاست میں بھی اسی طرح عزاداری کا زور رہا۔ یہ ریاست دکنی ریاستوں میں سب سے زیادہ منظم اور مستحکم تھی۔ مرزا جیسا نامور مرثیہ گو اسی حکومت میں پیدا ہوا۔ مرزا نے ساری عمر صرف حمد' نعت' منقبت اور مرثیے لکھے چنانچہ جب علی عادل شاہ ثانی نے اس سے اپنا قصیدہ کہنے کی فرمائش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ میری زبان اب میرے اختیار میں نہیں ہے کیونکہ میں اسے بزرگان دین کے لیے وقف کر چکا ہوں[1]

مرزا کو اپنے زمانے میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابتدائی دور میں ہی مرزا نے مرثیہ میں نئے نئے پہلو پیدا کیے مسلسل واقعات کا بیان، ان کی ڈرامائی مسافت، تمہیدی واقعات، گھریلو زندگی، نفسیات انسانی، رخصت، رجز، جنگ اور شہادت کی تفصیل بیان کر کے مرثیے میں معنوی خوبیاں پیدا کیں اور شوکت الفاظ اور زور بیان سے اس کو ادبی شان سے مزّین کیا۔[2]

اورنگ زیب کے بیجاپور اور گول کنڈہ پر قابض ہونے سے یہ سلطنتیں ختم ہوگئیں مگر جو تہذیبی روایات یہاں عروج پا چکی تھیں' باقی رہ گئیں۔ شاہی سرپرستی ختم ہوجانے کی بنا پر بہت سے شاعر اور مرثیہ نگار منتشر ہوگئے۔ اور دکن کے گرد و نواح میں چلے گئے جہاں انھوں نے شعر وسخن کی نئی روایتیں قائم کرلیں۔

بعد کے مرثیہ گویوں میں ذوقی، بحری، اشرف، ندیم، تبسم، احمد وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے مگر جس شاعر نے مرثیے کی روایت کو زیادہ تقویت بخشی وہ ہاشم علی، ہیں۔ ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کو ردیف وار ''دیوان حسینی'' نام کے مجموعے میں جمع کر کے رکھا جس کا ایک قلمی نسخہ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے[3]۔ مرزا کی طرح انھوں نے بھی مختلف شہداء کے حال کے الگ الگ مرثیے نظم کیے ہیں۔ ان کے طویل مرثیوں میں رخصت کے مناظر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں مگر رزم کی کمی ہے دراصل مرثیہ اس زمانے میں اپنے عہد طفولیت سے گزر رہا تھا اور اس کے محرکات داخلی جذبات تھے جو

---

۱ بساتین السلاطین ص ۴۳۲

۲ اردو مرثیے کی روایت ص ۲۲۔۲۱

۳ اردو مرثیے کی روایت ص ۲۳

شاعر کو سیدھے سادے طریقے پر اپنے احساسات کا اظہار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

درگاہ قلی نے بھی کچھ اسی زمانے کے قریب مرثیے کہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مرثیے اپنے ہاں کی مجلسوں میں پڑھنے کے لیے کہے مگر یہ چونکہ دلی کا سفر کر چکے تھے اس لیے ان کی اور ہاشم علی کی زبان میں کچھ فرق ہے اور درگاہ قلی کے ہاں واقعات سلسلہ وار نہیں ملتے ان کے مرثیے' مربع' مخمس مسدس' مثمن' ترجیع بند وغیرہ میں ہیں۔

ان مراثی کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مرثیہ کا مقصد رنج وغم کے بیان کو سمجھتے تھے اور اس پر زور دیتے تھے۔ ہیئت کے لحاظ سے مرثیہ کی کوئی شکل اب تک معین نہیں ہو پائی تھی جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں یہ ایک تجرباتی دور تھا اور جس کا جس طرح سے بس چلتا مرثیہ نظم کرتا تھا۔

دکن میں مرثیہ کی روایت کو مضبوط بنانے والے شعراء کے نام جو معلوم ہوتے ہیں یہ ہیں: محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی احمد، کاظم، مرزا، نوری، ہاشمی، لطیف، افضل، شاہی، اشرف، ہاشم علی، متین، ذوقی، بحری، اصغر، شرف، روحی، سرور، فائز، فتح، عطا، ہادی، یوسف، صلاح وغیرہ[1]

شمالی ہند میں مرثیہ کی روایت اور اس کی ترقی

ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کے بعد دہلی میں ایرانی اثرات بڑھنا شروع ہوئے ہمایوں کے عہد میں تو ایرانی اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

> "ہمایوں کے زمانے سے ایرانی سردار حکومت میں نمایاں ہونے لگے کیونکہ ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی کے حسن سلوک کی بدولت ہی ۱۵۵۵ء میں وہ دہلی اور آگرہ کا تخت دوبارہ حاصل کرسکا"[2]

---

۱ دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی۔ اردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں اور دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی سے ماخوذ۔

۲ اردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں ۱۹۶۸ء ص ۸۹

اکبر کی وسیع الخیالی اور رواداری نے اس رجحان کو مزید تقویت بخشی اور دارالسلطنت میں ان کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کی بیگمات نور جہاں اور ممتاز محل، اورنگ زیب کی بیگم دلرس بیگم، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ اول، اس کی بیگم شہر بانو نے سلطنت مغلیہ کے رگ و پے میں ایرانی عقائد داخل کردیئے جن میں عزاداری کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ یہی صورت حال بعد کے ادوار میں بھی باقی رہی۔

ان حالات میں مرثیہ کا لکھا جانا تعجب کی بات نہیں۔ اس طرح دہلی میں اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ محمد شاہی دور میں شاہ حاتم اور میر محمدی بیدار نے مرثیہ کہا۔ بیدار نے تو اس کے لیے مسدس کی شکل کا انتخاب کیا[1]

افضل حسین ثابت نے ''دربار حسین'' میں مسدس میں مرثیہ کہنے کی اولیت کا تاج حیدری کو پہنایا ہے[2] جو ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے نزدیک غیر صحیح ہے[3] مولانا مجتبیٰ حسن کاموںپوری مرحوم لکھتے ہیں :

> ''...... میر اور سودا کے عہد تک مرثیے بالعموم ''چوبولوں'' یا چار مصرعوں میں کہے جاتے رہے مگر پنجاب کے مشہور مرثیہ گو میاں سکندر نے پہلی بار مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھا۔ میاں سکندر سودا کے ہمعصر تھے ان کا مرثیہ اپنی مرثیت میں آج بھی بے نظیر ہے زبان کی سادگی اور جذبات کی اثر آفرینی سے ان کا مرثیہ سدا بہار بن گیا ہے''[4]

دکن سے دلی تک کے سفر میں مرثیہ نے مختلف ہاتھوں سے گزر کر کافی ترقی کی۔ اس کی ہیئت میں کئی تبدیلیاں آگئیں اور اس صنف کے استحکام کی طرف مختلف شاعروں نے کافی توجہ کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں :

> ''دکنی شعراء کے دو تجربات سے شمالی ہند کے شعراء نے خصوصیت سے فائدہ اٹھایا۔ اول تو یہ کہ دکنی شعرا نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ماتم یا سلام کی طرز میں

---

۱ نگار اصناف سخن نمبر جنوری فروری ۱۹۵۷ء

۲ دربار حسین ص ۳

۳ دبستان دبیر ص ۱۲۱

۴ ارشاد کراچی ۶ مئی ۱۹۶۶ء ''اردو میں مرثیہ نگاری کا ارتقاء'' ص ۸۔۷

کہے ہوئے مراثی مجمع کو متاثر نہیں کرتے اس لیے انھوں نے مربع، مخمس اور مسدس وغیرہ کا تجربہ شروع کردیا تھا اور آخر مربع کی صورت ایسی کامیاب رہی تھی کہ یہی صورت شمالی ہند میں منتقل ہوئی تھی اور عرصہ تک شمالی ہند کے مرثیہ گو اس کا تتبع کرتے رہے دوسری چیز جو دکن سے شمالی ہند پہنچی وہ مراثی میں اثر پیدا کرنے کے لیے مقامی مراسم و مروجات کا نظم کیا جانا ہے۔ دکنی شعراء کا یہ تجربہ نفسیاتی طور پر اتنا کامیاب تھا کہ شمالی ہند کے شعرا نے اس سے بڑا فائدہ اٹھایا اور انیس و دبیر وغیرہ کے مراثی میں بھی اس تجربہ کے اثرات شدت سے کارفرما ہیں۔"[1]

شمالی ہند میں ان اثرات کے ساتھ مرثیہ گوئی کا چلن جلد ہی عام ہوگیا اور عاصمی یکرنگ، سکندر، ندیم، ضاحک، سودا، میر تقی میر، میر حسن، باقر، ظہور شرف، مسکین، غمگین، حزین، نثار وغیرہ نے مرثیے کہے مگر دہلی میں چونکہ اس کو شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی اس لیے اس صنف نے وہاں اتنی ترقی نہ کی جتنی آگے چل کر اس نے اودھ میں کرلی۔

اَودھ میں مرثیہ کا فروغ

اودھ میں نوابان اودھ کی حکومت قائم ہوئی اور سعادت خان برہان الملک نے سرکش زمینداروں کے زور کو توڑ دیا۔ لکھنؤ کے شیخ زادوں[2] کی خودسری کو ختم کردیا اور دوسرے جاگیرداروں، رئیسوں اور راجاؤں کو زیر کر کے صوبہ اودھ کی آمدنی کو تقریباً ستر لاکھ سے دو کروڑ تک پہنچا دیا۔ اجودھیا سے چار میل دور دریائے گھاگھرا کے کنارے اپنا

---

۱ دبستان دبیر ص ۱۱۵

۲ لکھنؤ میں شیخ عبدالرحیم کی اولاد جو شیخ زادے کہلاتے تھے کسی صوبہ دار کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک محل بنایا تھا جس کے عالیشان دروازے میں ایک شمشیر لٹکی رہتی تھی اور جو صوبیدار دلی سے آتا اس دروازے سے جھک کر نکلتا اور اس طرح شیخ زادوں کی طاقت کے سامنے سرخم کرتا۔ دروازے پر یہ لٹکی ہوئی تلوار ان کے وقار اور تمکنت کا نشان تھی۔ (لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ابواللیث صدیقی' نیا ایڈیشن اردو پبلشرز لکھنؤ نظامی پریس ۱۹۷۳ء ص ۲۰

مسکن تعمیر کیا۔ یہ کوئی شاندار محل نہیں تھا بلکہ بلند مقام پر چاروں طرف کچی دیوار کھینچ کر چار گوشوں میں چار برج بنا دیے گئے تھے۔ اس کے وسط میں ایک خس پوش چھپر کا بنگلہ برہان الملک کا محل تھا۔ چہار دیواری کے اندر پورے قلعہ کی جگہ تھی۔ بیگمات کے لیے بھی اسی طرح کے کچے محل تعمیر کیے گئے۔ برہان الملک جب صوبہ کے مختلف علاقوں کے دوروں سے فرصت پاتے تو اس بنگلے میں آ کر ٹھہرتے۔ اس مناسبت سے اس بستی کا نام ہی "بنگلہ" پڑ گیا جس کو بعد میں صفدر جنگ کے عہد میں ایران کے ایک علاقے کے نام پر فیض آباد کا نام دیا گیا۔ یہی اودھ کا پہلا دارالخلافہ تھا۔ برہان لملک کے انتقال کے بعد صفدر جنگ تخت نشین ہوئے۔ صفدر جنگ کے بعد نواب شجاع الدولہ کے ہاتھ میں اختیار آ گیا اور انھوں نے لکھنو بسایا[1]۔ اس سے فیض آباد کی رونق کچھ وقت کے لیے کم ہوگئی پھر بھی شجاع الدولہ سال میں دو تین بار فیض آباد ضرور آتے اور قیام کرتے لیکن انگریزوں سے جنگ اور پھر معاہدہ ہونے کے بعد نواب احمد خاں بنگش کے مشورہ سے لکھنو کی بجائے دوبارہ فیض آباد میں قیام اختیار کیا۔ پرانے حصار کو نئے سرے سے تعمیر کرایا اور اس شہر کو نئے سرے سے رونق نصیب ہوگئی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کو اختیار ملا، تو انھوں نے فیض آباد کے بدلے لکھنو کو دارالخلافہ بنایا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

> "لکھنو میں ترقی کی رفتار آصف الدولہ کے وہاں قیام سے بہت ہوگئی۔ ان کی شاہ خرچی نے دولت کی فراوانی اور مادّی خوشحالی کے ایک غیر معمولی دور کا آغاز کر دیا۔"[2]
>
> "دولت کی فراوانی اور مادّی خوشحالی نے لکھنؤ کو اہل کمال کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ چنانچہ ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے لکھنؤ کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ یہ فخر البلاد ہوگیا۔ اس رنگا رنگی کے سبب سے فلک کے ہر کونے سے لکھنو کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔"

---

۱ لکھنو کی وجہ تسمیہ جاننے کے لیے دیکھیے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ص ۲۵۔ ۲۳

۲ اردو مرثیے کا ارتقاء، مسیح الزماں ص ۱۴۱

یہ وہ زمانہ تھا جب دلی کا دربار آخری سانسیں لے رہا تھا اور مغلیہ سلطنت کی شمع بجھنے کو تھی۔ سیاسی اقتدار کے ساتھ دولت اور اطمینان بھی ناپید ہو چکے تھے اہل کمال کی قدر دانی کون کرتا۔ ہنر مند دلی سے باہر نظریں اٹھا کر دیکھنے لگے تو اودھ کی معطر فضائیں اور فارغ البالی، دولت کی ریل پیل اور قدردانیِ اہل کمال باعثِ کشش ہوگئی دلی کے باکمالوں میں اکثر و بیشتر اودھ پہنچے۔ شجاع الدولہ کے عہد میں بھی اشرف علی خان فغاں اور ان کے بعد سودا، میر سوز، میر تقی میر ترک وطن کر کے لکھنؤ آئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے میر حیدر علی حیران، خواجہ حسن حسن، مرزا فاخر مکین، میر رضا، میر حسن بھی یہیں چلے آئے میر قمرالدین منت، ضیاء الدین ضیا، اشرف علی خان فغاں اگرچہ آخری عمر تک لکھنؤ میں نہ رہے مگر کافی وقت تک یہاں قیام کیا اور اپنے کلام کی یہاں داد پائی، جرات، انشا، مصحفی اور رنگین کی شاعری کا عروج بھی لکھنو ہی میں ہوا۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں بھی یہ فیض عام رہا۔ ان کے بعد وزیرعلی کے ہاتھ میں صرف چار ماہ انتظام و انصرام رہا اور ان کے بعد سعادت علی خان کے ہاتھوں میں یہ فیض اوروں تک پہنچتا رہا۔ سعادت علی خان کے بعد غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے ہاتھوں میں انتظام رہا۔ یہاں تک کہ سلطنت اودھ کا ستارۂ اقبال غروب ہوگیا اور واجد علی شاہ مٹیابرج کلکتہ بھیج دیے گئے۔

نواب برہان الملک کے آباء و اجداد ایرانی تھے اور ان کا شجرہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا تھا۔ عزاداری سے ان کو نہایت عقیدت تھی۔ گو کہ شمالی ہند کے دیگر علاقوں کی طرح اودھ میں اس سے قبل ہی عزاداری کی روایت پہنچ چکی تھی مگر ان کے زمانے سے اس کو اور ترقی ملتی گئی۔ حکمرانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں تک نے امام باڑے بنوائے اور یادگار مجلسیں منعقد کیں۔ مسلمانوں کی تو بات ہی نہیں تھی۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ بقیہ ہندوستان کی حالت ابتر تھی مگر یہاں کے حکمرانوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں سے نہ صرف اپنے علاقوں کی حفاظت کی تھی، بلکہ یہاں کے لوگوں کو بھی جینے کے آداب سکھائے تھے اور زندگی کو خوشیوں اور شادمانیوں سے بھر دیا تھا۔ لوگ اپنے حکمرانوں سے والہانہ محبت رکھتے تھے اس لیے اپنے حکمرانوں کی سب

ہی رسموں میں خوشی سے شریک ہوتے تھے[1] اپنے حکمرانوں کی طرح انہیں بھی اہل بیت طاہرینؑ سے عقیدت پیدا ہوگئی اور مجلسوں میں شریک ہونے لگے۔ تعزیے رکھنے لگے اور عزاداری کی دیگر رسموں کو بھی فروغ دیا۔ الماس علی خان وزیر (خواجہ سرا آصف الدولہ) نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء سے قبل ہی ایک عالیشان امام باڑہ چوپٹیاں لکھنو میں تعمیر کیا۔ اس کے بعد نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا سب سے بڑا امام باڑہ میر کفایت اللہ کی نگرانی میں تعمیر کرایا۔ یہ اب بھی ''آصفی امام باڑہ'' کے نام سے مشہور ہے اور ہندوستان کے تعمیری عجائبات میں شمار ہوتا ہے

غیر مسلموں کی عزاداری

آصف الدولہ ہی کے زمانے میں مہاراجہ جھاؤ لال عہدۂ نیابت پر ممتاز تھے۔[2] ان کی معزولی کے بعد آصف الدولہ کو ان کی جدائی کا اتنا قلق ہوا تھا کہ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ راجہ جھاؤ لال کی یادگاریں لکھنؤ میں اب بھی موجود ہیں ٹھاکر گنج میں انھوں نے ایک شاندار امامباڑہ اور اس کے قریب ہی مقابل میں ایک عالیشان مسجد بھی بنوائی تھی۔ راجہ موصوف عظیم آباد میں بڑے اہتمام سے عزاداری کرتے تھے۔

راجہ میوا رام پہلے ہندو تھے بعد میں مسلمان ہوئے اور اسلامی نام ہدایت علی اختیار کیا۔ نصیر الدین حیدر نے افتخار الدولہ کا خطاب دے کر اپنا دیوان مقرر کرلیا اور تین لاکھ روپے کا انعام بھی دیا۔ یہ بھی عشرہ محرم اور ائمہ طاہرینؑ کی وفات پر دل کھول کر روپیہ صرف کرتے تھے[3]

مرزا محمد کاظم ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''تعزیہ داری عشرہ محرم ہزار ہا صرف می کردند۔ دو سہ صد کس از ذاکرین در عشرہ محرم در مجالس معین می داشتند و مجلس از اول شب شروع می شد و آخر شب تمام می گردید و بہ اکثر ذاکرین مبلغ خطیر عنایت می شد و زائرین

---

۱ تفصیل کے لیے ملاحظ فرمایئے 'لکھنو کا دبستان شاعری' ص ۳۰۔۱۸

۲ تفضیح الغافلین، مرزا ابوطالب لندنی ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹۶ء ص ۱۴۴

۳ منظومات میاں دلگیر ص ۸۱۱

کربلائے معلیٰ و حجاج و سادات و مومنین تبرکات بسیار می نمودند''[1]

لالہ چھنو لال دلگیر بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ ان کے والد کا نام منشی رسوا رام تھا اور قوم کے کائستھ سکسینہ اور مہاراجہ جھاؤ لال اور راجہ میوہ رام کی برادری سے تھے۔ مسلمان ہوکر اپنا نام غلام حسین رکھا۔ اہل بیت طاہرینؑ سے ایسی عقیدت ہوگئی کہ اپنی غزلوں کا دیوان موتی جھیل میں ڈبو دیا اور پھر ساری عمر مرثیے اور منقبت کہتے رہے۔[2]

مرثیہ کی عام دلچسپی، حوصلہ افزائی اور اس کی ترقی

غازی الدین حیدر کی عقیدت کا پتہ شاہ نجف کے امام باڑے سے چلتا ہے جو انھوں نے تعمیر کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے حالات نائٹن کی تصنیف Life of an Eastern King سے معلوم ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کی اس والہانہ عقیدت نے، جو انہیں اہل بیت طاہرینؑ سے تھی اور جس کا اظہار وہ عزاداری کے ذریعہ کرتے تھے، اودھ کے عوام کو اس کی طرف مائل کردیا اور وہ بغیر کسی تعصب اور تفریق کے مجالس عزا میں بڑی سرگرمی سے حصہ لینے لگے اس طرح مرثیہ گوئی کے لیے ایک ہموار، حوصلہ افزا اور پروقار فضا تیار ہوگئی۔

مرثیہ اس سے پہلے ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کرچکا تھا مگر جو مرثیہ انیس اور دبیر کے زمانے میں کمال عروج کو پہنچا اور آج تک جس کا سلسلہ جاری ہے، اس کے لیے ابھی بہت محنت کرنا باقی تھی

شاہی سرپرستی اور عام لوگوں کی حوصلہ افزائی نے مرثیہ کا وہ جادو جگایا کہ پرانی مثل ''بگڑا شاعر مرثیہ گو''، ''بگڑا گویا سوزخوان'' بیکار ہوکر رہ گئی۔ اچھے اچھے شاعر اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اپنا زاد آخرت سمجھ کر اس طرح سنبھالا سنوارا کہ اس کے وقار سے اردو شاعری کے وقار میں اضافہ ہوگیا۔

سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

''مرثیہ نگاروں کی تربیت صرف ایک مذہبی میلان یا رجحان ہی کا نتیجہ

---

۱ رسالہ سوانح عمری - مرزا محمد کاظم مطبوعہ ۱۸۸۷ء ص ۲۰

۲ منظومات میاں دلگیر ص ۱۱۔ ۹

نہیں۔۔۔۔ سلاطین، امراء، وزراء اور عوام نے مرثیہ نگاروں کی ایسی قدر دانی کی کہ مرثیہ ایک علاحدہ صنف سخن کی حیثیت سے اپنی روایات کو لیے ہوئے لکھنؤ میں متجر ہوگیا۔[1]

اس حد تک تو عابد علی عابد صاحب کا فرمانا صحیح ہے کہ مرثیہ کی ترقی میں امراء اور وزراء کی حوصلہ افزائیوں کا بھی ہاتھ ہے مگر انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اکثر مرثیہ گو شعراء اپنے جذبۂ دل اور مذہبی میلان سے ہی متاثر ہوکر مرثیہ کہتے تھے۔ اگر یہ کام دوسروں کی قدر دانی کے بل پر کیا جاتا تو اتنی مقبولیت کا حاصل ہونا مشکل تھا اور ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے کے بعد اس کی مقبولیت میں ضرور فرق آتا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں :

''شیعہ لوگ صرف امام باڑوں میں جاکر اور مجالس عزا میں شریک ہوکر ہی سیدالشہدا کا غم نہیں مناتے بلکہ وہ زمانۂ عزا میں اپنے نفس پر بھی جبر کرتے ہیں۔ وہ معمولی کھری چار پائیوں یا چٹائیوں پر سوتے اور سادہ غذائیں کھاتے ہیں۔ گرم سالن اور مزیدار پلاؤ چھوڑ کر جو کی روٹی اور دال پر اکتفا کرتے ہیں۔ عورتیں بھی اپنے زیورات بڑھا کر سامانِ آرائش کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔''[2]

یہ بات پہلے ہی سامنے آچکی ہے کہ نصیر الدین حیدر کے زمانے سے لکھنؤ شمالی ہند میں عزاداری کا مرکز بن گیا تھا۔ مسلمان تو در کنار ہندوؤں نے بھی عالیشان امام باڑے تعمیر کروائے۔ اس سے لوگوں کے عزاداری کے ذوق و شوق میں بھی اضافہ ہوگیا اور مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور مرثیہ نے وہ قالب اختیار کیا جو اب تک مقبول ہے امام باڑوں میں مجلسیں پڑھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مرثیہ گو شاعر اور مرثیہ خوان بلوائے جاتے ہربانیِ مجلس یہ چاہتا تھا کہ مجلس کامیاب ہو اور اس طرح مرثیہ گو شعراء کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اس سے شاعر بھی مرثیہ کے بارے میں سنجیدہ ہوگئے

---

۱ اصول انتقادیات ادبیات ص ۶۴۹

۲ لکھنو کی تہذیبی میراث، ڈاکٹر صفدر حسین بارگاہ ادب لاہور ۱۹۷۵ء ص ۲۴۴

اور سننے والے بھی اور اردو مرثیہ نے ایک مکمل اور پختہ صورت اختیار کرلی۔ مرثیہ کی یہ صورت دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی مرثیہ کو یہ صورت دینا اور اس منزل تک لے جانا محض اردو کے شاعروں کا کارنامہ ہے۔ سید عابد علی عابد بجا کہتے ہیں:

> ''عجیب بات ہے کہ اردو شاعری نے تقریباً ہر صنفِ سخن کے سلسلے میں فارسی سے استفادہ کیا لیکن مراسم عزا اور مرثیہ نگاری میں برصغیر ہند و پاکستان کے لوگوں نے ایک بالکل نئے مسلک کی بنیاد رکھی جو نہ صرف ایرانی مسلک سے مختلف ہے بلکہ جس کی مثال دنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔''[۱]

عبدالحلیم شرر کہتے ہیں کہ مرثیے نے اردو شاعری میں اضافہ کر کے ایسی نئی چیزیں اردو والوں کو دے دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈنے لگی تھیں۔[۲]

اردو مرثیہ میں ندرت

اردو مرثیہ میں ندرت پیدا کرنے اور نئے طرز کی مرثیہ گوئی کی ابتدا کا سہرا عام طور پر میر ضمیر کے سر باندھا جاتا رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''[مرثیہ] اس وقت تک ۳۰ سے ۴۵ حد ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا۔ ع

''کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے''

> اس میں شہزادہ علی اکبرؑ کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا پھر سراپا لکھا، پھر میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا اور بیان شہادت پر خاتمہ کردیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا اس لیے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں تمام شہر میں شہرہ ہوگیا اور اطراف سے طلب میں فرمائشیں آئیں۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہوگئی باوجودیکہ انھوں نے مقطع میں کہہ دیا تھا۔

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ ورد ہے میرا

---

۱ اصول انتقاد ادبیات ص ۶۴۶

۲ گزشتہ لکھنو، عبدالحلیم شرر ص ۱۰۴

اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا

پھر بھی سب اس کی پیروی کرنے لگے، یہاں تک کہ پہلے امانت نے پھر
اور شاعروں نے و اسوخت کو سراپا میں داخل کیا۔"[1]

علامہ شبلی[2] نے بھی جدید طرز کے مرثیہ کا موجد میر ضمیر کو قرار دیا ہے

مولانا حالی[3] بھی مقدمہ شعر و شاعری میں میر ضمیر کی اس جدت پسندی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مؤلف ''گل رعنا'' اس ضمن میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک معلوم ہوا ہے سب سے پہلے میر مظفر حسین ضمیر نے اس میں جدتیں پیدا کیں اور جس نظم کی بنیاد محض درد و غم پر تھی اس میں گھوڑے تلوار وغیرہ اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے۔ سراپا ایجاد کیا۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ لڑائی کے داؤں و پیچ اور اس کے ٹھاٹھ کا خاکہ کھینچا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز خوانی کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پر ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کردی بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کردیے ایک ایک واقعے کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کردیا۔ مناظر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ بمشکل مل سکے گا۔ اس طرح جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی کرکے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچادیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خد و خال اور گل و بلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا اور اردو شاعری کی تاریخ نامکمل

---

۱ آب حیات ص۲۸۱

۲ موازنہ انیس و دبیر، شبلی ص۲۲ (کتب خانہ محمد رشید)

۳ مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۴۰

رہے گی اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے''[1]

صاحبان مطالعہ انیس کی بھی رائے یہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''میر ضمیر نے ایک مرثیہ ۱۰۱ بند کا لکھا جس میں شہزادہ علی اکبرؑ کی شہادت کا بیان کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے............

...... اس مرثیہ میں تمہید سے چہرہ باندھا پھر سراپا لکھا جو اس سے پہلے مرثیوں میں شامل نہیں تھا ....

.... میر ضمیر کا یہ دعویٰ سچ ہے' اس طرزِ نوی کی تقلید سب نے کی اور سب میر ضمیر کے چشمہ سے سیراب ہوئے''[2]

اسی طرح ڈاکٹر شارب رودولوی[3] اور سفارش حسین رضوی[4] بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

''ضمیر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی تمام کوششیں مرثیہ گوئی کی فنی ترقی کے لیے صرف کی ہیں۔ ان سے پہلے کے مراثی مختصر ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ۸۰۔۹۰ اور ۱۰۰ بند سے زیادہ کے مرثیے بھی کہے۔ پہلے مرثیے میں صرف واقعات شہادت کے بیان پر ہی اکتفا کی جاتی تھی۔ ضمیر نے مختلف موضوعات کو علاحدہ علاحدہ فنی خصوصیات کے ساتھ باندھا مثلاً سراپا، گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف وغیرہ ان خصوصیات اور ایسی ہی اور خصوصیات کے اعتبار سے وہ مرثیہ گوئی میں پہلے صاحبِ فن اور صاحبِ طرز ہیں۔''[5]

متذکرہ بالا ناقدین، مورخین اور محققین اردو مرثیہ کے متواتر بیان کے باوجود جدید تحقیق

---

۱ گل رعنا۔ مولانا حکیم سید عبدالحی ص ۹۹۔۴۹۸۔ طبع چہارم ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء مطبع معارف اعظم گڑھ

۲ مطالعہ انیس ص ۳۵۔۳۴

۳ مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر ص ۳۰

۴ اردو مرثیہ ص ۲۸۶

۵ لکھنو کا دبستان شاعری ص ۸۲۔۵۸۱

کی رو سے میر ضمیر کو عناصر مرثیہ: چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت، بین کا موجد قرار دینا غیر صحیح سمجھا جاتا ہے اور اسے ادبی مغالطہ کی حیثیت حاصل ہے جس میں عرصہ دراز تک شائقین مرثیہ گرفتار رہے۔ اس مغالطہ کا سبب میر ضمیر کے مشہور و معروف مرثیہ ''کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے'' کا ۱۰۰ واں بند ہے جو درج ذیل کیا جاتا ہے:

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبی کے | سن بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے | اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے

دس میں کہوں، سو میں کہوں، یہ ورد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

حقیقت یہ ہے کہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں میر ضمیر نے حضرت علی اکبرؓ کے حال میں متذکرہ بالا مرثیہ لکھا، جس کا آغاز سراپا کے بیان سے ہوتا ہے۔ انھوں نے حضرت علی اکبرؓ کا سراپا بیان کرنے میں زبردست کاوش کی ہے حالانکہ اردو شاعری میں سراپا نگاری نئی بات نہیں تھی لیکن مرثیے میں سراپا کا رواج دور ضمیر کے قبل نظر نہیں آتا۔ مدنظر رہے کہ عام شاعری کے انداز کا سراپا مراثی کے مقدس و روح پرور ماحول کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میر ضمیر نے تمام باریکیوں اور نفاستوں کو مدنظر رکھ کر شبیہ پیغمبر کی سراپا نگاری کی ہے:

خط جلوہ نما عارضِ گلگوں پہ ہوا ہے
مصحف کو کسی نے ورقِ گل پہ لکھا ہے

اس سراپا نگاری پر میر ضمیر کو احساس تفاخر ہوتا ہے اور وجد کے عالم میں کہتے ہیں:

نقاش میں یہ صنعتِ تحریر نہیں ہے
تصویر دکھاتا ہوں یہ تقریر نہیں ہے

میر ضمیر کے اس احساس تفاخر کو مدِ نظر رکھا جائے تو ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں 'طرز نوی' کے قائم کرنے کے دعوے کی حقیقت کا اندازہ ہو سکے گا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے مرثیے میں سراپا نگاری کی کامیاب ابتدا کی تھی۔ ان کو اندازہ تھا کہ بعد میں ان کے طرز پر دیگر

مرثیہ گو طبع آزمائی کریں گے جو وقت کے ساتھ صحیح ثابت ہوا پھر' جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا' کا قول کس طرح غلط یا مبالغہ پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے البتہ ان کے طرزِ نوی کے دعوے کو اردو مراثی کے عناصر ترکیبی کا متبادل قرار دینا صریحی زیادتی ہے اس موضوع پر ڈاکٹر مسیح الزماں نے واضح طور پر روشنی ڈالی ہے:

''طرزِ نوی'' سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ مرثیے کے عروج کی شکل یعنی جس میں چہرہ' سراپا' رخصت' آمد' رجز' جنگ' شہادت اور بین ہو چونکہ اسی زمانے میں مرّوج ہوئی اس لیے اسی کو ضمیر نے ''طرز نوی'' کہہ کر اس کی ابتدا کا دعویٰ کیا ہے یہ خیال جلد بازی اور سطحیت کا نتیجہ ہے اور اس دور کے مرثیوں سے بڑی حد تک ناواقفیت پر مبنی ہے''[1]

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ضمیر نے جو ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں نیا انداز اختیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے وہ ہمشکل نبیؐ کے وصف لکھنے کے سلسلے میں کیا ہے۔ پورے مرثیے کی ہیئت کے لیے نہیں کیا ہے۔[2] اس خیال کی تصدیق ڈاکٹر صفدر حسین بھی کرتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

''مرزا فصیح نے اپنے ایک مرثیہ 'مومنو فاطمہؑ کے لختِ جگر تھے حسنینؑ' میں چہرہ، رخصت، رزم اور شہادت وغیرہ نظم کیے ہیں۔ رزم خصوصیت کے ساتھ اچھی کہی ہے۔ صرف سراپا کی کمی ہے جسے بعد میں میر ضمیر نے پورا کیا۔ اس لیے میر ضمیر پر اوّلیت کا سہرا باندھنا مناسب نہیں۔''[3]

ڈاکٹر اکبر حیدری لکھتے ہیں:

''محض اس بند کی بنیاد پر میر ضمیر کے سر ''طرز نوی'' کا سہرا باندھنا درست نہیں ہے۔ میر ضمیر کے علاوہ اس دور کے مشہور مرثیہ گو میر خلیق' مرزا فصیح اور میاں دلگیر بھی تھے۔ میر خلیق سن کے لحاظ سے سب سے بڑے تھے۔''[4]

ڈاکٹر مسیح الزماں نے مراثی ضمیر کے اہم نکات اس طرح پیش کیے ہیں:

---

۱ اردو مرثیے کا ارتقاء ص۲۵۶

۲۔۳ نگار اصناف سخن نمبر جنوری فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۰۹

۴ میر ضمیر ص ۷۰

''دورِ تعمیر کے مرثیہ گویوں میں ضمیر کی شخصیت سب سے قدآور ہے۔ انھوں نے مرثیہ کو سراپا اور جنگ کے مناظر سے وسعت دی۔ جنگ کے بیانات کا انھوں نے جس طرح اضافہ کیا اس نے مرثیہ کی دنیا ہی بدل دی۔ اسے آگے بڑھنے اور پھیلنے کا ایک نیا راستہ مل گیا جس پر چل کر صنفِ مرثیہ اعلیٰ شاعری کے بہت سے خصوصیات پا گئی۔ جوش و ہمت، جاں نثاری کے جذبات نے شاعری میں صحت مند رجحانات کو تقویت پہنچائی۔ واقعہ نگاری کے نئے پہلو پیدا ہوئے اور مرثیہ صرف مظلومیت کی داستان نہ رہا بلکہ ہمت و جوانمردی، ولولہ اور بہادری کے کارناموں کا بیان ہوگیا جس سے اردو کی ایک بڑی کمی پوری ہوئی۔ دوسری طرف شوکت الفاظ اور معنی آفرینی نے مرثیہ میں قصیدہ کا شکوہ پیدا کیا اور ایک خالص ادبی رنگ نے مرثیہ میں جگہ پاکر شاعرانہ صناعیوں اور زورِ تخیل کے رنگ دکھائے جس سے اس مخصوص مذاقِ سخن کے شیدائیوں میں بھی اس صنف کی قدر بڑھی۔ غرض مرثیہ ضمیر کے ہاتھوں میں ایک شاندار صنف کی حیثیت سے نمایاں ہوگیا جس کے موضوعات کی وسعت اور وسیع امکانات نے بعد کے مرثیہ گویوں کے لیے ایک منضبط اور مربوط ڈھانچہ اور ایک قابل قدر روایت مہیا کی جسے وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھا سکتے تھے''[1]

مرزا دبیر انہیں میر ضمیر کے شاگرد ہیں۔ مرزا دبیر کی شہرت میر ضمیر کے زمانے میں ہی ہوئی اور استاد اور شاگرد ہونے کے باوجود دونوں کے انتقال میں بیس برس کا فرق ہے۔ خود میر ضمیر نے مرزا دبیر جیسے شاگرد پر فخر کیا ہے میر ضمیر اور مرزا دبیر میں جو مرثیہ

ذرہ ہے آفتاب درِ بوترابؑ کا

پر آپس میں ناراضگی ہوئی اس واقعہ سے بھی مرزا دبیر کی لیاقت کا ثبوت ملتا ہے اس لیے گمان غالب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے مرزا دبیر نے ہی سراپا کہنے میں پہل کی

---

1 اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۲۷۴

ہو۔ اس ضمن میں مرتضیٰ حسین فاضل کا بیان قابل توجہ ہے۔ وہ اپنے کتب خانے کے مراثی کے مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''اپنے ..... ان ستائیس مخطوطہ مرثیوں کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جو معاصر یا قریب العصر دبیر لکھے گئے ہیں۔ جن مرثیوں پر کاتب کے نام یا سنہ کتابت تحریر ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ جب قرب ہوگا آمد روز نشور کا — ایک سو گیارہ بندوں کا

یہ مرثیہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ کا مخطوطہ ہے اور بے حد قیمتی اور معلوماتی ہے۔

(الف) مرزا صاحب ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس مخطوطہ کے وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔

(ب) مرثیہ کے بند نمبر ۷۳ تا ۸۲ دس بند مرزا صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔[۱]

(ج) اس مرثیے میں دو سراپے ہیں۔ پہلا سراپا حضرت امام مہدی آخرالزماںؑ کا ہے۔

بند ۱۹

اس دم کی کیا شکوہ و تجمل کروں بیاں　　سرخ و سفید رنگِ رخِ سیدِ زماں
مثلِ ستارہ خال، رخِ راست پر عیاں　　سِن میں مثالِ خضر، مگر حسن میں جواں
پیدا یہ صاف ہوئے گا حسن و جمال سے
کم سن و سال ہے ابھی چالیس سال سے

ما بین ہر دو چشم رگِ ہاشمی بلند　　مردم کریں گے دیدۂ مردم کو واں پسند
وقت نظارہ چشم تجلی سے بہرہ مند　　وہ چشم وہ جمال خدا کو تھا یہ پسند
ہر لحظہ حق کو ذوق تھا اس رخ کی سیر سے
پنہاں اسی لیے تو رکھا چشمِ غیر سے

اور قد کی راستی الف راست سے سوا　　نسبت، پر اس سے ہے الف راستی کو کیا

۱　عکس تحریر مضمون کے ساتھ ص ۶۴ کے بعد شائع ہوا ہے دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء

اس قدِ پاک سے جو مشابہ الف بنا حق نے کیا حروفِ تہجی کا پیشوا
اس اک الف سے ارض بھی ہے اور سما بھی ہے
دنیا کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

سرمایۂ نور پتلیوں پر لوگوں کی پتلیاں سپند‘ مابین ہر دو چشم رگ ہاشمی بلند (بنی) دہان تنگ‘ موجود پر نگاہِ خلائق سے وہ نہاں‘ خط و پشت لب پاک جیسے تنگ متن پر حاشیہ گیسو دلیل شرع دولام—

یوں لائقِ درود شبیہِ امام ہے
جس طرح سے نماز میں واجب سلام ہے
سینہ گہر راز خدا کا خزینہ یہ ہاتھ وہ ہیں قبضے میں جن کے ہے کائنات
قرآن و وحی و شرح نبی دین کبریا
یہ چار چیزیں ہوئیں گی چار آئینہ کی جا
اور پشت شاہ دیں پہ سپر ہوگی یوں دھری
جیسے نبیؐ کی پشت پہ مہرِ پیمبریؐ

آٹھ بند سراپا کے اور تین بند اسلحہ اور آراستگی کے ہیں۔ بند ۳۵ سے دوسرا سراپا شروع ہوتا ہے۔

یارو سنو اب آمدِ دجّالِ روسیاہ سگ اس کی شکل نحس سے مشتق خدا گواہ
ریش دراز جس میں شیاطین کی پناہ بینا جو ایک چشم تو اک چشم کور‘ واہ
بے شبہ لام ظلم وہ گیسوئے پیچدار
عصیاں کا نون ابروئے دجّالِ نابکار

اس قدر طول بیان کا سبب یہ ہے کہ مرثیہ پر بحث کرنے والے صاحبانِ نظر کا اتفاق ہے کہ ''چہرہ'' سب سے پہلے ضمیر نے لکھا۔ خود میں بھی اب تک یہی لکھتا اور سمجھتا رہا۔ ضمیر نے اپنے مرثیہ ''کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے'' میں کہتے ہیں [کہا ہے]

جس سال کیے وصف یہ ہم شکلِ نبی کے .... جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا۔ یعنی ۱۲۴۹ ہجری میں ضمیر نے پہل کی مگر میرا مخطوطہ اس کی

تردید کرتا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۲۴۸ھ کا مکتوبہ ہے اس لیے قطعاً مرزا صاحب نے سال چھ مہینے پہلے لکھا ہوگا، یعنی محرم ۱۲۴۸ہجری سے کچھ پہلے یا محرم میں۔ بہرحال ضمیر کی تاریخ سے ایک سال پہلے ایک مرثیہ میں ایک کے بجائے دو چہرے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس بنا پر شاید یہ کہنے کا جواز موجود ہے کہ مرثیہ میں چہرہ کی ابتدا مرزا دبیر نے کی یہ اور بات ہے کہ میر ضمیر نے حضرت علی اکبر کا سراپا لکھنے میں پہل کی ہو اور ہم لوگ سمجھے کہ انہیں سراپا لکھنے میں اولیت کا دعویٰ ہے''[1]

مرزا دبیر کے مخطوطہ مرثیہ۱۸۳۲ء/ ۱۲۴۸ھ مملوکہ فاضل لکھنوی کی بنا پر اولیت کا شرف میر ضمیر کو عطا کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اس کے ردعمل میں ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے دبیر کے مرثیہ کو ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ یا اس کے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔ انھوں نے اسے دو سال بعد کی تصنیف قرار دینے میں دلائل اور مآخذ سے بے نیازی برتی ہے اس لیے ان کا دعویٰ سردست دعوائے بے دلیل ہے۔[2] ڈاکٹر اکبر حیدری کی صورت حال ان سے زیادہ دلچسپ ہے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ' طرزنوی' والے بند کی بنیاد پر میر ضمیر کے سر سہرا باندھنا درست نہیں اور اس دور میں ان کے بزرگ میر خلیق بھی موجود تھے۔[3] اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ موصوف نے اپنے بیان میں تضاد پیدا ہونے کا احساس کیے بغیر دوسری جگہ لکھا ہے کہ میر ضمیر نے اس کے قبل حضرت عباسؑ کا سراپا نظم کیا تھا۔[4] یہ متضاد بیانی کون قبول کرے گا؟ ایک طرف میر خلیق کی موجودگی میں میر ضمیر کے سر اولیت کا سہرا باندھنا غلط قرار دیتے ہیں، دوسری طرف میر ضمیر کے متعلق دعویٰ کر لیتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عباسؑ کا سراپا نظم کیا تھا۔

ہمارے نزدیک اردو مراثی میں سراپا نگاری کی اولیت کا شرف عطا کرنے میں فاضل لکھنوی کے مندرجہ بالا مخطوطہ کو مدِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر ضمیر نے

---

۱ ماہ نو دبیر نمبر۔ مضمون نوادر مرزا دبیر۔ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ص ۶۳۔۶۴

۲ مقالہ مرزا دبیر ص۱۲۸ غیر مطبوعہ کتب خانہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنو)

۳ میر ضمیر ص ۷۸

۴ ایضاً ص ۷۳۔۷۴

''سراپا'' کے لیے نہیں بلکہ ''حضرت علی اکبر کا سراپا'' نظم کرنے کے سلسلے میں اولیت کا دعویٰ کیا ہے مرزا دبیر کا مندرجہ بالا مرثیہ جس کا مخطوطہ مرتضیٰ فاضل صاحب کے پاس تادم تحریر موجود ہے۔ شاگرد کا یہ مرثیہ میر ضمیر کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ اس لیے کہ ان دنوں استاد و شاگرد میں اختلاف تھا تو اس صورت میں لکھنو کے چمکارنے والے کہاں چھوڑنے والے تھے۔ وہ فوراً میر ضمیر سے جاکر داغتے کہ حضور کے مقابلے میں دبیر نے مرثیہ کہا ہے! مدنظر رہے کہ مرزا دبیر کے اس مرثیہ سے میر ضمیر کا واقف نہ ہونا خالی از امکان ہے۔ مرزا دبیر کے اس مرثیہ میں ایک سو گیارہ (۱۱۱) بند ہیں۔ موجودہ صورت میں یہ فیصلہ آسانی سے نہیں ہوسکتا کہ سراپا کے نظم کرنے میں اولیت کس کو ہے کیونکہ یہ واقعات ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۳ء اور ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء کے ہیں۔ اور میر ضمیر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء سے قبل ۳۴ ہزار اشعار مراثی میں پیش کر چکے تھے اور اس کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی اشعار کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اپنی مثنوی ''مظہر العجائب''[1] میں کہتے ہیں:

کروں ابیات کا گر آج شمار ۔۔۔ ہوں گے البتہ سی و چار ہزار
یہ فقط مرثیوں کے ہیں ابیات ۔۔۔ ورنہ کرتا جو جمع کلیات
آج سب نظم ہو اگر موجود ۔۔۔ بیت ہو صد ہزار سے افزود[2]

مدنظر رہے کہ اس مسئلہ میں تمام اہل نظر متفق ہیں کہ ضمیر کے وقت تک مرثیے نے وہ ہیئت اختیار کرلی تھی جو بعد میں بھی مروج رہی۔ یہ ہیئت اتنی وسیع اور جامع تھی کہ اسے اردو شاعری کی تمام اصناف سخن کا سرچشمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں مثنوی کا داستانوی انداز بھی ہے غزل کا زور کنایہ اور حسن تغزل، بھی و اسوخت کا تیکھا پن، قصیدہ کی شان و شوکت، عالمانہ فکر و تصور، صنعت گری اور دقیق مسائل کے بیان کی وسعت اور ان کے پہلو بہ پہلو مرثیت بھی۔ مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے اس میں

---

۱ یہ میر ضمیر کی مشہور مثنوی ہے۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ ایک ادبی شاہکار ہے اس میں تقریباً پانچ ہزار اشعار ہیں۔ تفصیل کے لیے ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتابیں ''میر ضمیر'' اور ''تحقیق و انتقاد'' ملاحظہ فرمائیں۔

۲ مثنوی مظہر العجائب میر ضمیر

ندرت ہے۔ شاعر اپنے زور بیان اور ندرت بیان سے سامعین کے دل و دماغ کو متاثر کرسکتا ہے۔ ان کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت جو مرثیہ گویوں اور اس کے سننے والوں کے حق میں فالِ نیک بنی، وہ یہ ہے کہ مرثیہ نے اپنے ماحول کو سنجیدہ بنادیا۔ اسی سنجیدہ ماحول نے مرثیہ کو بھی سنجیدگی بخشی۔ اس کے سننے والے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر طبقہ برابر خشوع و خضوع سے اسے سنتا ہے۔ مشاعرہ میں انسان غزل سنتا ہے واہ واہ کردیتا ہے اور اس کو بھلا دیتا ہے، کوئی فقرہ کستا ہے، کوئی چوٹ کرتا ہے، کوئی شعر سمجھے بغیر ہی سر دھنتا ہے اور کوئی شعر سمجھ کر خاموش رہتا ہے یہی حال قصیدہ کا ہے اسے بھی ایک خاص طبقہ سنتا ہے۔ مثنوی کا مزاج مختلف ہے، بسااوقات اس کی داد اس طرح دی جاتی ہے جس طرح انشاء نے میرحسن کی مثنوی سحر البیان کی دی تھی مگر مرثیہ کی مجلس میں شاعر یا ذاکر کی ذات کو بھلا دیا جاتا ہے اور سامعین کا عقیدہ ہوتا ہے کہ مجلس میں ائمہ معصومینؑ موجود ہیں۔ وہاں کسی قسم کی ہزل گوئی، بد مذاقی یا نازیبا بات کی گنجائش نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صورت حال ہے کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، باپ اور بیٹا برابر بیٹھ کر ایک ہی مجلس میں اور ایک ساتھ ذاکر کو سنتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس حقیقت پر بھی نظر رہتی ہے کہ شاعر سے کسی قسم کی لغزش تو نہیں ہوئی۔ اس کی زبان، طرز بیان، طرز ادا غرض سبھی باتوں پر نظر رہتی ہے۔ ایک اور قید یہ ہے کہ اسے ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو نظم کرنا ہوتے ہیں۔ کرداروں کی تعداد مقرر ہے، مقامات متعین ہیں، واقعات سب کو معلوم ہیں۔ کرداروں کے افعال و اعمال اور سیرت کو سب جانتے ہیں۔ واقعہ کا انجام سب کو معلوم ہے اور یہ صرف ایک دن یا ایک مجلس کا کام نہیں بلکہ ہر مجلس میں اس کو دہرانا ہے، اس کے پہلو بہ پہلو لوگوں کی دلچسپی برقرار رکھنا ہے اس سے مرثیہ گویوں کا قافیہ تنگ ہونا چاہیے تھا مگر انھوں نے جزئیات کو اس طرح تفصیل سے بیان کیا کہ جز میں کل کا لطف حاصل ہونے لگا۔ اپنے ذہن کو اس حد تک ٹٹولا کہ کوئی بھی کڑی باقی نہ رہ جائے اور اس کے سہارے ہزاروں کی تعداد میں مرثیے کہے اور وہ بھی ضخیم۔ ابتدا میں مرثیہ کہنے والوں کے لیے تو گنجائش زیادہ تھی مگر بعد کے مرثیہ گویوں کے لیے دائرہ اور بھی محدود تھا۔ اس لیے کہ کون سا مضمون تھا جو نہیں باندھا گیا تھا، کون سا پہلو تھا جو نظم نہیں ہوا تھا، کون سا واقعہ تھا جو مرثیہ میں

نہیں آیا تھا مگر میر انیس اور مرزا دبیر نے تو اس صنف سخن کی ہر جہت کو اپنی باریک بین نگاہ سے اتنا کھینچا اور اپنی شیریں سخنی اور معجز بیانی سے اس طرح پیش کیا کہ ہر چیز سے لوگوں نے نیا لطف لے لیا اور یہ صنفِ سخن معراج کمال کو پہنچ گئی۔ قصیدے کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذوق کے بعد قصیدے کو وہ ماحول نہیں ملا اس لیے قصیدہ اور آگے نہ بڑھا مگر مرثیہ کا رواج آج بھی برقرار ہے اب بھی لوگ مرثیہ کہتے پڑھتے اور سنتے ہیں مگر جہاں جو رنگ ملے گا اس میں ان ہی گلستانوں کی مہک ملے گی۔

مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی

مرزا دبیر نے مرثیہ کو ایسے مضامین دیے جن سے نہ صرف اردو مرثیہ بلکہ اردو زبان مالا مال ہوگئی۔ انھوں نے جہاں ضرورت محسوس ہوئی' اجتہاد سے کام لیا اور نیا راستہ اختیار کیا۔ غالب جیسے شاعر کو مرزا دبیر پر رشک آیا۔ آتش نے مجلس میں بآواز بلند کہا کہ ایسے مضامین کہوگے تو خون تھوگے یا مرجاؤ گے۔ ناسخ نے جب مرزا دبیر کا یہ بند سنا:

کیوں مدنظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار پہلو کو بدلتے ہیں مگر مردمِ بیمار
ابرو کے قرینے سے کھلا چشم کا اسرار ہیں نور کے گہوارے میں عیسیٰؑ خوش اطوار

یاں پنجۂ مریم کہوں پنجے کو پلک کے
گہوارے میں عیسیٰؑ کو سلاتی ہیں تھپک کے

تو اچھل پڑے اور سیدھے اپنے کتب خانہ میں چلے گئے اور دیوانِ ظہیر فاریابی اٹھالائے اس کے بعد کہا کہ ظہیر نے بھی پتلی کو عیسیٰؑ سے تشبیہ دی تھی مگر ثابت نہ کرسکا سلامت علی (مرزا دبیر) سا طبیعت دار خلاق مضامین نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

> ''مرزا دبیر پہلے مرثیہ گو شاعر ہیں جس (جنہوں) نے اپنے کمال سخن کے سہارے مرثیہ گو کو اول درجہ کا شاعر اور مرثیہ گوئی کو ادب عالیہ کا جزو تسلیم کرالیا۔ آتش ناسخ اور غالب کے سے نامور اساتذہ نے ان کو خراج تحسین پیش کیا اور ادب اردو کی تاریخ میں وہ پہلے مرثیہ گو ہیں جن کو مرثیہ گوئی کی

بنیاد پر بقائے دوام کے دربار میں جگہ حاصل ہوئی۔[1]

مرزا دبیر نے جہاں ماضی کی مرثیہ کی روایت کی اس طرح آبیاری کی کہ یہ پودے سے ایک تناور درخت میں تبدیل ہوگیا اور اس کے سائے میں نہ صرف اردو شاعری کی تمام اصناف آ گئیں بلکہ نئی تر و تازگی، نئی آن بان اور نئی زندگی دے کر مرثیہ کا علم اس طرح نصب کردیا کہ کوئی طوفان اس کو اب ہلا نہیں سکتا۔ طبیعت دریا کی طرح رواں تھی۔ دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے۔ سینکڑوں شاگرد ہوئے۔ بالواسطہ شاگردوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوئی۔ عوام اور خواص کو یکساں طور پر متاثر کیا اور اتنا ذخیرہ مراثی کا چھوڑا کہ کسی کے کہنے کی تو کیا مکمل طور پر چھپوانے کی بھی اب تک ہمت نہ ہوئی۔ ہر رنگ میں مرثیہ کہا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

مراثی دبیر کی خصوصیات

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا دبیر کے مراثی کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ان کا کلام اب تک ارباب ذوق کی تسکین، عزاداران حسینؑ کی آنکھوں کا سرمہ، ادب نوازوں، ادیبوں اور شاعروں کی روح کے لیے فرحت کا سامان بنا ہوا ہے۔

مولانا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں غیر جانبدار ناقد و محقق کے فرائض صحیح طور انجام نہیں دیے ہیں جس سے شائقین مرثیہ مغالطہ میں مبتلا ہوگئے، ان لوگوں میں جنہوں نے شبلی کو پڑھا اور مرزا دبیر کو نہیں پڑھا تھا ان کا ذہن دور سے مرزا دبیر کو دیکھتا رہا اور جو مرزا دبیر کو جانتے تھے، ان کو سنا تھا، ان کا کلام پڑھا تھا، وہ برافروختہ ہوئے اور ''موازنہ انیس و دبیر'' کے جواب میں کئی کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔ ان میں 'حیات دبیر' ''المیزان'' ''رد الموازنہ'' اور ''تردید الموازنہ'' اہم ہیں مگر سانحہ اصل میں یہ ہوگیا کہ مولانا شبلی کے نظریات کی اشاعت کے لیے زبردست ادارہ تھا جو شبلی کا موازنہ تواتر سے شایع کرتا رہا۔ مرثیے یا انیس پر معقول کتابیں نہ ہونے کی بنا پر اس کو مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رکھا گیا اور حیات دبیر، المیزان اور رد الموازنہ

---

1 دبستان دبیر ص ۱۴۹۔۱۴۸ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حیات دبیر صفحات ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۲۰۷ اور سبع مثانی دیباچہ ثابت ص ۳۰)

انفرادی کوششیں ہونے تک محدود رہیں۔ ایک بار چھپ گئیں جس نے دیکھیں بس اس نے دیکھ لیں۔ آج حیات دبیر کی دونوں جلدیں نایاب ہونے کی حد تک کمیاب ہیں اور دوسری کتابوں کا حال اس سے مختلف نہیں اور موازنہ انیس و دبیر دیکھیے کہ اب تک سکۂ رائج الوقت بنا ہوا ہے۔ دوسروں نے بھی مرزا دبیر کے ساتھ ناانصافیاں کیں مثلاً عبدالغفور نساخ[1] مولانا محمد حسین آزاد[2] اور مختلف تذکرہ نگار جن کا ذکر اس مقالہ میں آچکا ہے مگر شبلی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس وقت سے اس بات پر زور دیا جاتا رہا کہ مرزا دبیر کا درجہ کم کرکے دکھایا گیا ہے۔ طرح طرح کے اعتراضات اور مختلف لوگوں کا کلام ان سے منسوب کرکے اس پر تنقید و تبصرے کرنا ایک عام بات ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ مرزا دبیر جیسے کثیر الکلام صنعت گر اور عالی تخیل شاعر کا کلام ہر ایک نہیں پڑھ سکتا۔ چھپے ہوئے کلام کا تو یہ حال ہے کہ ''دفتر ماتم'' کی بیس جلدیں کہیں پر یکجا نہیں ملتیں۔

مرتضٰی حسین فاضل لکھتے ہیں:

> ''دفتر ماتم کی تلاش لکھنؤ سے لاہور تک جاری ہے اتفاق ہے کہ اب تک اس کی بیس جلدیں یکجا دیکھنے میں نہیں آئیں''[3]

نول کشور کی چھپی ہوئی دو جلدوں کا حال بھی وہی ہے اور غیر مطبوعہ کلام کچھ تو مکان کے دب جانے سے ضائع ہوگیا، کچھ مختلف لوگوں کے پاس بکھرا پڑا رہا۔ ہنوز غیر مطبوعہ کلام ان کے پوتے مرزا صادق صاحب صادق کے پاس محفوظ ہے جو عام لوگوں کی نظر سے مخفی ہے اس لیے اکثر لوگوں نے آنکھ بند کرکے مولانا شبلی کی رائے پر اعتبار کرلیا۔

راقم الحروف کا یہ مقصد نہیں کہ شبلی کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس مقصد کے پیش نظر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے بلکہ راقم کا مدعا ہے کہ مرزا دبیر کے کلام کی خصوصیات براہ راست پیش کی جائیں تاکہ مرزا

---

۱ ملاحظہ ہو انتخاب نقص عبدالغفور نساخ

۲ آب حیات۔ حکایت آتش و دبیر موسوم بہ آتشی لطیفہ جس کی تردید اسی مقالے کے گزشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے

۳ ماہِ نو دبیر نمبر ص ۶۵

دبیر کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کی نشاندہی ہو سکے۔

موضوع

مرزا دبیر کے مراثی کا موضوع کربلا کا عظیم المیہ ہے جس کا ثانی تاریخ عالم میں نہیں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے خلاق ذہن کی مدد سے اس موضوع میں اتنی وسعت پیدا کی کہ اس سلسلے کے سینکڑوں موضوعات ہاتھ آگئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی پھر بھی شاعر کی فکر رسا نے بعض نئے پہلو پیدا کیے ہیں

زبان

مرزا دبیر کی زبان پر شدید اعتراضات کیے گئے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انھوں نے مشکل زبان، پرشکوہ الفاظ، فارسی اور عربی لغات سے کام لے کر کلام کو ادق بنادیا ہے۔ ان کے معترض اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ زبان اور ماحول ایک دوسرے سے اتنا قریبی تعلق رکھتے ہیں کہ کسی ایک کو سمجھے بغیر دوسرے کے بارے میں رائے دینا مناسب نہیں ہوسکتا۔

سفارش حسین رضوی تحریر کرتے ہیں:

> ''دبیر کی مرثیہ گوئی اور اس کے فن کے انداز کو سمجھنے کے لیے اس وقت کے لکھنؤ اور اس کے ماحول کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے سمجھے بغیر دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت کا لکھنؤ ناسخ کی زبان، کلام میں مرزا قتیل کی سی مضمون آفرینی اور بیان میں آرائش اور حسن پیدا کرنے پر اتنا مٹا ہوا تھا کہ تصنع کو حقیقت پر اور بناوٹ کو سچائی پر ظاہر ظہور دے دی جاتی اور پھر اس پر وجد کیا جاتا۔ اعتدال کی حد سے بڑھے ہوئے ان جذبوں نے زبان کو علیت کے ملمعے سے شعر کو مرصع کاری سے ایسا چمکایا کہ شاعری اور مرصع و ملمع سازی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوگئیں۔ دبیر کو اس زمین میں بیج بونا تھا اور ماحول کے موافق گل بوٹے کھلانا تھے اسی لیے انھوں نے انہیں عنصروں سے اپنے کلام کو آراستہ و پیراستہ کیا۔''[1]

---

1 اردو مرثیہ ص ۳۰۶

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

''مرزا دبیر کی زبان پر مشکل پسندی کا الزام عائد کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت بس اتنی ہے کہ مرزا صاحب ثقات لکھنو کی عام زبان استعمال کرتے تھے اور چونکہ علماء و ثقات کی زبان عوام کی زبان سے مختلف ہوتی ہے اس لیے بعض حضرات کو یہ مشکل نظر آتی ہے حالانکہ مجالس عزا میں شرکت کرنے والا مجمع اس زبان کا پورے طور پر خوگر ہوتا ہے اور اسے زبان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔''[1]

صاحب المیزان تحریر کرتے ہیں:

''لکھنؤ کو حسن شناسانِ سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کرلیا ہے اور میر صاحب[میر انیس] و مرزا صاحب[مرزا دبیر] زبان دانی میں اہل لکھنو کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں اس لیے ان دونوں صاحبوں سے بڑھ کر اور کون شخص روزمرہ اور محاورہ لکھنے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ دونوں بزرگوار اس میں یکتائے عصر مانے گئے ہیں۔ہاں فرق یہ ہے کہ پہلے زمانے کے فاضل ارباب کمال کے کان شعرائے عجم کی نازک خیالیوں اور رنگین بیانیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ زبانیں فصحائے فارس کے پرتکلف اور مضمون اشعار کے مزے اٹھائے ہوئے تھیں۔ اس لیے ان لوگوں کو وہی کلام محظوظ کرسکتا تھا جس کو علاوہ نازک خیالی' مضمون آفرینی اور تشبیہوں کی لطافت اور استعاروں کی نزاکت کے شوکت الفاظ نے بلند اور شاندار بنادیا ہو۔ اس وجہ سے زمانے کا رنگ اور شائقین کی طبیعتوں کا مذاق پہچان کر مرزا صاحب مرحوم نے تشبیہات، استعارات اور مضامین آفرینی پر زیادہ توجہ فرما کر وہ نادر اشعار نظم کیے کہ ارباب مذاق کے دلوں پر ان کی بلاغت کا سکہ بیٹھ گیا۔''[2]

شیخ محمد جان عروج فیض آبادی لکھتے ہیں:

''جناب مرزا سلامت علی صاحب متخلص بہ دبیر ابتدائے ولادت سے تا

---

۱ دبستان دبیر ص ۵۸

۲ المیزان ص ۶۲

سن شعور و تا وقت وفات لکھنؤ ہی میں رہے۔ ان کے بزرگ بھی عالی مناصب شاہان دہلی کی عزت افزائی سے نامی خاندان کے تھے۔ زمانہ ترقی لکھنؤ میں ہجرت کر کے لکھنؤ آ بسے تھے۔ جو زبان ستھری شفاف نکھری وہاں کے شرفائے اہل علم کی تھی مرزا صاحب کو گھٹی میں ملی تھی۔ حیثیت علمی عربیت فارسیت میں فاضل متجر حاوی علوم معقول و منقول، علم تفسیر و تاریخ میں وسیع النظر تھے...... لکھنؤ میں بظاہر زبان اردو ایک ہے لیکن لب و لہجہ اور الفاظ مستعملہ سے علمائے ذی علم کے بمقابل عام زبان کے بڑا فرق ہے۔ صاحبانِ علم کی عالمانہ بول چال اور ہے حکماء کے جداگانہ انداز ہیں۔ شعراء کے کلام حسب حیثیت علم نظم ہوئے ہیں۔ متونی بازاری عوام کا ڈھنگ اور ہے محلات کے متعلقان کی گفتگو دوسری ہے"[1]

صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب کا لکھنؤ میں وہ زمانہ تھا کہ جب لکھنؤ علوم مشرقی کا مجمع و مرکز ہو رہا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ۔ اس کے قریب قریب کی اکثر بستیاں، بلگرام، کاکوری، موہان، کنتور، جرول، جائس، بدایوں، امروہہ، نصیر آباد، سندیلہ، خیر آباد وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کی خوشبو سے مہک رہی تھیں۔ عربی و فارسی کے علوم کے ساتھ سینکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ لکھنؤ کے عالم سے لے کر جاہل تک بولتے تھے اور ہر لفظ و محاورہ وہ لوگ موقع سے استعمال کرتے تھے۔ اب جو جو عربی فارسی اس ملک میں کم ہوتی جاتی ہے وہ بیچارے الفاظ بھی اپنا بستر باندھتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کو غریب سمجھتے ہیں۔ خیر اس زمانے میں اگر کوئی نیا شاعر وہ الفاظ لائے اور کوئی ان کو غریب و ثقیل بتائے تو چنداں مضائقہ بھی نہیں ہے مگر قیامت تو یہ ہے کہ جس کلام کو یقینا ستر ساٹھ برس پہلے کا سمجھتے ہیں اور ان میں اہل علم کی زبان کے الفاظ پاتے ہیں ان کو ثقیل وغریب بتاتے ہیں جن لوگوں کو علم السنہ سے کام پڑا ہے وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں کہ جو الفاظ جس زمانے میں بولے جاتے ہوں اگر وہ اسی زمانے

---

1 تردید موازنہ۔ شیخ محمد جان عروج فیض آبادی تصویر عالم پریس لکھنؤ ص ۱۱۔۱۰

> کے شاعر یا نثر[نثار] کے کلام میں ہوں۔ ہر چند کہ زمانہ مابعد میں متروک ہوگئے ہوں وہ ثقیل ہرگز نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ جناب مفتی عبد ربّہ مفتی دیار مصر نے جو اس زمانہ کے ادیب کامل و فاضل متجر تھے، اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ کے دیباچہ میں فرمایا ہے ...... کہ چونکہ عبارت کتاب نہج البلاغہ دقیق ہے اور ہم لوگ اس زمانے میں ہیں کہ اصل زبان عرب سے بہت کچھ نا آشنا ہورہے ہیں لہٰذا بعض بعض الفاظ غریب ملتے ہیں مگر وحشت و تناؤ سے مبرّا و پاک ہیں۔ بعض ایسی دقیق ترکیبیں ملتی ہیں مگر تعقید سے مبرّا ہیں۔ یہ قصور ہمارے فہم کی کمی کا ہے معاذ اللہ مصنف کا ہرگز نہیں ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں جس طرح عربی و فارسی کے الفاظ اور بعض ترکیبیں آمیز نظر آتی ہیں ویسی ہی ان کے تمام اہل علم معاصرین شعراء کی ہیں۔ ذوق، مومن، غالب، ناسخ، آتش، وزیر، برق، رشک وغیرہ سب کو دیکھا جائے ...... اس پر بجز کم فہم یا جاہل شخص کے کوئی اہل علم معترض نہیں ہوسکتا۔"[1]

مرزا دبیر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ یہ زبان ان کی طبیعت کے عین مطابق بھی تھی اور اس مضمون آفرینی کا حق جو مرزا دبیر نے کی، اسی زبان میں ادا ہوسکتا تھا۔ اس ضمن میں سفارش حسین رضوی کا بیان ہے:

> "شوکت الفاظ دبیر کے کلام کی نمایاں خصوصیت کہی جاتی ہے۔ انہیں عربی اور فارسی پر پورا عبور تھا۔ ان زبانوں کے لفظ ان کا روزمرہ تھے۔ لکھنؤ کے شرفا میں بھی ان کا رواج تھا۔ اس لیے عالمانہ زبان شرافت کا معیار اور ثقافت کا بڑا جز بن چکی تھی۔ ایسی صورت میں دبیر کے لیے سہل اور ہلکی پھلکی زبان لکھنا کیسے ممکن تھا۔ سچ تو یوں ہے کہ دبیر اپنے جذبات ایسی ہی زبان میں پیش کرسکتے تھے۔"[2]

---

۱ حیات دبیر جلد اول ص ۱۵۶۔۱۵۵

۲ اردو مرثیہ ص ۳۰۷

مرزا دبیر اس زبان سے بچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ کوئی اہل علم یہ نہیں چاہے گا کہ وہ اعتراضات کا نشانہ بنے اور جب علماء اور ادباء کی زبان سنجیدہ، فارسی اور عربی آمیز ہو تو اس کے خلاف جانا اپنے آپ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہوگا۔ مرزا دبیر کے کلام نے اس زبان کے ذریعہ اردو مرثیہ کو ہر لحاظ سے رفعت بخشی۔ اس میں وقار پیدا ہوگیا۔ ایک طرف تو اس نے اپنے زمانے کے مذاق اور معیار کو برقرار رکھا، اور دوسری طرف زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور سرمایۂ ادب میں اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر ایک اور چیز سے بھی ایسا کرنے کے لیے مجبور تھے، وہ تھی ان کی فارسی اور عربی زبان و ادب کی واقفیت اور معلومات اور اس پر مختلف علوم کا مطالعہ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اپنے جذبات کی رو میں آ کر اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہتا تھا تو مختلف علوم سے مثالیں اور عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں اس طرح نظم کرتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے ایک جذبۂ بے اختیار ان کے دل میں ہے جو ان سے مضامین عالی، عالمانہ زبان میں ادا کرواتا ہے۔ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ انہیں عربی اور فارسی پر پورا پورا عبور تھا۔ انھوں نے ان زبانوں کے ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان زبانوں کے الفاظ وہ روزمرہ زبان میں استعمال کرتے تھے۔ اور بغیر کسی تکلّف کے اپنی گفتگو میں ان زبانوں (عربی و فارسی) کی ترکیبیں اور الفاظ برتتے تھے۔ وہ تو پہچان اس وقت ہوتی ہے جب مرزا دبیر جذباتی انداز میں کسی واقعہ کو پیش کرتے ہیں اور دل کی زبان میں اس کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جذبے کی شدت میں انسان وہی زبان استعمال کرتا ہے جس کے ساتھ اسے بہت لگاؤ ہو۔ ہر انسان غیر شعوری طور پر بھی ویسی ہی زبان ایسے موقع پر استعمال کرتا ہے۔ مرزا دبیر نے میر انیس کی موت پر جو قطعۂ تاریخ کہا ہے اس میں اس زبان اور جذبے کی پہچان بخوبی ہوتی ہے۔ اس میں دل کا درد بھی سمٹ کر زبان پر آیا ہے اور دل کی زبان بھی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث — از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس
وا دریغا عینی و دینی دو باز و یم شکست — بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس
الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوقِ نظم — شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس
آسمان بے ماہِ کامل سدرہ بے روح الامین — طورِ سینا بے کلیم اللہ، منبر بے انیس

اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مرزا دبیر شوکت الفاظ پر جان بوجھ کر زور دیتے تھے صحیح نہیں۔[1]
جو زبان ان کی رگ رگ میں بسی تھی، یہ وہی زبان ہے اور اس زبان کا اس وقت پورے لکھنؤ میں رواج تھا۔ شرفاء اس زبان کو استعمال کرنا نہ صرف فخر و مباہات کی بات سمجھتے تھے بلکہ اس سے ہٹ کر دوسری قسم کی زبان میں گفتگو کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ایہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کی پوری داد پائی۔ لوگ اس زمانے میں بھی سر دھنتے رہے اور آج تک کلام جس نے پڑھا اس نے پسند کیا۔
پنڈت رتن ناتھ سرشار تحریر کرتے ہیں:

''دبیر مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے۔ واللہ خدائے سخن تھا۔

سرمنبر — ع

جب قفلِ دہن کھلا جواہر نکلے

گویا کہ زبان کلید گنجینہ ہے۔ ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجۂ حیرت میں غرق ہوگئے کہ اللہ اللہ! یہ فصاحت یہ بلاغت''[2]

اس زمانے کے شرفاء اور علماء مرزا دبیر کے کلام کو زبان کے معاملے میں سند خیال کرتے تھے۔ صاحب خمخانۂ جاوید تحریر کرتے ہیں:

''لوگ کہتے ہیں کہ محلات شاہی کی زبان قابل سند ہے اور درحقیقت ہے مگر مرزا صاحب کی زبان کا کمال یہ ہے کہ محلات شاہی میں جب کسی لفظ یا محاورہ روز مرہ کے متعلق بحث ہوتی تھی تو کلام مرزا صاحب سے سند لی جاتی

---

۱ سفارش حسین رضوی لکھتے ہیں:

''شوکت الفاظ دبیر کے کلام کی نمایاں خصوصیت کہی جاتی ہے۔ انہیں عربی اور فارسی پر پورا عبور تھا۔ ان زبانوں کے لفظ ان کا روزمرہ تھے۔ لکھنؤ کے شرفا میں بھی ان کا رواج تھا۔ اس لیے عالمانہ زبان شرافت کا معیار اور ثقافت کا بڑا جز بن چکی تھی۔ ایسی صورت میں دبیر کے لیے سہل اور ہلکی پھلکی زبان لکھنا کیسے ممکن تھا۔ سچ تو یوں ہے کہ دبیر اپنے جذبات ایسی ہی زبان میں پیش کرسکتے تھے'' اردو مرثیہ ص ۳۰۷

۲ فسانۂ آزاد جلد اول ص ۳۴ مطبع نامی نولکشور لکھنؤ جنوری ۱۹۴۹ء

تھی یا اس کے فیصلہ کا حصہ مرزا صاحب پر رکھا جاتا تھا۔"[1]

ان حقائق سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر دوسری یعنی آسان زبان میں شعر کہنے سے عاجز تھے یا سادہ اور سلیس زبان ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ دراصل انسان سادہ اور سلیس الفاظ سے ہی زبان سیکھتا ہے۔ علمیت' تجربہ اور پختگی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی زبان بھی عالمانہ اور سنجیدہ ہوتی جاتی ہے۔ مرزا صاحب نے دونوں قسم کی زبان استعمال کی یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی میں حسب ضرورت زبان بدل جاتی ہے۔ زبان کی پوری شوکت مدح میں ملتی ہے طنطنہ، اور جوش رجز میں ہے، رنگینی سراپا میں ہے۔ سادگی رخصت، شہادت اور بین میں ہے۔ چنانچہ خود اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں:

ہے رزم سراپا تو بیاں (زباں) اور ہی ہے　　　بین کے مابین بیان اور ہی ہے
کس درجہ فکر ہے تیری بلند دبیر　　　کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

بین کی زبان تو مرزا دبیر کی اس طرح بدل جاتی ہے کہ سننے والے تڑپتے ہیں۔ نالہ و فغاں بلند کیے بغیر نہیں بنتی ہے انسان کا دل رونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب ہی ناقدین اس پر متفق ہیں کہ مرزا دبیر کے مرثیے نہایت مبکی ہوتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد تحریر کرتے ہیں:

"[مرزا دبیر نے] طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو اس ضمن کے لیے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔"

آگے چل کر وہ بیان کرتے ہیں:

"مرزا دبیر صاحب شوکت الفاظ، مضامین کی آمد، اس میں جابجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنائے، المناک اور دل گداز انداز، جو مرثیے کی اصل غرض ہے ان وصفوں میں بادشاہ تھے"[2]

مرثیہ کا اصل مقصد دلوں کو اس طرح متاثر کرنا ہے کہ بے اختیار ہوکر آنسو نکل آئیں۔

۱　غم خانہ جاوید جلد سوم ص ۱۵۴

۲　آب حیات ص ۵۳۹-۵۴۷

ایسا کرنے کے لیے مرثیہ گو کا زبان پر قادر ہونا بھی ضروری ہے اور جذبات کی تصویر کشی پر بھی۔ مولانا آزاد نقل کرتے ہیں:

''جس مجلس میں ان کا کلام پڑھا گیا کہرام ہوگیا۔ کیسے غم انگیز اور دردخیز مضامین ہیں۔ ان کے لفظوں کو دیکھو، اعتقاد کے آبِ حیات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''[1]

اس سلسلہ میں امداد امام اثر تحریر کرتے ہیں:

''واقعی جناب ممدوح بڑے خلاق سخن اور عالی طبیعت تھے۔ لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے۔ مآل مرثیہ نگاری کا بکا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مرثیہ حضرت کا بہت مبکی ہے۔
میری دانست میں حضرت کو سلطان الذاکرین نہیں کہنا ایک بڑی حق کشی ہے۔''[2]

غرض مرزا دبیر جہاں جیسی زبان چاہیے وہاں ویسی ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ بین میں ان کا لہجہ اور ان کے الفاظ مختلف ہوجاتے ہیں اور یوں تو ان کے ایسے مرثیے بھی تعداد میں کافی ہیں جو پورے کے پورے ایک ہی رنگ یعنی دقیق یا سادہ زبان میں ہیں۔ سبع مثانی کے مراثی میں مرزا دبیر کی سادہ زبان ملاحظ کی جاسکتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

گہوارے[3] میں درندۂ اژدر علیؑ علیؑ — رن میں کنندۂ درِ خیبر علیؑ علیؑ
معراج میں نبیؐ کے برابر علیؑ علیؑ — کعبہ میں نقشِ مہرِ پیمبرؐ علیؑ علیؑ

---

۱ ایضاً ص ۵۴۵

۲۔ کاشف الحقائق ج ۲ ص ۵۴۳

۳ مطلع: گہوارے میں درندۂ اژدر علیؑ علی — اس مرثیہ کے کچھ بند راقم کو مرزا دبیر کے پڑپوتے مرزا محمد صادق صاحب صادق نے عنایت کیے ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ مرثیہ شہادتِ حضرت علیؑ کے باب میں ہے اس کا مطلع اول ہے:

''روشن ہے لوحِ مہر مبیں کس کے نام سے''

یارا کسے حضور کی مدح و ثنا کا ہے
وہ عبد ہیں کہ بعض کو دھوکا خدا کا ہے

جتنا غلو ہے مدح میں اتنا ہی فرق ہے بحرِ حیا میں کشتیِ اغراق غرق ہے
خرمن مبالغہ کا سر راہ برق ہے اب انتظار لطف شہ غرب و شرق ہے
انجام وصف خویش نبی کا بخیر ہو
یارب شریک خویش نہ مضمونِ غیر ہو

شکر خدا، علیؑ کے ثناخواں رقم ہوئے منظور چشم صاحب لوح و قلم ہوئے
مصروف ملک گیری مضمون جو ہم ہوئے طبل و علم دوات و قلم سے بہم ہوئے
مضمون شش جہت کی خبر پیک کہتے ہیں
جبریلؑ جھک کے کان میں لبیک کہتے ہیں

صف بستہ ہیں ادھر نبی خالقِ زمن پروانہ وار گرد نبیؐ ہیں ابوالحسنؑ
قوت میں لاکھ تن سے فزوں ہے یہ ایک تن پنجہ میں دستِ حق کے علم ہے ضیا فگن
اعدا کے مورچے شہِ مرداں کے سامنے
اک صف ہے چونٹیوں کی سلیمان کے سامنے

یہ ذکر تھا کہ واں سے بڑھا ایک پہلواں رستم کا رعب، زال کی طاقت، پشن کی جاں
دل کفر، آنکھ فتنہ، بدن شعلہ، سر دھواں پیر و جواں میں نام ابو جردل جواں
پھرنے میں بختِ بد تھا ٹھہرنے میں کوہ تھا
پر سامنے علیؑ کے فقط بے شکوہ تھا

عقرب کا ہر طریقۂ بد اس کو یاد تھا افعی سے رہزنی کے فنوں میں زیاد تھا
شرک و نفاق و کفر کا وہ خانہ زاد تھا پتھر سے اعتقاد خدا سے عناد تھا

شہرہ تھا اس کے زور کا اور مکر و زور کا
سب فوج کلمہ پڑھتی تھی اس کے غرور کا

اہلِ فلک[1] علی کو شماخیل کہتے ہیں — اہل زمیں تمام حجایل کہتے ہیں
اور مصحفِ خلیل میں جزئیل کہتے ہیں — استاد لاکھ فخر سے جبریل کہتے ہیں
اریا زبور میں لقب بو تراب ہے
انجیل کو پڑھو تو بریا خطاب ہے

چاہیں[2] تو آئینہ کو سکندر کریں علی — سبزے کو مثل خضر سخنور کریں علی
قطرے کو موج موج کو کوثر کریں علی — جو ہر کو تیغ، تیغ کو اژ در کریں علی
نقطے کو حرف، حرف کو دفتر کریں علی
غنچے کو باغ، باغ کو خلد بریں بنائیں
پر کو ہما، ہما کو یہ روح الامیں بنائیں

آمد خزاں[3] کی گلشن خیر الورا پہ ہے — نکہت گلِ بتول کی دوش فنا پہ ہے
رنگ ریاض ساقی کو ثر ہوا پہ ہے — چھایا سحابِ غم دلِ آلِ عبا پہ ہے
تاراجی چمن سے بہت حال غیر ہے
مدِ نظر حسینؑ کو جنت کی سیر ہے

---

۱ یہ مرثیہ بھی حضرت علیؑ کے حال کا ہے۔ عالمانہ مضامین اس میں باندھے گئے ہیں اور عام آدمی تو اس کو سمجھنے سے قاصر ہے جب تک احادیث اور مختلف علوم سے واقفیت نہ ہو۔ اس میں کئی صنعتیں پیدا کی گئی ہیں۔

۲ زباں کی سادگی کے ساتھ روانی اور حسن تکرار ملاحظ فرمایئے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ مرثیہ ''روشن ہے لوح مہر مبیں کس کے نام سے'' کا ہی حصہ ہے اور یہ اسی مرثیہ کا ایک ضمنی مطلع ہے۔

۳ زبان کی صفائی ملاحظہ فرمائیں۔

مرگِ پسر سے خانۂ دل بے چراغ ہے　　سروِ حسنؑ کے غم سے جگر داغ داغ ہے
ویراں الم سے بھائی کے راحت کا باغ ہے　　فرقت میں بھانجوں کی پریشاں دماغ ہے
قالب میں روح جسم میں تاب و تواں نہیں
خاموش یوں کھڑے ہیں کہ گویا زباں نہیں

چہرہ ہے زرد آنکھوں میں نور و ضیا نہیں　　قابو میں آہ دل نہیں اور دست و پا نہیں
ہوش و حواس و عقل و طبیعت بجا نہیں　　سوکھی زبان تالو سے ہوتی جدا نہیں
بیتاب دل ہے سینے میں تھرائے جاتے ہیں
عالم یہ ضعف کا ہے کہ غش آئے جاتے ہیں

دل بھی ہے چاک جیب قبا بھی پھٹا ہوا　　جامہ بھی رخ بھی خونِ پسر سے بھرا ہوا
دل سے خطاب کرتے ہیں رو کر یہ کیا ہوا　　سب ہوگئے جدا نہ مرا سر جدا ہوا
حسرت سے جب اٹھاتے ہیں رو کر نگاہ کو
خیمے کو دیکھتے ہیں کبھی قتل گاہ کو

کہتا ہے دل کبھی کہ چلو جانبِ حرم　　مل لو بہن سے قتل میں وقفہ بہت ہے کم
کہتا ہے گہ تڑپ کے کہ اے سیدِ امم　　اکبرؑ کی لاش دیکھ لو پھر چل کے ایکدم
ہر سمت اضطرار سے گھوڑا بڑھاتے ہیں
مقتل کو جاتے ہیں کبھی خیمہ کو جاتے ہیں

جذبات نگاری

شاعری میں جذبات کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جذباتِ انسانی کی مختلف و متنوع کیفیتیں شاعری کو نہ صرف تاثیر عطا کرتی ہیں بلکہ اس کی افادیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں جو کچھ رونق اور چہل پہل ہے، وہ جذبات کی بدولت ہے' اگر خوشی، غم، محبت، عداوت، نفرت، خوف، ہمدردی وغیرہ، یہ سب جذبے ناپید ہوجائیں تو دنیا میں ایک سناٹا چھا جائے''[1]

مرزا دبیر شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے باوجود ہر قسم کے جذبات کی مصوری کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اس میں ان کے موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جس میں مختلف قسم کے جذبات بیان کرنے کی گنجائش موجود ہے۔محبت کے جذبات سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں انھیں انسانی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ مراثی میں پیش کش کا محور جذبۂ محبت و مودت ہے بلکہ یہ کہنادرست ہوگا کہ مرثیہ گوئی کے اصل محرک بھی یہی جذباتِ محبت ہیں۔ مرزا دبیر کے ہیرو پیکر عقیدت و محبت ہیں۔ مرثیہ کہنے والا، سننے والا اور پھر جس منظر کی تصویر کشی کی جارہی ہے، اس کے کرداروں کے دل جذباتِ محبت سے سرشار ہوتے ہیں، خواہ کسی کے حال کا مرثیہ کیوں نہ ہو۔ جذبات انسانی کی ایسی تصویریں سامنے آتی ہیں جن کا جواب نہیں ملتا۔ بھائی شہید ہوتا ہے بہن کا دل جذبات سے بے قابو ہوکر زبان حال سے فریاد کرتا ہے ضبطِ غم آنکھوں کی راہ لیتا ہے اور درد و الم کی کائنات سامنے آجاتی ہے۔ بیٹا شہید ہوتا ہے تو ماں کا کلیجہ منہ کو آتا ہے جگر کانپ اٹھتا ہے آواز تھرتھرا جاتی ہے آنکھوں میں دنیا تاریک نظر آتی ہے۔ شہید کے اوصاف رہ رہ کر یاد آتے ہیں اور دل وفور جذبات سے امڈ آتا ہے۔ اگرچہ ایسے موقعوں پر الفاظ جذبات کی تصویر کشی کرنے سے عاری ہوتے ہیں مگر ان کے علاوہ اظہار رنج و الم کا ذریعہ بھی کیا ہے۔

---

1 ہماری شاعری ص ۳۱

جذبات نگاری کا کمال یہ ہے کہ انسان دوسرے کے احساسات کو اپنا احساس سمجھنے پر مجبور ہوجائے۔ کسی اور پر خنجر چلے اور وہ تڑپ اٹھے کوئی اور فراق میں تڑپتا ہو اور اس کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ مظلوم اور ظالم کا مقابلہ ہو تو یہ حق و انصاف کے لیے اپنے دل میں حرکت سی محسوس کرے۔ بے قراری و بے تابی شکوہ و شکایات، مہر و محبت، مسرت اور جوش، غیظ و غضب وغیرہ کی تصویریں اس طرح کھینچی جائیں کہ سننے یا پڑھنے والے کے احساسات میں شاعر و فنکار کے جذبات کی آمیزش نظر آئے۔

مرزا دبیر کی جذبات نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں حسب منشا جذبات ابھارتے ہیں۔ علم النفس میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ وہاں جذبات ہی انسان کو انسان بنائے رکھتے ہیں۔ عام انسان اپنے جذبات کی تربیت نہیں کرپاتے اپنے جذبات پر قابونہیں رکھ سکتے جس سے توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ خطائیں کرتے ہیں مگر اس انسان کی قوت گویائی کا اندازہ کیجیے جو دوسرے کے جذبات پر قدرت رکھتا ہے دوسروں کے دلوں کی دھڑکن سے واقف ہے کہ اسے کس نقطے سے چھیڑا جاسکتا ہے کس طرح سے متاثر کیا جاسکتا ہے کس زاویہ سے گفتگو کی جائے کہ سننے والا یا پڑھنے والا دوسرے کے غم کو اپنا غم اور دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھے۔ قاعدہ کلی ہے کہ انسان مشاہدۂ ذاتی کے بغیر شاذ و نادر ہی متاثر ہوتا ہے اس کا تجربہ آئے دن کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر باپ کی موت بچے کے تولد ہونے سے پہلے ہوگئی ہو تو بچہ بڑا ہو کے اس کو یادنہیں کرتا۔ اگر کم سنی میں ماں مرجائے تو بعد میں اولاد اس پر ماتم نہیں کرتی۔ اپنے غم کو دوسرے کے غم پر فوقیت دی جاتی ہے۔ دوسرے کی مصیبت کا احساس مشکل سے ہوتا ہے مگر مرزا دبیر جذبات انسانی کی تصویریں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے ان کے ہم نوا ہوجاتے ہیں جیسے سامنے دیکھ رہے ہوں۔ فضائل کا بیان ہے تو واہ وا اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور آلام و مصائب کا ذکر ہو تو فلک شگاف نالے بلند ہوتے ہیں، سینوں میں دل تڑپ اٹھتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ لوگ روتے پیٹتے بے ہوش تک ہوجاتے ہیں۔ غم و الم کے جذبات کے بیان کرنے کے لیے بقول محمد حسین آزاد مرزا دبیر کی طبیعت خاص طور پر نہایت ہی گداز

تھی۔[1] صاحب المیزان لکھتے ہیں:

> ''پہلے تو وہ خود ہر کیفیت سے متاثر ہوجاتے تھے اور جب ان کے دل پر چوٹ لگتی تھی تو زبان سے درد انگیز الفاظ نکلتے تھے اور سننے والوں کے دل پر بھی وہی حالت طاری ہوجاتی ہے جو خود ان کے دل پر پیدا ہوئی تھی پس ان کے اشعار گویا ان کے اندرونی احساس کی اصلی تصویریں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے مضامین کے ادا کرنے میں کمال پیدا کرلیا ہے۔ وہ جس واقعہ کا نقشہ اتارتے ہیں جس کیفیت کی تصویر کھینچتے ہیں اس کو ایسے درد ناک اور دل نشین پیرائے سے شروع کرتے ہیں کہ سامعین کی طبیعت بے چین ہوجاتی ہے سننے والوں کے درد وغم، فرحت و انبساط کے فطرتی ولولے جوش میں آجاتے ہیں اور تمام قدرتی جذبات میں حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔''[2]

صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں کہ دلوں کو گداز کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ایسی تمہید باندھی جائے جس سے سننے والوں کے دل نہ صرف واقعہ کی طرف متوجہ ہوجائیں بلکہ جو واقعہ بیان کیا جارہا ہے اس کی شان و شوکت کی ایک تصویر بھی سامنے آجائے تاکہ بعد میں جب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو ان کے دل خود بخود تڑپ اٹھیں۔ جب کسی کے ذہن میں کسی کی شان و شوکت کی تصویر ابھرے اور اس کے بعد اس کی پریشانی و مصیبت سامنے آجائے تو فطرتاً وہ اس میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔[3] مرزا صاحب کا یہ بند ہے:

جس دم نگین خاتمِ پیغمبران گرا   رونق اٹھی زمیں سے امامِ زماں گرا
گرنے پہ سب گروہ لیے برچھیاں گرا   ہے ہے نہ ان جفاؤں پہ بھی آسماں گرا
زہراؑ سے پوچھیے یہ قلق نورِ عین کا
تپنا زمیں کا اور تڑپنا حسینؑ کا

---

۱   آب حیات ص ۵۳۷

۲   المیزان ص ۱۹۸

۳   حیات دبیر جلد اول ص ۱۴۳۔۱۴۲۔ ثابت نے بھی یہ بند مختلف ٹکڑوں میں اس صفحے پر پیش کیا ہے۔

اس بند میں پہلے مصرعہ میں امام حسینؑ کے منصب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہیں خاتم پیغمبراں کے خاتم کی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے مصرعہ میں کائنات کی رونق اٹھنے کا بیان ہے کہ باعث رونق نہ رہا تو رونق مفقود ہوگئی۔ تیسرے مصرعہ میں اس کیفیت کو مزید درد انگیز بنادیتے ہیں کہ ایسے صاحب شرف و عزت پر ظالموں کی جماعت برچھیاں لے کر ٹوٹ پڑی۔ چوتھے مصرعہ میں شاعر تڑپ کر فریاد کرتا ہے کہ اتنے مظالم ہوئے اور سب تماشائی بنے رہے۔ ان ظالموں پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا اور پھر اس کیفیت میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے دکھیاری ماں کے جذبات کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے کہ تپتی زمین، زخمی بیٹے کا تڑپنا اگر کوئی غریب ماں دیکھ لے تو اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

مرزا دبیر جذبات نگاری میں جذبات کے مختلف مراحل پیش کرکے قاری یا سامع کو شریک کرتے ہیں پھر ایک موقع پر شاعر اور سامع یا قاری کے جذبات میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

مرزا دبیر اور ان کے معاصر مرثیہ نگاروں کی فنکاری کا دوسرا رخ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ہر ایک مرنے والے یا قتل ہونے والے کے لیے ہمدردی کے جذبات نہیں ابھارے ہیں۔ اگر ایک طرف انھوں نے امام حسینؑ اور ان کے اعوان و انصار کے لیے کائنات کو غم زدہ پیش کیا تو دوسری طرف یزیدی فوج کے نامی پہلوانوں کی موت پر جذبات مسرت ابھارے ہیں۔ ایک واقعہ میں دو مرنے والوں کے لیے دو مختلف کیفیات پیدا کردینا مرثیہ نگاروں کا کمال فن ہے۔

مرزا دبیر اس فن میں ماہر ہیں اور اسی لیے غم انگیز اشاروں اور دردخیز کنایوں کے ساتھ اپنے ہیرو کے منصب، عالی نسبی، عزت و توقیر اور مقبولیت کی طرف بھی اشارے کرتے جاتے ہیں۔ اس کا بھرپور اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہوتا ہے۔

امام حسین جب اپنی چار برس کی بیٹی سکینہ، جسے وہ بہت پیار کرتے تھے، اپنے سینے پر سلاتے تھے اپنے ساتھ کھلاتے تھے اور بہت عزیز رکھتے تھے، سے رخصت ہونے کے لیے آتے ہیں۔ مرزا دبیر اس طرح سے اس واقعہ کو نظم کرتے ہیں:

چلاتے ہیں حسینؑ کہ لاؤ سکینہ کو — روٹھی ہے وہ کہ اب نہ بلاؤ سکینہ کو

جاؤ بس اب گلے نہ لگاؤ سکینہ کو کیا قصد ہے وہیں سے سناؤ سکینہ کو
میں تم سے بولتی نہیں مرنے کو جاتے ہو
کہنے کو الوداع ہمیں واں بلاتے ہو

امام حسینؑ کے بہن بیٹی اور اہلیہ سے رخصت ہونے کا حال اس طرح نظم کرتے ہیں:[1]

مرقوم ہیں یوں شاہ کے اخبار مصیبت جب رو چکے ہفتاد ودو[1] تن کے لیے حضرت
گھر آنے کی میداں سے نہ تھی شاہ کو طاقت پر کھینچ کے لے آئی سکینہؑ کی محبت
یاں آن کے دیکھا تو اسے پیاس بڑی ہے
ماں بیٹھی ہے بالیں پہ وہ بیہوش پڑی ہے

زینب سے یہ رو رو کے گلہ کرنے لگے شاہ جیتے جی مرے حال سکینہ کا یہ ہے آہ[2]
ہے خاک پہ بیہوش خبر تم کو نہیں واہ جانو اسے بن باپ کی شفقت کرو للہ
غافل مرے بچوں سے جو اس آن ہوئی ہو
ہاں پال کے اکبر کو پشیمان ہوئی ہو

حضرت امام حسینؑ کے اپنے بھائی علمدار کربلا حضرت عباسؑ کے شہید ہونے کی اطلاع پاکر میدان کی طرف جانے کے واقعہ کو یوں نظم کیا ہے:

گھوڑے سے گرے جب تو برادر کو پکارا کام آیا یہ خادم یہ نمک خوار تمہارا
سنتے ہی نہ حضرت کو رہا ضبط کا یارا بس ہائے اخی کہہ کے گریباں کیا پارا
کانپا جو بدن حیدر صفدر نے سنبھالا
غش کھا کے گرے تھے کہ جو اکبر نے سنبھالا

---

۱ اس وقت تک امام حسینؑ اپنے سب رفیقوں کی شہادت کا منظر دیکھ چکے ہیں اور اب آخری قربانی کی تیاری ہے اور اپنے پیچھے ایک بیمار فرزند سید سجاد امام زین العابدینؑ کے سپرد قافلہ کو کر آتے ہیں جو بخار سے بے ہوش ہو رہے ہیں اور اس بیمار کو بہن حضرت زینبؑ کے سپرد کرتے ہیں۔

۲ پہلی نظر میں ممکن ہے کوئی اسے بچی کا گلہ شکوہ سمجھے۔ حقیقت میں یہ علی اکبرؑ کا پرسا ہے جس کا اظہار بند کے آخری مصرعہ میں ہوتا ہے

پھر مڑ کے جواں بیٹے کو چلائے کہ جلد آؤ　　اکبر مرے ٹوٹے ہوئے بازو سے لپٹ جاؤ
بیتاب ہوں میں جلد مرے بھائی کو دکھلاؤ　　دم آنکھوں میں آ پہنچا ہمیں نہر پہ پہنچاؤ
آنکھوں سے مرے خونِ دل اس وقت بہا ہے
چھریوں سے کلیجے کو کوئی کاٹ رہا ہے

یہی واقعہ دوسرے مرثیے میں یوں نظم ہوا ہے:

واں ایک بلندی جو درِ خیمہ کے تھی پاس　　بے فوج کا سردار کھڑا تھا وہاں بے آس
سید کی تر آنکھیں نگراں تھیں سوے عباسؑ　　منھ دیکھتے تھے ان کا حرم در سے بصد یاس
واں نہر پہ غل اٹھتا تھا یاں درد جگر سے
تاریک تھا دن آلِ پیمبرؐ کی نظر سے

حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور ماں باپ کی حالت کو اس طرح نظم کیا ہے:

اکبر نے کیا عزم جو میدانِ ستم کا　　تغیر ہوا حال شہنشاہ امم کا
روکر کہا مجھ کو ہے بھروسا ترے دم کا　　عباسؑ موے میں بھی ہوں مہماں کوئی دم کا
کس منہ سے کہوں مرنے کو جاؤ علی اکبرؑ
بانو کی کمائی کو لٹاؤ علی اکبرؑ

حضرت علی اکبر کی نزع کی حالت میں امام حسینؑ کی بے تابی اور بے چینی کو اس طرح نظم کیا ہے:

آواز سنی بیٹے کی شہ نے جو قضا را　　گھبرا گئے باقی نہ رہا ضبط کا یارا
سر پیٹ کے ہاتوں سے گریباں کیا پارا　　کس یاس کے عالم میں سوے خیمہ پکارا
میدان میں ضائع مری دولت ہوئی زینبؑ
ہے ہے علی اکبرؑ کی بھی رحلت ہوئی زینبؑ

امام حسینؑ کی شہادت کے وقت حضرت زینبؑ کے جذبات کی تصویر اس طرح پیش کی ہے:

زینبؑ کا جگر ہل گیا گر کر یہ پکاری　　آؤ علی اکبرؑ میں تمہارے گئی واری
بھائی موے، نکلی ہے پھوپھی گھر سے تمہاری　　ہے ہے مرا ماں جایا، مرا عاشق باری
مرجاؤں گی حسرت میں یہیں پاؤں رگڑ کر
تم لاش پہ لے جاؤ مرا ہاتھ پکڑ کر

حضرت امام حسینؑ کے ذبح ہونے کا قیامت خیز نظارہ حضرت زینبؑ دیکھتی ہیں تو دل میں اضطراب کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ تڑپ تڑپ کے شمر سے منت و زاری کرتی ہیں۔ اس لرزہ خیز کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

لکھا ہے جب کہ غش ہوے مولاے کائنات　　آئی عزیز مردہ بہن شاہ دیں کے پاس
وہ بیکسی، وہ درد، وہ اندوہ، وہ ہراس　　قابو نہ کچھ مدد کا نہ فریاد کے حواس
کچھ بس نہ تھا بھائی کے بدلے نثار ہو
پوچھو یہ درد اس سے جو بے اختیار ہو

وہ رونا بیکسی کا وہ گھبرانا یاس کا　　وہ تھرتھرانا دل کا وہ اڑنا حواس کا
کہنا بلک بلک کے یہ کلمہ ہراس کا　　اے شمر واسطہ علی اصغرؑ کی پیاس کا
للّٰہ تین روز کے پیاسے کو چھوڑ دے
صدقہ نبیؐ کا ان کے نواسے کو چھوڑ دے

تھم جا خدا کو مان حبیبؐ خدا کو مان　　زہراؑ کو مان، حضرتِ مشکل کشا کو مان
سو گند فقر و فاقہء آلِ عبا کو مان　　اپنی رسول زادی کی تو التجا کو مان
سارے بزرگ مر گئے مجھ بدنصیب کے
میرا کوئی نہیں ہے، سوا اس غریب کے

اے شمر پاس بھائی کے آؤں جو تو کہے　　زخموں سے جلتی ریت چھڑاؤں جو تو کہے
چادر بدن کے نیچے بچھاؤں جو تو کہے　　بیکل ہے سر میں آ کے اٹھاؤں جو تو کہے
پانی تو یاں ملے گا نہ زہراؑ کی جائی کو
آنسو چھڑک کے ہوش میں لاؤنگی بھائی کو

اے شمر میں گلے سے لگا لوں تو ذبح کر　　کچھ درد اپنے دل کا سنا لوں تو ذبح کر
سید کو قبلہ رو میں لٹا لوں تو ذبح کر　　بھائی سے مل کے خیمہ میں جا لوں تو ذبح کر

پانی نہ بھوکے پیاسے کو اے بدخصال دے
وقت ذبح آنکھوں پہ کپڑا تو ڈال دے[1]

آخر میں ایک اور مثال دی جاتی ہے جس میں مرزا دبیر نے امام حسین کی شہادت کے بعد ذوالجناح کے خیمہ اہل بیت میں آنے اور اہل حرم کی بے قراری و بے بسی کی تصویر کشی کی ہے اس موقع پر ان کی فنکارانہ پیش کش خلاقانہ ذہن ہی محسوس کرسکتا ہے عام حالات میں الفاظ ناکافی محسوس ہوتے ہیں اور مفاہیم' الفاظ کا پردہ چاک کر کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ انسان جذباتِ غم و الم سے بے اختیار ہوجاتا ہے خاص طور پر کمسن سکینہ کے جملے:

اب دمبدم گلے سے لگائے گا ہائے کون　　بچپن کے میرے ناز اٹھائے گا ہائے کون
کہہ کر سکینہ جان بلائے گا ہائے کون　　روٹھوں گی کس سے اور منائے گا ہائے کون
غربت میں جان دی مرے بابا امام نے
میں غم نصیب مر نہ گئی ان کے سامنے

واقعہ نگاری

موضوع کے اعتبار سے مرثیہ گو ایک ایسا واقعہ نظم کرنے کا پابند ہے جس کی حد بندی تاریخ نے پہلے ہی کر رکھی ہے ایک افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، داستان گو یا مثنوی نگار ان پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ مرثیہ گو کو واقعۂ کربلا اس انداز سے پیش کرنا ہے کہ واقعات صحیحہ سے انحراف نہ ہو مگر اس واقعہ کے اندر جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں وہاں شاعر کی اپنی انفرادی صلاحیتوں کے اظہار کی گنجائش تو ہے لیکن ایسے مواقع پر بھی شاعر کو اتنی آزادی نہیں کہ وہ جیسے چاہے واقعہ بیان کرے اس کے لیے پہلے سے ہی ایک دائرہ کھینچا ہوا ہے جس کے اندر رہ کر ہی وہ اپنی شعریت کی جولانیاں دکھا سکتا ہے

---

[1] دل تو چاہتا ہے کہ اور مثالیں دی جائیں تاکہ شبلی کی رائے کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے مگر طوالت کا خوف ہے۔

شاعر اور مورخ کی واقعہ نگاری میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ مورخ ایک فوٹو گرافر ہے جس کو واقعہ کی ہو بہو تصویر پیش کرنا ہوتی ہے مگر وہ دلوں کے اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ وہ انسان کی انفرادی کشمکش کو اسی حد تک پیش کرسکتا ہے جس حد تک اس کشمکش کے خطوط چہرے پر سمٹ آئیں اور روشنی میں رہیں۔ جب واقعہ اندھیرے میں رہے تو وہ بے بس ہے۔ غرض جہاں تک اس کی نگاہ جائے گی اور روشنی اس کا ساتھ دے گی وہیں تک واقعہ اس کی نظر میں رہتا ہے مگر شاعر واقعہ کی تصویر آنکھ سے نہیں دیکھتا اپنے دل و دماغ کو وسیلہ بناتا ہے وہ واقعہ سے تاثر قبول کرتا ہے جسے فنی بالیدگی سے پیش کرتا ہے۔ شاعر بیک وقت فوٹو گرافی بھی کرتا ہے اور مصوری بھی۔ تصویر کے خد و خال تو یہ واقعہ سے لے لیتا ہے مگر اس میں رنگ اپنے دل سے ملا لیتا ہے اور قلم اپنے دماغ اور شعری تجربہ سے حاصل کرتا ہے۔ واقعہ کے اصل خد و خال اس کے لیے ایک حد مقرر کرتے ہیں اور دل کے رنگ ان حدود کو وسعت عطا کرتے ہیں اور ذہن اور شعری تجربہ زبان و بیان کے ذریعہ اس کو حقیقت نگاری کا رنگ بخشتے ہیں۔ شاعرانہ واقعہ نگاری کا کمال یہ ہوتا ہے کہ شاعر واقعہ میں اپنے رنگ اس طرح سے ملا دیتا ہے کہ سامعین یا ناظرین کو اس پر اصلیت کا گمان ہوتا ہے وہ شاعر کے رنگوں کو واقعہ میں اس طرح تحلیل کردیتا ہے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہوجاتی ہے کہ شاعر کے اضافے کیا ہیں اور واقعہ کی اصل تصویر کیا ہے وہ اس قدر متاثر کن ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔

شاعر کو یہ موقع اس وقت ملتا ہے جب وہ ایسے تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے جلوت سے خلوت کی راہ اختیار کرتا ہے جب دربار عام سے اٹھ کر دربار خاص یا حرم کا نقشہ کا کھینچتا ہے جب وہ اپنے ناظرین یا سامعین کو عدالت سے قید خانے کی طرف لے جاتا ہے۔ شاعر کو جہاں واقعہ کے جزئیات بیان کرنے کا موقع مل جاتا ہے، وہاں وہ اپنے فن اور اپنی قوت گویائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اردو مراثی کے تخلیقی جوہر سے ناواقف ادبی مورخ بسا اوقات مرثیہ گویوں کی واقعہ نگاری پر اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے واقعات کی صحت مشکوک ہوتی ہے تاریخی لحاظ سے ان کے پیش کیے ہوئے واقعات سو فیصد سچ نہیں ہوتے۔ سوچنے کی بات ہے کہ پھر شاعر اور مورخ میں فرق ہی کیا رہے گا۔ مورخ کسی واقعہ کی تصویر کشی کرتا ہے تو صرف سامنے کی باتیں

درج ہوتی ہیں۔ ایک بڑے واقعہ کے ساتھ کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات منسلک ہوتے ہیں جن کا اسے خیال ہی نہیں ہوتا ہے۔ مورخ جب ایک شاہراہ پر گزرتے ہوئے ایک بڑے جلوس کو دیکھتا ہے، اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس جلوس میں شامل ہزاروں لوگوں کے دلوں پر اس واقعہ کا کیا ردعمل ہے۔ ایک نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ساتھ جو دو دو تین تین آدمی آپس میں سرگوشیاں کرتے جاتے ہیں وہ اس واقعہ میں کس طرح اضافہ کرتے ہیں۔ جو مکانوں کے اندر رہ کر کھڑکیوں سے اس جلوس کو دیکھتے جاتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں ان کی سرگوشیوں ان کے فقروں اور ان کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر مورخ کیسے دھیان دے سکتا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ان جزئیات کے بغیر واقعہ نامکمل ہے۔ پارلیمنٹ کے کسی واقعہ کو بیان کرکے، گیلری میں بیٹھے ہوئے تماش بینوں اور اخباروں کے ذریعہ پڑھنے والوں کے ردعمل معلوم کیے بغیر واقعہ مکمل نہیں قرار دیا جاسکتا یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہوگا۔ مرثیہ گویوں نے واقعۂ کربلا کی حدود میں ان ہی جزئیات کی تفصیل پیش کی ہے۔ اگر وہ اس تفصیل سے کام نہ لیتے تو مرثیے میں المیت کو برقرار رکھنا دشوار تھا۔ اس کے بغیر مرثیہ میں یہ تاثیر نہ ہوتی جو ہم اس میں دیکھ رہے ہیں اور اس میں سب سے بڑا کمال مرثیہ گویوں کا یہ ہے کہ انھوں نے واقعہ نگاری کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان سے حقیقت کا دامن چھوٹ گیا ہے بلکہ سننے والا یا پڑھنے والا یہ سوچ کے مطمئن ہوجاتا ہے کہ یہ مورخ کے امکان سے باہر ہے کہ وہ ان جزئیات کو بیان کرسکے۔ وہ بیک وقت میدان جنگ میں بھی نہیں رہ سکتے اور دور ایوان شاہی کے اندر بھی جہاں امن اور امان ہو۔ وہ بیک وقت شہید ہونے والے کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے اور دور سے دیکھنے والے اس کے اقارب کے ساتھ بھی وہ نقارۂ جنگ کی آواز اور حرم کے اندر کے کہرام کو بیک وقت نہیں سن سکتے وہ خون میں ڈوبی ہوئی لاشوں اور پیاسے بچوں، جنہیں مائیں تھپک تھپک کرتسلی دے رہی ہوں، کے زرد چہروں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ روئے حسینؑ کے تاثرات اور بیمار کربلاؑ کی غشی کی حالت کا نقشہ ایک ساتھ کھینچنے سے قاصر ہیں۔

مرزا دبیر کے مراثی میں واقعہ نگاری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ فوق مہانی لکھتے ہیں :

''انھوں نے ہر واقعہ کے بیان میں جو دلخراش الفاظ استعمال کیے ہیں اور جو
دردانگیز سماں دکھایا ہے اس سے ہر چیز، ہر واقعہ، ہر حالت اور ہر کیفیت کی
اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔''[1]

جہاں تک مرزا دبیر کی واقعہ نگاری کا تعلق ہے اس کی بہترین مثالیں ان کے ان مراثی میں ملتی ہیں جن میں انھوں نے واقعات شام نظم کیے ہیں۔ واقعات شام بجائے خود اپنے اندر درد انگیزی اور تنوع رکھتے ہیں۔ مرزا دبیر نے اس چیز سے خوب کام لیا ہے دربار یزید اور زندان شام اور ہند (زوجہ یزید) کے حالات اور واقعات کو مرزا دبیر نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ واقعہ اپنی پوری کیفیت اور پورے تاثر کے ساتھ لفظوں کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ لفظ نظروں کے سامنے رہتے ہیں اور ذہن اصل واقعہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ زوجہ یزید ہند کے احوال، اہل بیت اطہارؑ سے اس کے جذبۂ خلوص و ہمدردی کے واقعات وغیرہ اس خوبی سے بیان کیے ہیں کہ سننے والا بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوجاتا ہے خود مرزا دبیر بھی اس سے واقف تھے اور مرزا دبیر اس پر فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں:

بے مثل مرثیے کہے احوال ہند میں
تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ عجم میں

زندان شام کے واقعات میں جو جزوی واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں ان کا جواب نہیں۔ کربلا کے بعد یہ دوسری کربلا کے مناظر ہیں جو اپنی افسوناکی اور درد انگیزی سے سامعین کے دلوں کو تڑپاتے ہیں۔ ہند جب زندان شام میں داخل ہوکر اسیران یزید کا حال معلوم کرتی ہے اس کے دل کا اضطراب، فطری ہمدردی اور ایسے واقعات کے نقشے مرزا دبیر نے خوب کھینچے ہیں۔

جب ہند یکایک دربار شام میں داخل ہوئی تو دربان بھی خوفزدہ ہوگئے اور اہلِ حرم سے کہا کہ تم لوگوں کی آہ و زاری سے ملکہ کے آرام میں خلل پڑ گیا اور وہ قید خانے میں اس وقت گئی ہیں اور غصے میں ہیں۔ وہ تم سب کو قتل کروانے آئی ہیں۔ اس

---

[1] المیزان ص ۲۷۱

موقعے پر اہل حرم میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے اور بچے خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ مرزا دبیر نے اس واقعہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

یہ ذکر تھا جو ہند وہاں آئی پہ بیہوش　　عابد سے کہا بانو نے واری گئی خاموش
اک اک کے پسِ پشت ہوا شرم سے روپوش　　بچے تو یہ سمجھے کہ ہوئی پیاس فراموش
منہ ڈھانپ لیے خوف سے کرتوں کو الٹ کر
اور سانس نہ لی بیوؤں کے سینوں سے لپٹ کر

اس واقعہ میں جو کیفیت پیدا کی جاسکتی تھی بڑے اختصار سے کام لے کر اس کو پیش کیا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ کی تخلیق بھی ہے۔ اس واقعہ میں خوف کو جس طرح سمودیا گیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے بچوں کے خوف کو اس واقعہ کے ساتھ اس طرح ملانا نہ صرف صورت حال(Situation) پیدا (Create) کرتا ہے بلکہ اس کو زندگی بھی دیتا ہے۔ بچوں کی حالت:

منہ ڈھانپ لیے خوف سے کرتوں کو الٹ کر
اور سانس نہ لی بیوؤں کے سینوں سے لپٹ کر

بیان کر کے اس واقعہ میں شدت تاثر سے کام لیا ہے۔ خوف اور تشویش کی امکانی تصویر کا واقعہ کے ساتھ بظاہر کوئی تعلق نہیں مگر غور کیا جائے تو اس کے بغیر واقعہ میں جان نہیں رہتی۔

دربار شام میں اہل بیت پیمبرؐ کے بلاوے کا واقعہ اس طرح نظم کیا ہے:

آمد ہے اہلِ بیت پیمبر کی شام میں　　گیسو کھلے ہوئے ہیں عزائے امام میں
سرپیٹتی ہے فاطمہ دارالسلام میں　　زینبؑ یہ نوحہ کرتی ہے دربار عام میں
لوگو خبر کرو مرے نانا رسولؐ کو
بلوے میں شمر لایا ہے بنتِ بتولؑ کو

اس مرثیہ میں ایک واقعہ کی مختلف جہتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ واقعہ بظاہر مختصر سا ہے مگر اس کے ذیل میں آنے والے واقعات جو مرزا دبیر مسلسل بیان کرتے گئے تاثر میں لاجواب ہیں۔ شاعری کا کام واقعہ نگاری میں یہی ہوتا ہے کہ واقعہ کے ساتھ انسان کی نظروں کے سامنے وہ منظر ابھر کر آئے اور وہ مختلف پہلوؤں

سے اس کو دیکھے اور جدھر نظر اٹھائے واقعہ اس کے ساتھ ساتھ رہے۔
حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں داخل ہونا، دشمنانِ اہل بیتؑ کی اس موقع پر روک ٹوک، رفقائے امامؑ کی برہمی، حضرت امام حسینؑ کی صلح پسندی اور معافی وغیرہ کے واقعات حقیقت میں ایک ہی واقعہ یعنی ورود کربلا کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس پورے واقعہ کو مرزا دبیر نے بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ یہاں مثال کے لیے صرف ایک بند پیش ہے:

اب خامۂ نقاش غمِ حضرت شبیر   یوں کھینچتا ہے شاہ کے احوال کی تصویر
جب ہادیۂ کرب و بلا پر شہِ دلگیر   پہونچے مع فوج و حرم صاحبِ تطہیر
بجنے لگے نقارے نزول شہ دیں پر
رتبے تھے سوا تختِ سلیماں سے زمیں پر

حضرت عباسؑ جب میدان میں جاتے ہیں اور شمر اپنے رشتے کے سہارے انہیں فوج یزیدی سے ملنے کی ترغیب دیتا ہے حضرت عباسؑ یہ سن کر غصے سے لال ہوکر اس کو سخت زبان میں جواب دیتے ہیں۔ ادھر شمرؔ اہل بیت رسولؐ کو پست ہمت کرکے اس بات کی تشہیر کرتا ہے کہ عباسؑ ان کی فوج سے مل گئے۔ اس واقعہ کا اہل بیتؑ پر کیا اثر پڑتا ہے پورا واقعہ مرزا دبیر نے اس طرح نظم کیا ہے کہ واقعہ تو اپنی جگہ مختصر ہے مگر اس مختصر سے عرصہ میں کس کے دل میں کیا آتا ہے کس کی زبان کیا کہتی ہے اس کی تفصیل بڑی خوبی سے بیان کی ہے۔ نمونے کے لیے یہاں صرف پانچ بند پیش کیے جاتے ہیں:

عباسؑ تو یاں شمر سے کرتے تھے یہ گفتار   اور فوج میں غل تھا کہ ملا ہم سے علمدار
لو ٹوٹ گئی اب کمر سید ابرار   اے لشکریو لوٹ پہ خیمہ کی ہو تیار
زینبؑ کی ردا چھین لو شبیرؑ کے آگے
پھر قتل کرو بھائی کو ہمشیر کے آگے

یاں متصلِ خیمہ کھڑے تھے شہِ ابرار   عباسؑ کے فرزند کو فرما رہے تھے پیار
یہ غل جو اٹھا لشکرِ کفار سے اک بار   پوچھا علی اکبر سے یہ کیا شور ہے دلدار

معذور بصارت سے ہم اے نورِ نظر ہیں
تم اپنے چچا جان کو دیکھو تو کدھر ہیں

اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی
نرغہ میں گھرا ہے اسداللہ کا جانی
ہے بے ادبی گر میں کہوں اپنی زبانی
آپس میں یہ کہتے ہیں مگر ظلم کے بانی
بیعت بھی ہم اب لیں گے شہنشاہِ امم سے
عباسِ دلاور سا جواں مل گیا ہم سے

پردے سے لگی سنتی تھی زینبؑ یہی گفتار
اکبر کو پکاری کہ یہ کیا کہتے ہو دلدار!
بہتان ہے، تہمت ہے، غلط کہتے ہیں کفار
ایسا نہیں، عباسؑ تو ایسا نہیں زنہار
کیا مکر و فریب آتے ہیں اس فوج لعین کو
عباسؑ سے کرتے ہیں یہ بدظن شہِ دیں کو

حضرت کو سنا کر تو یہ کہتے ہیں ستمگار
عباسؑ سے واں اور ہی کچھ ہوتی ہے گفتار
منظور ہے آپس کا نفاق ان کو سو دشوار
سردار نہ ایسا ہے نہ ایسا ہے علمدار
اک جان دو قالب ہیں یہ افضالِ خدا سے
یہ ان سے پھریں گے نہ وہ شاہِ شہدا سے

شبلی نعمانی موازنہ انیس و دبیر میں لکھتے ہیں کہ واقعہ نگاری جب کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری کہتے ہیں[1]۔ یعنی واقعہ منظر کی طرح سامنے آتا ہے آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے اور اس تصویر پر انسان جتنا غور کرے اس کے رنگوں اور ان کی خصوصیات کے مفاہیم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مرزا دبیر کے کلام میں ایسے مرقعے کثرت سے ملتے ہیں۔

---

۱ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۱۰

حضرت علی اصغر کے لیے امام حسینؑ کا پانی طلب کرنا اور حرملہ کے تیر سہ شعبہ کا شش ماہے بچے (علی اصغر) کے گلے میں پیوست ہونا ایک انتہائی دردناک واقعہ ہے جو نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی مختصر ہونے کے باوجود تاثر آفرینی میں واقعۂ کربلا پر محیط ہے۔ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب امام حسینؑ کے رفقاء و انصار میدان بلاخیز میں جامِ شہادت نوش کر چکے ہوتے ہیں۔ اس سے کچھ دیر پہلے حضرت امام حسینؑ اپنے اٹھارہ برس کے نوجوان بیٹے علی اکبرؑ کی لاش میدان سے لے آئے ہوتے ہیں اور علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد ہی حضرت امام حسینؑ بہ نفس نفیس شہادت کی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس واقعہ کی دردناکی اپنی جگہ مسلم ہے کہ شش ماہہ علی اصغرؑ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے:

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے

ادھر امام حسینؑ اس وقت تک اپنے تمام رفقاء اور اعزاء کی لاشیں میدان سے اٹھا چکے ہوتے ہیں اور اب سوائے بھوکے پیاسے علی اصغر کے امام حسین کا کوئی ناصر و یاور نہیں ہوتا ہے۔ حضرت عابد (سید سجاد) ضرور باقی ہیں مگر وہ اس قدر بیمار ہیں کہ مسلسل غشی کی وجہ سے وہ کسی طرح جہاد کے لائق نہیں اور نہ ان میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی قوت ہے۔ اس موقع پر امام حسینؑ نے علی اصغر کے لیے اعدا سے پانی طلب کیا۔ مرزا دبیر نے یہ واقعہ انتہائی بلاغت اور تاثیر کے ساتھ نظم کیا ہے:

آئے جو شاہ متصلِ لشکرِ جفا چادر الٹ کے حال دکھایا صغیر کا
آنکھوں کے حلقے خشک زباں چھوٹا سا گلا چاہا کہ پانی مانگیں مگر آ گئی حیا
مشکل سے اتنا لفظ کہا درد و یاس سے
یارو قریب مرگ یہ بچہ ہے پیاس سے

اس ایک بند میں پورا واقعہ اس طرح سمو دیا ہے کہ جذبات انسانی بربط کے تاروں میں الجھ جاتے ہیں۔ تصویر سامنے آتی ہے اور امام عالی مقام کی بے بسی بے کسی اور عزت و عترت کا لحاظ سب کچھ سامنے آ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا دبیر کے کچھ بند اور پیش کیے جاتے ہیں جن کی شبلی نے بھی تعریف کی ہے لکھتے ہیں:

''مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے

اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہوسکا۔"[1]

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفٰے — لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر — رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

مرزا دبیر کے متذکرہ بالا اقتباس کے متعلق علامہ شبلی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ان کا جواب نہیں :

"اسلوب بیان کی بلاغت کو دیکھو امام علیہ السلام اصغر کو لے کر پانی مانگنے کو نکلے تو سہی لیکن غیرت کے اقتضاء سے ہر قدم پر ٹھہر جاتے ہیں کہ سوال کیونکر کروں اور کروں بھی تو نتیجہ کیا ہوگا، پھر فوج کے قریب پہنچ کر سوال کرتے ہوئے شرمانا، تھرا کے رہ جانا اور سب سے بڑھ کر بچہ کے چہرہ سے چادر سرکا کے رہ جانا، کس قدر قیامت انگیز سماں ہے پھر سوال بھی

---

1 موازنہ انیس و دبیر ص ۳۵۲

کرتے ہیں تو علی اصغر پر رکھ کر ع

اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

واجب الرحم ہونے کی وجہیں کس قدر لاجواب ہیں اور سب ایک ہی مصرع میں ادا ہوگئی ہیں۔ یعنی شش ماہہ ہے، بے زبان ہے، نبی زادہ ہے، شیرخوار ہے، ان سب پر قیامت یہ کہ جب سب کچھ کہہ چکے تو بچہ کی زبانِ حال سے بھی کہلوایا اور بچہ نے کہہ بھی دیا کیونکہ بچہ پیاس کی شدت سے لبوں پر زبان پھیرا کرتا تھا، اب بھی اس نے ایسا ہی کیا تو یہ زبان حال سے کہنا تھا''۔[1]

مرثیہ گویوں نے اپنے کلامیں حضرت زینبؑ کی ردا چھیننے اور اہل بیت اطہارؑ کی بے پردگی کا اکثر ذکر کیا ہے۔ واقعہ کربلا کا یہ پہلو بہت درد ناک ہے کہ نبی زادیاں بے پردہ کی گئیں۔ ایک منزل پر جب میدان کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت کا وقت قریب آتا ہے اور شمر شاہ شہیداں کے سینے پر سوار ہوجاتا ہے تو امام کی ستم زدہ بہن جذبات سے بے قابو ہوکر اپنے بھائی کے قریب پہنچتی ہے۔ مرزا دبیر بلاغت بیان کے ساتھ واقعہ نظم کرتے ہیں اور امام حسینؑ کے تصور میں پردہ داری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں، گوکہ وہ زیرِ خنجر ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا دبیر نے یوں نظم کیا:

تغیّر گو تھی حالتِ مظلوم کربلا غیرت سے بند بند مگر تھر تھرا گیا[2]
رو کر کہا کہ اے جگرِ اشرف النساء بھائی کے جیتے جی یہ بہن تم نے کیا کیا
سر ننگے آئیں تم سپہِ نابکار میں
ماں کا چلن بھلا دیا بھائی کے پیار میں

مرزا دبیر فطرتِ انسانی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ایک واقعہ کے ساتھ انسانی

---

۱ موازنہ انیس و دبیر ص ۵۴-۳۵۳

۲ اس مرثیہ کا مطلع ہے ''آمد خزاں کی گلشنِ خیرالوریٰ پہ ہے''۔ ۹۸ بند کا یہ مرثیہ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں ''ادارۂ یادگار دبیر'' کی طرف سے ''کلام دبیر'' (مطبوعہ سرفراز پریس لکھنو) کے نام سے شائع ہوا ہے ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی کتاب ''شاعر اعظم'' صفحہ ۱۹۲ میں اسے غیر مطبوعہ قرار دیا ہے غالباً ان کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔

فطرت کی جو جو چیزیں سامنے آ سکتی تھیں ان کو بڑے موثر پیرائے میں نظم کیا ہے اور اس کو اتنا پرکشش بنادیا ہے کہ یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ واقعہ میں کوئی تصرف کیا گیا ہے سکینہؑ پانی کے لیے دعا مانگتی ہیں اور سب بچوں سے مل کر آمین کہنے کو کہتی ہیں دعا و مناجات کی اس رسم میں شامل ہونے کے لیے علی اصغر بہت کم سن تھے۔ اس واقعہ کو مرزا دبیر نے اس طرح نظم کیا ہے:

بانو نے سنی جب یہ سکینہ کی مناجات پھیلا دیے اصغر کے بھی قبلہ کی طرف ہات
کہنے لگی، اے کل کے برآرندۂ حاجات صدقے ترے، سن لے مرے معصوم کی بھی بات
بے شیر مناجات میں ہے ہاتھ اٹھا کے
پانی یہ طلب کرتا ہے ہونٹوں کو ہلا کے

اسی طرح علی اکبرؑ کی پیدائش کے چند روز بعد جب جناب زینبؑ ان کو امام حسینؑ کی خدمت میں لاتی ہیں تو اس واقعہ کو مرزا دبیر نے نظم کرتے وقت عورتوں کی مسرت اور آداب و سلام کے طریقے کا خیال رکھا ہے۔ آداب و سلام کے معمولات کو اس طرح ادا کرتے دکھایا ہے کہ واقعہ کی مسکراتی ہوئی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ کہتے ہیں:

اکبر کو بر میں لے کے مثالِ دل و جگر خوش خوش گئی حضورِ شہِ دیں وہ خوش سیَر
ہاتھ اس کا اپنے ہاتھ سے رکھا جبیں پر بولی نگاہ روبرو اے شاہِ بحر و بر
ننھا سا ہاتھ چاند سے ماتھے پہ دھرتے ہیں
ہمشکلِ مصطفےٰ تمھیں تسلیم کرتے ہیں

جب میدان کربلا میں تشنہ لب بچوں کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت عباسؑ ان کے لیے نہر سے پانی لانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس واقعہ کو اضطراب اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ جو اس وقت بچوں کی فطرت سے ظاہر ہونے چاہئیں' اس طرح کمال اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے:

ہاتھوں میں کٹورے لیے سادات کے پیارے ڈیوڑھی پہ کھڑے کرتے تھے دریا کے نظارے

ایک باپ کا نوجوان بیٹے کی لاش دیکھنا فطرتِ انسانی کے لحاظ سے انتہائی المناک سانحہ ہے۔ انسانی فطرت اس موقع پر کس بے چینی اور بے قراری کا مظاہرہ کرتی ہے اس کا اندازہ مرزا دبیر کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

دستور ہے سواروں کا جس دم اترتے ہیں　　پہلے جدا رکابوں سے وہ پاؤں کرتے ہیں
حضرت نے پاؤں بھی نہ نکالے رکاب سے
لاشے پہ جست کرکے گرے اضطراب سے

حضرت زینبؑ جب اپنے دو بیٹوں عون و محمد کی لاشیں دیکھتی ہیں تو انتہائی صبر اور استقلال کا ثبوت دیتی ہیں۔ خواہرِ حسین کی قوت برداشت ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے مگر فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ ماں جب اپنے بیٹے کی لاش دیکھے گی تو اس سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جائے گا۔ وہ مضطرب و پریشان ہوکر آہ و زاری کرے گی۔ مرزا دبیر نے اس واقعہ کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے:

یہ کہہ کے پھر وہاں سے چلا حق کا وہ ولی　　تھرا کے اٹھی بنتِ علی کہہ کے یا علیؑ
آئی جو پاس لاشوں کے زہراؑ کی لاڈلی　　وہ آہ کی کہ سب کے دلوں پر چھری چلی
پھر ہوسکا نہ ضبط دلِ پاش پاش سے
گر کر زمیں پہ لپٹی وہ دونوں کی لاش سے

شفقت سے بار بار گلے سے لگاتی تھی　　لیتی تھی گہہ بلائیں کبھی صدقے جاتی تھی
آنکھوں سے آنکھیں ملتی تھی آنسو بہاتی تھی　　بوسے لبوں کے لیتی تھی اور رنج کھاتی تھی
کہتی تھی واہ پیارو بڑا کام کر گئے
ماموں پہ صدقے ہو کے مرا نام کر گئے

حضرت شہر بانو کا اہل حرم سے رخصت ہونا انسانی فطرت کے تقاضوں کے اعتبار سے ایک بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ بیٹے شہید ہو چکے ہیں۔ بیٹیاں زندہ ہیں مگر تباہ حال اور ان کا کوئی والی وارث نہیں۔ اس وقت ان کی ایک ایک بات سامنے آتی ہے ایک ایک شہید یاد آتا ہے۔ ایسے موقعہ کی تصویر کھینچنے سے مصور بھی قاصر ہے۔ مرزا دبیر نے اس واقعہ کے مختلف جزئیات کو اپنے ذہن رسا اور شعری تجربے سے نظم کیا ہے۔ خاص طور پر جب علی اصغر کی یاد آتی ہے یا جس وقت سکینہؑ کو سامنے لاتی ہیں۔ اس موقع پر سکینہؑ کو کیا تلقین کرتی ہیں دیکھیے کس طرح نظم ہوا ہے۔

اب گوشِ دل سے واری نصیحت مری سنو　　ہر ایک بات پر ہے تمہیں روٹھنے کی خو!
ایسا نہ ہو کہ طور پھوپھی سے یہی کرو　　رتبہ سمجھ کے کیجیو تم ان سے گفتگو

میں بنتِ یزدجرد یہ زہراؑ کی پیاری ہیں
میں دائی تھی تمہاری یہ مالک تمہاری ہیں
اکبر کو جب یہ روئیں تو پلہ چھڑائیو   ننھے سے ہاتھ باندھیو قسمیں دلائیو
ہٹ کر کے ہر گھڑی نہ پھوپھی کو ستائیو   سو جائیو زمیں پہ جو بستر نہ پائیو
جو چیز دیں سلام انہیں کر کے لیجیو
فرمائش اس غریب پھوپھی سے نہ کیجیو

سید عابد علی عابد نے مرزا دبیر کی واقعہ نگاری کو کمال بلاغت اور ایجاز قرار دیا ہے۔[1]

مناظر قدرت

علامہ شبلی نعمانی کا قول ہے کہ عربی اور فارسی شاعری میں مناظر قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے اور اردو میں تو گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا۔[2]

موصوف کا ارشاد گرامی ان کے غیر محتاط رویّے کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو کی نیچر شاعری" میں ابتدا سے دور اقبال تک کی نیچر شاعری کا جائزہ لیا ہے انھوں نے نیچر کے زندگی سے لگاؤ، اس کے صوفیانہ اور فلسفیانہ پہلوؤں، تمثیلی صرف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے فارسی میں نیچر شاعری، اردو شاعری کے مختلف ادوار اور اصناف میں نیچر شاعری کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ مراثی میں مناظر قدرت کا مختلف و متنوع زاویوں سے تجزیہ کیا ہے۔ اس کا داخلی زاویہ نگاہ واقعات پر عقیدت کا پرتو، پس پردہ مناظر کی کارفرمائی، کسی مخصوص علاقہ کی تصویر وغیرہ موضوعات کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر بلگرامی لکھتے ہیں :

"اگر ہم مرثیہ کی منظر نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اردو ادب میں پہلی بار فنی اہمیت سے اس کا تعارف کیا گیا۔ اب تک زیادہ تر تفریحی یا ضمنی انداز سے اسے پیش کیا گیا تھا۔ مرثیہ گویوں نے اس کی

---

۱ موازنہ انیس و دبیر شبلی، مقدمہ و حواشی عابد علی عابد، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء ص ۲۷۸

۲ موازنہ انیس و دبیر ص ۱۷۶

> قدر و قیمت صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ثانوی حیثیت سے بلند کر کے اس کو ذوق شاعری و انسان کا جزو ایمان کردیا۔ مرثیہ ایسی مقدس چیز کے پس منظر کے لیے اگر کوئی عنوان منتخب کیا تو صرف مناظر قدرت کو فطرت کی پاکیزگی روحانیت کا صحیح احساس کر کے مذہب کے تقدس سے اس کی سرحد ملا دیتی ہے۔'' [1]

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے قصائد اور مراثی میں منظر نگاری کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے :

> ''یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ مرثیہ گو شعراء نے قصیدہ گو شعراء کی بہ نسبت فطرت کا استعمال بطور پس منظر زیادہ کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔'' [2]

مراثی میں بہاریہ مضامین پیش کرنے کے متعلق ڈاکٹر جعفر رضا کے خیالات بھی اس دور کے رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''وہ ثقہ افراد اور علماء جو غزل گوئی سے دور رہتے تھے۔ مرثیہ میں گھوڑے اور تلوار کے بیان میں ان مضامین کو سننے کے لیے مشتاقانہ شرکت کرتے تھے۔ لکھنؤ میں باغوں کی کثرت نے مراثی میں بہاریہ مضامین کے لیے راستے ہموار کیے اور اس دور کے تمام مرثیہ گویوں کے یہاں بہاریہ مضامین کا اہتمام نظر آتا ہے'' [3]

صنف مرثیہ کے مفہوم کے لحاظ سے بظاہر مثنوی سے مناظر قدرت کے بیان کی گنجائش کم ہے مگر مرثیہ گویوں نے اپنی جولانی طبع سے اس کے ایسے ایسے مواقع پیدا کیے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ جس طرح اس صنف نے اردو میں اپنا ایک منفرد انداز اختیار کیا جو عربی اور فارسی تو کیا دنیا کی تمام زبانوں سے مختلف ہے اسی طرح اس میں مناظر قدرت کے بیان کا پہلو پیدا کر کے اردو مرثیہ کو مرثیہ گویوں نے ایک علاحدہ اقلیم

---

۱ اردو کی نیچر شاعری ص ۲۲۶۔۲۲۵

۲ اردو شاعری میں منظر نگاری ص ۲۳۸

۳ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ص ۵۳

سخن بنادیا۔ ہمارے یہاں مثنویوں میں اس سے پہلے بھی مناظر قدرت کے بیان کی خصوصیات موجود ہیں مگر مثنوی کہنے والے شاعروں نے مناظر قدرت کے ایک سطحی پہلو کو پیش کیا۔ وہ منظر کی روح میں اتر کر اس کی تفصیل کو بیان کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں۔ دور سے کسی منظر کو دیکھ کر پیش کرنا اور بات ہے۔ یہ ایک عام بیانیہ انداز ہے مگر اس میں کھوکر اپنے آپ کو اس کا ایک حصہ بنالینا مرثیہ گو شاعروں کا کام ہے۔ وہ مناظر قدرت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں اپنی طرف سے وہ چیزیں شامل کرتے ہیں جن کی ضرورت ان کو صنف کے مفہوم اور مقصد سخن کی وجہ سے ہے۔ کہیں شفق کی لالی میں خونِ شہیداں کا رنگ فرض کرلیا اور کہیں رات کی سیاہی پر زندانِ شام کی تاریکی کا سایہ دکھایا۔ سورج کی تمازت اور تپتی ہوئی ریت کا نقشہ کھینچنا آسان ہے مگر اس میں پیاسے انسانوں کی تڑپتی ہوئی روح کو سمودینا ایک مشکل کام ہے۔ ریگستان میں سے گزرتا ہوا ایک قافلہ سب کی نظر میں ہوسکتا ہے مگر عابد بیمار کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کی صدا سے اس منظر میں جو رنگ مرثیہ گویوں نے بھردیا ہے وہ رنگ اس نظارے کو ایک مستقل نقش کی صورت میں ابھارتا ہے۔

مناظر قدرت کے اس بیان نے مرثیوں میں ڈرامائیت پیدا کی ہے۔ اس سے سامعین پہلے سے ایک زبردست اور پر ہول واقعہ کے سننے کے لیے تیار بھی ہوجاتے ہیں اور واقعہ کے ابھرنے میں اس سے مدد بھی ملتی ہے۔ مناظر قدرت کے بیان نے مراثی میں وہی اثر پیدا کیا ہے جو اس وصف سے شیکسپیئر کے ڈراموں میں آگیا ہے۔

مرثیہ میں جہاں مناظرِ قدرت کا بیان ہوا ہے وہاں اس نے ایک خاص کام یہ بھی کیا ہے کہ اس نے آنے والے واقعات کے لیے ایک ایسے پس منظر کا کام کیا ہے جس سے مرثیہ کے تاثر میں شدت پیدا ہوتی ہے اور اس پر شاعروں کے تخیل نے ان مناظر میں جن چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ کردیا ہے اور جو صفتیں اپنی طرف سے شامل کرلی ہیں ان کی وجہ سے ایک عام انسان کا ذہن مناظر قدرت کی طرف اس طرح منتقل ہوجاتا ہے جیسے یہ مرثیہ کا ایک اہم جزو ہوں۔ مرثیہ گویوں میں میرانیس اور مرزا دبیر نے مختلف معیاروں کی منظر نگاری کی ہے جس سے اکثر اندیشہ ہوتا ہے کہ مراثی میں مناظر قدرت کے بیان کرنے میں میرانیس بہ نسبت مرزا دبیر کے زیادہ

کامیاب رہے ہیں۔ صاحب المیز ان لکھتے ہیں:

''مناظر قدرت کا سماں دکھانے میں جیسے میرانیس کے کلام میں صاف شستہ اور بے ساختہ اشعار پائے جاتے ہیں، مرزا دبیر کے ہاں نہیں ملتے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے میں میر انیس لاجواب شاعر ہیں''۔[1]

موصوف نے مرزا دبیر کے مراثی میں اس عنصر کے کم ہونے کی کوئی وجہ نہیں بیان کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا دبیر کچھ بھی بیان کر رہے ہوں، مرثیت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ کسی بھی منظر کے بیان کرنے میں وہ رنج و الم کی کیفیت کو ساتھ ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر جہاں مناظر قدرت میں کھوجانے کی ضرورت ہے وہاں وہ مصائب اہل بیت میں زیادہ گم ہوجاتے ہیں۔ وہ مناظر قدرت میں مصائب کونہیں دیکھتے بلکہ مصائب اہل بیت میں مناظر قدرت کو دیکھتے ہیں۔ پھر بھی اکثر مقامات ان کے اس طرح نظم ہوئے ہیں جہاں پر ان کے یہاں مظاہر قدرت کی تصویریں صاف، واضح اور گہری ہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کا خیال ہے:

''مرزا دبیر نے منظر کشی بطور پس منظر کی ہے اور چاند غروب ہونے کا ذکر اس واسطے کیا ہے کہ اب امامت کا چاند بھی غروب ہونے والا ہے اس طرح انسان کو فطرت کے قریب لانے کی بھی کوشش کی ہے۔''[2]

شاہد احمد دہلوی ان ہی موقعوں کے پیش نظر کہتے ہیں:

''منظر نگاری میں بھی دبیر کسی طرح انیس سے کم حسن کار نہیں ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر انھوں نے نادر تشبیہات سے کام لیا ہے۔''[3]

کلام مرزا دبیر سے مناظر قدرت کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱ بہار کا منظر

کوفہ میں بہار آئی ہے گلگشت چمن کو　　　شرمانے لگا رنگ زمیں چرخ کہن کو

۱　المیز ان ص۳۳۲

۲　اردو شاعری میں منظر نگاری　ص ۲۲۷

۳　ماہِ نو کراچی نومبر ۱۹۵۰ء ص ۲۰

رگ رگ سے ملی نبض رواں گل کے بدن کو　　لالے نے کیا کھل کے سبک لعل یمن کو
ہر سرو بنا شکلِ زباں شوقِ سخن میں
فوارے در افشاں ہوئے تعریفِ چمن میں
وہ موسم گل رنگ پہ کوفہ کے چمن میں　　شبنم تھی کہ تھے موتیوں کے ڈھیر عدن میں
دنداں نظر آنے لگے غنچے کے دہن میں　　بلبل کی طرح جان پڑی گل کے بدن میں
پر بلبلِ بستانِ نجف مرثیہ خواں تھا
زہرا کا چمن فصل بہاری میں خزاں تھا
سلطانِ بہاری نے تجمل جو دکھایا　　ابر آگئے نقارہ سلامی کا بجایا
ہر برگ سے گل دستِ ادب باندھ کے آیا　　رومال شگوفہ نے غلامانہ ہلایا
مہتاب نے بوسہ جو دیا گل کی جبیں پر
تسبیح گری زاہدِ شبنم کی زمیں پر

---

۲ صبح کا منظر

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب　　خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب　　تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیور جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھدی اتار کے
شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب　　پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجر بیضائے آفتاب　　باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاجِ ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی　　پنہاں درازی پر طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِٰ زہرہ لقب ہوئی　　مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکر رفو تھی چرخ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے
سایہ جہاں جہاں تھا وہاں نور ہوگیا پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہوگیا
گویا کہ رنگ آئینے سے دور ہوگیا باطل رسالۂ شب دیجور ہوگیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا' ذروں کے نامے میں

خورشیدِ آسماں نے جو الٹا نقاب کو بے نور کر دیا ورقِ آفتاب کو
معدوم کرکے چشمِ خلائق سے خواب کو دکھلادیا سحر نے رخِ بے حجاب کو
پرتو پڑا جو روشنیِ آفتاب کا
دریا میں قمقمہ ہوا روشن حباب کا

خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم سالار قمر لے کے چلا لشکر انجم
ذروں کو تجلی نے کیا ہمسر انجم زائل صدف شب سے ہوئے گوہر انجم
انگشتریِ صبح کا خورشید نگیں تھا
کیا خوب نگیں تھا کہ جہاں زیرِ نگیں تھا

---

۳ رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جس دم شب عاشور کچھ صبح قیامت سے نہ تھی کم شب عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شب عاشور زینب کو ہوئی جامۂ ماتم شب عاشور
ظلمت کی ردا اس لیے ہر سمت پڑی تھی
سرکھولے ہوئے فاطمہ مقتل میں کھڑی تھی

جس وقت پڑا سکۂ شب سیمِ قمر پر پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر

مریخ کا خنجر جو چلا ترک سحر پر　　بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر
کیواں علم ایواں فلک اور چاند نگیں تھا
آفاق سلیماں کی طرح زیرِ نگیں تھا

شب تھی کہ سیہ بختی کفار ہر اک سو　　چشم سیہ قہر تھی، یا ظلم کا گیسو
کجر و صفت نقش نگیں تھے جو وہ بدخو　　آخر کو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو
روشن ہے سیہ کار وہ سب فوج جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

---

۴ گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب　　گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
ہے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کتاب　　خط غبار سے ہے یہی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی　　رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی　　حدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

لکھا ہے عجب فصل میں یثرب سے چلے شاہ　　یہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمتہ للّٰہ
ان روزوں میں چلتا تھا مسافر نہ کوئی راہ　　پرواز سے تھا مرغ تصور کو بھی اکراہ
لوں چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرّے
اسپند کی مانند نظر آتے تھے ذرّے

تپتی تھی زمیں آہن حداد کی تمثال   شہبازِ نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال
خرمن میں ہر اک دانہ سیہ تھا صفتِ خال   بے رنگِ شفق منہ فلکِ سبز کا تھا لال
اس فصل کی حدّت اگر آجائے بیاں میں
اغلب ہے کہ چھالے پڑیں خامے کی زباں میں

مولانا شبلی یہ بھی کہتے ہیں منظر میں کسی خاص واقعہ یا کسی حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں ''سین'' (scene) کہتے ہیں واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے، عام واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے بخلاف اس کے سین اس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر شبلی نے یہ شعر پیش کیا ہے:

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے، ہے ظہر کا ہنگام
تنہا پہ چلی آتی ہے اُمڈی سپہ شام

اور پھر لکھا ہے کہ لوں کا چلنا، خاک کا اڑ نا، ظہر کا وقت ہونا، فوجوں کا امنڈنا، ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہے اور ان سب کو مجموعی حیثیت میں دیکھا جائے تو سین ہے[1]۔

اگر شبلی کی اس تعریف کو سامنے رکھا جائے تو مرزا دبیر کے یہاں بیسیوں مثالیں ایسی منظر نگاری کی بھی ملیں گی۔ بعض کو راقم الحروف واقعہ نگاری کے ضمن میں رقم کر چکا ہے کہ واقعہ میں کس طرح مرزا دبیر نے جان ڈال دی ہے یہاں چند مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں:

حضرت عباسؑ کی حالتِ نزع:

یہ کہہ کے تبسم کیا پھر لب نہ ہلایا،   سینہ میں رکی سانس، جبیں پر عرق آیا
آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی نے چھپایا   منکا جو ڈھلا سر قدمِ شہ پہ جھکایا
غش ہوگئے شبیر قضا کر گئے عباسؑ
تھرا کے بدن رہ گیا اور مر گئے عباسؑ

---

1 موازنہ انیس و دبیر ص ۱۸۳

گرمی کی شدّت میں لوگوں کی حالت کو اس طرح پیش کیا ہے:

دو دو قدم پہ ہوتے ہیں اطفال بے حواس　　اک پانی پانی کہتا ہے اور ایک پیاس پیاس
یوں قافلہ ہے گردِ علمدارِ حق شناس　　جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس
عباسؑ شان ساقیِ کوثر دکھاتے ہیں
اک دم میں ساری فوج کو پانی پلاتے ہیں

علی اصغر کی حالتِ نزع کا منظر اس طرح بیان کیا ہے:

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے　　بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے　　پھرتی ہے آس پاس پہ جینے کی آس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

فریاد یا علی میں کدھر جاؤں یا علی　　ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علی
کس طرح ان کے سانس کو ٹھہراؤں یا علی　　پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علی
پچھلے کو آنکھ کھولی تھی اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں، بولتے نہیں

گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت اس طرح پیش کی ہے کہ پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔ کہتے ہیں:

کعبہ سے جب عراق کو فوجِ خدا چلی　　آلِ رسولؐ پاک سوئے کربلا چلی
شبیر کی رکاب میں خیر النسا چلی　　مقتل سے پیشوائی کی خاطر قضا چلی
خورشید کی تپش سے مسافر ملول تھے
جنگل کی لو تھی اور پیمبرؐ کے پھول تھے

پیاس کی شدّت سے خیمہ میں بچوں کی حالت:

اور خیمہ میں تھا غلغلۂ تشنہ دہانی　　سب واعطشا کہتے تھے با اشک فشانی
پانی نہ ملنے سے جگر ہوتا تھا پانی　　بے جان ہوئے جاتے تھے شبیر کے جانی

سیدانیوں کے نازوں کے پالے ہوئے بچے
تھے غش میں زباں منہ سے نکالے ہوئے بچے

اک سمت کو بے ہوش تھا عباس کا دلبر   اک جا تھی تڑپتی شہِ مظلوم کی دختر
تھا غش میں کہیں باقرِ معصوم زمیں پر   دم توڑتا تھا ایک طرف جھولے میں اصغر
پیاسوں کی فغاں سن کے جو پاس آتے تھے شبیر
دیکھا جو نہ جاتا تھا تو پھر جاتے تھے شبیر

نہر سے مشکیزہ کو بھرنے کے بعد حضرت عباسؑ جب واپس آنے لگتے ہیں تو دشمن اس وجہ سے ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں کہ پانی خیام حسینی تک نہ پہنچنے پائے۔ حضرت عباسؑ کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ مشک کو بچائیں یا خود کو سنبھالیں۔ اضطراب کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

مشکیزہ بھرا نہر سے سقائے حرم نے   کاندھے پہ رکھا بازوئے سلطان امم نے
خود پانی نہ ہرگز پیا اس بحر کرم نے   گھاٹوں پہ پرے باندھ لیے فوجِ ستم نے
غل تھا کہ مزہ مشک کے بھرنے کا دکھا دو
دریا ہی میں سر کاٹ لو اور لاش بہادو

جنگ کربلا میں پردہ کی بھی اہمیت ہے۔ حرمِ شاہِ شہیداں کے بے پردہ ہونے کی روایت کو بھی مختلف جگہوں پر مختلف طریقوں سے شعراء نے پیش کیا ہے۔ مرزا دبیر نے بھی اس کو کئی مراثی میں نظم کیا ہے۔ ایک موقعہ پر پردہ کے اہتمام کے منظر کو یوں ابھارا ہے:

آواز دور باش کا ناگاہ غل اٹھا   اور خیموں میں اترنے لگی آلِ مصطفےٰ
ڈیوڑھی سے پرے کجا وہ زینبؑ جہاں ملا   خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا
روکی قنات اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر
عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

درباں عصا اٹھا کے بڑھے جانبِ یسار   دہنی طرف نقیب گئے باندھ کے قطار

آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار آئے ادھر سے اب، نہ کوئی جائے ہوشیار
آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اترتی ہیں

عاشورہ کی شب کو مدینہ میں حضرت صغرا کا دل اچانک گھبرانے لگا اور وہ بے قرار ہوگئیں چونکہ اہل بیت کو درد انگیز مصائب کا سامنا تھا اور امام حسینؑ کی شب شہادت تھی۔ کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اس لیے حضرت صغرا کے دل پر اس کا اثر غیر محسوس طور پر اس قدر ہوا کہ وہ مضطرب ہوگئیں اس اضطراب اور انتشار کا منظر مرزا دبیر نے یوں بیان کیا ہے:

ناگاہ مدینہ میں قیامت کی شب آئی گزرا جو نواں روز شہادت کی شب آئی
صغرا کے لیے سخت ہلاکت کی شب آئی نانی کو پکاری یہ کس آفت کی شب آئی
بے نور ستارے بھی ہیں اور چرخ بریں بھی
اے لو در و دیوار بھی ہلتے ہیں زمیں بھی

کردار نگاری اور مکالمے

مرثیہ گو کا مقصد ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس سے اس کے سامعین متاثر ہوں، وہ واقعۂ کربلا کو ذاتی مشاہدہ کی طرح محسوس کریں، شہداء میں دلچسپی لیں، ان کی شخصیت اور ان کے مخالفین کی شخصیت میں موازنہ کرسکیں۔ اشخاص مرثیہ سے انہیں ہمدردی ہو۔ ان کے غم کو وہ اپنا غم سمجھیں اور اس طرح وہ ان کے لیے آنسو بہائیں۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر مرثیہ گویوں نے مرثیہ میں ڈرامائیت کا وہ عنصر پیدا کیا جس سے ان کے سامعین خود کو واقعہ کے قریب محسوس کرنے لگے۔ ذہنی اور جذباتی طور پر اشخاص مرثیہ سے رشتہ پیدا کیا۔ اس قسم کے تاثرات پیدا کرنے کے لیے مرثیہ میں کرداروں کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک خاص اثر پیدا کرنے کے لیے کردار بڑی قوت رکھتا ہے۔ مرثیہ گویوں نے بھی کردار نگاری کی لیکن یہ کردار نگاری افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، داستان گو یا ناول نویس کی سی کردار نگاری نہیں۔ اگرچہ تاریخی ڈرامہ یا ناول لکھنے کے لیے بھی اس میں

پابندیاں ہوتی ہیں کہ وہ ایک مقررہ حد سے باہر یا ایک مقررہ زمانے سے باہر نہیں جاسکتا مگر مرثیہ میں تو اس سے بھی زیادہ پیچیدگیاں ہیں کہ مرثیہ کے کردار مذہبی بھی ہیں۔ اول تو ان کی تاریخی حیثیت بھی مرثیہ گو پر کافی پابندیاں عائد کرتی ہے دوم ان میں مذہب کی گرفت اور اضافہ کرتی ہے یعنی مرثیہ گو کے لیے کردار نگاری جتنی اہم ہے اس سے کہیں زیادہ اہم ان پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔ تاریخ میں مرثیے کے اشخاص کے متعلق بہت کچھ درج ہے، ان کے کردار کی بھی بہت سی خصوصیات متعین ہیں۔ ان کی شہادت کا مقصد واضح ہے ان کے سفر کے حالات بھی واضح ہیں۔ جنگ کا نقشہ اور انجام بھی متعین ہے۔ ان کی مذہبی اہمیت بھی سامنے ہے۔ دوسری اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ یہ کردار تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتے ہیں۔ رخصت حاصل کرتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں شہید ہوتے ہیں۔ رجز میں زیادہ سے زیادہ اس بات کی گنجائش ہے کہ شاعر اپنے زورِ قلم اور قوتِ فکر کا مظاہرہ کرے ورنہ تمام کردار سیدھے سادے ہیں۔ شاعر اپنی زبان ان کو آسانی سے سونپ نہیں سکتا۔ اپنا اضطراب ان کے قلب میں نہیں دکھا سکتا۔ اپنی صلاحیتیں جو اسے ہر طرح سے پست معلوم ہوتی ہیں ان کو نہیں سونپ سکتا۔ ہر قدم پر ایک پابندی ہے۔ عابد علی عابد نے بھی اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> ''جس طرح مثنوی میں مختلف کردار ہوتے ہیں، مرثیے میں بھی مختلف کردار ہیں۔ اکثر ٹائپ ہیں یعنی رفتار زمان کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایک شاندار المیہ کے افراد ہیں خیر کے نمائندے ہیں اور شر سے برسرِپیکار ہیں۔ یہ اوصاف ان میں مشترک ہیں۔''[1]

ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم لکھتے ہیں:

> ''اگر شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار اپنی تخلیق میں ایسے کرداروں کو جگہ دیتا ہے جن کی تاریخی حیثیت ہے تو اس کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں لیکن اگر وہ کردار تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتے ہوں تو اس کی دشواریاں اور بھی زیادہ ہوجاتی ہیں۔ مرثیہ کے کرداروں کے ساتھ یہی دشواری ہے۔ واقعات کربلا مقاتل اور دوسری تاریخی کتابوں سے ماخوذ ہیں

ا اصول انتقاد ادبیات ص ۶۵۱

جن میں تقریباً تمام اہم واقعات درج ہیں۔ واقعات کے ساتھ ساتھ ان میں جو اشخاص کے بعض خصوصیات، گفتگوئیں، مکالمے وغیرہ بھی ملتے ہیں جن سے ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ان اندراجات کے ساتھ ساتھ ان اشخاص کے بارے میں روایات، معتقدات اور خیالات کا بھی ایک سلسلہ ملا ہوا ہے جنہوں نے ان شخصیتوں کا ایک عام تصور قائم کردیا ہے جس سے مرثیہ نگار نہ انحراف کرسکتا ہے نہ اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم کرسکتا ہے''۔[1]

ان پابندیوں کے پیشِ نظر مرثیہ گو شاعر جہاں کردار نگاری میں اپنی جولانی طبیعت دکھا سکتا ہے وہ ہے ان اشخاص مراثی کی گفتگو اور جذباتی ردعمل۔ اس میں بھی وہ پابند ضرور ہے مگر اس پابندی میں وسعت پیدا کرنا فنکاری ہے۔ جہاں تک خیر اور شر کا تعلق ہے مرثیہ کے سب ہی کرداروں کا ردعمل ایک ہے۔ زندگی اور موت کا تصور بھی سب ہی کے ہاں ایک ہے۔ اب یہ ردعمل کہاں پر آتا ہے جہاں دوسرے عزیز و اقارب شہید ہورہے ہوں۔ بچے پیاس سے بلک رہے ہوں، خیموں میں آگ لگائی جارہی ہو، بی بیاں بے پردہ کی جارہی ہوں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی مقامات پر مرثیہ گویوں نے اپنے کرداروں میں اظہارِ قلق کا طریقہ۔ جلال اور شوکت اور مکالمے سے کردار نگاری کے فن کا کام لیا ہے اور اپنے کرداروں کو ایک دوسرے سے ممیّز کیا ہے۔ مرثیہ گویوں کی یہ فنکاری ایسے موقعوں پر نمایاں ہوئی جب ان کی فیصلہ کرنے کی قوت کا اظہار ہوا ہے۔

یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان پابندیوں نے جہاں مرثیہ کے کرداروں کو فلیٹ بنادیا ہے وہاں ان کی کچھ ذاتی خصوصیات نے ان کرداروں کی زندگی اور ان کی حرکت کی ضمانت کا کام بھی کیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت فیصلہ کرنے کی وہ قوت ہے جو اشخاص مرثیہ سے علاحدہ نہیں ہوسکتی اور مرثیہ گویوں نے اس فیصلہ کے ساتھ ساتھ جو جذباتی اور نفسیاتی کشمکش ہر کردار کے ساتھ پیش کی ہے، جس خارجی دباؤ اور داخلی کش مکش کو اپنے اشخاص مرثیہ کے ساتھ منسوب کیا ہے، اس نے ان کرداروں کو زندگی بخشی ہے۔ اس وجہ سے نہ تو ان کرداروں کو کمزور کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی مرثیہ گویوں کی

---

۱ اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۳۲۲

کردار نگاری کو کمزور قرار دیا جاسکتا ہے لیجس اگری (Lajos Egri) لکھتے ہیں:

"The truly weak character is the person who will not fight because the pressure is not strong enough............ contradiction is the essence of conflict and when a character can overcome his internal contradictions to win his goal, he is strong."(1)

اس خیال کو وہ اس طرح سے زیادہ جامع انداز میں پیش کرتے ہیں:

"A weak character is one who, for any reason cannot make a decision to act."(2)

کردار کی مضبوطی اور ہمہ گیری اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ خارجی دباؤ کو کس طرح سہتا ہے۔ اس کا ردعمل خارجی حالات کے مقابلے میں کیا ہوتا ہے۔ اس کی اندرونی کیفیت کیا ہوتی ہے اور وہ کس طرح سے فیصلہ کرتا ہے۔ وہ کس جذبہ پر قابو حاصل کرلیتا ہے اور کس کو مقدم خیال کرتا ہے۔ والٹر کر (Walter Kerr) نے اس بات کو یوں پیش کیا ہے:

"Character is best revealed by the response it makes to circumstances. Between the pressure of circumstances and the response of character a tension exists.This tension– this opposition of forces so powerful that one or another must give way–is a distinguishing mark of what we have come to call a story,"(3)

والٹر کر کا یہ بیان کہانی سے متعلق ہے جو کہ کردار نگاری کے بنیادی مسائل و

1&2. The Art of Dramatic Writing p. 82

Simon and Schuster, New York 1946, published originally by them in 1942, under the title of 'How to write a play'.

3. How not to write a play by Walter Kerr. Max Reinhardt, London 1956 p. 128-129

مباحث کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کردار کی تشکیل میں حالات کی زبردست کارفرمائی ہوتی ہے۔ مراثی میں کرداروں کی تشکیل کہانی کی طرح نہیں کی جاسکتی لیکن جزوی اعتبار سے واقعات اور حالات کی روشنی میں کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ نگار کا تخلیقی جو ہر یہ ہے کہ وہ تاریخی کرداروں کو تاریخی واقعات کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے ایسا اجتہاد کرتا ہے جو اسے فنی اور تخلیقی آزادی بھی عطا کرتا ہے لیکن عام لوگوں کے معتقدات پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

مرثیہ کے کرداروں میں فنی اعتبار سے کشمکش پیدا کرنے کی گنجائش جہاں بھی نکل سکتی تھی، مرثیہ گویوں نے پیدا کی ہے اور مرثیہ کے کرداروں کی یہی دو بڑی خصوصیتیں ہیں یعنی تناؤ اور قوت فیصلہ۔

مرزا دبیر کے کلام میں ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں ان پابندیوں کے باوجود کہ ان کے سننے والے اہل علم، شرفاء وخواص ہوتے تھے۔ شہزادیاں اور شہزادے ان کے کلام کو سنتے تھے۔ مخالفین اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کہیں کوئی چوک تو نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس فن کے تقاضوں کو نبھایا اور اپنے کرداروں کو اپنے سننے والوں کے ذہن میں نقش کیا۔ یہ کہنا بھی یہاں ضروری ہے کہ انھوں نے ایسے موقعوں پر مقامی رنگ اور مقامی رسموں سے کام لے کر کردار نگاری کے بڑے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ لیکن کہیں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا کہ ہر کردار کی جو اپنی تاریخی اور مذہبی حیثیت ہے اس میں کہیں فرق آیا ہے۔ ایسے وقت پر وہ کمال بلاغت کا ثبوت دیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ بلاغت ہی ایسے مشکل مقامات پر انسان کی رہنمائی اور مدد کرتی ہے۔ کردار نگاری میں اپنی جگہ سراپا، انداز گفتگو، انداز جنگ، خارجی اور داخلی کوائف میں کشمکش، صبر و ضبط وغیرہ سب ہی کچھ آتا ہے اس لیے کہ ان ہی کے مجموعی تاثر کا نام کردار ہے لیکن مرثیہ میں یہ فن سب سے زیادہ مکالمے میں ابھرتا ہے۔

مکالمہ کردار کی ایک اہم خصوصیت ہے بغیر اس کے کردار کا ذہنی پس منظر اس کی عادتیں اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آہی نہیں سکتے۔ اب اس میں فنکاری یہ ہے کہ قاری یا سامع ایسا محسوس نہ کرے کہ کردار کے منہ میں کوئی اور جملے ٹھونس رہا ہے بلکہ اس انداز میں مکالمہ سامنے آنا چاہیے کہ کردار اپنے اختیاری عمل اور آزادانہ

سوچ کے تحت یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ مکالمہ کے متعلق مس جین میکائل (Miss Jeane Micheal) کے حوالے سے لیجس ایگری (Lajos Egri) تحریر کرتے ہیں:

"The dialogue must stem from the character not the author.It must indicate character's background and occupation."[1]

مرزا دبیر کے یہاں مکالمہ تقریباً اسی انداز میں سامنے آتا ہے۔ کردار کا ذہنی پس منظر، اس کی خاندانی روایات اور اس کی فیصلہ کرنے کی قوت، داخلی کیفیت اور خارجی حالت، معیار اخلاق وغیرہ سب ہی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مرثیہ کے کردار، عمر اور درجہ میں ایک دوسرے سے مختلف تو ہیں البتہ منزل سب کی ایک ہے ارادہ سب کا ایک ہے اس لیے ان میں فرق دکھانا ایک بہت ہی مشکل کام ہے مگر مرزا دبیر نے مکالمہ کے ذریعہ ان کی شخصیتوں کے ان پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں جن سے یہ کردار ایک دوسرے سے متمیز ہوتے ہیں۔

رونے لگے سن کر یہ سخن سید والا   اور شمر ستمگر سے ہوئے شاہ یہ گویا
پیاسا تو ہے شبیر مگر یہ تو نہ ہوگا   بیعت کروں جس وقت تو پانی ہومہیا
مارے گئے دلبر مرے اب میں نہ جیوں گا
جز آب دمِ تیغ میں پانی نہ پیوں گا

حضرت امام حسینؑ کے کردار کی پہچان کلامِ مرزا دبیر میں یوں ہوتی ہے:

اظہار شجاعت:

جرأت سے یہ فرماتا تھا وہ سیدِ والا   امت یہ پیمبرؐ کی ہے ان سے میں لڑوں کیا
ان سے عوضِ خون عزیزاں نہیں ملتا   گوحق نے مجھے زور ہے سب طرح کا بخشا
گر کھینچوں ابھی غصہ میں شمشیرِ علی کو
جیتا ہوا چھوڑوں نہ لعینوں میں کسی کو

حضرت امامؑ پر تشنگی کا غلبہ تھا' زبان خشک تھی اس لیے لکنت سی ہوتی تھی۔ بھوک

---

1. The Art of Dramatic Writing by Lajos Egri, Page 264

سے لاغر ہوگئے تھے اس لیے رعشہ تھا۔ دوست یا ور سب شہید ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے شدّتِ غم سے کانپ رہے تھے۔ اس پر شمر نے طعنہ دیا کہ اس کے خوف سے یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو امام کہتے ہیں:

شہ نے کہا ایسا ہی ترا خوف ہے اکفر — تھراتا ہے جس سے اسد اللہ کا دلبر
خاموش ہو، ہے دھیان کدھر تیرا ستمگر — تو پیاس کو کیا سمجھے ترا حلق تو ہے تر
ہے سایہ میں اور چترِ زری سر پہ لگا ہے
یاں دھوپ میں پیاسا شہِ مظلوم کھڑا ہے

بھائی کی محبت

جب حضرت عباسؑ میدان میں پیغام لے کر جاتے ہیں کہ یہ ظلم و ستم روا رکھنا اچھا نہیں اور ان کی تقریر سن کر غضب ناک ہو کے واپس آ جاتے ہیں تو حضرت امام حسینؑ کہتے ہیں:

ہر چند کہ اکبر سے میں بہلاتا تھا جی کو — سینہ سے لگاتا تھا میں ہمشکل نبیؐ کو
پر چین نہ آتا تھا دلِ ابنِ علیؑ کو — آنکھیں تھیں مری ڈھونڈھتی ہر بار تجھی کو
بازو میں نہ تھا زور نہ طاقت تھی کمر میں
کانٹا سا کھٹکتا تھا جدائی سے جگر میں

عام انسانی جذبات

مظلوم نے رو رو کے کئی بار سنایا — شبیرؑ کی امداد کو پر کوئی نہ آیا
بے آس ہوئے شاہ سر پاک جھکایا — پر دل سے لگا کہنے یہ زہرا کا وہ جایا
کون آئے مدد کو یہاں بے یار ہے شبیرؑ
اور زعم میں اعدا کے گنہگار ہے شبیرؑ

جیتا کہیں ہوتا مرا اس وقت جو اکبر — کہتا ہے ہوا لبیک ابھی آتا مقرر
یا ہوتا اگر قتل نہ عباسؑ دلاور — وہ کھینچتا تیروں کو مرے جسم سے آ کر

مرنے سے میں ان دونوں کے آفت میں پڑا ہوں
مردہ ہوں مگر زندہ میں ظاہر میں کھڑا ہوں

مکالمہ شمر کے ساتھ

بس اب بھی کہا مان لو شبیر ہمارا　　اور کھاؤ سکینہ پہ ترس اپنی خدا را
پانی پیو در یا یہاں موجود ہے سارا　　بیعت کرو حاکم کی مگر دل میں گوارا
رو رو کے نہ اس غم سے دم سرد بھرو تم
لاشوں کو شہیدوں کی بھی مدفون کرو تم

حضرت امام حسینؑ پانی نہیں پیتے کیونکہ ان کے رفقا پیاسے شہید ہوگئے تھے۔
اس موقع پر فرماتے ہیں:

منظور تو خود مجھ کو نہ وہ پانی تھا پینا　　تھا ممتحن اس وقت مگر تشنہ لبی کا
ششماہہ پسر قتل مرا ہوگیا پیاسا　　اب پیاس سے معصوم سکینہ پہ ہے ایذا
لشکر تو مرا قتل ہو اور حیف جیوں میں
اکبر مرا پیاسا مرے اور پانی پیوں میں

حضرت عباسؑ کا کردار مندرجہ ذیل بندوں میں ملاحظہ فرمائیں:

گھوڑے سے محبت

خیمے سے برآمد ہوئے عباسِؑ علمدار　　زینبؑ نے کہا ہوگئے بیکس شہ ابرار
دو ایک قدم چل کے رکا راہ میں رہوار　　تب حضرت عباس نے کی اس سے یہ گفتار
دو روز کے فاقہ سے ترا حال برا ہے
اب ہوکے پیادہ ہی لڑوں میں تو بجا ہے

عباس کو تکلیف نہیں تیری گوارا　　گھوڑے تجھے ہے پیاس نے دو روز کی مارا
ناچار ہیں کچھ بس نہیں چلتا ہے ہمارا　　یہ کہہ کے اتر آیا یداللہ کا پیارا
کیا دیکھتا ہے اس گھڑی وہ دیدہ غم سے
قاسم کی دلہن لپٹی ہے گھوڑوں کے قدم سے

میدان میں جانا

بولا پسر سعد کہ اے ابن ید اللہ   تم آؤ تو آنکھوں پہ رکھیں گے تمہیں واللہ
پانی بھی پلائیں تمہیں بخشیں حشم و جاہ   کیا فائدہ گر مر گئے شبیر کے ہمراہ
خود کہتے ہو بیکس پسرِ شیر خدا ہے
پھر کس لیے محتاج کا یوں ساتھ دیا ہے

حضرت عباسؑ کا جواب

عباسؑ نے فرمایا نہ بک اوستم آرا   کونین کا سلطان ہے زہرا کا وہ پیارا
بیکس نہ سمجھ اس کو وہ آقا ہے ہمارا   آقا سے بھی خادم کہیں کرتے ہیں کنارا
تقریر زباں پر نہ یہ لا بے ادبی کی
دیکھی نہیں کیا تو نے زباں تیغِ علیؑ کی

حضرت سکینہ کا کردار

ان کی بچپنے کی باتیں کم سنی کے جذبات وغیرہ اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ کردار لازوال ہوگیا ہے

جب بنّے قاسم کی لاش آتی ہے اور سکینہ سے کوئی کہتا ہے کہ دولہا میدان سے واپس آرہے ہیں تو ان کی کمسنی سے جو توقع کی جاسکتی ہے مرزا دبیر نے اس کو یوں نظم کیا ہے:

خیمہ میں بالی سکینہ سے کسی نے یہ کہا   لے مبارک ہو کہ میداں سے پھر آیا دولہا
دوڑی خیمہ سے یہ سنتے ہی سکینہ دکھیا   اور جلدی سے درِ خیمہ کو بند اس نے کیا
کہتی تھی نیگ میں جب تک کہ نہیں لے لوں گی
بھائی نو شاہ کو خیمے میں نہ آنے دوں گی

عمر سعد کا کردار

بولا[1] پسرِ سعد کیا تو نے بڑا کام   صد شکر مٹا پنجتنِ پاک کا اب نام

---

۱ حضرت امام حسینؑ کو شہید کرنے پر عمر سعد شمر سے یہ گفتگو کرتا ہے۔

اس ظلم سے لیکن نہیں دل کو مرے آرام　　اے شمر یہ دے فوج کو اس دم مرا پیغام
سینے پہ محمدؐ کے وہ سو سو کے پلا ہے
پامال ہو شبیرؑ کا لاشہ تو بجا ہے
یہ سن کے منادی نے ندا کی یہ بتکرار　　ہاں غازیو مقتل میں بڑھو چھیڑ کے رہوار
پامال کرو لاشِ شہ بیکس و بے یار　　تا قبر میں فریاد کریں احمدِ مختار
قاسم کے بھی لاشہ پہ نہ وہ ظلم ہوا ہو
پامال اب اس طرح سے لاشِ شہدا ہو

کلام دبیر میں نہ صرف ان کے ممدوحین کے کردار ابھرتے ہیں بلکہ مخالفین کے کرداروں کی بھی وہ جھلک دکھاتے جاتے ہیں اور مخالفین کے کردار تو اس طرح پیش کرتے گئے ہیں کہ چند مصرعے سننے کے بعد ہی قاری کے ذہن میں مخالفین کی کمینہ سیرت ابھرتی ہے اور وہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ ذیل میں ایسے کچھ اور بند پیش ہیں:

قاتلِ علی اصغر، حرملہ کے کردار کی ایک جھلک

یہ کہہ کے برآمد ہوئے خیمے سے جو سرور　　بس حرملہ کہنے لگا یہ شہ کو سنا کر
مجسا[1] کوئی بیرحم نہیں فوج کے اندر　　یہ میرا ہی دل تھا کہ بنا قاتلِ اصغر
گو فوج نے [سب] پیاسوں کو تدبیر سے مارا
بچّہ کوئی اصغر سا نہیں تیر سے مارا

قاتلِ علی اکبر کے کردار کی ایک جھلک

نیزہ کو ہلا کہنے لگا قاتلِ اکبر　　میں قاتلِ اکبر ہوں جو تھا شکلِ پیمبرؐ
غربت میں وہ شبیر تھا اور خلق میں شپر　　اور فاطمہ کا صبر تھا اکبر میں سراسر
زہرا کو علی کو شہِ لولاک کو مارا
مارا جو اسے پنجتنِ پاک کو مارا

شمر کے کردار کو یوں بھی پیش کیا ہے

کی لاف زنی شمر نے، اے سیّد والا　　میں وہ ہوں کہ دنیا کو کرونگا تہ و بالا

1　مجھ سا

گو آپ کو نازوں سے پیمبرؐ نے ہے پالا　　پر وہ مرے خنجر کو نہیں روکنے والا
میں وہ ہوں کہ زہرا کو ستاتے نہ ڈرونگا
میں تجسے[1] نبی زادے کو اب ذبح کرونگا

میں وہ ہوں کہ ہے قاتلِ شبیر مرا نام　　وہ ظلم کروں جس سے کہ ہو سستے[2] اسلام
وہ کام کروں آل نبی جس سے ہوں ناکام　　اب آج سے تا حشر نہ زہرا کو ہو آرام
جب اہل جہاں صبر ترا یاد کریں گے
سن سن کے مرے ظلم کو فریاد کریں گے

شمر کی نفسیاتی کشمکش، قوت فیصلہ اور بزدلی کو مندرجہ ذیل بندوں میں ملاحظ فرمائیں۔ شمر جب حضرت امام حسینؑ کو شہید کرنے کے لیے بڑھتا ہے تو کیا محسوس کرتا ہے اور عمر ابن سعد سے کس طرح گفتگو کرتا ہے اور وہ کس طرح اسے اس فعل پر آمادہ کرتا ہے جو دنیا کا عظیم المیہ بن کے رہ گیا۔

بولا کہ تھی زخموں سے عجب جسم کی توقیر　　گویا کہ شہادت کے سب احوال تھے تحریر
تھا جدول شنجرف ہر اک خطِ شمشیر　　سیپارہ تھا ہر عضوِ تنِ حضرتِ شبیرؑ
ہر زخم تھا یوں مصحفِ ناطق کے بدن پر
گویا کہ نشاں وقف کا تھا صفحۂ تن پر

پھر مستعد اس وقت ہوا میں پےٴ بیداد　　کیا دیکھتا ہوں شیرِ خدا کرتے ہیں فریاد
غصہ سے رگِ ہاشمی آنکھوں میں ہے استاد　　سر پیٹ کے فرمایا کہ او ظالمِ جلاد
تو کاٹے گا شبیر کا سر تیغ جفا سے
ڈرتا نہیں ظالم، غضب شیر خدا سے

یہ سنکے چھٹی تیغ گرا ہو کے میں بیہوش　　اب تک وہ جلال اونکا نہیں مجکو فراموش

۱　تجھ سے
۲　سستی اسلام

بولا پسر سعد کہ خاموش ہو خاموش یہ سحر ہے شپیر کا ناحق تو ہے مدہوش
جرات کے یہ معنی ہیں کہ پھر طیش میں آ کر
شپیر کو کر ذبح تو ان سب کو دکھا کر

تب شمر لگا کہنے کہ اے صاحب لشکر ہاں اب بھی ترے حکم سے میں تو نہیں باہر
منگوا تو مرے واسطے اب خلعتِ پرزر لاتا ہوں میں جا کر پسرِ فاطمہ کا سر
جس طرح بنے گا میں اسے قتل کرونگا
اب تو میں کسی سے نڈر ونگا نہ ڈرونگا

رزمیہ عناصر

مرثیہ کا موضوع ہی ایسا ہے جس میں جنگ کے واقعات بیان کرنے کی کافی گنجائش ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موضوع اصل میں جنگ ہی ہے جس کے گرد دوسری چیزوں کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ گویوں نے اردو میں رزمیہ شاعری کا بڑا اچھا اضافہ کیا ہے مرزا دبیر اور میر انیس کے ہی کلام سے اردو شاعری کی دو رزمیہ کتابیں اردو شاعری کو مل گئیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی (مرحوم) نے انیس کے کلام سے بعض رزمیہ حصوں کا انتخاب کرکے ''رزم نامہ انیس[1]'' مرتب کیا اور سید سرفراز حسین خبیر (مرحوم) نے کلام مرزا دبیر سے ایسا انتخاب کرکے ''رزم نامہ دبیر[2]'' مرتب کیا۔

بیانیہ شاعری کے اس پہلو میں بھی اردو مرثیہ گویوں خاص کر میر انیس اور مرزا دبیر نے کافی اضافے کیے علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ عربی میں مثنوی سرے سے مفقود ہے اور مسلسل واقعات چونکہ بغیر مثنوی کے کسی صنف سخن میں آ ہی نہیں سکتے اس لیے رزمیہ شاعری کو عربی میں چنداں ترقی نہ ہوئی صرف زمانہ جاہلیت کے بعض قصائد میں لڑائی

---

۱ رزم نامہ انیس مرتبہ سید مسعود حسن رضوی' کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنو ۱۹۵۸ء

۲ رزم نامہ دبیر مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر، نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۶۴ء

کے جستہ جستہ واقعات نظم ہوئے ہیں لیکن اس تمام شاعری میں کوئی مسلسل نظم پچاس شعروں کی بھی نہیں ملتی۔ فارسی میں شاہنامہ اور سکندر نامہ کو الگ کرلیا جائے تو رزمیہ شاعری نظر ہی نہیں آتی لیکن شاہنامہ کی وجہ سے رزمیہ شاعری میں فارسی کا رتبہ بلند ہوگیا ہے[1]۔

اردو میں تو یہ چیز سرے سے مفقود تھی البتہ مرثیہ کی صنف نے اس کمی کو نہ صرف پورا کردیا بلکہ اردو شاعری میں ایسی لاتعداد نظموں کا اضافہ کردیا۔ ابتدا تو میر ضمیر نے کی لیکن وہ ابتدا تھی آگے چل کر انیس اور دبیر نے اس میں چار چاند لگادیئے۔ لڑائی کی تیاری، رجز خوانی، معرکۂ جنگ، تلوار، گھوڑے وغیرہ کی تعریف میں بے مثل مضامین نظم کیے۔ یہ کام آسان نہیں تھا اس کے لیے فنون جنگ سے واقفیت، مختلف ہتھیاروں کے استعمال کا علم اور لڑائی کے طور طریقوں سے واقفیت کا ہونا ضروری تھا اس لیے مرثیہ گوئی کے لیے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والوں کی بہ نسبت گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عابد علی عابد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> ''مرثیہ نگار بہت سے علوم وفنون میں متخصص کا رتبہ رکھتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ نہ وہ لڑائی کا اچھا نقشہ کھینچ سکے گا اور نہ کرداروں کے منہ سے معقول باتیں کہلوا سکے گا۔ اچھے مرثیہ نگاروں کے ہاں ہمیں نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فنون جنگ کا کیا عالم ہے بلکہ ہماری معلومات میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے۔ ہم عالی نسب، چست و چالاک گھوڑوں کو پہچانتے ہیں۔ ہم مختلف ہتھیاروں کے استعمال کی نزاکتوں سے واقف ہوتے ہیں۔ ہم نبرد آزماؤں کے رجز کی نوعیت سے متاثر ہوتے ہیں''[2]

میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنی جولانی طبع سے رزمیہ مضامین کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے چونکہ ہر مرثیہ میں رزم کا عنصر نہایت ضروری ہے اور بغیر اس کے کسی مرثیہ کو مکمل نہیں سمجھا جائے گا، اگر وہ واقعہ کربلا سے متعلق ہو اور چونکہ مرثیہ کے

---

۱ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۴۷

۲ اصول انتقاد ادبیات ص ۶۵۵

سامعین ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں اس لیے تنوع اور طرزِ ادا کی خوبی ہی ان کو متاثر کرسکتی تھی اس لیے مرثیہ کے اس پہلو میں دونوں اساتذہ نے جوش بیان، ایجاد مضامین، زور اور جدت سے کام لیا۔ ہزاروں مرثیے نظم کیے اور ہر مرثیے میں رزمیہ عناصر کو جدا جدا عنوانات اور مختلف پہلوؤں سے نظم کیا ہے۔ لڑائی کی تیاری، ہنگامہ خیزی، تلوار کی کاٹ چھانٹ، معرکہ کا زور و شور، نیزوں کے حملے، برچھوں کی چمک، تیروں کی سرعت، کمانوں کا کھچنا، ڈھال کا استعمال، گھوڑوں کے خد و خال اور رفتار، شہیدوں کی رجز خوانی وغیرہ سب ہی مضامین کو اس طرح سے ادا کیا ہے کہ میدان جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے واقعہ نگاری کے ضمن میں دی گئی مثالوں میں راقم ایسی مثالیں پیش کرچکا ہے جن سے جنگ کے واقعات اپنے مکمل نقوش کے ساتھ ذہن میں ابھرتے ہیں۔ حقیقت میں رزمیہ عناصر کو نظم کرنے کا مطلب بھی واقعہ نگاری ہی ہے لیکن بجائے خود رزمیہ مضامین میں اتنی وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی اپنی ایک علاحدہ کائنات ہوتی ہے اردو مرثیہ میں یہ کائنات اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد میر انیس کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

> ''سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اس میں چند میدان جنگ ہیں، رزم، رنکبار، جنگ دارا، جنگ روس، جنگ فور، جنگ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں۔ شاہنامہ کے ۶۰ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیے۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا۔''[۱]

صاحب المیزان تحریر کرتے ہیں:

> ''اگر فارسی کو رزمیہ مضامین کے بیان میں شاہنامہ اور سکندر نامہ پر بجا فخر ہے تو اردو شاعری کو بھی مرثیوں کی نادر اور بیش بہا رزم پر ناز کرنا زیبا ہے۔''[۲]

---

۱ آب حیات ص ۵۴۳

۲ المیزان ص ۴۴۴

مرزا دبیر کے کلام میں بھی رزمیہ مضامین کی کثرت ہے اور جو زبان رزم کے شایان شان تھی وہ چونکہ ان کی گھٹی میں پڑی تھی اس لیے ان مضامین کی ادائیگی میں کمال فنکاری سے کام لیا ہے۔ احسن فاروقی کہتے ہیں:

> ''مرزا دبیر کا رنگ ایک شاعروں کے عالمانہ اور پرشکوہ رنگ سے بہت کچھ مشابہ ہے اور اس معنی میں وہ میر صاحب[میر انیس] پر سبقت لے جاتے ہیں۔''[1]

رزمیہ مضامین نظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود شاعر بھی فنون جنگ میں مہارت رکھتا ہو۔ اس میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ شاعر کا سپاہی ہونا مشکل ہے اور سپاہی آسانی سے شاعر نہیں ہوسکتا مگر یہ بات لازمی ہے کہ شاعر جب تک جنگ میں استعمال ہونے والے مختلف ہتھیاروں کے استعمال سے واقف نہ ہو اس وقت تک اس کے رزمیہ اشعار میں جان نہیں ہوسکتی۔ مرزا دبیر چونکہ خود فنون جنگ سے واقف تھے اور مختلف ہتھیاروں کا استعمال جانتے بھی تھے اس لیے انھوں نے رزمیہ مضامین کامیابی سے نظم کیے ہیں۔ ان کی فنون جنگ سے واقفیت کے متعلق افضل حسین ثابت نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

> ''نواب اقتدار الدولہ مستقیم الملک مرزا کلب علی خان ارسلان جنگ، دبیر سے عمر میں بڑے تھے اس لیے کہ ان کی ولادت ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء کی تھی مگر وہ بھی دبیر کے شاگرد ہوئے۔ وہ مجمع کمالات تھے کہ اس زمانے میں جبکہ ملک میں انگریزی خواں بہت کم تھے انھوں نے عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ نسخ و نستعلیق دونوں خطوں کے باقاعدہ خوش نویس بھی تھے۔ تیراندازی، تفنگ بازی و شہسواری برج بہادر مرہٹہ و دلیل خان دکھنی سے حاصل کی تھی۔ انتظار تخلص کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کی صحبت میں مرزا دبیر نے بھی ان فنون جنگ میں مہارت یا واقفیت پیدا کی تھی۔ ثابت نے ایک بزرگ کے حوالہ سے مزید لکھا ہے ایک دن مرزا دبیر محلات شاہی کے دفتر سے نکل کر آرہے تھے کہ ایک مست ہاتھی بھاگا ہوا

---

۱ ضمیمہ نگار نومبر ۱۹۴۹ء ص ۹۰

آیا۔ مرزا دبیر نے ہاتھی کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ لوگ خوف سے بھاگ رہے تھے مگر مرزا دبیر کے ہوش بجا رہے اور ایک چبوترے پر چڑھ کر برچھا ہاتھ میں لیا۔ جب ہاتھی قریب آیا تو وہیں سے تاک کر اس کی مستک پر برچھا مارا اور ہاتھی چنگھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس دن سے لوگ جان گئے کہ مرزا دبیر فنون جنگ میں بھی دخل رکھتے تھے۔"[1]

مرزا دبیر کے مراثی میں جو رزمیہ اشعار ملتے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت ایسے مضامین نظم کرنے کے لیے نہایت موزوں تھی۔ اس میں مبالغہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس میں مرزا دبیر مرثیہ گوئی میں یکتا مانے جاتے ہیں۔تلوار اور گھوڑے کی تعریف، رجز، معرکہ آرائی وغیرہ میں ایسے مضامین ایجاد کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے[2]۔ تخئیل سے کام لے کر میدانِ جنگ کی اتنی واضح تصویریں کھینچی ہیں کہ جواب نہیں۔اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ تلوار کی صفتیں ہاتھ کی وجہ سے ہوں۔ گھوڑے کی خوبیاں سوار سے ہوں۔ پڑھتے ہوئے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر تلوار ہاتھ سے پھینک دی جائے تو یہ محض لوہے کا ایک ٹکڑا رہے گا۔ یہی حال اور ہتھیاروں کا بھی ہے اس سے بھی مرثیہ کا تاثر قائم رہتا ہے اور اس کے ہیرو سے

---

۱ سبع مثانی دیباچہ ثابت ص ۱۸۔۱۷

۲ امیر احمد علوی تحریر کرتے ہیں:

"تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں بھی مرثیہ گویان لکھنؤ خصوصاً مرزا دبیر علیہ الرحمہ نے قلم توڑ دیا تھا۔ اس میدان میں تعلی اور مبالغہ کی حد باقی نہ رکھی تھی۔ گھوڑے کی سرعت کی توصیف یہاں تک بڑھا دی تھی کہ "سن بڑھ نہیں سکتا"

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اور تلوار کی شعلہ فشانی کا یہ عالم تھا کہ:

تلواروں پر وہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی
جل بھن کے آب تیغوں کی رن میں دھواں ہوئی"

(یادگار انیس ص ۱۶۹)

دھیان ہٹنے نہیں پاتا۔ ذہن غیر شعوری طور پر ایک سلسلہ میں جکڑا رہتا ہے تلوار اس لیے ان خوبیوں کی مالک ہے کہ ایک مخصوص فرد کے ہاتھ میں ہے اور اس فرد کی خصوصیت یہ ہے کہ امام حسینؑ کا حامی ہے یا رشتہ دار اور جاں نثار ہے اور امام حسینؑ نبیؐ کے نواسے، علیؑ و فاطمہؑ کے لال ہیں۔ رجز میں بھی برابر اس کے اشارے کیے ہیں اور یہ سلسلہ ذہن کے ساتھ اس طرح ملا ہوا رہتا ہے کہ انسان اس کو بھولنے نہیں پاتا یہاں مرزا دبیر کے کلام سے چند ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں رزمیہ عناصر نمایاں ہیں۔

حملہ کا زور و شور

جب رن میں شیرِ حق کا پسر حملہ ور ہوا　　باہر نیام سے سرِ تیغِ دو سر ہوا
خورشید نے کہا کہ وہ شق القمر ہوا　　آیا جو پیشِ تیغ وہ زیر و زبر ہوا
مولا بڑھے جو تیغِ دو پیکر کو تول کر
روح الامیں سپر ہوئے شہپر کو کھول کر

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار　　تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گرانبار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار　　اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار
دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند[1]

---

[1] علامہ شبلی (موازنہ ۵۶۔۳۵۵) اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب تک چلنے پھرنے کی قید نہ ہو، تشبیہ پوری نہیں ہوتی۔ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے پھرنے کی حالت میں ہی کانپتے ہیں۔ مرزا صاحب (مرزا دبیر) نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکات کا ذکر نہیں کیا ہے اس لیے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ افضل حسین ثابت (حیات دبیر ۲۳۔۵۲۲) لکھتے ہیں کہ شبلی کا اعتراض بجا ہے۔ مصرعۂ اول میں بھاگنے کا لفظ موجود ہے ع دہشت سے بھاگتے تھے جواں تیر کی مانند، اور جوانوں کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے ان کو قدم پیر کی مانند رعشہ تھا۔ اول تو تیر کی طرح بھاگنا خاص روز مرہ ہے دوسرے جب بھاگتے تھے جو جنبش و حرکت وغیرہ جتنے لوازم بھاگنے کے ہیں وہ سب سامع سمجھ سکتا ہے۔ شبلی کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ بوڑھے آدمی کے پاؤں صرف چلنے میں ہی کانپتے ہیں۔ اگر

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے　　سب ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر　　کہتے ہیں انا العبد لرز کر صنمِ دیر
جاں غیر ہے تن غیر مکیں غیر، مکاں غیر　　نے چرخ کا ہے دور نہ سیاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے
جز بختِ یزید اب کوئی گردش میں نہیں ہے

رجز

میں ہوں مکیں دوشِ نبی ہر مکاں کا فخر　　شیر خدا کا لال ہوں نو شیرداں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں اور اہلِ جناں کا فخر　　کعبہ کا نور، عرش کا اوج، آسماں کا فخر
نام و نسب سے قدر عجم اور عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے

روشن پدر کا زور ہے دنیا پہ دین پر　　ششدر تھے جبرئیل کٹے جبکہ تین پر

رعشہ ہوگا تو بغیر چلنے کے بھی کانپیں گے مگر مرزا دبیر نے تو ''بھاگنا'' لکھا ہے اس میں بجائے خود''چلنے کی کیفیت'' موجود ہے۔ جب آدمی بھاگیں گے تو ان کے ہاتھوں میں رکھے ہوئے نیزے حرکت میں رہیں گے کیونکہ نیزے میں لچک ہوتی ہے اس لیے بھاگتے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں وہ زیادہ ہلے گا۔

شبلی کا اعتراض ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس جو مصرعہ انھوں نے (میر انیس کا مصرعہ۔ چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثلِ پائے پیر) موازنہ کے لیے پیش کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ فصیح ہے مگر ترجیح کے لیے اتنا کہنا ٹھیک ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک انگلی سے زین پر   گردوں کی ڈھال چیر کے رکھدوں زمین پر[1]

ہم نو بہارِ گلشنِ صبر و ثبات ہیں
ہم شہسوار توسنِ والعادیات ہیں

پیاسا ہوں پر خضر بھی ہوں آب بقا بھی ہوں   ہمسایہ بھی ہوں سایۂ رب العلا بھی ہوں
ہمراہ بھی خدا کے ہوں راہِ خدا بھی ہوں   راہِ خدا بھی ہوں بخدا رہنما بھی ہوں

حرزِ گلوئے عیسیٰ عالی وقار ہوں
کل کی دوا ہوں حکمتِ پروردگار ہوں

اسپ کی تعریف

مضمون ذوالجناح نیا باندھتے ہیں ہم   آج اپنی شاعری کی ہوا باندھتے ہیں ہم

---

۱   علامہ شبلی اس شعر کے بارے میں (موازنہ ص ۳۵۵) لکھتے ہیں "مرزا صاحب کے شعر کا پہلا مصرعہ نہایت بدترکیب ہے۔ اس کے علاوہ ایک انگلی سے چیرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ کھونچا دینا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے۔" صاحب حیات دبیر لکھتے ہیں (حیات دبیر جلد اول ص ۲۱-۵۲۰) کہ چیرنا اردو میں شق کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے جیسے آنحضورؐ نے ایک انگلی کے اشارے سے چاند کو شق کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک انگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ایک گیلی چپاتی یا ایک گیلے پاپڑ کو توے پر ڈالنے سے پہلے ایک بچہ بھی ایک انگلی سے چیر سکتا ہے یعنی شق کرسکتا ہے۔ کھونچا دینا اس موقع پر ہرگز مناسب نہیں ہے۔ کوئی بھی اہل زبان اس طرح نہیں بولے گا۔ یہ خلاف روزمرہ ہے کیونکہ کھونچہ تو اسے کہتے ہیں جو لباس دامن وغیرہ میں از خود لگے۔ شبلی کا اعتراض صحیح نہیں ہے۔ رہی تشبیہ کی بات کہ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے موزوں ہے صحیح نہیں ہے۔ آسمان اور آفتاب دونوں گول ہیں اس لیے تشبیہ اپنی جگہ درست ہے بلکہ آسمان کے ساتھ تشبیہ میں چار وجہ شبہ ہیں (۱) آسمان کی گولائی (۲) آسمان کا خم ہونا (۳) آسمان کے ستاروں سے ڈھال کے پھولوں کی تشبیہ (۴) آسمان بھی ازرق (نیلا) رنگ ہے جو قریباً ڈھال کا رنگ ہے۔ اس کے مقابلہ میں آفتاب سے ڈھال کی تشبیہ صرف گولائی کی وجہ سے ہے مگر وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔

جہاں تک مصرعہ اول کا تعلق ہے جسے شبلی نے "نہایت بدترکیب" کہا ہے اپنی جگہ مناسب ہے بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو اس مصرعے کو بدترکیب بناتی ہے۔

کھلتا نہیں یہ عقدہ کہ کیا باندھتے ہیں ہم　　پائے قلم سے پائے صبا باندھتے ہیں ہم
یاں اک طرف کو دم ہے وہ حسن و جمال میں
چوٹی کے آرہے ہیں مضامیں خیال میں

سن لو نسب، یہ رخش بڑا قوم دار ہے　　کھیت اس کا صحن قدرت پروردگار ہے
یہ شیر خوارِ دایۂ ابر بہار ہے　　تخمِ مرادِ ابلقِ لیل و نہار ہے
مالک ہے ماہِ نو سے یہ چرخِ بلند کا
پہلے فلک پہ نعل گڑا ہے سمند کا
اللہ رے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی　　آتی ہیں نظر صاف رگیں گل سے بدن کی
سیرت ہے اگر شیر کی صورت ہے ہرن کی　　رانوں میں ٹھہرتا نہیں بو سونگھ کے رن کی
دھن ہے کہ گزر جائے حدِ چرخِ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اڑ جاؤں زمیں سے
چلنے میں یہ شمشیر ہے چلّہ میں یہ ہے تیر　　لڑنے میں یہ تدبیر بگڑنے میں یہ تقدیر
جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر　　چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر
مضموں ہیں بہت پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہے اعجاز یہ اسپ نہیں ہے

دیکھا نہ سنا ہم نے سمندوں کا یہ دستور　　وہ کہتا تھا میں طور ہوں یہ کہتا تھا میں نور[1]
وہ کہتا تھا میں رعد ہوں یہ کہتا تھا میں صور　　وہ کہتا تھا لیلیٰ ہوں تو یہ کہتا تھا میں حور
وہ کہتا تھا دیکھ آیا ہوں میں گاوِ زمیں کو
یہ کہتا تھا میں پھاند تا ہوں عرشِ بریں کو
وہ کہتا تھا بجلی ہوں یہ کہتا تھا ہوا ہوں　　وہ کہتا تھا سودا ہوں یہ کہتا تھا بلا ہوں
وہ کہتا تھا نکہت ہوں یہ کہتا تھا صبا ہوں　　وہ کہتا تھا عنقا ہوں یہ کہتا تھا ہما ہوں

۱　حضرت عونؓ و محمدؓ کے گھوڑوں کی تعریف میں

وہ کہتا تھا واقف ہے قمر کبکِ دری ہوں
یہ کہتا تھا شاہد ہے سلیماں میں پری ہوں
شبدیز فلک سامنے ان کے کمری ہے　　نبض ان کی شرر سانس نسیمِ سحری ہے
آنکھوں میں وہ شوخی ہے کہ شیشوں میں پری ہے　　سایہ ہے ہما نقشِ قدم کبکِ دری ہے
چلنے میں اگر نرم روی مدِ نظر ہو
آنکھوں میں پھریں اور نہ مردم کو خبر ہو
طے ہر اک قدم پہ ایک مہینے کی راہ تھی　　رویت ہلالِ نعل کی اس پر گواہ تھی

کیا تیز قدم اسپ شہِ عرش نشیں ہے　　اللہ کی قدرت ہے یہ رہوار نہیں ہے

جولانیِ فرس کو کروں کیا میں آشکار　　آہو کی طرح ہوتے ہیں مضمون بھی فرار

چالاک ہے اس درجہ عقابِ علی اکبر　　آرام نہیں مدح کے حرفوں کو ورق پر

ڈھونڈو تو بھلا نقش سمِ نعل کہیں ہے　　دنیا میں جگہ پاؤں کے رکھنے کی نہیں ہے

سرعت یہ ہے گر آئینہ خانے میں رواں ہو　　ہرگز نہ کسی آئینہ میں عکس عیاں ہو

سرعت کی جو قسمت ہوئی منظور قضا کو　　نو جزو تو اس کو دیے اک جزو ہوا کو

تلوار کی تعریف

چھل بل تھی، چھلا وہ تھی، طلسمات تھی اسرار　　چالاک، سبکسار، طرحدار، نمودار
نیزہ کہیں، خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار　　بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفاں تھی، ہوا تھی
شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی

شمشیر تھی کہ ناخن مشکلکشا تھی وہ — دستِ قضا تھی یا کہ اجل کا عصا تھی وہ
الیاس بحر فتح کہ خضر فنا تھی وہ — زخموں کے تنگ کوچوں سے خوب آشنا تھی وہ
بے بار کیوں خمیدہ سر ذوالفقار تھا
اعدا کے سر پہ تن تھے یہی اس پہ بار تھا

ماہی کے سر پہ گاہ سرِ آسماں پہ تھی — گاو زمیں کی شاخ پہ گہ کہکشاں پہ تھی
گہ ابر رعد پر گہے برق تپاں پہ تھی — دوش ہوا پہ تھی گہے آبِ رواں پہ تھی
شعلہ فگن تھی گہ کرۂ زمہریر پر
مہر منیر پر کبھی بدرِ منیر پر
کیا کیا ہنر یہ تیغ دو پیکر نہ رکھتی تھی — قالب میں روح جسم پہ یہ سر نہ رکھتی تھی
عنقا کی طرح پاؤں زمیں پر نہ رکھتی تھی — پر فضل حق سمجھیے کہ یہ پر نہ رکھتی تھی
چار آئینہ بدن پہ برابر پگھلتے تھے
لوہے کی یہ کڑی تھی کہ پتھر پگھلتے تھے
سرپوش تھی زمین کا پر آسماں نہ تھی — روشن تھی آسماں پہ ولے کہکشاں نہ تھی
دریا میں بھی رواں مگر آبِ رواں نہ تھی — چمکی ہر ایک سمت پہ برق تپاں نہ تھی
ان سے ملی یہ جن سے کبھی آشنا نہ تھی
چلتی تھی غرب و شرق پہ لیکن ہوا نہ تھی

جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے — دکھلائے دو ہلال شہ مشرقین نے
لی دادِ حرب فاطمہؑ کے نور عین نے — کی مدحِ حرب فاتح بدر و حنین نے
یہ ہیبت جہادِ شہِ نیک خو ہوئی
خود ذوالفقار میان سے کھینچتے ہی دو ہوئی

بو کی طرح دماغوں میں آئی چلی گئی　　مثلِ ہوا سروں میں سمائی چلی گئی
مانند شعلہ باگ اٹھائی چلی گئی　　آندھی کی طرح آگ لگائی چلی گئی
سینے میں صاف آتی تھی اور صاف جاتی تھی
انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

آنکھوں میں کوند جاتی تھی پیش نظر نہ تھی　　صف کون تھی رن میں کہ زیر و زبر نہ تھی
کچھ انتہائے برشِ تیغ دوسر نہ تھی　　یہ کون مبتدا تھی کہ جس کی خبر نہ تھی
یاں تھی تو واں نہ تھی جو ادھر تھی ادھر نہ تھی
پر یہ نہ کچھ کھلا کہ کدھر تھی کدھر نہ تھی

معرکہ آرائی — مخالفین کے حملوں کا جواب

اس عرصہ میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار　　پر ایک بھی اس پنجتنی پر نہ لگا وار
مانند دل و چشم ہر اک عضو تھا ہشیار　　عاری ہوئی تلوار، مخالف ہوا ناچار
جب تیغ کو جھنجھلا کے رخ پاک پہ کھینچا
تلوار نے انگلی سے الف خاک پہ کھینچا[1]

غازی نے کہا بس اسی فن پر تھا تجھے ناز　　سیکھا نہ ید اللہیوں سے ضرب کا انداز
ممکن ہے کہ اک ضرب میں دو ہو تو برابر　　پر اس میں عیاں ہوں گے نہ جوہر مرے تجھ پر
لے روک مرے وار ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا ابھی اظہار ہنر ہے

ناگہ پرے سے اک تہمتن بڑھا ادھر　　بد قوم و بد شمائل و بد خو و بدسیر
کج فہم، کج کلاہ، کج انداز، کج نظر　　آنکھوں سے یہ عیاں تھا کہ گلخن میں شعلہ ور

---

[1] علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر نے جنگ کے واقعات اس طرح نظم کیے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ حریف فن جنگ میں مہارت رکھتے ہیں (موازنہ ص ۲۵۷) ان کے ہنر سامنے نہیں آتے لیکن ان اشعار سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مخالفین کے حملوں کا حال بھی مرزا دبیر نے نظم کیا ہے۔

قسمت میں جو عذابِ جہنم زیادہ تھے
آنکھوں سے رخ پہ دو درِ دوزخ کشادہ تھے

عوج ابن عوق سے بھی تھا قد میں زیادہ تر　　کالا تھا اس قدر کہ کہے دیو الحذر
منہ پر جھلم، بدن میں زرہ، خود زیب سر　　اک دوش پر کمان تو اک دوش پر سپر
زنجیر سے تھا چست کمر کو کیے ہوئے
باگ اک میں، ایک ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے

اس شان سے وہ اہرمن لشکر جفا　　آیا جو رو بروئے سلیمانِ کر بلا
پریاں سروں کو پیٹ کے کرنے لگیں بکا　　زہراؑ کا چاند اور یہ گہن وا مصیبتا
جن کہتے تھے جو حکم شہ خوشخصال دیں
اس کو اٹھا کے قاف کے دریا میں ڈال دیں

برچھوں ہلا کے نیزہ کو اچھلا وہ بد گہر　　گہ زین سے اٹھا کبھی بیٹھا وہ زین پر
دکھلائے ضربِ تیغ کے فن، تیر کے ہنر　　بولا ہنر و رانِ عرب میں ہوں نامور
سر تاجِ سرکشانِ حجاز و عراق ہوں
شمشیر، تیر، نیزے کے فن میں میں طاق ہوں

پھر دونوں سمت نیزہ، آتش فشاں ہلے　　یوں گتھ گئے کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے ملے
یوں زد کی ردتھی جیسے بہم دفع ہوں گلے　　چنگاریوں سے پڑ گئے گردوں پہ آبلے
نایاب تھا یہ نیزہ تو وہ انتخاب تھا
وہ تھا زباں دراز یہ حاضر جواب تھا

گرزِ گراں شقی نے اٹھایا بصد غضب　　چاہا کرے حوالۂ فرقِ شہِ عرب
غالب ہو نورِ حق پہ سیاہی کفر کب　　پایا نہ ایک وار کا اس بے ادب نے ڈھب
گرزِ گراں بھی لقمۂ شمشیر ہوگیا
گو شکل میں تھا پیش مگر زیر ہوگیا

تلوار کا شقی نے کیا شاہ دیں پہ وار　　حضرت نے روک لی رخِ اقدس پہ ذوالفقار
تیغِ علیؑ کی دھار پہ اس کی پڑی جو دھار　　دندانے تیغ میں ہوئے یک لخت آشکار

آری بنی جو تیغ تو عاری لعیں ہوا
گردن پہ سر تو زین پہ بھاری لعیں ہوا

المیہ واقعات اور بین

مرثیہ کا اصلی مقصد اپنے ممدوح کے مصائب اور موت پر رنج و غم کا اظہار کر کے دوسروں کو رلانا ہے اردو مرثیہ کی غایت بھی حقیقت میں یہی ہے۔ صنف مرثیہ کے اردو میں آنے کے وقت بھی یہ عنصر اس میں موجود تھا اور جب کہ یہ ترقی کی منزلوں سے گزر کر ایک مکمل صنف کی صورت اختیار کر چکی ہے اس کی ہیئت میں تبدیلی آ چکی ہے مضامین میں تنوع آ گیا اور مضامین کی ادائیگی میں مختلف صنعتوں سے کام لیا گیا' یہ عنصر پھر بھی موجود رہا اور بغیر اس کے کوئی نظم مرثیہ نہیں کہلائی جا سکتی۔ مرثیہ گو شعرا نے رنج و الم کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا اور ان کی باریکیوں پر غور کیا اور جو بھی ممکن بات نظر آئی اسے سپرد قلم کیا۔ مصائب میں بھوک پیاس سے لے کر شہادت تک، طعنہ زنی سے لے کر بے پردگی تک۔ غریب الوطنی سے لے کر آتش زنی خیام تک سب ہی موضوعات نظم کیے گئے۔ یزید کے ڈھائے ہوئے مظالم کو ہر ہر پہلو سے نظم کیا گیا۔ شہیدوں کی قوت برداشت کے مطابق، حیثیت اور درجوں کے مطابق ان کا نوحہ کیا گیا اور اس طرح اس صنف کی اصل روح کو محفوظ رکھا گیا۔

مرثیہ کو چونکہ مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے اور لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جو عزائے امام میں روئے گا وہ دین و دنیا میں افتخار حاصل کرے گا اس لیے زاد آخرت سمجھ کر شاعر بھی اس میں بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔ موضوع بھی یہ ایسا تھا کہ جس میں اس کی کافی گنجائش تھی لہٰذا مرثیہ گویوں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔

مرزا دبیر کی طبیعت بقول محمد حسین آزاد اس فن کی مناسبت کے لحاظ سے بہت ہی گداز تھی اور جابجا غم انگیز اشاروں اور دل گداز کنایوں سے کام لے کر مرثیہ کو بہت ہی مبکی بناتے تھے۔ امداد امام اثر کی رائے میں بھی مآل مرثیہ بکا ہے اور مرزا دبیر اس خصوصیت کی وجہ سے ان کی نظر میں سلطان الذاکرین ہیں۔

صاحب المیزان تحریر کرتے ہیں:

''مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ ایسے موزوں اور مناسب لائے ہیں
جن سے بے انتہا درد وغم ظاہر ہوتا ہے اور ہر لفظ تیر ونشتر کا کام دیتا ہے،
اور یہ ان کے (مرزا دبیر کے) کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے وہ ہمیشہ بیتیہ
مضامین میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو اپنے دل میں ہے۔ وہی
دوسرے کے دل میں پیدا ہوجائے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے''[1]

مرزا دبیر کچھ بھی کہہ رہے ہوں مگر مرثیہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ جابجا غم انگیز اشارے کرنے کے علاوہ بین میں ایسی جذباتی زبان اور جذباتی انداز سے کام لیتے ہیں کہ سخت سے سخت دل رکھنے والوں کے بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔ چنانچہ اس کا تذکرہ راقم اس مقالہ کے باب اول میں مرزا دبیر کی مجلسوں کے ضمن میں کر چکا ہے اس لیے خوف طوالت سے یہاں پر صرف چند مثالیں ہی پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نورعین کی

فریاد یا علیؑ میں کدھر جاؤں یا علیؑ ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علیؑ
کس طرح ان کی سانس کو ٹھہراؤں یا علیؑ پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علیؑ
پچھلے کو آنکھ کھولی تھی اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں، بولتے نہیں

۲۔ چار سال کی بہن سکینہ، شش ماہہ بھائی علی اصغر کو یوں بہلاتی ہے:

ہردم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے ہاتھوں میں لے کے ان کے کھلونے دکھاتی ہے

---

[1] المیزان ص ۲۷۱

سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سناتی ہے   من جاؤ بھائی جان سکینہ مناتی ہے
کڑھتی ہیں اماں، آنکھ کو تم کھولتے نہیں
اللہ ہم پکارتے ہیں، بولتے نہیں

۳۔ امام حسینؑ حضرت علی اصغر کو میدان کی طرف لے جاتے ہیں۔
اصغر کو لے چلے جو شہنشاہِ بحر و بر   مڑ مڑ کے اس نے کنبہ پہ حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہاتھ ماتھے پہ رکھا جھکا کے سر   بانو پکاریں پھیر کے منھ کو ادھر ادھر
لوگو مرا کلیجا نکلتا ہے، تھام لو
اصغر سدھارتے ہیں جہاں سے سلام لو

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ   لے تو چلا ہوں، فوج عمر سے کہونگا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا   منت بھی گر کرونگا تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری
پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے   چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

۴۔ حضرت عباسؑ کی شہادت پر امام حسینؑ کا اظہارِ غم:
پھر مڑ کے جواں بیٹے کو چلائے کہ جلد آؤ   اکبر مرے ٹوٹے ہوئے بازو سے لپٹ جاؤ
بیتاب ہوں میں جلد مرے بھائی کو دکھلاؤ   دم آنکھوں میں آ پہونچا ہمیں نہر پہ پہنچاؤ
آنکھوں سے مرے خونِ دل اس وقت بہا ہے
چھریوں سے کلیجے کو کوئی کاٹ رہا ہے
اب دل میں ہے وہ درد جو پہلے تھا کمر میں   شانوں کی طپش پھیل کے آئی ہے جگر میں

یوں کوئی مسافر نہ لٹا ہوگا سفر میں   بیٹا مرے عباس کا باہر ہے کہ گھر میں
سمجھا دو چچی کو اسے پاس بلالیں
بہنوں سے یہ کہدو کہ سکینہ کو سنبھالیں

بولے شہِ مظلوم یہ شانے کو ہلاکر   اٹھتے نہیں کیا سوگئے عباسِ دلاور
ہمراہ تھے ہم بھی، نہ توقف کیا دم بھر   اللہ! یہ جلدی ہوئی اے جانِ برادر
پایا جو مکان سرد تو نیند آگئی تم کو
ہاں شیر تھے دریا کی ہوا بھاگئی تم کو

۵۔ دربار یزید میں بعد معرکۂ کربلا اہل حرم کا آنا:

اب نوحے کا ہنگام ہے رقت کی گھڑی ہے   شہ مر گئے زینب پہ قیامت کی گھڑی ہے
دربار میں اب آمدِ عترت کی گھڑی ہے   حیدر کے محبّو! یہ عدالت کی گھڑی ہے
جائز ہے؟ حرم مجلس میخوار میں جائیں
عابد لیے ماں بہنوں کو دربار میں جائیں

دربار بھی ظالم کا ہے عادل کا نہیں ہے   اندیشہ عدو کو حق و باطل کا نہیں ہے
وقت اس سے زیادہ کوئی مشکل کا نہیں ہے   کچھ بس حرم بیکس و بے دل کا نہیں ہے
منظور ہے یہ، طوق تو گردن میں پڑے ہوں
سب کرسیوں پر بیٹھے ہوں سادات کھڑے ہوں

یہ سن کے سکینہ نے کہا ماں سے میں قربان   دربار میں کس کے ہے طلب آپ کی اس آن
کیا بیٹھا ہے انصاف پہ اس شہر کا سلطان   گر یہ ہے تو بی بی نہ حزیں ہوں نہ ہراسان
نے خون کیا ہم نے کسی کا، نہ خطا کی
چل کر سر دربار دہائی دو خدا کی

زینب علی اکبر کا کہیں واقعہ سارا　　یوں نیزہ لگا یوں جگر ان کا ہوا پارا
تم کہیو کہ برقعہ مرا ظالم نے اتارا　　نالش میں کروں گی کہ طمانچہ مجھے مارا
گر پوچھے گا وہ کیا تری مرضی ہے بتادے
میں ہاتھوں کو جوڑوں گی کہ بابا سے ملادے

۶۔ حضرت سکینہ کی حالت اس طرح پیش کی ہے کہ سخت سے سخت دل رکھنے والا انسان بھی روئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

جب داغ بے کسی نہ سکینہ اٹھا سکی　　اور سوزِ دل نہ خوف کے مارے سنا سکی
کھائے طمانچے شمر کے جب تک کہ کھا سکی　　سن کم تھا دکھ بہت تھے نہ برداشت لا سکی
روئی تو ظالموں نے جفا بے شمار کی
آخر یہ جبر دیکھ کے موت اختیار کی

گر آہ کی تو شمر پکارا خموش ہو　　اور چپ ہوئی تو بے پدری نے کہا کہ رو
گہ شدت عطش میں پکاری کہ پانی دو　　گہ یاد کرکے رہ گئی بابا کی پیاس کو
سوئی جو آنسو پونچھ کے چشم پر آب سے
ہے ہے حسینؑ کہہ کے وہ اٹھ بیٹھی خواب سے

دل میں سما گیا تھا جو شمرِ لعین کا ڈر　　سونے میں بھی پکارتی تھی چونک چونک کر
فریاد چھینتا ہے گہر شمرِ بد گہر　　آماں بچاؤ آتا ہے درّہ لیے عمر
زینب پھوپھی دہائی کلیجہ دھڑکتا ہے
سجاد بھائی دیکھو وہ خولی گھڑکتا ہے

جب پیاس لگتی رو کے چچا کو پکارتی　　دکھتے جو کان شاہِ ہدا کو پکارتی
آتا نہ جب کوئی تو خدا کو پکارتی　　جینے سے تنگ آکے قضا کو پکارتی
کہتی تھی نے چچا نہ امامِ امم رہے
رلوانے کو عدو رہے رونے کو ہم رہے

۶۔ حضرت امام حسینؑ شہادت پانے سے قبل شمر سے جو گفتار کرتے ہیں اس کو طرح طرح سے مرثیہ گویوں نے پیش کیا ہے۔ مرزا دبیر نے بھی مختلف مراثی میں مختلف انداز اختیار کر کے جذبات کو چھونے والے مضامین نظم کیے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے کہ محض اشاروں میں اس المیہ کا بیان کس قدر درد انگیز ہے۔

پر دیکھ سکینہ تو نہیں خیمے کے در پر
فضہ تو نہیں روتی ہے اس وقت کھلے سر

ایک اور مرثیہ میں خود کلامی کے ذریعہ اس المیہ کا یوں اظہار کیا ہے:

جو رگ کٹی گلے کی یہ پیدا ہوئی صدا — اے زینب آہ بعد مرے کون ہے ترا
اے عابد آہ کون تجھے دے گا اب دوا — اے بانو آہ آج پھرے گی تو بے ردا

حیف اے سکینہ حیف بڑا لے کے غم چلے
بی بی نہ ملنے پائیں زمانے سے ہم چلے

بین

حضرت سکینہ جب زندان میں قضا کرتی ہیں تو اس کی میت پر بانو یوں بین کرتی ہیں:

جب خانۂ زنداں میں سکینہ نے قضا کی — دیکھا سرِ شبیر کو اور جان فدا کی
رو کر کہا بانو نے کہ فریاد خدا کی — کیا خوب مرے درد کی قسمت نے دوا کی

مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹے ہیں
زندان میں اس لاڈلی دختر سے چھٹے ہیں

اب کون کرے گا شہِ مظلوم کا ماتم — اب کون سکینہ کی طرح روئے گا ہر دم
سر پیٹتی تھی چھوٹے سے ہاتھوں سے یہ پیہم — تازہ تھا اسی سے پسرِ فاطمہ کا غم

گو شمر ڈراتا تھا نہ ڈرتی تھی سکینہ
کیا نوحہ پدر کے لیے کرتی تھی سکینہ

پھر بولی سکینہ کی وہ میت سے لپٹ کر — ہے ہے یہ تری مرگ یہ ناداریٔ مادر
بانو تو ہے محتاج کفن دے تمہیں کیونکر — نے غسل کو پانی ہے نہ تابوت میسر

پونچھے کوئی یہ درد اسیروں کے جگر سے
ہم رو بھی نہیں سکتے تمھیں شمر کے ڈر سے
لو شمر گھر کتا ہے تمھیں اے مری پیاری   اب ڈر کے لپٹتی نہیں چھاتی سے ہماری
دربار میں پھر مجھ کو لیے جاتے ہیں ناری   تم باندھ کے ہاتھوں کو سفارش کرو واری
اصغر کو میں اب روتی ہوں سمجھاؤ سکینہ
دربار میں بانو کے عوض جاؤ سکینہ

باب چہارم

چند دیگر خصوصیات

اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے کہ اردو شاعری نے جب اپنی منزل کی طرف قدم بڑھایا تو نظروں کے سامنے فارسی تھی۔ فارسی کی ہی گود میں اردو شاعری کی تربیت ہوئی اور اس کے سرمایہ سے منفعت حاصل کرکے اردو شاعری نے ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کیں۔ شعرائے اردو اس زمانے میں جتنا بھی اس زبان اور زبان کی شاعری کو وسعت اور ترقی دینا چاہتے تھے وہ یہی بات تھی کہ فارسی کے خد و خال آجائیں اور فارسی ہی کی طرح اس میں بھی مختلف اصناف سخن اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ نظم ہوں۔ یہ کام ایک دن کا نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ شاعر اس زبان کو سنوارتے رہے اور ہر مقام پر ٹھہرنے کے باوجود اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ اردو شاعری کے لیے جو ترقی یافتہ منزل قرار دی گئی، وہ تھی کہ یہ فارسی کے ہم پلہ ہوجائے۔ اس منزل کی طرف لے جانے میں مختلف لوگوں، ادوار اور تہذیبوں کا ہاتھ ہے۔ مرزا دبیر کے زمانے تک اس میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی جاچکی تھی مگر انیس و دبیر نے اردو مرثیہ کے ذریعہ جو وسعت اور رفعت اردو شاعری کو بخشی وہ اس وقت تک اسے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یوں تو اردو مرثیہ تمام زبانوں کے مرثیے کے مقابلے میں اپنی ایک الگ حقیقت رکھتا ہے۔ اس کی خصوصیات کسی اور زبان کے مرثیے میں نہیں ملتیں۔ اردو مرثیہ گویوں نے اپنی طبعی جولانیوں سے واقعۂ کربلا میں وہ رنگ بھردیا جو کسی اور زبان میں نظر ہی نہیں آتا۔ یہ رنگ مقامی بھی ہے اور تاریخی بھی، سماجی بھی ہے اور معاشی بھی، سیاسی بھی ہے اور مذہبی بھی۔ یہ ملائے ہوئے رنگ اس طرح سے ذہنوں پر چڑھ گئے ہیں کہ مرثیہ سے اب الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کو ایک مستقل حیثیت مل گئی۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ اردو مرثیہ میں شاعری کے وہ خد و خال پیدا ہوگئے جو ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری خصوصاً فارسی شاعری میں پائے جاتے تھے۔

مرزا دبیر عالم متبحر تھے۔ اگر ایک طرف ان کی نظر تاریخ، احادیث و روایات پر تھی تو دوسری طرف فارسی شعر و ادب سے وہ کماحقہ واقف تھے۔ اساتذہ فارسی کے دواوین کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ بھی اس بات کے کوشاں تھے کہ اردو شاعری خصوصاً اردو مرثیہ اپنے اندر وہ تمام خوبیاں پیدا کرے جو فارسی شاعری کا خاصہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ تھا، زبانوں کے مزاج سے واقف تھے، روزمرہ پر عبور تھا۔

جہاں جیسا موقع ہوا وہاں انھوں نے ویسی زبان استعمال کی، مطابق واقع یا حال الفاظ انتخاب کیے۔ جہاں مبالغہ سے کام لینا تھا، لیا اور جہاں حقیقت نگاری ان کے مقصد کو فائدہ پہنچاسکتی تھی وہاں ایسا ہی کیا۔

حقیقت نگاری میں بھی اگر شاعر حسن اور سلیقہ سے کام لے یعنی ادائیگی مضامین میں کچھ تکلف بھی ہو مگر اتنا ہی کہ سادگی کو ٹھیس نہ پہنچے، کچھ رنگین بھی ہو بشرطیکہ رنگ اتنا گاڑھا نہ ہو کہ طبع سامع پر بار ہو۔ مختلف علوم وفنون کی طرف اشارے بھی ہوں مگر اس حد تک کہ جس سے ضمناً شاعر کی شخصیت کی طرف اشارے ہوئے ہوں اور سامعین اس کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کرتے ہوں تو زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

عام طور پر ہر چیز ابتدا میں بہت ہی خلوص اور سادگی سے پیش کی جاتی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کو سنوارنے اور سجانے کی فکر ہوتی ہے۔ دراصل انسان فطرتاً تنقیدی صلاحیتیں لے کے پیدا ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کو آج ایک رنگ میں پسند کرتا ہے اسی چیز کے لیے وہ دوسری دفعہ دوسرا رنگ تجویز کرتا ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہوتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان نے ترقی کی اتنی منزلیں طے نہ کی ہوتیں۔ اس کے استعمال کی چیزیں اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ انسان کے لباس کی تاریخ لیجیے۔ مکانوں کی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی ساخت پر غور کرلیجیے۔ دیگر رسم و رواج پر نظر کرلیجیے تو یہ تبدیلیاں ضرور نظر آئیں گی۔ انسان تبدیلی پسند کرتا ہے اور وہ تبدیلی دراصل اس تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔ حواس کو فطرت نے ودیعت کیا ہے۔ اگر یہ شعور انسان میں نہ ہوتا تو وہ مہذب نہیں بن سکتا تھا۔ یہی بات شعر و ادب میں بھی ہوتی ہے اور مرثیہ بھی اس سے ضرور متاثر ہوا۔ اردو کے ابتدائی مرثیے اور میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی کا اگر موازنہ کیا جائے تو اس تبدیلی کا احساس ضرور ہوگا۔ اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مرثیہ کا مقصد اصلی یہ ہے کہ کربلا کے غم انگیز سوانح کو پیش کرکے لوگوں کو رلایا جائے۔ پھر سراپا، منظر نگاری، واقعہ نگاری، رزم وغیرہ کیا ضروری ہے، البتہ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس تاثر میں اضافہ ہوتا ہے، جو مرثیہ گو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان ان تاثرات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے جو وہ کسی خاص چیز کو بنانے، پیش کرنے یا سننے یا دیکھنے یا دکھانے سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مثال

کے طور پر اگر کھانا کھانے کا مطلب یہ ہے کہ جسم کو تقویت ملے اور جسم کی نشو و نما ہو تو کھانے کے ساتھ جن دوسرے لوازم کا تعلق ہوتا ہے جن کا براہ راست جسم کی نشو و نما پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ان کو کیوں انسان ضروری خیال کرتا ہے۔ کھانا کھانے یا کھلانے کے ساتھ وہ برتن ذہن میں ضرور ابھرے گا جس میں کھانا کھایا جائے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو برتن کا غذا کے فائدوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شاعری کی دنیا میں تو اہمیت اسی برتن یعنی ہیئت کی تزئین کو ہے۔ خیالات سب کے ذہن میں آتے ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے خیالات ہیں جو کوئی آدمی دوسروں کے سامنے رکھتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کیسے پیش کرتا ہے۔ پیش کش کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہو، چیزوں کی فراوانی ہو اور ان کے استعمال کا سلیقہ ہو وہ اسی طرح اپنے مہمان کے لیے میز سجائے گا یا دسترخوان بچھائے گا۔ اور جس کے پاس ایسے وسائل کم ہوں وہ اسی انداز سے یہ چیزیں پیش کرے گا۔ اب اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ چیزوں کے استعمال کا سلیقہ کس کو کس حد تک ہے۔ اگر وہ میز پر اتنا سامان بکھیر دے کہ وہ کھانے کی میز کے بدلے ''کراکری'' کی دوکان میں رکھی ہوئی میز نظر آئے اور کھانے سے زیادہ اہمیت ان ہی چیزوں کو دی جائے تو میزبان کی بدسلیقگی صاف نظر آئے گی اور مہمان کھانا کھانے سے پہلے ہی ہاتھ کھینچ لے گا۔

یہی حال شاعری کا ہے جس کے پاس مضامین وافر ہوں، الفاظ کا اچھا سرمایہ ہو، ان کے استعمال کا سلیقہ ہو وہ ضرور ان کا استعمال کرے گا مگر یہ استعمال ایسا ہوگا کہ پڑھنے یا سننے والا اس سے لطف اندوز ہوگا۔ وہ بھی نفاست سے کام لینے پر مجبور ہوگا۔ جس طرح مختلف قسم کی ضیافتوں کو ایک رکابدار ہی مختلف کھانے خوش سلیقگی سے دوسروں کے آگے رکھ دیتا ہے یا دستر خوان پر چن دیتا ہے اسی طرح ایک سلیقہ مند آدمی آہستہ آہستہ شاعر کی سلیقہ مندی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی وضع داری اور صناعی سے مزے لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر قابل اور لائق شعراء نے اپنے کلام کو مختلف صنعتوں سے سجایا ہے۔ اپنے خیالات کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ ایک ہی خیال کو مختلف شاعروں نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے۔

جن شاعروں کی استطاعت زیادہ تھی انھوں نے مختلف قسم کی صنعتوں سے کام لیا ہے اور ان کے استعمال پر زور بھی دیا ہے۔ اس سے پہلے بات فارسی شاعری کی ہو رہی تھی۔ اس زبان کے اساتذہ کے کلام پر نظر ڈالنے سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب یہ شاعری کمال کو پہنچی تو اس میں بھی سلیقہ مندی کا اظہار صنعتوں کے استعمال سے کیا گیا۔ اردو شاعری کی دنیا چونکہ فارسی شاعری تک محدود تھی اور اسی کو منزل مان کر وہ اردو شاعری کو ترقی دے رہے تھے، اس لیے اردو شاعری میں بھی یہ خصوصیات پیدا کرنے کے لیے شعرا اپنی طرف سے کام کرنے لگے اور جس سے جتنا ہو سکا اس کی تزئین کے لیے کرتا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اردو شاعری فارسی شاعری کی ہم پلہ ہو۔ صدر الدین محمد خان بہادر[1] فائز جو مختلف علوم سے دلچسپی رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر تھے، لکھتے ہیں:

"شاعر کا کمال صنائع شعریہ پر موقوف ہے۔ ہر شخص جو فی الجملہ موزوں طبع ہے اور مہمل شعر کہہ لیتا ہے وہ اپنے کو شاعر علامہ سمجھ لیتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ شاعر کی استعداد صنائع میں ظاہر ہوتی ہے۔"[2]

حقیقت میں علم بدیع کا تعلق شعر کے حسن سے ہے۔ شعر ایک حسن ہے۔ شاعر کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے حسن یعنی شعر کو اس طرح پیش کرے کہ لوگ اس میں زیادہ سے زیادہ کشش محسوس کریں۔ لوگوں کو یہ توقع سے زیادہ حسین معلوم ہو۔ ذوالفقار علی تحریر کرتے ہیں کہ:

"بدیع" کلام کے تحسین و تزئین کے طریقے معلوم کرنے کا ایک علم ہے۔"[3]

---

۱ نواب صدر الدین محمد خان بہادر متخلص بہ فائز اورنگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک موجود تھے۔ شمالی ہند کے سب سے قدیم صاحب دیوان شاعر ہیں۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ دیوان اردو دیوان فارسی کے علاوہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے "دیوان فائز" مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)

۲ دیوان فائز ص ۸۵ (انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۶ء)

۳ تذکرۃ البلاغت ص ۸۹۔ ذوالفقار علی۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۲۳ء

یہی وجہ ہے کہ اردو کے شعرا جہاں شاعری کو وسعت دینے کے لیے کوشاں رہے وہاں اس میں لفظی اور معنوی حسن پیدا کرنے کی فکر میں بھی رہے تاکہ اس میں وہ خصوصیات پیدا ہوں جو اور زبانوں خصوصاً فارسی کے شعرا کے نزدیک محسنات شعر میں شمار ہیں۔

چنانچہ سودا، انشا، ذوق، غالب وغیرہ نے بھی اپنی طرف سے اردو شاعری کو ان خصوصیات سے مالا مال کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ انشا کو تو اس چیز کی اہمیت کا اس قدر احساس تھا کہ قواعد وعروض پر پہلی کتاب ''بحر الفصاحت'' مرتب کی۔

لکھنؤ میں اردو شاعری کو اچھی سرپرستی اور اچھا ماحول ملا۔ اردو کے شاعروں نے جو خواب اپنی زندگی کی آسودہ حالی اور شاعری کی سرپرستی کے دیکھے تھے ان کی تعبیر لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کے قدر داں عالم، فاضل، دولت مند لوگ، یہاں تک کہ بادشاہ وقت بھی ہوئے اور ناسخ جیسے شعرا نے شعر کی زبان ہی مختلف بنادی جس کو اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ اس کا اثر گفتگو پر بھی ہوا۔ یہاں تک کہ نثر بھی شعر زدہ ہوگئی جس کی ایک زندہ مثال رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ جب تزئین نثر کی یہ حالت ہے تو نظم کے تقاضے کیا ہوں گے۔ تشبیہ، استعارہ، اور مختلف صنائع ایک ایسے پردے کی حیثیت رکھتے ہیں جو کسی حسین بت پر پڑا تو ہو مگر اس بت کا حسن اس پردے کے اندر سے اس طرح جھانک رہا ہو کہ انسان کا دل اس پردے کو چاک کرکے اس بت کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو۔ اگر اس پردے کے اندر سے یہ بت جھانکنے کے قابل نہ رہے تو بیکار ہے۔ یہ پردہ ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے اندر چھپا ہوا بت اس سے اور خوبصورت معلوم ہو۔ اگر وہ بالکل ہی نظروں سے چھپ جائے تو بیکار ہے۔ شاد عظیم آبادی نے اپنی کتاب '' فکر بلیغ'' حصہ اول میں اس مثال سے بڑی اچھی طرح سے اس کو واضح کیا ہے :

> '' اصل یہ ہے کہ صنائع بھی وہیں تک اور وہی پسندیدہ ہوسکتے ہیں کہ جوہر کلام یعنی فصاحت و بلاغت و سلاست وغیرہ .... محض آورد نہ معلوم ہوں ورنہ ٹھیک ٹھیک وہی مثال ہوجائے گی کہ ایک کالی کلوٹی بدہیئت بد ترکیب جھریوں سے بھری ناخردس بڑھیا کو قیمتی زیورات سے لاد دیا جائے برخلاف ایک حسین زیباطلعت دل کش صورت شباب والی عورت

> کے۔ فرض کرو کہ اگر اس کے بدن پر زیور نہ بھی ہوں تو اصل جوہر حسن ہی اس کا دل کشی و جذب قلوب کے لیے کافی ہے۔ ہاں اگر مختصر طور سے اتنے زیور قیمتی (کہ اس کے حسن کو ڈھانک نہ دیں) پہنا دیے جائیں تو نورٌ علیٰ نور ہے۔''[1]

مولانا شبلی موازنہ انیس و دبیر میں کہتے ہیں کہ بعض صنائع ایسے بھی ہیں کہ اگر بے تکلفی سے آجائیں تو کلام میں حسن پیدا ہوجاتا ہے لیکن عام حالت یہ ہے کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں۔[2]

مگر شبلی نے اس بات کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ جسے وہ دیباچۂ زوال سمجھتے ہیں وہی درجہ کمال بھی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کمال کی پہچان اور اس کا دوام کیسے ہو۔ جس چیز میں آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہے وہ چیز کمال کی حد کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔

> جہاں تک مرزا دبیر کی ان خصوصیات کا تعلق ہے شبلی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ''خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔''[3]

یہ کہنے کے بعد انھوں نے ضرور مرزا دبیر کی ان خصوصیات سے نظریں پھیر لی ہیں۔ وہ دراصل ان کی مجبوری تھی کیونکہ موازنہ کرتے وقت ان کے سامنے ایک مقصد تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت راقم الحروف کو یہ نظر آتا ہے کہ جتنے وہ میر انیس کے کلام سے واقف نظر آتے ہیں اتنے ہی مرزا دبیر کے کلام سے ناواقف نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ غلط اور ناموزوں اشعار مرزا دبیر سے منسوب کیے ہیں حتیٰ کہ مرزا دبیر کا کلام میر انیس کے کلام سے پہلے شائع ہوا تھا۔ شبلی اگر تلاش و جستجو کرتے تو انہیں مرزا دبیر کا مستند کلام اس وقت کافی تعداد میں مل سکتا تھا مگر کسی وجہ سے اس کی ضرورت اس وقت انہیں محسوس نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے موازنہ میں خامیاں رہ گئیں۔

---

۱ فکر بلیغ حصہ اول ص ۵۱۔۵۰

۲ موازنہ انیس و دبیر ص ۱۱۱۔۱۱۰

۳ ایضاً ص ۲۱۸

صاحب المیزان تحریر کرتے ہیں :

''ہر زبان کے لٹریچر کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ پہلا عام درجہ جس میں معمولی روز مرہ کے خیالات سیدھی سادی زبان میں ادا کیے جاتے ہیں اور اس موقع پر صاف راستہ اختیار کرلیا جاتا ہے مگر جب یہ لٹریچر عام درجہ سے خاص اورخاص سے خاص الخاص کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے واسطے صنائع و بدائع، تشبیہات و استعارات لازمی ہوجاتے ہیں تاکہ کلام میں رفعت و دلفریبی کی ایک شان پیدا ہوجائے .... جو عالی دماغ اور قادر الکلام شاعر ہوتے ہیں ان کا مقصود اصلی تو یہی ہوتا ہے کہ کلام پرزور، پر تاثیر، پر مضمون اور لفظاً و معناً فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ اس کے بعد ضمناً صنائع و بدائع کا استعمال ایسی بے تکلفی اور بے ساختگی سے کرتے ہیں کہ وہ معنی مقصود میں مطلق مخل نہ ہوں بلکہ اس میں اور زیادہ قوت پیدا کردیں۔ شعر کا حسن دوبالا ہوجائے۔ گویا شاہد معنی کو زیور سے آراستہ کردیا۔ چنانچہ اس موزونیت کے ساتھ صنائع بدائع کے استعمال کو نیچرل شاعر بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔''[1]

شاہان اودھ چونکہ اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور صنف مرثیہ کے دلدادہ تھے۔ جس طرح فارسی میں قصیدہ بادشاہوں کے قریب لانے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا اسی طرح شاہی قرب کا یہاں واحد ذریعہ مرثیہ تھا جو اہل بیت سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور ان کی منقبت اور ان کے مراثی سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس لیے مرثیہ گو ان کے ذوق اور علمی استطاعت کے پیش نظر اس بات کی زیادہ کوشش کرتے تھے کہ وہ نئے نئے مضامین تلاش کرکے انہیں نئے نئے سانچوں میں پیش کریں۔ صنعتوں کے زیور سے کلام کو آراستہ کریں، دلآویز تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر اپنے قدر دانوں کو اور متاثر کریں۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ قدیم شعرا جس علم کو بلند کرچکے تھے اس کو اور بلندی ملتی تھی اور اردو شاعری کے پیر مضبوط ہوتے جارہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ خود انہیں عزت ملتی تھی اور دین کا لیبل

---

۱ المیزان ص ۶۶۔ ۱۶۵

تو اس پر تھا ہی۔

صنائع لفظی و معنوی

مرزا دبیر خاص طور پر اسی ماحول میں پلے تھے ان پر بھی اس کا کافی اثر تھا علمی استعداد بھی کافی تھی۔ اس استعداد نے شاعری میں مجتہدانہ قدم اٹھانے میں مدد کی اور انھوں نے اردو شاعری کو اپنے مراثی کے ذریعے فارسی شاعری کا ہم پلہ بنادیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب کے مراثی کی بدولت اردو تقریباً ان تمام صنائع و بدائع سے مالا مال ہوگئی جو عربی اور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز تھیں۔''[1]

صاحب ''حیات دبیر'' تحریر کرتے ہیں:

> ''جب مرزا صاحب کو سلیس نظم پر اور زبان پر مشق و قدرت ہوگئی اور معلومات بھی بڑھ گئیں تو صنائع و بدائع کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بات کا خیال رکھا کہ ایسے اشعار بے تکلف حتی الامکان ہوں۔''[2]

ثابت مولانا شبلی کی رد میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ صنائع کا کلام میں ہونا بے اعتدالی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بھی صنائع ملتی ہیں۔[3]

شبلی کے اپنے بیان کی روشنی میں ان کی تردید میں صاحب المیز ان رقمطراز ہیں:

> ''مولف (شبلی) خود صنائع کی ہر دلعزیزی کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے میر انیس جس زمانے میں تھے اس زمانہ میں عام طور پر صنائع بدائع کو بنظر استحسان و مقبولیت دیکھا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس رنگ کو مرزا صاحب نے کمال پر پہونچادیا اس کی دنیا کو کس قدر تلاش تھی۔ یہی وجہ ہے

---

۱ دبستان دبیر ص۱۵۲

۲ حیات دبیر ص ۱۵۹

۳ حیات دبیر ص۱۶۰۔ ثابت نے اس سلسلہ میں کئی مثالیں دی ہیں۔ ایک یہ ہے تـحسبهـم ایقاظاً و هم رقوداً آلآیہ (ترجمہ: تو ان کو جاگتا ہوا سمجھتا ہے اور وہ سورہے ہیں) سونے اور جاگنے میں تضاد ہے۔ اس صنعت کو صنعت طباق کہتے ہیں[کہف آیت ۱۸]

کہ انھوں نے زمانے کا رخ دیکھ کر اس پر زیادہ توجہ کی اور اس کو ترقی کی اس منزل پر پہنچا گئے کہ اب اس سے ایک قدم بڑھنا ناممکن ہے۔ اگر زباندانی اور سلاست پسندی کا زیادہ چرچا ہوتا تو وہ سب کو چھوڑ کر ہمہ تن اس پر متوجہ ہو جاتے۔ پس انھوں نے سلاست و سادگی پر اسی قدر توجہ کی جس قدر اس زمانہ میں اس کی مانگ تھی تاکہ یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ کسی صنف میں عاجز اور مجبور نہیں اور ان کے کلام سے ہر مذاق کے لوگوں کو حظ حاصل کرنے کا موقع ملے۔''[1]

مظفر حسین ملک تحریر کرتے ہیں:

''دبیر کے ہاں یہ صنعتیں [لفظی و معنوی] ابلاغ کی مدد کرتی ہیں اور یہ شاعر کے سلیقہ پر دلالت کرتا ہے کہ صنائع لفظی و معنوی کی اس کثرت کے باوجود کلام میں گنجلک پیدا نہیں ہوتی بلکہ حسن بڑھتا ہے اور بے تکلفی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مطالب و معانی کی توضیح ہوتی ہے اور پڑھنے والا صنعتوں کے انبار میں اس طرح گم نہیں ہوتا کہ مطلب کی طرف سے توجہ ہٹ جائے اور صرف صنعتوں کی بھول بھلیوں میں کھو کے رہ جائے۔''[2]

بہرحال یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں جتنی صنعتیں ملتی ہیں اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتیں۔ اب مرزا دبیر کے کلام سے مختلف صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) صنعت طباق۔

اس صنعت کو تقابل، تضاد، مطابقت، تطبیق، تکافو بھی کہتے ہیں۔ یعنی ایسی دو چیزیں اسم یا فعل یا حرف میں ایک جگہ جمع کردی جائیں جو آپس میں مطابق، متقابل یا متضاد ہوں۔

(۱) حضرت امام حسینؑ میدان میں جنگ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اس موقعہ پر سپاہ یزید کہتی ہے:

---

۱ المیزان ص ۶۷۔ ۱۶۶

۲ مقالہ غیر مطبوعہ ''مرزا دبیر'' مظفر حسن ملک ص ۲۵۹

حق یہ ہے رگ و ریشہ میں ڈر بیٹھ گیا ہے　　کیا پاؤں اٹھیں رن کو کہ جی بیٹھ گیا ہے

''اٹھیں'' اور'' بیٹھ گیا'' میں تضاد موجود ہے۔

(۲) القصہ گئی نہر پہ غازی کی سواری　　واں گرم وغا ہوتے ہی ٹھنڈے ہوئے ناری

'گرم' اور 'ٹھنڈے' میں تضاد موجود ہے۔

(۳) ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرم عناں ہوا　　صرصر کی سانس رک گئی جب یہ رواں ہوا

'ٹھنڈی' اور 'گرم' اور 'رک گئی' اور 'رواں ہوا' میں تضاد ہے۔

(۴) جب روزِ حساب آئے گا فریاد کرو گے　　بھولے ہوئے ہو خیر کبھی یاد کرو گے

(۵) جو مر گئے مٹی ہیں جو زندہ ہیں مریں گے　　تجھ کو یوہیں ہم بعد ترے یاد کریں گے

(۶) جنات پہ تو فتح نہ پائی تھی کسی نے　　اس آگ کو پانی کیا کس طرح علیؑ نے

(۷) حق پہ موا ہے فرقہ باطل سے پوچھ لے　　سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

(۸) کھلنا سر حرم کا کسی سے چھپا نہیں　　امت کے پردہ پوشوں کے سر پر ردا نہیں

(۹) اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر　　جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

(۱۰) وہ بولا کہ سونچا ہوں میں کچھ سب نے کہا کیا　　ہم بھی تو سنیں دردِ اجل کی ہے دوا کیا

(۱۱) سینہ تھا ورق اور ہر انگشت قلم تھی　　اور شام و سحر نام شہ دیں کے رقم تھی

(۱۲) جو قدرت حق میں ہے وہ سب اسکو ملا ہے　　مختار بہشت و سقر و ارض و سما ہے

(۱۳) ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا　　پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہوگیا[۱]

(۱۴) کھلتا نہیں کیا آنسوؤں کا تار بندھا ہے

(۱۵) منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے

(۱۶) فاقوں کی تو یہ حد ہے کہ جینے سے ہوئے سیر

(۱۷) سائے نے زیر تیغ بٹھایا کھڑے کھڑے[۲]

(۲) ایہام[۳]

ایہام کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں یعنی ایک ذو معنی لفظ کلام میں لایا

۱　مشک اور کافور کے رنگ میں بھی تضاد ہے۔

۲　خوف طوالت سے زیادہ مثالیں نہیں دی گئیں۔

۳　ثابت نے قرآن مجید سے اس صنعت کی یہ مثال پیش کی ہے: والشمس والقمر و بحسبان

جائے۔ دوسرے الفاظ کی نسبت سے جو اس لفظ کا قریبی مطلب ہو، شاعر نے وہ مطلب مراد نہ لیا ہو مثلاً مرزا دبیر کا شعر ہے:

ہستی پکاری وہ نظر آئی اجل مجھے   چلّایا دن کہ آج پڑے گی نہ کل مجھے

شاعر نے 'کل' چین کے معنوں میں استعمال کیا ہے جبکہ قاری کا خیال لفظ'آج' کی مناسبت سے فوراً ہی 'کل' یعنی دوسرے دن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

مرزا دبیر نے اس صنعت سے بھی بہت کام لیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱) نظارہ غنیمت رخِ پر نور کا جانا   موسیٰ کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا
۲) احمد مدینہ علم کا در بوتراب ہے   اس باب میں حدیث رسالتمآبؐ ہے
۳) مجرے کو خم کماں لیے چرخ بریں ہوا   اور تیر فتنہ سہم کے چلہ نشیں ہوا
۴) پلّے پہ تم ہو شیعوں کے میزاں کا ڈر نہیں

(۳) مراعات النظیر

جب کئی متناسب اور غیر متضاد چیزوں کا ذکر کلام میں لایا جائے تو اسے صنعت مراعات النظیر کہتے ہیں۔ اس صنعت کو توفیق، تناسب، ائتلاف، رعایت لفظی بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت بھی طباق کی طرح ہے۔ فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ مراعات النظیر میں ایسی چیزوں کو لایا جاتا ہے جو باہم ضدو مقابل تو نہ ہوں مگر متناسب ہوں۔ اس صنعت اور 'ضلع جگت' میں یہ فرق ہے کہ اس میں رعایت بہت ابھری ہوئی نہیں ہوتی۔ شاعروں نے اس صنعت کو بہت پسند کیا ہے چنانچہ ہر اچھے شاعر کے ہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مرزا دبیر نے بھی اس صنعت کا خوب استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر ایہام التناسب کا۔ کلام دبیر سے اس صنعت کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

۱) شامی کباب تھے یہ ہوئے جب شرر فشاں   اہل تتار بن کے ہرن، رن سے تھے رواں

والنجم والشجر یسجدان۔ نجم کے دو معنی ہیں ایک ستارہ دوسرے وہ نبات جو ساق نہیں رکھتی جیسے ساگ وغیرہ۔ اور جو نبات ساق دار ہے اس کو شجر کہتے ہیں۔ پس شمس و قمر کے ساتھ نجم آنے سے وہم ہوتا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ سے ہوگی مگر یہاں نبات بے ساق کے معنی پر آیا ہے۔ (حیات دبیر ص ۱۶۲) [الرحمٰن آیت ۵ و ۶]

مصری نہ بات کر سکے سب بولے الاماں　　بت بن کے گبر رہ گئے، پتھرائیں پتلیاں
زر دار زرد ہو کے گلِ اشرفی بنے
نصرانی خاک ہو کے گلِ ارمنی بنے

۲۔ واللہ ہات دو نگانہ فاسق کے ہات میں　　سر جائے گا پہ فرق نہ آئے گا بات میں
۳۔ ہر مور چہ لرزاں ہے سلیماں کی ہے آمد　　فرعونیوں پہ موسیِٰ عمراں کی ہے آمد
۴۔ جن سیر کو نکلے تھے یہ رستے سے مڑے ہیں　　پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اڑے ہیں
۵۔ دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں　　پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں
۶۔ نورِ نظر فاطمہؓ نے چشمِ کرم کی　　یہ عین عنایت ہے شہنشاہ امم کی
۷۔ چہرہ نہ رہا دفترِ انجم میں کسی کا　　پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا
۸۔ کھولے علم اور باندھ لیے گوشے قبا کے　　رستے میں ہوے ہوش ہوا پیک صبا کے
۹۔ ساتھ اس کا دیا جائے ہوا سے نہ پری سے　　شہباز نگہ باز رہے تیز پری سے
۱۰۔ قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہ دیں میں　　پھل جا کے لگا شاخ سرِ گاوِ زمیں میں
۱۱) جب میان سے نکلی تو میانِ سرو تن تھی
۱۲) جلوہ کیا کرسی پہ شہِ عرش نشیں نے
۱۳) بن بن کے ہوا خواہ صبا بولی میں قربان
۱۴) دکھلائے دو ہلال شہِ مشرقین نے
۱۵) بارش تھی آب تیغ کی برسات سے فزوں　　بدلی تھی فوجِ شام کی رنگتِ گھٹا تھا خوں

(۴) لف و نشر

لف کے معنی لپیٹنے کے اور نشر کے معنی منتشر کرنے کے ہیں۔ جب کلام میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور اس کے بعد ان سے منسوب خصوصیات کا ذکر کیا جائے تو اس کو لف و نشر کہتے ہیں۔ اگر ان میں باہم ترتیب ہو تو لف و نشر مرتب۔ جو ترتیب نہ ہو یعنی نمبروار سلسلہ نہ ملتا ہو تو لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱ اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب　　لرزندہ و شرمندہ و در ماندہ و بیتاب
خورشید و سحاب و فلک و انجم و مہتاب　　سوزان و خر و شان و سراسیمہ و بیخواب

بازار گل و موج و صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے، وہ آب ہے، وہ گرد ہے اس سے

۲ نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم — وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم

۳ ایمان و کفر و توبہ و عصیاں دمِ جہاد — یہ زندہ اور وہ مردہ یہ خوشدل وہ نامراد

کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیر خوش نہاد — جوہر کمند نوک سناں خود وہ برق و باد

دشمن کو قید آب و خورش سے چھڑادیا
کھینچا، گرایا، مارا، جلایا، اڑا دیا

۴ سیمرغ و شیر و کرگدن و گرگ خشمناک — پر بستہ دل شکستہ جگر خستہ سینہ چاک

۵ دو نیزے، دو رہوار، دو شمشیریں، دو صفدر — دو شمعیں، دو پروانے، دو دریا، دو شناور

دو بجلیاں، دو صاعقے، دو موجیں، دو کوثر — دو ابر تھے، دو رعد، دو باراں تھے دو اختر

دو سرو، دو گلشن، دو مہ نو، دو فلک تھے
دو سانپ دو طاؤس، دو شاہیں، دو ملک تھے[1]

۶ شرمندۂ رخسار و قد و گیسوے پرتاب — باغ تر و سرو سہی و سنبل سیراب

دندان و دہان و لب جاں بخش سے آب آب — سلک در و لعلِ یمن و دانۂ عناب

(۵) عکس

اس صنعت کو تبدیل بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ صفت ہے کہ پہلے کلام میں دو لفظ لائیں پھر ان دونوں کو الٹ پلٹ دیں۔ یعنی دوسرے کو پہلے لے آئیں اور پہلے کو بعد میں مرزا دبیر نے اس صنعت کا استعمال اس شعر میں کیا ہے :

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے[2]

---

۱ حضرت عون و محمد کی مدح میں یہ لاجواب بند ہے۔ پڑھنے یا سننے والا مسلسل تشبیہات سے لطف لیتا ہوا مدہوش سا ہوجاتا ہے۔ اتنے مضامین اس مناسبت کے ساتھ نظم کرنا اور پھر اس اختصار سے، مرزا دبیر کا ہی کام ہے۔

۲ مولانا شبلی نے اس شعر کے بارے میں کہا ہے کہ مرزا دبیر نے میر انیس کے اس شعر کو الٹا ہے۔

(۶) رجوع

جب کلام میں شاعر پہلے ہی خود ایک بات کہے پھر خود ہی اس کی تردید کرکے کسی خاص فائدہ اور نکتہ کی غرض سے دوسری بات پیش کرے اس صنعت کو" رجوع" کہتے ہیں۔ یہ بہت ہی دلچسپ صنعت ہے۔ مرزا دبیر کی قوت استدلال چونکہ کافی تھی اس لیے اس صنعت کو خوب استعمال کیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) بِنی کی ثنا مثل قلم زیبِ ورق ہے — انگشتِ یدِ قدرتِ حق کہیے تو حق ہے[۱]
ابرو کے شرف کا سر بِنی پہ سبق ہے — یہ ناخنِ انگشتِ یدِ قدرتِ حق ہے

عالم ہے مکدر کہ دل صاف نہیں ہے — اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

(افضل حسین ثابت نے حیات دبیر ص۱۶۸ پر اس کی تردید کی ہے اور بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ مولانا شبلی کی اس بات پر یقین کیا جائے۔ شبلی کا ایسی صنعتوں کو گورکھ دھندا قرار دینا بھی انتہائی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ثابت نے اکثر ایسی صنعتوں کی نشاندہی قرآن مجید میں کی ہے۔ اس صنعت کی مثال میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی ہے" الحی من المیت و یخرج المیتہ من الحی۔" اس کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو خدا نکالتا ہے۔ مرادی معنی یہ ہیں کہ عالم سے جاہل کو اور جاہل سے عالم کو خدا پیدا کرتا ہے۔ (حیات دبیر ص ۱۶۸) [الروم آیت ۱۹۔ یونس آیت ۳۱]

۱ اس میں پہلے تو بینی کو قلم سے تشبیہ دی ہے، پھر دست قدرت حق کو انگشت سے مشابہ بتا کر ابرو کو ناخن سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے بعد نیزے سے تشبیہ دے کر پیشانی کو آفتاب سے مثال دے کر یہ گریہ خیز مضمون پیدا کیا کہ کل یہی آفتاب نیزے پر علم ہوگا کیونکہ مشہور ہے کہ قیامت میں سورج سوا نیزے پر ہوگا۔ پھر اس پر ترقی دے کر آنکھ کو رحمت خدا کا دروازہ کہا اور ابروؤں کو دربان اور دربان کا عصا بِنی کو بتایا پھر اس مضمون سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ ناک دو آنکھوں کے درمیان مثل تکیہ کے ہے اور پتلیاں مثل مردم بیمار ادھر ادھر ہیں اور یہ بیمار مئے عرفان الٰہی میں ایسے مست و مخمور ہیں کہ بیہوشی میں بھی سوائے خدا کے کسی پر تکیہ نہیں کرتے اور پلکوں کے سوا ناک کو بھی بستر پہ نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود اس طرح گردش میں ہیں کہ تکیہ پر کبھی سر نہیں رکھا۔ بعد میں ان تمام مضامین پر ترقی کر کے قلم، نیزہ، تکیہ، عصا سے انحراف کر کے کہتے ہیں کہ یہ دراصل دو عالم کا نور ہے جو ایک جگہ جمع ہوگیا ہے اور یہ غش ہونے کا مقام ہے۔ مدح کہاں ہو سکتی ہے۔

دل شیعوں کا چسپیدہ نہ کیوں اس سے سدا ہو
ممکن نہیں ناخن سے کبھی گوشت جدا ہو

خورشیدِ جبیں کا سرِ بینی ہے یہ اظہار | خورشید یوں ہیں نیزے پہ کل ہوگا نمودار
توبہ کہاں نیزہ کہاں بینی خوش اطوار | چشمِ علی اکبر ہے درِ رحمتِ غفار

در باں کہوں ابرو کو یہاں میں تو بجا ہے
بینی مبیں حاجبِ ابرو کا عصا ہے

بینی کا کھلا بیچ میں آنکھوں کے یہ اسرار | ہے بیچ میں اک تکیہ دو جانب ہیں دو بیمار
بیمار ہیں مخمور مئے الفت غفار | بیہوشی میں بھی غیر پہ تکیہ نہیں زنہار

پلکوں کے سوا نام کو بستر نہیں رکھا
سونا کہاں تکیہ پہ کبھی سر نہیں رکھا

پھر مدحت بینی میں مری عقل رسا ہے | نیزہ ہے نہ تکیہ ہے نہ خامہ نہ عصا ہے
اب ہم سے محبانِ علی پوچھیں کہ کیا ہے | ہشیار ہوشیار یہ غش ہونے کی جا ہے

بینی کی زیارت کرو آداب سے ہٹ کر
اک جا ہوا [ہے] نور دوعالم کا سمٹ کر

---

(۲) رو دار ہے خورشید پہ ابرو نہیں رکھتا | ابر و مہِ نو رکھتا ہے پر رو نہیں رکھتا
قد رکھتا ہے شمشاد پہ گیسو نہیں رکھتا | سنبل کے ہیں گیسو قدِ دل جو نہیں رکھتا

گل گوش ہے پر گوشِ سماعت نہیں رکھتا
غنچہ ہے دہن، طرزِ فصاحت نہیں رکھتا

بو ہے گل جنت میں پہ رخسار نہیں ہے | ایمن میں تجلی ہے پہ دیدار نہیں ہے
قد رکھتا ہے طوبیٰ بھی، پہ رفتار نہیں ہے | شیریں لب کوثر ہے پہ گفتار نہیں ہے

آئینے میں رو ہے یہ خط سبز کہاں ہے
غنچے کے دہن ہے نہ زباں ہے نہ بیاں ہے[1]

---

۱ اس میں چہرے کو سورج سے مشابہ کیا ہے پھر سورج کے حسن پر اس کو یوں ترجیح دی ہے کہ سورج ابرو نہیں رکھتا اور مہِ نو میں ابرو تو ہے مگر چہرہ نہیں ہے۔ ممدوح کے قد کو شمشاد سے

(۳) گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
چہرے پہ مہِ عید کی بے جا ہے اشارت وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدر کی بشارت
ابرو کے مہِ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے
اک شب وہ مہِ نو ہے یہ ہر شب مہِ نو ہے[۱]

(۷) جمع

کلام میں چند چیزوں کو پیش کر کے ایک حکم میں جمع کرنے کو صنعت جمع کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی اس آیت میں بھی یہ صنعت موجود ہے المال و البنون زینته الحیوٰة الدنیا۔ یعنی مال و اولاد، زندگی دنیا کی زینت ہیں پس مال و اولاد کو ایک حکم میں جمع فرمایا ہے۔[۲]

تشبیہ دی مگر اس کو یوں باطل قرار دیا ہے کہ یہ گیسو نہیں رکھتا۔ گیسو کی وجہ سے سنبل کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر سنبل میں قدِ دلجو نہ پاکر اپنے ممدوح کو آگے لے جاتے ہیں۔ گل گوش ہے مگر صفت سماعت اس میں نہیں، دہن کی وجہ سے غنچہ کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر اس میں فصاحت نہ ہونے کی وجہ سے آگے بڑھتے ہیں۔ خوشبو کو گل جنت محسوس کرتے ہیں مگر رخسار نہ ہونے کی وجہ سے ایمن کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں تجلی ہے مگر دیدار نہیں ہے۔ قد کی وجہ سے طوبیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر اس میں رفتار نہیں پاتے۔ لب کوثر میں شیرینی ہے مگر گفتار نہیں۔ آئینے میں رو ہے مگر خط سبز نہ ہونے کی وجہ سے اس کو بھی غلط قرار دیتے ہیں۔ غنچے کے دہن میں زبان و بیان کی خصوصیات نہ دکھا کر اپنے قاری کو اور آگے لے جاتے ہیں۔ قاری محوِ حیرت ہوجاتا ہے کہ شاعر نے اتنی تشبیہیں دی ہیں مگر رجوع کے لیے مجبور ہوجاتے ہیں۔

۱ اپنے ممدوح کی آنکھ کی مدح کرنے میں کس طرح رجوع کرتے ہیں کہ کہیں کوئی بات غیر فطری معلوم نہیں ہوتی اور نہ صرف اپنی تشبیہوں کو غلط قرار دیتے ہیں بلکہ بڑے بڑے شاعروں کی تشبیہوں کا بطلان اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی عقل نارسا تھی۔ انھوں نے آنکھ کو نرگس سے چہرے کو مہِ عید سے، ابرو کو مہِ نو سے تشبیہ دیتے وقت غور و فکر سے کام نہیں لیا اور رجوع اس طرح کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا شاعر کے جذبۂ دل کے ساتھ اپنے آپ کو ملادیتا ہے اور کسی ایسی چیز کا متلاشی ہوجاتا ہے جس کو نہ شاعر نے پیش کیا نہ اس کے سامنے ہے۔

۲ حیات دبیر ص ۱۷۴ [الکہف آیت ۴۶]

مرزا دبیر نے اس صنعت کو اپنے کلام میں کمال فن کے ساتھ جگہ دی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) نقاش و نقش و کاتب و خط بانی و بنا ۔۔۔ بود و نبود و ذات و صفت ہستی و فنا
آدم، ملک، زمین، فلک، گرد، کیمیا ۔۔۔ دنیا و دیں، حدوث و قدم، بندۂ خدا
سب شاہدِ کمالِ شہِ مشرقین ہیں[۱]
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں

(۲) باران و قطرہ، باغ و گل و معدن و گہر ۔۔۔ صحرا و ذرہ، برج و نجوم آتش و شرر
طور و کلیم و آب بقا، خضر نامور ۔۔۔ ظلمات و نور شہر و بیابان و خشک و تر
شاہد ہیں سب کہ صاحب اعجاز ہیں حسینؑ
جان آفریں کے عاشقِ جانباز ہیں حسینؑ[۲]

(۳) سورج کو چھپاتا ہے گہن، آئینہ کو زنگ ۔۔۔ داغی ہے قمر، سوختہ دل، لالہ خوش رنگ
دیکھو گل و غنچہ وہ پریشاں ہے یہ دل تنگ ۔۔۔ کیا اصل، در و لعل کی وہ پانی ہے یہ سنگ
اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا
بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا[۳]

(۴) شبیر کے بازو بھی ہیں اور زور کمر بھی ۔۔۔ رشتہ میں برادر بھی ہے الفت میں پسر بھی

---

۱ بڑی بے تکلفی سے ہر مصرع میں ٦ چیزیں جمع کی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز چھوڑی نہیں۔ اس سے مرزا دبیر کی قدرت زبان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

۲ باران و قطرہ، باغ و گل، معدن و گہر، صحرا و ذرہ، برج و نجوم، آتش و شرر، طور و کلیم آب بقا و خضر، وغیرہ الفاظ میں جو مناسبت قدرتی ہے اس پر غور کیا جائے اور ٹیپ کے مصرع ثانی میں جان آفرین و جاں باز کے الفاظ کو مدِ نظر رکھا جائے تو مرزا دبیر کی زبان دانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اگر اس چیز کو سامنے رکھا جائے تو وہ اس سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ شبلی کا مرزا دبیر کی زبان دانی پر اعتراضات کرنا اور یہ کہنا کہ وہ صنائع و بدائع کے لیے کوشاں رہتے ہیں، ان کا ذخیرہ ان کے پاس اتنا ہے کہ سنبھال نہیں پاتے، درست نہیں معلوم ہوتا۔

۳ روے حضرت عباس کی مدح میں کئی اعلیٰ چیزوں کو اس حکم میں جمع کرتے ہیں کہ سب میں ایک عیب ہے مگر ان کے ممدوح کا چہرہ بے عیب ہے۔

خادم بھی مصاحب بھی دل و جاں بھی جگر بھی اللہ کی شمشیر، شہِ دیں کی سپر بھی
ثابت یہ ہوا، رن میں جو تیروں سے چھنے ہیں
شبیر کی خاطر زرہِ حفظ بنے ہیں[1]

(۵) شمع و چراغ و آئینہ و صبح و آفتاب باغ و بہار و یاسمن و لالہ و گلاب
ناہید و بدر و مشتری و قطب و ماہتاب آب حیات، لعل بدخشاں درِ خوش آب
یوسف اور ان کے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف، یہ روئے ضیا بار اک طرف

اس بند میں مدح رخِ حضرت امام حسینؑ میں ۱۹ ایسی چیزوں کو جمع کیا ہے جو بہت ہی قیمتی اور خوبصورت ہیں اور پھر یہ حکم لگایا ہے کہ ان کے ممدوح کا چہرہ ان سب سے بہتر اور خوبصورت ہے۔

(۶) نخل و گل و برگ و ثمر و میوہ و طوبےٰ خلد و ارم و کوثر و فردوس مصلےٰ
ہر مصحف و سیپارہ و ہر سورہ ہر آیہ انسان و جن و حور و ملک آدم و حوا
ان سب سے کہو کون امامِ ازلی ہے
بے ساختہ چلائیں حسینؑ ابن علیؑ ہے

---

(۸) تفریق

کلام میں ایک طرح کے دو امروں میں فرق ظاہر کرنے کو صنعت تفریق کہتے ہیں۔ چند مثالیں کلام مرزا دبیر سے ملاحظہ ہوں:

۱۔ شیریں رقموں میں رقم اس لب کی جدا ہے اک نے شکر اور ایک نے یاقوت لکھا ہے
یاقوت کا لکھنا مگر انسب ہے بجا ہے یاقوت سے بڑھ کر جو لکھوں میں تو مزا ہے

---

۱ اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عباسؑ کا امام حسینؑ سے تعلق اس صنعت میں ظاہر کرنے کے باوجود مرثیت کا پہلو بھی برقرار رکھا ہے۔ امام حسینؑ کا زور کر ٹوٹنا یا حضرت عباسؑ کا تیروں کی بوچھار سے بہت زخمی ہونا' ان گریہ خیز واقعات کو ساتھ ساتھ چلانا مرزا دبیر کے فن کا آئینہ ہے جس میں ان کے کمال کو بڑی خوبی کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے۔

چوسا ہے یہ لب مثل رطب حق کے ولی نے
یاقوت کا بوسہ لیا کس روز علیؑ نے[1]

۲۔ آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی — صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی — طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا[2]

۳۔ گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت — نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت[3]

۴۔ آئینے کے آئین پر میں نے جو کیا غور — منہ پر تو ہے کچھ اور پسِ پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور — پر حاضر و غائب دلِ روشن کا ہے اک طور
جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے[4]

۵۔ رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہوکر — حیدرؑ کو کہا ابر، سخنداں ہوکر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر — وہ دیتا ہے رورو کے یہ خنداں ہوکر[5]

---

(۹) تقسیم

صنعت تقسیم، لف و نشر کی طرح کی صنعت ہے۔ فرق یہ ہے کہ لف و نشر میں سننے یا پڑھنے والا خود بخود ہر شے کو منسوب الیہ کی طرف منسوب و متعین کرلیتا ہے اور

---

۱ یاقوت اور حضرت عباسؑ کے لبوں میں تفریق

۲ آئینہ اور روے انور حضرت عباسؑ میں تفریق

۳ آنکھ اور نرگس میں تفریق۔ عام شعراء آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دیتے ہیں اور مرزا دبیر آنکھ کو نرگس سے اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ نرگس ہیچ اور پست نظر آتی ہے۔

۴ آئینہ اور صفائے قلب میں تفریق

۵ اس رباعی میں اور شاعروں کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہ سخنداں ہوکر حیدر کو ابر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا دبیر دونوں میں تفریق اس طرح کرتے ہیں کہ ابر روتا ہے (برسنے کو رونا کہا ہے) اور ان کے ممدوح میں یہ صفت ہے کہ جو دیتے ہیں ہنس ہنس کر دیتے ہیں۔

تقسیم میں شاعر چند چیزیں بیان کرتا ہے یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کرتا ہے۔ پھر ہر چیز یا ہر جزو کے منسوب کو بطریق تعین بیان کرتا ہے۔ اس صنعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی شے کی تمام قسموں کو ایک جگہ بیان کیا جاتا ہے۔

صنعت تقسیم میں مرزا دبیر نے امام حسینؑ کے عزاداروں کی مدح اس طرح کی ہے:

پابندی طاعت پہ ہے اس مشغلہ کو فوق　　سجادؑ کے ماتم میں پہنتا ہے کوئی طوق
دلدل کے بنانے کا کسی شیعہ کو ہے ذوق　　عباس کا سقا کوئی بنتا ہے بصد شوق
لیتا ہے کوئی تعزیہ زہراؑ کے خلف کا
تابوت اٹھاتا ہے کوئی شاہ نجف کا

تابوت اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت　　دلدل کے بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی حکومت　　دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابد کے لیے طوق پہنتے ہیں سو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرۂ حفظِ خدا ہے

جمع و تفریق کو ایک ساتھ اور کبھی جمع و تفریق و تقسیم کو اور کبھی جمع و تقسیم کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر ان کا فرق بیان کیا جاتا ہے یا ان کی تقسیم کردی جاتی ہے یا ان دونوں خصوصیات کو پیش کیا جاتا ہے۔ مرزا دبیر حضرت عباسؑ کی مدح میں کہتے ہیں:

پیدا ہوں جو ایسے چمنستانِ جہاں لاکھ　　افلاک کروڑ اور زمینیں ہوں عیاں لاکھ
باراں کے ہر اک قطرے سے طوفاں ہوں عیاں لاکھ　　گھر گھر ہوں مسن خضر سے یوسف سے جواں لاکھ
نایاب ہوں نزدیک کی اور دور کی شکلیں
سب نور کے رخسار ہوں سب نور کی شکلیں

کیا منہ جو نقابوں سے حسیں منہ کو نکالیں　　عیسیٰ قسم انجیل کی بے ساختہ کھالیں
توریت کو موسیٰ یدِ بیضا پہ اٹھالیں　　فرقان مبیں فرق پہ خاصانِ خدالیں
انصاف خدا بڑھ کے حکم ہو کہ یوں ہے
اتنوں میں کوئی ثانیِ عباسؑ نہیں ہے

---

(۱۰) صنعت تجرید

یہ مبالغہ کی ایک سرسبز شاخ ہے۔ یہ صنعت اس طور پر ہے کہ ایک صاحب صفت شے سے مبالغہ کے قصد سے اسی شے کے مانند دوسری چیز حاصل کریں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم اس کی یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے آپ کو ایک دوسرا شخص قرار دے کر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ اس سے کوئی شاعر خالی نہیں۔ مقطع میں تو شعرا اکثر اسی طرح خطاب کرتے ہیں۔ کلام مرزا دبیر سے مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ آغاز مرا خاک تھا ہے خاک ہی انجام — دیکھ اپنی بدی خوب، بد و نیک سے کیا کام
گر مہر نہیں دل پہ تو نخوت کا نہ لے نام — نازاں نہ ہو دنیا پہ، نہ کر شکوۂ ایام

ارشاد کیا طور پہ موسیٰ سے خدا نے
اچھا وہ ہے، جو سب سے برا آپ کو جانے[1]

۲۔ بالوں کی سفیدی سے سرِ مو نہیں رنجور — دھوپ آ گئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستور
ہشیار کہ نزدیک رہا اب سفرِ دور — ہاں ڈھونڈ کفن، مشک جوانی ہوا کافور

اے ملکِ عدم کے سفری زادِ سفر لے
مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے[2]

(۱۱) مبالغہ

یعنی کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اس حد تک دعویٰ کرنا کہ اس کا وہاں تک پہنچنا ممکن اور محال ہو، تا کہ سامع کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کی شدت یا ضعف کا کوئی مرتبہ باقی ہے۔ فن بدیع کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔ جب مبالغہ عقلاً و عادتاً ممکن ہو تو اسے تبلیغ کہتے ہیں۔ جب باعتبار عقل ممکن ہو اور باعتبار عادت محال ہو تو اس کو اغراق کہتے ہیں۔ جب دونوں عقل اور عادت کی رو سے محال ہو تو اسے غلو کہتے ہیں۔

---

۱ آپ کو یعنی اپنے نفس کو

۲ اس میں اپنے نفس سے خطاب کیا ہے۔

عربی اور فارسی شاعری میں مبالغہ اپنی حد کو پہنچ چکا تھا۔ اردو شاعروں نے بھی مبالغہ سے خوب کام لیا ہے۔ حقیقت میں مبالغہ لطفِ کلام ہے۔ مرزا دبیر نے بھی اس کو خوب برتا ہے، اس وقت کا لکھنو مبالغہ پر جان دیتا تھا اور اسے حسنِ کلام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اسی میں شاعر کی نزاکتِ حسن اور تخیل کی بلندی نمایاں ہوتی تھی۔ مرزا دبیر عوام و خواص میں مقبول تھے۔ ان کی پسند کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے رخ اور مذاق کو پہچانتے تھے۔ انھوں نے مبالغوں میں وہی انداز اختیار کیا جو اہل مذاق کو مرغوب تھا۔ اگرچہ انھوں نے دوسرے بلند خیال شعرا کی طرح مبالغوں میں اکثر جگہ تبلیغ اور اغراق سے گزر کر غلو سے کام لیا ہے مگر اس میں بھی وہ دلچسپ پیرائے سے کام لیتے ہیں کہ طبیعت محظوظ ہوتی ہے۔ سامعین ایسے موقعوں پر ان کی جدت، رسائی طبع، باریک بینی، نکتہ سنجی اور بلند پردازی کی بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ مولانا شبلی بھی مرزا دبیر کی اس خصوصیت کی تعریف کرتے ہیں[1]۔ مگر ارادتاً مبالغہ کو ہی معیوب قرار دیا ہے حالانکہ شاعر کتنا بھی حقیقت پسند کیوں نہ ہو بغیر مبالغہ کے کلام میں تاثیر پیدا کرنا مشکل ہے۔ اب اس میں شاعر کا کمال یہ دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح اپنے استدلال سے اسے دلچسپ بنادیتا ہے اور اپنے سامع کو متاثر کرتا ہے۔ شاعری تو تخیل کا کھیل ہے یہ کسی سائنسداں کا اپنے معمل (Laboratory) میں کیا ہوا تجربہ نہیں ہے جس کا ایک ایک حرف یا ایک ایک حصہ عملی زندگی میں صحیح ہونا چاہیے اور پھر انسان کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو پرانی مثنویوں اور داستانوں میں پیش کی ہوئی پریوں کی کہانیاں کتنی غیر حقیقی، مصنوعی اور بے جان نظر آتی ہیں۔ مگر غور کیجیے تو یہی مصنوعی خیالات، ناممکن خواہشیں، نامکمل تصورات اور ناقابل عمل اقوال انسان کی پیش رفت کے لیے مہمیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس مبالغہ نے ایک سائنس داں کے لیے ہائی پوتھیس (Hypothesis) کا

---

1 لکھتے ہیں "میر انیس کے زمانہ میں مبالغہ کمال کی حد کو پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب تک مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہیں ہوتا تھا' سامعین کو مزا نہیں آتا تھا مجبوراً میر صاحب نے بھی وہی روش اختیار کی لیکن چونکہ ان کی اصلی فطرت میں سلامت روی اور اعتدال تھا اس لیے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے" (موازنہ انیس و دبیر ص ۱۱۵)

کام کیا ہے اس لیے راقم کا خیال یہ ہے کہ مبالغہ نے انسانی زندگی میں بڑا کام کیا ہے۔ دماغ کو ورزش کا موقع دیا ہے اور سوچ کے دروازے وا کردیے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ عام آدمی اور خاص آدمی میں فرق ہے۔ علماء اور ادباء پر اس کا اثر اچھا ہوگا۔ اور وہ گمراہ نہیں ہوں گے مگر کم فہم انسانوں پر اس کا اثر اتنا اچھا نہیں ہوگا۔

مبالغہ کے لیے شاعر ایک بنیاد کو سامنے رکھتا ہے اور پھر اپنی ذہنی قوت سے اس کو بڑھا چڑھا کر یعنی میگنیفائی (Magnify) کر کے پیش کرتا ہے۔ یہی بڑھا چڑھا کر پیش کرنا یعنی میگنیفکیشن (Magnification) اس کی باریک بینی اور نکتہ رسی کی دلیل ہوتی ہے۔ کلام مرزا دبیر سے اس ضمن میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے آپ ان کی قوت مبالغہ کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ استدلال سے بھی محظوظ ہوں گے:

۱) مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے دانہ بریاں درِ خوش آب آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب
یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی[1]

۲) اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا
چلنے میں یہ سرعت ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا[2]

۳) طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ تھی
رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ تھی[3]

---

۱ گرمی کی شدت میں مبالغہ

۲ گھوڑے کی رفتار میں مبالغہ

۳ ایضاً

۴) لڑنے میں یہ ہے عقل، بگڑنے میں جہالت　　بڑھنے میں یہ ہے حرص تو گھٹنے میں قیامت
جانے میں حواس آنے میں عاشق کی طبیعت　　مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت
ہر سو جو نسیم اس کے طرارے کی بہی ہے
سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے[۱]

۵) چلنے میں یہ شمشیر ہے چلے میں ہے یہ تیر　　لڑنے میں یہ تدبیر بگڑنے میں ہے تقدیر
چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر　　جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر
مضموں ہیں بہت پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہے اعجاز ہے یہ اسپ نہیں ہے[۲]

---

(۱۲) حسنِ تعلیل

یہ ایک لطیف صنعت ہے جس میں شاعرانہ نزاکت کی پہچان بخوبی ہوتی ہے۔ اس میں شاعر ایک ایسی چیز کی علت فرض کرلیتا ہے جو دراصل اس کی علت نہیں۔ اس صنعت کے برتنے میں شاعر کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے کیونکہ دلیل اس میں بہت ہی اہم ہے۔ اگر فرض کی ہوئی صفت کے حق میں دلیل پیش نہ کرسکا تو کلام ہی بے لطف ہوکے رہ جائے گا جس قدر شاعر کا ذہن تندرست ہو، قوت استدلال زیادہ ہو، اسی قدر اس صنعت میں جان ڈال سکتا ہے۔ مرزا دبیر اس صنعت میں بھی، اردو شاعروں میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱) چاروں طرف تھا بسکہ ہجوم سپاہِ شام　　گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالک کوثر تھا تشنہ کام　　بالکل الٹ دیے تھے حبابوں نے اپنے جام
دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے[۳]

۱　ذوالجناح کی خوبیوں میں مبالغہ مگر اس میں روزمرہ کی مدد سے اس کو بہت خوبصورت بنادیا ہے۔

۲　اسپ علی اکبر کی تعریف میں مبالغہ۔ اس میں بھی روزمرہ سے اس خوبی سے کام لیا ہے کہ سامع میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔

۳　مالک کوثر کی پیاس کے قلق کی وجہ سے حباب اپنے جام الٹ دیتے ہیں اور دریا اپنے منھ پر طمانچے

۲) کس کا یہ حق ہے معرکۂ کار زار میں — اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

۳) دل صاف سینہ صاف بدن صاف واہ واہ — تن پر زرہ بتاتے ہیں گو صاحب نگاہ

پر عقل کہہ رہی ہے کہ سب کو ہے اشتباہ — حر کی صفائے قلب ہے اس بات پر گواہ

دل حر کا مضطرب غم شاہِ زمن میں ہے

یہ دل کا پیچ و تاب نمایاں بدن میں ہے[۱]

۴) چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں

خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

۵) عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا

جوبن ٹپک رہا ہے جوانی کے حسن کا[۲]

۶) دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو

مانندِ غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو[۳]

۷) فوارہ بلندی کی طرف چھوٹ رہا تھا — پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اٹھا تھا

۸) شب عقد حضرت علیؑ

ناگاہ وہ شام آئی کہ جو صبح سے لے باج — غازہ رخ نو روز کا عیدین کی سرتاج

حسنِ شب قدر و شب بدر و شب معراج — تھی رات بھی نازاں کہ علی کی تھی برات آج

کثرت وہ ستاروں کی شب جلوہ فگن پر

مشاطوں کا جھرمٹ تھا شب عقد دلھن پر

سج دھج تھی عروس شب شادی کی نرالی — پھولی شفقِ شام کے لالے کی جولالی

مارتا ہے۔ الٹنے اور طمانچے مارنے کی علت کو حباب کی قدرتی صورت اور موج کی قدرتی حرکت سے ثابت کر کے کمال کر دکھایا ہے۔

۱ حضرت حر کی زرہ کی نسبت حسنِ تعلیل کیا لاجواب ہے۔ حر کی بہادری کی وجہ سے کوئی قریب جا کے دیکھ نہیں سکتا اور دور سے لوگ جس کو زرہ سمجھتے ہیں وہ دل کا پیچ و تاب ہے جو صفائے قلب، صفائے سینہ اور صفائی بدن کی وجہ سے دور سے نظر آ رہا ہے۔

۲ ذوالفقار آبدار کی نسبت کہتے ہیں کہ اس سے دشمنوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔

۳ یہ شعر مرزا دبیر کے اخلاق کا بھی آئینہ ہے۔

ہلکی سی لبِ بامِ فلک اس نے جمالی　　پازیب بھی اور کان کے بندے بھی ہلالی
موباف زری نظم کیا کاہکشاں کو
مضموں یہی چوٹی کا ملا اہلِ زباں کو[1]

---

(۱۳) مُذہب کلامی

کلام میں دعویٰ کے ساتھ دلیل لانے کو مذہب کلامی کہتے ہیں۔ یہ صنعت بھی فارسی شعراء کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ بیدل اور غنی کاشمیری اس صنعت کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس قسم کی شاعری کو تمثیلی شاعری بھی کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں بھی یہ صنعت موجود ہے "لو کان فیھما الھتہ الا اللّٰہ لفسدتا'' یعنی اگر آسمان و زمین میں کئی خدا ہوتے تو زمین و آسمان فاسد[2] ہوجاتے۔ اب کلامِ دبیر سے چند مثالیں اس صنعت کی ملاحظہ ہوں:

۱) باطل ہے سوا حق کے بد و نیک کا سجدہ　　ہے ایک جبیں فرض ہے بس ایک کا سجدہ
۲) گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت　　نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت
۳) ہوتی تھیں صفیں آبِ دمِ تیغ سے بے دم　　پانی جو کھڑے ہو کے پیو ہوتا ہے سن کم
حل کرتی تھی ہر مسئلہ تیغِ شہِ عالم　　ہے خون نجس اس میں یہ آلودہ تھی ہر دم
پر اس پہ نجاست کا گماں ہو نہیں سکتا
یعنی کہ نجس آبِ رواں ہو نہیں سکتا

---

(۱۴) تاکید المدح بمایشبہ الذّم

یہ صنعت اس طرح ہے کہ مدح میں ایسی تاکید کی جائے کہ ذم کا پہلو سامنے آتا ہو۔ مرزا دبیر کے کلام سے مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱) قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی　　لیکن نہ ہے نہ ہوئیگی قدرت گناہ کی

۱　یہ بند اپنی جگہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں عروس کے سامانِ آرائش کی فہرست دی ہے مگر اس طرح کی ابتذال نہیں آنے پایا۔

۲　حیات دبیر ص ۱۸۲ [الانبیاء آیت ۲]

۲) جز دستِ گدا اور کہیں زر نہیں رکھتے　　تکیہ کرم حق پہ ہے بستر نہیں رکھتے
۳) بے مہری افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں　　ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہل ہنر ہوں
۴) کیا زہد ہے کیا فیض کہ رغبت سے کبھی　　روزے کے سوا کچھ نہ علیؑ نے رکھا
۵) میں کون ہوں صاحب علم کلک جہانگیر　　نوبت زنِ نہ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر　　خاکِ قدمِ محتشم و مقبل و شبیر
منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خدا وند یوہیں ہے

---

(۱۵) استتباع

کلام میں مدح اس طرح سے کرنے کو کہتے ہیں کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) دنیائے دنی ان کا نشانِ کفِ پا ہے　　لیکن وہ نشاں ہے کہ کفِ پا سے جدا ہے
عقبیٰ کی جو تعریف سنا کرتے ہو کیا ہے　　وہ اک رہِ باریک ہے یہ راہ نما ہے
لو سن لو خلاصہ کہ یہ وہ خاصۂ حق ہے
بے اس کی گواہی کے نہ باطل ہے نہ حق ہے[۱]

(۲) خالق نے عطا کی شہِ مرداں کو یہ قدرت　　لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت
گردوں نے بلندی لی زمیں نے زر و دولت　　یوسف نے لیا حسن، سلیمان نے حشمت
پر ان کی قناعت ہے فزوں حدّ بیاں سے
جز نامِ خدا آپ لیا کچھ نہ زباں سے

(۳)　　دِرہم ہیں یوں پرے کہ قرار اب محال ہے
درہم کاشہ کے دست کرم میں جو حال ہے[۲]

۱　یہ بند حضرت عباس کی مدح میں ہے۔ دنیا کو ان کی کف پا کا نشاں بتایا ہے۔ پھر اسی میں سے دوسری مدح نکالی اور یہ کہا کہ وہ نقشِ کفِ پا سے جدا ہے۔

۲　میدان جنگ میں امام حسین کی آمد سے متعلق شعر ہے۔ حسین کی شجاعت کی وجہ سے فوجوں کے پرے درہم برہم ہورہے ہیں اور پھر دِرہم سے ملاکر یہ بتایا کہ جس طرح امام کے دستِ

(۱۶) ادماج

یہ بھی ایہام کے قریب قریب ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ایہام میں ایک لفظ ذومعنی ہوتا ہے اور ادماج میں تمام کلام سے دوسرے معنی نکلتے ہیں۔ یہ مدح و ذم اور ہر شے کے بیان کے واسطے آتا ہے۔ مرزا دبیر اس موقع پر کہ جب شمر نے حضرت زینبؑ کے فرزندوں عونؑ و محمدؑ کو دو علم پیش کر کے اپنے ساتھ ملانا چاہا' اس صنعت میں کہتے ہیں:

بہکا انھیں، خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں   کہہ ان سے یہ شقی، جو تجھے جانتے نہ ہوں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان کو بہکا جو تجھے نہ جانتے ہوں دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ ان سے کہہ جو تجھ کو شقی نہ سمجھتے ہوں۔

---

(۱۷) تعجّب

مبالغۂ مدح کی غرض سے جب شاعر کلام میں کسی فائدہ یا غرض کی وجہ سے اظہار تعجب کرے اس کو صنعت تعجب کہتے ہیں۔

آمد جناب علی اکبر میں مرزا دبیر کہتے ہیں:

۱۔ نورِ نظر شاہ جو گھر سے نکل آیا   حیران ہیں سب چاند کدھر سے نکل آیا

۲۔ ہنستے تھے آہ رونے پہ ابن بتولؑ کے   کیسے یہ کلمہ گو تھے جنابِ رسولؐ کے

صنائع معنوی اگر کلام کو عظمت بخشتی ہیں تو صنائع لفظی اسے خوبصورتی اور ترنم دیتی ہیں۔ معنی کو اگر کلام کی سیرت سمجھا جائے تو لفظ اس کی صورت ہیں۔ مگر صنائع لفظی کا استعمال کرتے وقت کلام کے معنی کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ صرف قادر الکلام شعرا کے ہاں ہی یہ بات ملتی ہے کہ صنائع معنوی و صنائع لفظی دونوں کا بوجھ سنبھال سکیں۔ کلام میں بے ساختہ پن کا قائم رکھنا بھی آسان کام نہیں۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

'' وزیر صاحب مرحوم پسر جناب مفتی میر عباس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے فرماتے

کرم پر یہ بیقرار رہتا ہے وہی بیقراری فوجوں میں ہے۔ اس میں سخاوت کی مدح بھی ہے اور درہم و دِرہم میں تجنیس خطی بھی ہے۔

> تھے کہ جناب مفتی صاحب اعلی اللہ مقامہ اکثر مرزا صاحب کے بے نقط مرثیہ، مہر علم سرور اکرم ہوا طالع، کی تعریف فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فیضی نے سواطع الالہام تفسیر قرآن بے نقط لکھی مگر جا بجا ٹھوکریں کھائیں۔ مثلاً حضرت یوسف کو ولد لاعمیٰ لکھا ہے۔ لفظ اعمیٰ ایک نبی معصوم یعقوب کی نسبت سوء ادب ہے۔ مرزا صاحب کا مرثیہ ان لغزشوں سے پاک ہے۔"[1]

غرض بڑے قابل ادیب و شاعر صنائع لفظی کو برتنے کے شوق میں کئی اور طرح کی خامیوں کے شکار ہوجاتے ہیں مگر مرزا دبیر ایک خلاق ذہن رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ہر طرح کے الفاظ اس تعداد میں موجود رہتے تھے کہ وہ بآسانی انہیں استعمال کرتے تھے۔

مرزا دبیر کے کلام سے صنائع لفظی کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

ا صنعت تجنیس

اس کی کئی قسمیں ہیں:

ا۔ ایسے دو ہم صورت لفظ لائے جائیں جو معنی میں مختلف ہوں۔

۲۔ دونوں الفاظ کے اجزاء میں مشابہت ہو۔

۳۔ دونوں الفاظ قریب المخرج ہوں۔

۴۔ تجنیس قلب۔ کہ ایک لفظ کو الٹیں اور وہی فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ یا دوسرا فقرہ یا مصرع پیدا ہو۔ اس کو مقلوب مستوی کہتے ہیں۔

تجنیس کی ایک اور قسم تجنیس تام ہے۔ اس میں ایک ہی لفظ کو دو جگہ دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تجنیس تام کی ایک مثال کلام مجید سے بھی دی جاتی ہے، وہ اس طرح ہے " و یوم تقوم الساعتہ یقسم المجرمون ما لبثو اغیر ساعتہ " ظاہری الفاظ کے معنی یہ ہیں" جس روز قیامت ہوگی گنہگار قسم کھائیں گے کہ نہ ٹھہرے وہ مگر ایک گھڑی۔"[2]

ا حیات دبیر جلد اول ص ۱۸۹

۲ حیات دبیر جلد اول ص ۱۹۰ [الروم آیت ۵۵]

اب کلامِ مرزا دبیر سے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱) مومن کو ہر اک بکا سے بے زاری ہے — واجب غم شہ میں گریہ و زاری ہے
جز ماتمِ نورعین زہراؑ رونا — آنکھیں کہتی ہیں مردم آزاری ہے[۱]

۲) جب قبلہ کو ہم نے رخ امید پھرایا — مغرب کی طرف شام کو خورشید پھر آیا[۲]

۳) ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سر دربار — دربار میں دُر بار علی ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنین ان پہ تصدق مرا گھر بار — عارض ہیں قمر بار لب لعل گہر بار
یہ والی اقلیم ولایت کا ولی ہے
تصویرِ تولائے حسینؑ ابن علیؑ ہے[۳]

---

(۲) اشتقاق و شبہ اشتقاق

یہ بھی صنعت تجنیس کی ہی خوشنما شاخیں ہیں۔ اشتقاق میں ایک ہی مادہ کے دو لفظ لائے جاتے ہیں اور شبہ اشتقاق میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک مادہ تو نہیں ہوتا البتہ بظاہر ایک مادہ معلوم ہوتا ہے۔ صنعت شبہ اشتقاق میں قرآن کی یہ آیت ہے: قال انی لعملکم من القالین اس میں '' قال'' اور '' قالین'' میں شبہ اشتقاق ہے(ترجمہ: کہا کہ میں تمہارے اعمال کے سبب تمہارے دشمنوں یعنی بغض رکھنے والوں میں سے ہوں)۔[۴]

لیجیے اب کلام مرزا دبیر سے مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

---

۱ اس رباعی میں لفظ زاری تینوں جگہ قافیہ میں لائے ہیں مگر مطلب ہر جگہ مختلف ہے اس میں صنعت ایہام بھی موجود ہے کیونکہ مردم پتلی کو بھی کہتے ہیں اور مردم آزاری سے مطلب آنکھوں کو آزار دینے کی طرف اشارہ ہے۔

۲ پھرانا کے معنی پھیرنا اور پھر آیا کے معنی پلٹ کے آنا۔

۳ اس بند میں تجنیس خطی ہے۔ ٹیپ کے دو مصرعوں میں صنعتِ اشتقاق و شبہ اشتقاق ہے۔ قرآن شریف میں بھی یہ صنعت پائی جاتی ہے۔ ھو یطعمنی و یسقینہ و اذا مرضت فھو یشفین اس میں یقین اور یشفین میں تجنیس خطی ہے۔ ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔ صرف نقطوں کا فرق ہے۔ (حیات دبیر ص ۱۹۱)

۴ حیات دبیر ص ۱۹۲ [الشعراء آیت ۱۶۸]

(۱) بس اے دبیر طاقت نظم و بیاں ہے طاق		ہوش الوداع کہتا ہے اور عقل الفراق[۱]
(۲) یاں سب کو تھا یقین وہاں تھی، وہیں نہ تھی		واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی، یہیں نہ تھی
ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی، کہیں نہ تھی		لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی، نہیں نہ تھی
اس برقِ ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھی جہاں زمیں نہ تھی آسماں نہ تھے[۲]
(۳) کھولا کسی نے جینے سے ہوکر یہ تنگ تنگ		گوشے میں کوئی رکھ کے کمان و خدنگ دنگ
بے وقفہ ہوش اڑ گیا اور بے درنگ رنگ		یہ کیا تھا منزلوں ہوئے پائے پلنگ لنگ
گو مکر و حیلہ ظالموں کی آب و گل میں تھا
اس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل میں تھا[۳]

---

(۳) ردّ العجز علی الصدر

اس میں وہ الفاظ جو مصرع اول کے آخر میں ہوتے ہیں مصرع دوم کے اول میں لائے جاتے ہیں اور جو مصرع دوم کے آخر میں ہوتے ہیں انہیں مصرع سوم کے اول میں لاتے ہیں۔ یہ بہت پرلطف صنعت ہے اسے صنعت معاد بھی کہتے ہیں۔ مرزا دبیر نے اس صنعت میں بڑے پرلطف اور دلچسپ اشعار کہے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) زہرا کا گھر اختر صد برج شرف ہے		یہ اختر صد برج شرف در نجف ہے
یہ در نجف حیدرِ صفدر کا خلف ہے		یہ حیدر صفدر کا خلف حق کی طرف ہے
یہ حق کی طرف مثل رخ قبلہ نما ہے
یہ قبلہ نما کعبۂ تسلیم و رضا ہے
یہ کعبۂ تسلیم و رضا فخر پدر ہے		یہ فخر پدر فاطمہ کا نور نظر ہے
یہ فاطمہ کا نور نظر رشک قمر ہے		یہ رشک قمر درج امامت کا گہر ہے
یہ درج امامت کا گہر جان نبی ہے
یہ جان نبی، خاص خدائے احدی ہے

---

۱ طاقت اور طاق میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔
۲ اس میں شبہ اشتقاق کے علاوہ ذو قافتین کی صنعت بھی ہے۔
۳ اس میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔

یہ خاص خدائے احدی قبلۂ دیں ہے　　یہ قبلۂ دیں کعبۂ ارباب یقیں ہے
یہ کعبۂ ارباب یقیں عرش نشیں ہے　　یہ عرش نشیں مہر نبوت کا نگیں ہے
یہ مہرِ نبوت کا نگیں درِ عطا ہے
یہ درِ عطا ملہرِ اسرارِ خدا ہے

(۲) کوثر کی آبرو ہوں میں رضواں کی آبرو　　رضواں کی آبرو ہوں میں سلماں کی آبرو
سلماں کی آبرو ہوں میں ایماں کی آبرو　　ایماں کی آبرو ہوں میں قرآں کی آبرو
قرآں کی آبرو ہوں تو آدم کا فخر ہوں
آدم کا فخر ہوں تو دو عالم کا فخر ہوں

عالم کا فخر ہوں کہ میں عالی وقار ہوں　　عالی وقار ہوں کہ میں حق پر نثار ہوں
حق پر نثار ہوں کہ میں طاعت گزار ہوں　　طاعت گزار ہوں کہ میں الفت شعار ہوں
الفت شعار ہوں کہ میں عاشق خدا کا ہوں
عاشق خدا کا ہوں کہ میں دل مصطفیٰؐ کا ہوں

دل مصطفےٰ کا ہوں کہ میں نورِ الہٰ ہوں　　نورِ الہٰ ہوں میں ہی زہرا کا ماہ ہوں
زہرا کا ماہ ہوں شہِ انجم سپاہ ہوں　　انجم سپاہ ہوں مہیں شاہوں کا شاہ ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں مہیں کل کا امیر ہوں
کل کا امیر ہوں میں علیؑ کا وزیر ہوں

(۳) معراجِ سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے　　ہے ذہن رسا اوج پہ اکبر کی ثنا سے
اکبر کی ثنا کرتا ہوں افضالِ خدا سے　　افضالِ خدا ہے مددِ خیرِ ورا سے
جب ہو مددِ خیرِ ورا ذہن رسا پر
پھر ذہن رسا کا ہو گزر عرشِ علا پر

---

(۴) لزوم مالا یلزم

یہ ایک ایسی صنعت ہے جس کی بے شمار شاخیں ہیں یعنی جو صنعت چاہے شاعر یا نثار لازم کرے جیسے مقید قافیہ لانا وغیرہ۔ قرآن مجید میں اس صنعت میں یہ آیت ہے فاما الیتیم فلا تقھر و اما السائل فلا تنھر اس میں لازم کرلیا ہے کہ حرف آخر ''رے''

کے ماقبل "ہائے ہوز" حالانکہ قمر کا قافیہ تمر بھی ہوسکتا ہے۔[1] مرزا دبیر کے کلام سے اس صنعت کی مثال ملاحظ ہو:

اس بار کے اٹھانے کو طاقت بھی چاہیے　　طاقت فقط بخیر لیاقت بھی چاہیے
صاحب علم کو حسن رفاقت بھی چاہیے　　دل کو وفا زباں کو صداقت بھی چاہیے
ایسا ہے منتظم کوئی تیرے قیاس میں
لاکھوں سے جو لڑائے بہتر کو پیاس میں

---

(۵) غیر منقوط

یہ صنعت بھی اسی لزوم مالایلزم سے ہے۔ اسے صنعت مہملہ بھی کہتے ہیں یعنی کلام میں ایسے الفاظ لانا جن میں نقطے نہ ہوں۔ مرزا دبیر کا ایک پورا مرثیہ اسی صنعت میں ہے۔ اس کا مطلع ہے: مہر علم سرور اکرم ہوا طالع[2] اس صنعت میں مرزا دبیر کے

۱　حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۹۸ [الضحیٰ آیت ۷]

۲　مولانا محمد حسین آزاد تحریر کرتے ہیں: "کم از کم ۳ ہزار مرثیہ لکھا ہوگا سلاموں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ایک مرثیہ بے نقط لکھا جس کا مطلع ہے ع ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا" (آب حیات ص ۶۷۶)۔ یہ مرثیہ دراصل نواب محمد تقی خان کا ہے جو ۱۸۹۱ء میں مطبع شوکت جعفری سے سید حسن جعفر نے چھپوایا ہے۔ اس کے ۱۰۱ بند ہیں۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس مرثیہ کا ایک اور مطبوعہ نسخہ بھی راقم کے پاس ہے جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ۱۰۱ بند ہیں۔ یہ سید عابد علی کے اہتمام سے مطبع اثنا عشری محلہ فراش خانہ وزیر گنج لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ مرزا دبیر کا مرثیہ "مہر علم سرور اکرم ہوا طالع" ۷۳ بند کا مرثیہ ہے۔ یہ مہذب لکھنوی نے جنوری ۱۹۶۱ء میں سرفراز قومی پریس لکھنو سے شائع کروایا ہے۔ اس میں صرف ۶۹ بند ہیں جو شائع ہوئے ہیں۔ راقم نے مرزا صادق صاحب کے پاس اس مرثیہ کے ۷۳ بند دیکھے ہیں۔ اس مخلوطہ میں مرثیہ کے آخر میں چند غیر منقوط رباعیاں اور قطعات بھی ہیں جن میں مصرع تاریخ بھی نظم ہوا ہے جو یہ ہے:

مدح روح سالم سرور عطارد کا کلام (۱۲۵۹ھ)

چنانچہ ایسے کلام میں دبیر کے بدلے عطارد تخلص رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں خود مرزا دبیر کہتے ہیں:

ڈھونڈھا جس دم تخلص بے نقط
ہم نام دبیر کا عطارد نکلا

سلام بھی ہیں، رباعیات اور قطعات بھی۔ کہیں کہیں مراثی میں بھی اس صنعت میں مختلف بند ملتے ہیں اس سلسلہ میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) صمصام کو الہام ہوا سر کو علم کر　　گہ سورہ الحمد کو گہ صور کو دم کر
اک وار لگا اور دو اعدا کا علم کر　　ہر دم عمر سعد کا دم محو عدم کر
دو حصہ کمر کر کہ الگ کاسۂ سرکر　　ہر طرح مہم سہل کر اور معرکہ سرکر

(۲) حرحملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا　　وہ حملہ ور ادھر ادھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سرِ اعدا اگر ہوا　　وہ گل کھلا کہ لالۂ کہسار سر ہوا
اہلِ حسد کو درس ادھر آہ آہ کا
حور و ملک کو ورد ادھر واہ واہ کا

مرزا دبیر کی غیر منقوط کی رباعیوں کی تعداد بھی خاصی ہے یہاں صرف ۳ رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

اعدا کو ادھر حرام کا مال ملا　　حر کو اسداللہ کا ادھر لال ملا
واللہ کلاہِ سرِ عالم ہوا حر　　حلّہ ملا معصومہ کا رومال ملا

گر مہرِ امامِ دوسرا حاصل ہو　　گو درد ہو لا دوا، دوا حاصل ہو
اس دم ہو مددگار گر احمد کا لال　　واللہ کہ درِّ مدّعا حاصل ہو

آرام دلِ حرم کا معدوم ہوا　　کم عمر کا حال مرگ معلوم ہوا
دود[1] اگلا لہو ڈالا ڈرا کھا کر سہم[2]　　اور سرد وہ معصوم کا معصوم ہوا

اس صنعت میں سلام کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

مسطور اگر کمال ہو سرو امامؑ کا　　مصرع ہمارا سرو ہو دارالسلام کا
حاصل سر عمر کو مرصع کلاہ واہ　　دردا سرِ علم سرِ اطہر امامؑ کا
اسرار طالع عمر و حر کا وا ہوا　　داور کا وہ عدو وہ ہراول امامؑ کا

---

۱ دودھ
۲ سہم بمعنی تیر

مداح سنگ در ہوا ہر مصرع رسا   سحر حلال اسم رکھا اس کلام کا

(۶) منقوط

جب کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو منقوط حروف پر مشتمل ہوں تو اسے صنعتِ منقوط کہتے ہیں۔ مرزا دبیر کے کلام سے اس صنعت کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) تیزی تب تیغ نے بخشی نئی خفت   بے چین شقی، بخت بغی چین[1] بہ نیت
چینی خفتنی چیں بجبین پشت بجنت   نے جی بچے نے تن بچے نے زین نہ زینت
نے چین جبیں نے ذقن زشت نہ بنی
نے نبض بجنبش نتنِ زشت نہ بنی

(۲) رباعی:

جب بخت بن قین نے زینت بخشی   زینبؑ نے تشفی تب بشفقت بخشی
تیغیں جزتن جبین شق جی بے چین   جنت بخشی نبیؐ نے جنت بخشی

جب اس صنعت میں الفاظ ایسے استعمال ہوں جن کے سارے حروف ملا کے لکھے جاسکیں تو اس کو صنعت موصل کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں میں (۱) میں دوسرے اور تیسرے مصرع میں اور (۲) میں دوسرے اور چوتھے مصرع میں یہ صنعت موجود ہے۔ ان کو اس طرح سے ملاکر بھی لکھا جاسکتا ہے:

مثال نمبر (۱) کا مصرع ثانی   بیچینشقیبختبغیچینبنیت

مثال نمبر (۱) کا مصرع سوم   چینیختنیچینبجبینپشتبجنت

مثال نمبر (۲) کا مصرع دوم (سوائے حرف اول) زینبنیتشفیتببشفقتبخشی

مثال نمبر (۲) کا مصرع چہارم   جنتبخشینبینیجنتبخشی

---

۱ ''بہ'' میں جو ہائے ہوز استعمال ہوا ہے یہ اظہار حرکت کے لیے ہے۔ حقیقی حرف (جس کا تعلق آواز سے ہے) ''ب'' ہی اس میں استعمال ہوا ہے جو منقوط ہے اگر ''بہ نیت'' کو ''بنیت'' کی شکل میں لکھا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہی صورت ''نہ'' کی ہے۔ ''نہ زینت'' کو اگر ''نزینت'' کی شکل میں بھی لکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

(۷) سجع و ترصیع

ایک لفظ کے مقابل جب دوسرے ہم وزن لفظ لائیں تو اس کو سجع کہتے ہیں۔ وزن سے مراد وزن عروضی ہے جس میں حرکات الفاظ کا باہم متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور اگر متفق ہوں تو اور خوبی ہے۔ جب وہ الفاظ باہم قافیہ بھی ہوسکیں تو اس کو ترصیع کہتے ہیں۔ اس کا مرتبہ سجع سے اعلیٰ ہے۔ کلام مرزا دبیر سے سجع و ترصیع کی مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

(۱) حضرت علی اکبر کے رجز میں ایک بند:

ہم قابضِ اجسام ہیں کفار کی خاطر
ہم مرہمِ آرام ہیں دیندار کی خاطر
ہم ضربتِ صمصام ہیں اشرار کی خاطر
ہم قوتِ اسلام ہیں ابرار کی خاطر
ہم پردۂ غفاری و غفاریِ رب ہیں
ہم خنجر قہاری و جباریِ رب ہیں

---

(۲)
لے ہدیۂ تائیدِ قدیرِ ازلی لے
لے خلعت تحسین حسین ابنِ علی لے

---

(۳) صنعتِ ترصیع میں رجز امام حسین کے سلسلے میں چار مصرعے :

معبودِ جز و کل نے کریمانہ رضا دی
اور صاحبِ دلدل نے بزرگانہ دعا دی
فوج اپنی توکل نے دلیرانہ بڑھا دی
آمد کے تجمل نے نقیبانہ ندا دی

---

(۴) باغ کی تعریف میں یہ ٹیپ صنعت ترصیع میں ملاحظہ فرمائیں:

ہر غنچہ ہے دفترِ غمِ شاہِ دوسرا کا
ہر لالہ ہے محضرِ گلِ زخمِ شہدا کا

(۵) اسی صنعت میں تلوار کی تعریف:

تھا شور وہ تڑپی۔ وہ گری۔ فوج پر آ کر
وہ جسم میں ڈوبی۔ وہ تری خوں میں نہا کر

---

(۶)
میزانِ خدا۔ مفتی دیں۔ قاضی فردا
سلطانِ ازل۔ شاہ ابد۔ عروۂ و ثقا
خورشیدِ نجف۔ بدرِ حرم۔ رونقِ بطحا
اقبالِ عرب۔ اوجِ عجم۔ خسرو دنیا
بیعت کو سند ہاتھ سے قرآں کو قلم سے
خطبہ کو شرف نام سے منبر کو قدم سے
کس نے یہ معجزا کیے سیپارۂ ایام
کس نے یہ مصفا کیے رخسارۂ اسلام
مجموعہ یہ کس نے کیا شیرازۂ آرام
مرفوع یہ کس سے ہوا آوازۂ انعام
کس نور سے آدم کا شرف خاک نے پایا
کس طور سے نورِ ابد افلاک نے پایا

---

(۷)
ہے کوہِ فرازندہ جو ساکن ہو تہِ ران
ہے ابرِ خرامندہ اگر ہو یہ خراماں
ہے جلوۂ گلزار اسے کشتِ بیاباں
ہے تلۂ کہسار اسے تختِ سلیماں
ہے برقِ شرر خیز اگر جلوہ کناں ہے
ہے ابرِ گہر ریز اگر قطرہ زناں ہے[۱]

---

۱ گھوڑے کی تعریف میں کہا ہے۔

(۸) حاتم کا کرم بخل ہے فیض و کرم ایسا
گردوں کا حشم پست ہے جاہ و حشم ایسا

---

(۹) جس روز سے ہے ملکِ خضر آب بقا پر
جس عہد سے ہے ابر کرم دوش ہوا پر

(۸) ذوقافیتین

اس صنعت سے مراد ہر مصرعہ میں دو دو قافیے لانا ہے اگر ہر مصرع میں دو سے زیادہ قافیے ہوں تو اسے ذوالقوافی کہتے ہیں۔ کلام مرزا دبیر سے مثالیں ملاحظ ہوں:

(۱) سردار لشکر کوفہ و شام اپنی فوج سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:

ہاں سرفروشو جان لڑانا لڑائی میں — پیاسوں کے خوں کی نہر بہانا ترائی میں

(۲) تلوار کی تعریف میں کہتے ہیں:

یاں سب کو تھا یقیں کہ وہاں تھی وہیں نہ تھی
واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی
لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی نہیں نہ تھی[1]

(۳) معبود جز و کل نے کریمانہ رضا دی — اور صاحب دلدل نے بزرگانہ دعا دی
فوج اپنی توکل نے دلیرانہ بڑھادی — آمد کے تجمل نے نقیبانہ ندا دی

(۴) بجلی کا جست شیر کی آمد ہوا کا شور — قدرت کا کھیل قہر کی طاقت بلا کا زور[2]

(۹) تلمیح

کلام میں کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ مرثیہ کے موضوع کی وجہ سے اس میں اس صنعت کے برتنے کی کافی گنجائش ہے اور تقریباً ہر مرثیہ گو کے ہاں اس صنعت کا استعمال ملتا ہے۔ مرزا دبیر کے کلام میں بھی اس کا بہت

---

۱ دو قافیوں کے درمیان کی "تھی" ردیف ہے۔ اس صنعت کو ذوی القافیتین مع الحاجب کہتے ہیں۔

۲ تلوار کی تعریف میں کہا ہے۔

استعمال ہوا ہے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔
(۱) جنات اور حضرت علی میں ایک جنگ ہوئی تھی جو ''جنگ بیرُالعلم'' کے نام سے مشہور ہے، اسی کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے کہ جب زعفر جن کو جنوں نے یہ خبر دی کہ امام حسینؑ ایک میدان میں تنہا تین دن کے پیاسے کھڑے ہیں تو وہ ان جنوں سے کہتا ہے:

دم غم سے الجھتا ہے یہ کھلتا نہیں ہم پر　　پانی بھی ہوا بند شہنشاہ امم پر
تم لوگوں کا پہرہ تھا اسی بیرِ علم پر　　آئے جو علیؑ گر پڑے سرکٹ کے قدم پر
پتھر تھے کناروں پہ مگر ہوگئے پانی
یوں لے گئے پانی کہ جگر ہوگئے پانی

(۲) مندرجہ ذیل بند میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں:
(۱) حضرت علیؑ کے واسطے آفتاب نے غروب ہوکر رجعت کی (۲) امام حسینؑ نے بچپن میں روزہ رکھا تو آفتاب وقت سے پہلے غروب ہوگیا (۳) جناب رسول خداؐ کے واسطے شق القمر ہوا (۴) امام حسینؑ کی خاطر سے بحکم خدا جبریل نے آکر پر مارکر ایک موتی کے دو ٹکڑے برابر کردیے کہ ایک ٹکڑا امام حسنؑ نے اور دوسرا ٹکڑا امام حسینؑ نے لے لیا۔ بند ملاحظہ فرمائیں:

روشن ہے مثل مہر یہ اعجاز مرتضےٰ　　مغرب سے آفتاب نے رجعت کی بار ہا
روزہ مگر حسینؑ نے طفلی میں جو رکھا　　پیش از زوال چھپ گیا مہر جہاں نما
انگشت مصطفےٰ سے دو پارہ قمر ہوا
اور خاطر حسینؑ سے ٹکڑے گہر ہوا

(۳) تھی نور سے پیدا جو وہ رشک شرر طور　　حل کرنے لگی ترجمۂ ینفخ فی الصور[1]
میداں میں قلم کرکے سرِ ظالم مقہور　　لفظ غضب اللہ علیہم کیا مسطور
(۴) قرآں میں قتلِ نفس کی حرمت ہے جابجا　　سید کا خون حلال کہاں سے تمھیں ہوا
ہے نفسِ مصطفیٰ بخدا سبط مصطفا　　آخر جزائے من قتل مومنا ہے کیا

۱　اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر بڑی بے تکلفی سے عربی فقروں کو بھی نظم کرتے تھے۔

سید نہیں امام نہیں، مقتدا نہیں
مومن بھی میں تمہارے عقیدے میں کیا نہیں

(۵) پوشش مہِ عارض کی ہے یہ زلف شب آسا — لوحل ہوئی شرح جعل اللیّل لباسا

(۶) کہتے ہیں اس جمال پہ سب کودک و مسن — صلوا علی النبی و ال محمداً

---

(۱۰) سیاق الاعداد

کلام میں عددوں کو بالترتیب یا بے ترتیب نظم کرنے کو سیاق الاعداد کہتے ہیں۔ مثال ملاحظ فرمائیں۔ پنجتن پاک کی مدح میں مرزا دبیر کہتے ہیں:

واجب ہے شش جہت پہ تو لائے پنجتن — ہیں ہشت خلد بہر احبائے پنجتن
ساتوں سقر ہیں مسکنِ اعدائے پنجتن — چرخِ نہم ہے کرسیِ زیبائے پنجتن

ایماں پناہ ہیں یہ شریعت پناہ ہیں
ان کے شرف پہ پانچ نمازیں گواہ ہیں

ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس — تا حق پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموں پہ ان کے پانچ نمازوں کا ہے اساس — جن کو کہ ان کا پاس ہے وہ ہیں خدا کے پاس

پانچ انگلیوں سے ہم نے چنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلاؤ ہات کو

(۱۱) تنسیق الصفات

ایک موصوف کے لیے صفات کلام میں ایک جگہ جمع کرنے کو تنسیق الصفات کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس صنعت سے متصف ہے۔ " هو الله الذی لا اله الاهو۔ الملك القدوس السلامه المئومن المهیمن العزیز الحبار المتكبر۔ " اس میں خدا نے اپنی صفات ملک، قدوس، سلام، مومن، مہیمن، عزیز، جبار متکبر بیان فرمائی ہیں۔[1]

مرزا دبیر کے کلام سے تنسیق الصفات کی مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱) رخشِ حسین، قدرتِ حق، صنع کبریا — دلدل خرام و برق بحام و براق پا

---

۱ حیات دبیر ص ۲۰۲۔۲۰۳ [الحشر]

پرو دم و سہیل دوال و قمر ضیا گلگونِ شاہِ دیں کی نزاکت کہوں میں کیا
۲) گل[1] پیرہن و گل بدن و گل رخ و گل فام شمشاد قد و غنچہ دہان و سمن اندام
خوش قامت و خوش رو و خوش آغاز خوش انجام حسن چمن ِ شرع ' بہارِ گلِ اسلام
کس عرصہ میں یہ فاطمہؑ کا باغ کھلا تھا
سو ظہر تلک رن میں تہِ خاک ملا تھا

۳) پھل[2] وزن میں تھا پھول تجلی میں نخل طور گرمی میں محض نار تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ، چال پری، قبضہ چشمِ حور خود لہر، آب زہر، تڑپ قہر، شور صور
نکلی بس اور زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر

۴) بجلی[3] کا جست، شیر کی آمد، ہوا کا شور قدرت کا کھیل، قہر کی طاقت، بلا کا زور
راہ عدم، جنازۂ ہستی، دہان گور جلوہ وہ تھا کہ دیکھنے سے مدعی تھے کور
رن میں جدھر یہ پارۂ الماس مڑ گئی
مانندِ ہوشِ اہلِ جفا دھوپ اڑ گئی

۵) حضرت امام حسینؑ کی مدح اس صنعت میں:

سر تاج عرش، زیب دہ کرسیِ بلند سرکارِ حق کے کارگزار اور کار بند
عاشق، مطیع، فدیہ، مصاحب، نیازمند راضی رضا پہ، محوِ شہادت، بلا پسند
سب کچھ خدائے عز و جل کے حسینؑ ہیں
مالک ابد کے اور ازل کے حسینؑ ہیں

۶) حضرت عباسؑ کی مدح:

شبیر کے بازو بھی ہیں اور زور کمر بھی رشتہ میں برادر بھی ہیں، الفت میں پسر بھی
خادم بھی، مصاحب بھی دل و جاں بھی جگر بھی اللہ کی شمشیر، شہِ دیں کی سپر بھی

---

۱ اقربائے امام حسینؑ کی مدح صنعت تنسیق الصفات میں
۲ ذوالفقار کی مدح
۳ حضرت عباسؑ کی تلوار کی مدح

۷) تلوار کی تعریف

چھل بل تھی چھلا وہ تھی طلسمات تھی اسرار چالاک، سبکسار، نمودار، طرحدار
نیزہ کہیں منجر تھی کہیں، اور کہیں تلوار بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار
سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفاں تھی، ہوا تھی
شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی

(۱۲) تضمین

بعض الفاظ عربی یا بعض کلام عربی و فارسی کو صفائی و خوبصورتی سے لانے کو صنعت تضمین کہتے ہیں۔ مرزا دبیر کو عربی اور فارسی پر قدرت تھی اس لیے ان کے ہاں اس صنعت کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بنتے[1] ہی یہ قالب سوے شبیرؑ پکارا
القلب علی بابك لیلاً و نهارا

(۲) پڑھتا[2] تھا کوئی فاعتبروا یا اولی الابصار
اک سمت توکلت علی اللہ کی تکرار
اک جا فسیکفیکهم اللہ کی گفتار
منہ سے کہیں وجهت الی اللہ کا اظہار
وہ مصحفِ ناطق کی حفاظت میں سدا تھے
گر حافظِ قرآں رفقا تھے تو بجا تھے

---

۱ حبیب ابن مظاہر کی مدح میں
۲ صبح عاشور لشکر امام حسین کی کیفیت

مراثی میں جدت

مرزا دبیر نے تقریباً بارہ برس کی عمر میں مرثیہ پڑھنا اور کہنا شروع کیا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، میر ضمیر سے پہلے کا مرثیہ ابھی اپنی جڑیں مضبوط کر ہی رہا تھا' اور ضمیر کے عہد میں اس کی صورت ایک ایسے تناور شجر کی ہوگئی جس کا سایہ اب تک باقی ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کے ثمر شیریں سے لوگوں کو اس طرح واقف کرایا کہ اب تک لوگ مزے لیتے ہیں۔ میر انیس تو بعد میں فیض آباد سے لکھنو آئے مگر مرزا دبیر پہلے سے ہی اس درخت کے میوے کو شیریں تر بنانے کی فکر میں تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے کافی کام کیا۔ چنانچہ امیر احمد علوی تحریر کرتے ہیں:

> "انھوں [میر انیس] نے طرز مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسن کلام کا ایک مرقع بنایا اور اس پر میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کا رنگ و روغن چڑھا کے طلسمات کا عالم دکھایا۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرثیہ کی تعمیر اور ترقی میں میر ضمیر اور مرزا دبیر نے جو حصہ ادا کیا میر انیس نے بھی اس کی تقلید کی اگرچہ اس بات میں بھی شک کی گنجائش ہے کہ مرثیہ میں سراپا نظم کرنے کی ابتدا کس نے کی پھر بھی مرثیہ میں مرزا دبیر نے جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔ ان ہی خوبیوں کی بدولت ان کا نام میر ضمیر، خلیق، دلگیر اور فصیح کے ساتھ اس زمانے میں لیا جانے لگا۔ جیسا کہ فسانۂ عجائب کی عبارت سے ظاہر ہے جس کو اس سے قبل اسی مقالہ میں پیش کیا جا چکا ہے، ان مرثیہ گویوں یعنی میر ضمیر، خلیق، دلگیر اور فصیح کے مرثیے سامنے رکھے جائیں اور مرزا دبیر کے کلام کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بعض چیزوں میں مرزا دبیر کی اولیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں اس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ میر انیس کے ہاں بھی وہ چیزیں پائی جاتی ہیں مگر میر انیس کی شہرت کا زمانہ چونکہ مرزا دبیر کی شہرت کے کافی بعد کا ہے اس لیے بھی مرزا دبیر کی اولیت کا گمان صحیح ہے۔ مرزا دبیر کی شہرت غازی الدین حیدر کے زمانے

---

۱ یادگار انیس ص ۲۷

میں ہوئی۔ میر انیس اس کے کافی عرصہ بعد عہد امجد علی شاہ میں، جو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں تخت نشین ہوئے، لکھنؤ آ گئے۔ چودھری سبط محمد نقوی ہفت روزہ وثیقہ دار محرم نمبر ۱۹۵۴ء کے حوالے سے میر انیس کے ورود لکھنؤ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''سب سے بڑی معرکتہ الآرا بات عہد حکومت امجد علی شاہ میں ہوئی کہ مرثیہ گوئی کے درخشاں آفتاب ببر علی انیس انہیں کے زمانۂ شہر یاری میں سکونت فیض آباد ترک کر کے لکھنؤ تشریف لائے۔''[1]

میر انیس کی عمر ورود لکھنؤ کے وقت بیالیس سال سے زیادہ تھی[2] اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ میر انیس نے فیض آباد میں اس سے پہلے ایسے تجربے کیے ہوں جن کو مرزا دبیر کا اضافہ خیال کیا جاتا ہے لیکن جب تک مراثی کے وقت تصنیف کا تعین نہیں ہوتا کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی۔ پھر بھی اس کا تعلق صرف ان اضافوں سے ہے جو دونوں اساتذہ یعنی میر انیس اور مرزا دبیر میں مشترک ہیں۔ افضل حسین ثابت کا بھی یہی خیال ہے چنانچہ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جو باتیں میر ضمیر و میر خلیق و منشی دلگیر و مرزا فصیح مرحومین کے کلام میں نظر نہیں آتیں اور دبیر و انیس کے کلام میں موجود ہیں ان کا شرف ایجاد و اختراع غالباً مرزا صاحب کو حاصل ہے۔ خصوصاً ایسے مرثیوں میں جو میری تحقیق کے موافق عہد امجد علی شاہ سے پہلے مرزا صاحب کہہ چکے ہیں .... اس خیال سے کہ شاید کوئی بات ادھر مرزا صاحب نے لکھنؤ میں ادھر میر صاحب نے فیض آباد میں ایجاد کی ہو۔ اور ایک دوسرے کی ایجاد و اختراع کی خبر نہ ہو۔ میں ایسے ایجادوں میں جو میر صاحب اور مرزا صاحب کے یہاں نظر آتے ہیں میر و مرزا دونوں بزرگواروں کو شریک قرار دیتا ہوں۔''[3]

اس موقع پر جو ایجادات ثابت نے مرزا دبیر سے منسوب کی ہیں ان کو یہاں پیش کیا

---

۱ امجد علی شاہ۔ سبط محمد نقوی ص ۱۲۶

۲ ایضاً

۳ حیات دبیر جلد اول ص ۶۰۔ ۲۵۹

جاتا ہے:

(۱) مرثیہ کو مرزا دبیر نے حمد و نعت و منقبت سے شروع کیا اور بادشاہ و مجتہدین عصر کی بھی مدح فرمائی۔ دفتر ماتم کی جلد اول میں پہلا مرثیہ ایسا ہی ہے۔ اس کے ۶۴ بند ہیں اور مطلع ہے: **طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ھے**

اس سے یہ مراد لینا کہ مرزا دبیر بادشاہوں کی مدح میں کسی دنیاوی غرض سے شعر کہتے تھے صحیح نہ ہوگا۔ مرزا دبیر کے اخلاق کے باب میں بیان کرتے وقت راقم نے تفصیل سے اس پر بحث کی ہے پھر بھی یہاں متذکرہ بالا مرثیے کے بارے میں افضل حسین ثابت کی رائے نقل کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''امجد علی شاہ مرحوم کی مدح میں چند بند ان کے مرثیہ'' طغرا نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے'' میں موجود ہیں۔ ان دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح و ثنا کے قابل سمجھتے تھے اس لیے مدح کی کہ دوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔ بے جا خوشامد و طمع کے زنگ سے اپنی [اپنے] آئینۂ شاعری کو آلودہ نہیں ہونے دیا''[۱]

اس مرثیے کے مطالعہ سے بھی ثابت کے قول کی تائید ہوتی ہے اول تو اس میں علماء کی بھی مدح کی گئی ہے اور دوسری بات یہ کہ مرزا دبیر نے اس میں بھی کہا ہے:

انصاف کھا رہا ہے مرے قول پر قسم   مطلوب دادِ نظم ہے نے شہرۂ رقم
واقف ہے کبریا کہ دروغ و ریا نہیں
مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

(۲) مرزا دبیر نے چہار دہ معصومین علیہم السلام کے حال میں علاحدہ علاحدہ مرثیے کہے چنانچہ دفتر ماتم کی چودہ جلدوں میں یہ ترتیب مبارک ہے کہ ہر جلد ایک معصوم کے حال کے مرثیہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہ مرثیے زیادہ مختصر ہیں۔[۲] ثابت اس بارے میں

---

۱ حیات دبیر جلد اول ص ۹۸۔ ۹۷

۲ ثابت نے مرزا اوج خلف مرزا دبیر کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ آتش کے ایک نامور شاگرد نواب نادر مرزا صاحب نے مرزا دبیر سے فرمائش کی تھی کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مرثیے کہہ دیجیے۔ میں ہر معصومؑ کی وفات کے دن مجلس کیا کرتا ہوں، پڑھا کروں گا۔ مرزا دبیر جب فیض آباد سے چلے تو ان کے چند نوکر ہمرکاب تھے مرزا دبیر پالکی میں آئے

تحریر کرتے ہیں:

"مرزا صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ طولانی اور کہوں گا چنانچہ امام موسیٰ کاظمؑ کے حال میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا .... اس کی ایک مشہور ٹیپ ہے۔

حضرتؑ پر انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی و پیری گزر گئی" [1]

(۳) مرزا دبیر نے ولادت حضرت عباسؑ اور ولادت حضرت علی اکبرؑ کے حال میں بھی مرثیے کہے۔ مطلعے یہ ہیں:

۱۔ "انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں عباسؑ۔"

۲۔ "جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی۔"

۳۔ جناب امیرؑ اور جناب فاطمہؑ زہرا کے عقد کا حال مرثیہ میں نظم کیا۔ اس کا مطلع یہ ہے" جب فاطمہؑ سے عقدِ شہ لافتاً ہوا۔"

حضرت عباسؑ کے عقد کا حال اس مرثیے میں نظم کیا ہے جس کا مطلع ہے:

"جب اخترِ یعقوب پہ کی مہر خدا نے"

اسی طرح حالِ عقدِ جناب امیرؑ کو جو حمیدہ ام البنین سے ہوا تھا، اس مرثیے میں نظم کیا ہے جس میں ولادتِ حضرت عباسؑ کا حال بیان کیا، اس کا مطلع ہے:

"انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں عباسؑ"

(۴) مرزا دبیر نے مرثیہ میں فن مناظرہ کو شامل کیا۔ اسی زمانے میں ایک شخص نے بڑی شد و مد کے ساتھ تعزیہ داری کی مخالفت کی۔ مرزا دبیر نے ان کے رد میں ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے" اے شمع قلم انجمن افروز رقم ہو" کمال یہ ہے کہ اس میں بھی مرثیت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

(۵) مرزا دبیر کے عہد میں ترکوں نے کربلائے معلیٰ میں قتل عام کیا تھا۔ جس میں

تھے۔ راستہ میں یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے۔ لکھنؤ آکر جب ان کے ملازم رخصت ہوگئے تو ان کے ہاتھ نواب صاحب موصوف کو بھیج دیئے(حیات دبیر جلد اول ص۲۶۱۔۲۶۰)

۱ حیات دبیر جلد اول ص ۲۶۱

بعض علمائے کرام اسلام بھی شہید ہوگئے تھے۔ از بسکہ علماء کا قتل بالخصوص اہل علم کے دلوں پر بہت صدمہ پہنچاتا تھا اس سے متاثر ہوکر مرزا دبیر نے ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے :

'' اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر ''

اس سے مراد وہی ترک ہیں جو شریک ظلم تھے۔ اس مرثیہ میں بھی مرثیت کو قائم رکھا ہے۔ اس طرح عصری تاریخ کے واقعات بھی مرثیے میں شامل ہوگئے۔

(۶) بطور حالات تاریخی ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے :

'' فہرست یہ شبیرؑ کے لشکر کی رقم ہے ''

اس مرثیے میں جناب علی اکبر کی نسبت لکھا ہے کہ بعض مورخوں نے ۲۵ سال کی عمر بھی لکھی ہے مگر مشہور اٹھارہ سال ہے۔ ۲۵ سال کی عمر کہنے پر اعتراضات بھی ہوئے مگر مرزا دبیر کی تائید علماء نے کی۔ اس طرح وہ روایتیں جو عربی کی نایاب و کمیاب کتابوں میں محفوظ تھیں، مرزا دبیر کے مراثی کی وجہ سے ہندوستان میں مشہور ہوئیں۔

(۷) مرثیے میں طرز بیان کے نئے نئے پہلو نکالے۔ چنانچہ دو مرثیوں میں یکے بعد دیگرے قید خانۂ شام میں جناب سکینہؑ کو سلانے کے لیے حضرت زینبؑ کا کہانی کہنا بیان کیا ہے۔ اور وہ کہانی خود امام حسینؑ کی ہے۔ ایک مرثیہ کا یہ مطلع ہے:

'' جبکہ زنداں میں نبی زادیوں کو رات ہوئی''

اور دوسرے کا مطلع ہے :

'' جس دم اسیر عترتِ مشکل کشا ہوئی ''

(۸) مرزا دبیر نے بہت سی روایتیں اپنے مراثی میں نظم کی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ تواریخ و سیر و مقاتل کی کتابیں کثرت سے انھوں نے دیکھی تھیں۔

(۹) پانی اور آگ کا مناظرہ عمدہ پیرائے میں نظم کیا ہے اور ان دونوں عنصروں کے سبب سے جو ظلم اہل بیتؑ پر ہوئے ان کو بیان کیا ہے۔ اس مرثیے کا مطلع ہے :

'' آتش سے سبب دشمنیِ آب کا کیا ہے ''

(۱۰) امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہی محبانِ اہل بیتؑ نے قاتلانِ امام حسینؑ سے انتقام لینے کی غرض سے ان کو قتل کرنا شروع کیا تھا اور پانچ چھ برس تک یہ طوفان

انتقام اتنا شدید رہا کہ مخالفین امام کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان بدلہ لینے والوں میں سب سے زیادہ کامیابی جس دلیر جانباز کو ہوئی وہ تھے مختار بن ابوعبیدہ۔ انھوں نے ۶۴ھ/ ۶۸۳ء کے قریب قریب ایک لشکر فراہم کرکے ابراہیم بن مالک اشتر کو سپہ سالار فوج بنا کر تقریباً تمام قاتلان حسین کو قتل کیا اس حال میں بھی مرزا دبیر نے ایک طویل مرثیہ کہا ہے جس کا مشہور مطلع ہے :

'' جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی ''

اس مرثیے کے کئی مطلعے ہیں اور پورا مرثیہ لاجواب ہے۔

(۱۱) اصحاب امام حسینؑ میں سے صرف حضرت حر ریاحی کے حال میں عام طور پر مرثیہ گویوں نے مرثیے کہے ہیں مگر حضرت حر کا سراپا سب سے پہلے مرزا دبیر نے ہی نظم کیا ہے۔ اس کے بارے میں خود کہتے ہیں:

اب تک کسی نے حر کا سراپا نہیں کہا   گنجینہ فیض سے ہے خدا کا بھرا ہوا
مضمون میرے حصہ کا یہ تھا دھرا ہوا

اس کے علاوہ اصحاب امام حسینؑ جو ان کے ساتھ شہید ہوئے، کے حال میں مرثیے کہے ہیں۔ اس سلسلے میں مرزا دبیر نے جو مرثیہ حبیب ابن مظاہر کے حال میں کہا ہے جس کا مطلع اول ہے:

'' مصروف نگہداشت شہنشاہ قلم ہے ''

کہا ہے کہ یہ ایجاد ان کے استاد میر ضمیر کی ہے البتہ روایت جو اس حال میں نظم کی ہے اس کے موجد وہ خود ہیں۔

(۱۲) میر ضمیر کے زمانے سے پہلے عموماً چھوٹے چھوٹے بیئیہ مرثیے کہے جاتے تھے اور اکثر سوزخوانوں سے پڑھوائے جاتے تھے۔ میر ضمیر صاحب خود منبر پر پڑھتے تھے اور پڑھتے ہوئے ہاتھ ابرو چشم کے اشارے سے سمجھاتے بھی تھے۔ اس طرح بحور اور اوزان کے متعلق وہ تقاضے نہیں رہے جو سوز خوانوں کے ہوتے تھے۔ اور عموماً مرثیے چار بحروں میں کہے گئے۔ بحر رمل، ہزج، مضارع اور مجتث میں۔ مرزا دبیر نے ان بحور سے ہٹ کر دوسرے اوزان میں بھی مرثیے کہے۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے :

۱۔ روز دہم کا یہ ماجرا ہے

۲۔ عزیزو آج پہلی رات ہے ماہِ محرم کی
۳۔ جب رہے میدان میں تنہا حسینؑ
۴۔ جعفرؑ صادق کا رتبہ خلق میں مشہور ہے
۵۔ جب شبِ عاشور سے نورِ سحر پیدا ہوا
۶۔ جب اہل بیت آئے لاشوں پہ اقربا کے
۷۔ جب صف آرائی کی میداں میں سپاہِ شام نے

(۱۳) مرزا دبیر نے ایک ایک مرثیہ میں جابجا رخصت، لڑائی، شہادت وغیرہ کے موقع پر کئی مطلعے کہہ دیے۔ اس سے مجلسوں میں مرثیہ پڑھنے میں سہولت ہوئی۔ جتنا وقت ہے اسی حساب سے کسی مطلع سے چند بند پڑھ دیے۔ سوزخوانوں نے اپنی سہولت کے لیے مرزا دبیر کے اکثر مراثی پر سوز رکھا اور ان کا کلام دوسرے مرثیہ گوشعراء سے زیادہ پڑھا گیالیکن اس طرح کی تعداد میں لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی اور ایک ہی مرثیے کو کئی مرثیے سمجھا گیا۔

(۱۴) شرع اسلام میں ذبیحہ عیدالضحیٰ کے واسطے جس قدر شرائط کتب فقہ میں ہیں سب کو ایک جگہ پر بطور تمہید بیان فرما کر صاحب ذبح عظیم امام حسینؑ کی تشنہ دہنی اور مصائب ذبح وقتل کا مقابلہ کیا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے:

"آہوئے کعبۂ قربانیٔ داور ہے حسینؑ"

اور زیارت ناحیہ مقدسہ کے اکثر فقروں کا اس مرثیہ میں مطلب بیان کیا ہے:

"کیا شانِ روضۂ خلفِ بوتراب ہے"

(۱۵) سلام میں بھی مرزا دبیر نے ایک خاص بات ایجاد کی ہے وہ یہ کہ کسی واقعہ کو مسلسل دس پندرہ بیس شعروں میں بطور قطعہ نظم کیا۔ ان کے اکثر شاگردوں کے سلاموں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سید عبدالوہاب حسینی حیدر آبادی متخلص بہ وہاب نے ایک سلام کے قطعہ میں جناب علی اکبر کا میدان میں آجانا، رجز، سراپا، رزم سب کچھ نظم کرکے اخیر میں بین کے کچھ شعر کہہ کے سلام ختم کردیا گویا سلام میں ایک پورا مرثیہ موجود ہے۔

مرزا دبیر کی زود گوئی

مرزا دبیر کا کلام جو اب تک شائع ہوا ہے، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بہت ہی پرگو تھے۔ تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کے باوجود مراثی اتنے کہے کہ دفتر ماتم کی ۱۴ جلدوں میں نہ سما سکے — اور اب تک غیر مطبوعہ کلام موجود ہے، اس کے علاوہ بھی سبع مثانی اور دوسری متفرق کتابوں اور رسالوں میں کلام چھپتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ بہت زود گو تھے۔ ان کی اس خصوصیت کے متعلق اسی مقالے میں کہیں کہیں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ کچھ اور واقعات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ افضل حسین ثابت لکھتے ہیں :

> '' جب کبھی طبیعت حاضر ہوتی تھی تو وہ دو دو چار چار گھنٹے میں ستر ستر اسی اسی بند کہہ اٹھتے تھے۔ اس سماں کے دیکھنے والے اہل بصیرت بحمد اللہ اب تک موجود ہیں ••••••• [میر باقر حسین سرکاری وکیل ریاست جے پور کی روایت ہے] •••••••• ان کے روبرو دو کاتبوں کو چار پانچ گھنٹے میں ۱۲۰ بند کہہ کر لکھوا دیے تھے۔ ''[۱]

طبیعت بہت رواں تھی اور موضوع دل پسند تھا۔ مرثیہ کہنا عبادت اور باعث نجات خیال کرتے تھے اس لیے ایسے شعر کہنا طبیعت ثانی ہوگئی تھی۔ اکثر ذاکرین کے اصرار اور مخلصانہ تقاضے پر فوراً ہی کچھ بند کہہ کر دے دیا کرتے تھے جو نقل بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک روایت صاحب حیاتِ دبیر نے میر دستور علی بلگرامی کے حوالے سے نقل کی ہے، ملاحظہ ہو :

> '' مرزا صاحب والد ماجد میر محمد رضا صاحب بلگرامی سے باتیں کرنے لگے کہ یکایک ایک صاحب آئے اور بعد معمولی آداب و تسلیمات کے انھوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ مجھے اس وقت بارہ تیرہ بند اس حال میں کہہ دیجیے کہ بعدِ شہادت علی اصغر، علی اصغر کی ماں قبر علی اصغر پر آئیں کہ میں آج ہی ان پر سوز رکھ کر کل ان رئیس کے یہاں پڑھوں کہ اس حال کا

---

۱ حیات دبیر جلد اول ص ۲۷۲، ص ۵۱

مرثیہ پڑھنے کی ان رئیس[1] نے مجھ سے فرمائش کی ہے مرزا صاحب بولے: جناب اب تو میں مجلس میں جارہا ہوں۔ اس وقت تو معاف فرمایئے۔ انھوں نے عرض کی: حضور میرے رزق کا معاملہ ہے۔ اگر ایسا مرثیہ نہ پڑھوں گا تو شاید مجھے نقصان پہنچ جائے۔ فرمایا: تو اچھا لکھتے جایئے۔ کھڑے کھڑے چودہ یا پندرہ بند کہہ دیے۔ وہ سوز خوان لکھتے گئے اور ان کے ساتھ ساتھ میں لکھتا گیا۔ مرزا صاحب نے اپنے پاس اس کی کوئی نقل نہیں رکھی۔ اس طبیعت حاضر اور زود گوئی پر والد ماجد کو اور مجھ کو سخت تعجب ہوا۔ وہ بند اب تک میرے پاس موجود ہیں نہ دفتر ماتم میں چھپے ہیں اور نہ مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایسے ایسے سینکڑوں مرثیے مرزا صاحب کے منتشر یا تلف ہوگئے جن کی نقل کچھ ان کے گھر میں نہیں رہی۔''[2]

اور بھی ایسے واقعات لوگوں نے نقل کیے ہیں جن سے مرزا دبیر کی زود گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت امیرؑ کے حال کا مشہور مرثیہ:

''ذرہ ہے آفتاب در بو ترابؑ کا''

جس پر اپنے استاد میر ضمیر سے اختلاف ہوا تھا بھی صرف ایک دن میں کہا گیا[3] جیسا کہ اس سے قبل اسی مقالے میں تحریر کیا جاچکا ہے۔ اسی طرح ۱۲۳ بند کا مرثیہ جس کا مطلع ہے:

''جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی۔''

جو دفتر ماتم کی جلد اول میں چھپا ہے کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک ہی رات میں نظم ہوا ہے۔[4]

ہر مہینے مرزا دبیر کی ولادت کی تاریخ کو ان کے گھر پر مجلس ہوتی تھی[5] اور اس

---

۱ رئیس کا نام نہیں دیا ہے۔

۲ حیات دبیر جلد اول ص ۵۳۔۵۲

۳ ایضاً ص ۳۳

۴ حیات دبیر جلد اول ص ۲۷۳

۵ ان کی وفات کے بعد یہ مجلس تیس محرم یا پہلی صفر کو ان کے گھر پر ہوتی تھی (حیات دبیر ص ۹۰)

مجلس میں وہ ہر ماہ اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے جس کے بارے میں خود ایک سلام کے مقطع میں کہتے ہیں :

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر مہ
دبیر اس کو سمجھو مہینہ ہمارا[1]

مذکورہ بالا واقعات نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ راقم کا مقصد اس طرح کے واقعات پر زور دینا نہیں ہے بلکہ مرزا دبیر کی جودت طبع اور خلاقی کی مثالیں پیش کرنا ہے جن کو ان واقعات کی مدد سے زیادہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ پرگوئی میں شاعرانہ محاسن اور تخلیقی قوتوں کا اظہار مرزا دبیر کی فنکاری کی دلیل ہے کیونکہ عموماً پرگو رطب ودیا بس میں تمیز نہیں کرتے لیکن مرزا دبیر نے اپنی تمام تر پرگوئی اور فرمائش پر مرثیے کہنے کے باوجود کلام کے فنی محاسن کو اولیت دی۔ صنائع و بدائع، نادر تشبیہیں، متنوع استعارے، زبان و بیان کی باریکیاں، جزئیات پر نظر وغیرہ میں ان کی زودگوئی کسی طرح سے حائل نہیں ہوئی۔ ان کے کلام کے اس پہلو کے مطالعہ سے واضح طور پر احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے فن شعر کو اپنی شخصیت کا جزبنالیا تھا اس لیے ان کے تجربات، محسوسات اور جذبات میں تخلیقی رویے زودگوئی کی صورت میں بھی سامنے آتے تھے۔

مرزا دبیر کی پرگوئی کے واقعات میں مراثی کی نقل نہ رکھنا، متعدد انکشافات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ نادرات دبیر کے نام سے آئے دن جو نئے مراثی کی دریافت ہوتی ہے ان میں بیشتر مراثی وہ ہیں جو مرزا دبیر نے کسی سوزخوان یا مرثیہ خوان کی فرمائش پر کہہ کر دیدیے ہوں جن کی نقل مرزا صاحب نے نہ رکھی ہو۔ موجودہ صورت میں تمام نودریافت مرثیوں کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سب اسی انداز کے مرثیے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعضوں کا مذکورہ بالا شق کے مراثی ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ مرزا دبیر کے بارے میں محققوں کی سہل انگاری نے یہ امکان بھی ختم کردیا ہے کہ اب ان میں سے زیادہ تر مرثیوں کی شناخت کی جاسکے۔

○

---

۱ حیات دبیر جلد اول ص ۳۵

باب پنجم

مراثی کی تفصیل

مرزا دبیر کی زود گوئی اور روانی طبع سے یہ بات عیاں ہے کہ مرزا دبیر نے بہت سے مرثیے کہے ہوں گے۔ ان کے مطبوعہ کلام کی تعداد بھی کافی ہے اور اب تک غیر مطبوعہ کلام برابر سامنے آرہا ہے جس کے بارے میں آئندہ صفحات میں مفصل گفتگو ہوگی۔ باوجود اس کے کہ اکثر دوستوں اور شاگردوں کی فرمائش پر بھی مرثیہ کہہ کر انھیں کا تخلص ڈال دیا کرتے تھے اور اپنے پاس کوئی نقل نہیں رکھتے تھے تو اس طرح بہت سے مرثیے ضائع ہوگئے۔ تعداد مراثی کے بارے میں مولوی محمد حسین آزاد تحریر کرتے ہیں:

> ''مرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس مدت میں کم سے کم ۳ ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں .... اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئے گا نہ ویسے صاحب کمال پیدا ہوں گے۔''[1]

محمد حسین آزاد کا بیان مبالغہ آمیز ہے۔ انہوں نے تو میر انیس کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے کہ ''کم از کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔''[2] جو کسی طرح بھی حقیقت نہیں۔ میر انیس پر آج تک اتنا کام ہوا مگر یہ تعداد کسی محقق کی نظر سے نہیں گزری۔

مرزا دبیر کے کلام کی تعداد کے بارے میں سب سے پہلی شہادت مولوی صفدر حسین مصنف شمس الضحیٰ کی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''واضح باد کہ ادراک حال تصانیفش دشوار...... آنچہ تا آخر عمر فرمودہ احصارش ممکن نیست با ایںہمہ از کلامش کہ نزد تلمیذان آنجناب [مرزا دبیر] است اکثر کلام نزد صاحبزادہ آنجناب ...... مرزا محمد جعفر صاحب اوج دام مجدہ موجود است بایں تفصیل مرثیہ زائد از سہ ہزار وسلام زائد از سہ ہزار مع مخمس و رباعیات قریب دہ ہزار کلام فارسی ہچو مخمس ہفت بند ملا کاشی و مسدس اشعار محتشم علیہا الرحمۃ و قصائد و چند جلد مثنوی و چند جلد کتب دیگر مشتمل بہ نظم و نثر مع دیگر تصانیف متفرقہ عربیہ و فارسیہ و اردو کہ این ہمہ بہ مناقب و

---

۱ آب حیات، ص ۵۴۱-۵۴۰

۲ آب حیات، ص ۵۴۳

مصائب حضرات چہار دہ معصومین علیہم السلام است۔"[1]

مراثی کی تعداد جو بتائی گئی ہے بہت زیادہ ہے۔ مرزا دبیر نے عمر بھر مرثیے کہے۔ زود گو بھی تھے۔ ایک ایک واقعہ کو کئی طرح سے نظم کیا ہے۔ ایک ایک چیز کو کئی کئی پہلوؤں سے دیکھنے کی صلاحیت ان میں تھی مگر اس کے باوجود یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ دراصل مرثیہ کی تعداد کے تعین کے بارے میں ایک عام الجھن یہ ہے کہ مرثیہ گویوں نے ایک ایک مرثیہ میں کئی کئی مطلع رکھ دیے۔ اور مرزا دبیر کے یہاں تو یہ خصوصیت خاص طور پر پائی جاتی ہے اس سے ایک فائدہ تو انھیں ضرور ہوا کہ مجلس کے وقت، سامعین کے ذوق اور اپنی فرصت اور جسمانی صحت کو مدنظر رکھ کر ایک مرثیے کے کسی ٹکڑے کو لے کر پڑھتے تھے دوسری بات یہ کہ ایک مرثیہ کو کئی مجلسوں میں پڑھ لیتے تھے مگر اہل ذوق حضرات مجلسوں میں نقل بھی کر لیتے تھے اور یہ نقلیں بعد کے لوگوں تک بھی پہنچیں، پورا پورا مرثیہ تو لوگوں کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مطلع سامنے آیا اور اس کو پورا مرثیہ سمجھ کر تعداد کا تخمینہ لگایا گیا۔ یہاں یہ سوچنے کی بھی گنجائش ہے کہ اس سے مرثیہ گو کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ بنیادی طور پر تو اشعار کی تعداد وہی رہی جس تعداد میں کہے گئے۔ مگر محض ٹکڑے ہونے سے مرثیے کے بند دہرائے گئے کیونکہ ربط مصائب کے لیے اکثر بند دہرائے جاتے تھے۔ اگر کسی نے دوسرے مطلع سے مرثیہ حاصل کرلیا تو اس میں بندوں کی تعداد زیادہ ہوگی بہ نسبت اس کے جو ساتویں یا آٹھویں مطلع سے لیا گیا۔ غرض اس طرح صحیح تعداد کا اندازہ لگانا دشوار ہے اس سے ایک الجھن یہ بھی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کوئی مرثیہ چھپ گیا ہے اور اسی مرثیہ کا دوسرا حصہ دوسرے مطلع سے کسی صاحب کے پاس ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ غیر مطبوعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مراثی کے غیر مطبوعہ ہونے میں بھی قطعی فیصلہ دینے سے پہلے ان کو مطبوعہ مراثی کے ایک ایک بند سے ملانے کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی تصنیف "شاعر اعظم" میں ایک مطلع لکھ کر اس مرثیہ کو غیر مطبوعہ مراثی کی فہرست میں شامل کرلیا۔ مطلع یہ ہے: "گہوارے میں دَرندۂ اژدر علی علی"۔[2]

---

1 شمس الضحیٰ حاشیہ، ص ۹۸ 2 شاعر اعظم، ص ۹۲

انھیں ضرور یہ مرثیہ کہیں سے ملا ہوگا مگر حقیقت میں ۲۶۴ بند کا ایک مرثیہ ہے جس کا مطلعِ اول ہے: ''روشن ہے لوح مہر مبیں کس کے نام سے'' اور (۱) ''در نجف ہے مدح علیؑ میں تخن مرا'' (۲) چاہیں تو آئینہ کو سکندر کریں علیؑ (۳) ''گہوارے میں درندۂ اژدر علی علیؑ'' بھی اس کے ضمنی مطلعے ہیں[۱]

اسی طرح ڈاکٹر اکبر حیدری نے غیر مطبوعہ فہرست میں ایک مرثیہ شامل کیا ہے جس کا مطلع (بقول ان[۲] کے) ہے: ''جب نخل انتقام میں تیغوں کے پھل لگے۔'' یہ دراصل اس مرثیہ کا ایک ٹکڑا ہے جو ''نادراتِ مرزا دبیر'' میں اس مطلع ''جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی'' سے چھپا ہے۔ یہ ایک طویل مرثیہ ہے۔ راقم نے اس کا مخطوطہ مرزا صادق صاحب کے پاس دیکھا ہے۔ راقم کا مقصد ڈاکٹر اکبر حیدری کی حرف گیری کرنا نہیں بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس الجھن کا سبب بن گئی ہے' ورنہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ضرور ایسے قلمی نسخے ملے ہوں گے جن کی بنیاد پر انہوں نے ان کو علاحدہ مرثیے شمار کیا ہے۔ ثابت نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> ''ایک ایک مرثیے میں پانچ پانچ چھ چھ مطلع کہنے کے سبب سے بھی مرزا صاحب نے اگر ایک ہزار مرثیے کہے ہوں گے تو پانچ سات یا دس ہزار مشہور ہو گئے۔''[۳]

اس کے علاوہ مجلسوں میں پڑھنے کے لیے کافی اہتمام سے ایک مرثیہ تیار کیا جاتا تھا جس میں مختلف مراثی کے چیدہ چیدہ بند شامل کیے جاتے تھے تاکہ ہر بند چست ہو اور خوب داد ملے۔ اگر یہ انتخاب ایک ہی مصنف کے مراثی سے کیا جاتا پھر بھی ایک بات تھی۔ کم از کم ایک مصنف سے تو منسوب ہوسکتا تھا مگر اسے اکثر مختلف مرثیہ گویوں کے مراثی سے انتخاب کر کے پڑھنے کے قابل بنایا جاتا تھا۔ اگر ایسا لکھا ہوا مرثیہ نہیں ہو اور اتفاق سے اس میں کہیں کسی شاعر کا تخلص پڑ گیا ہو اس سے بھی دھوکا ہونے کا احتمال ہے یا مطلع کسی مصنف کا مشہور ہو تو پورا مرثیہ اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ ایسا

---

۱ راقم نے اس مرثیے کو مرزا دبیر کے پڑپوتے مرزا صادق صاحب کے پاس دیکھا ہے۔

۲ شاعر اعظم، ص ۱۹۰

۳ حیات دبیر، ص ۲۷۵

ممکن ہے اور زبانوں کے مراثی کے ساتھ بھی ہوا ہو۔ جہاں تک راقم کا تعلق ہے کشمیری مراثی میں تو یہ اب بھی ہوتا ہے۔ اکثر ذاکرین فضائل کا حصہ ایک مرثیے سے پڑھتے ہیں اور مصائب کا حصہ کسی دوسرے مرثیے سے پڑھ لیتے ہیں۔ ذاکرین ربط اس طرح دیتے ہیں کہ اگر سننے والا واقف نہ ہو تو پہچان نہیں کر پائے گا۔ اردو کے دو عظیم المرتبت شاعروں میر انیس اور مرزا دبیر کے زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا اور ایسے مراثی کو ''پیوندی'' مرثیہ کہتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی نے اس سلسلے میں ایک حکایت لکھی ہے:

''ایک سید صاحب مجیب تخلص ساکن گڑھی نعیم خان بارہ امام کی درگاہ میں نوکر اور میاں واجد تمباکو فروش کے تلمیذ تھے۔ میر مجیب اگرچہ غزل گو شاعر تھے مگر گاہ گاہ مرثیہ کہہ کر میاں واجد کو دکھاتے تھے اور مرثیہ خوانی میں میر شرف الدین مرحوم کے شاگرد تھے ان کے مرثیے کا یہ مصرعہ ہے:

اب عرض میرے سمت سے یہ کیجئے موسیٰ

مرثیہ خوانوں نے مرزا دبیر مرحوم وغیرہ کے دو تین مرثیوں کے بند لے کر میر مجیب کے اس مرثیے میں ملا دیئے اور مطلع مرثیۂ مشہورہ کا لگادیا۔ چنانچہ اس مرثیہ میں مرثیہ (۱) ہے یوسف کنعان فصاحت سخن اپنا۔ اور

(۲) تسبیح امامت جو گری خاک شفا پر۔ اور

(۳) جب رن میں دم عصر شہ بحر و بر آئے

مرثیہ مرزا فصیح اور دبیر مرحوم کے بھی بند شامل ہیں جو چاہے دیکھ لے۔ غرض کہ ایسے مرثیہ کو جو دلق فقیرانہ اس طور سے مروج ہے' اہل مطبع نے چھاپ دیا۔ اس قسم کے بہت سے مرثیے میر و مرزا کے ہیں۔''[1]

افضل حسین ثابت اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''پیوندی یا اصلی مرثیوں کی یہ کیفیت ہے کہ ذاکروں میں یہ عادت جاری تھی اور اب بھی ہے کہ پانچ سات مرثیوں کے چست چست بند چھانٹ کر ایک مرثیہ کسی ذاکر نے بنالیا اور پڑھا۔ ظاہر ہے کہ معمولی مرثیہ سے زیادہ اس پر مجلس میں رنگ ہوگا۔ خربزے کو دیکھ کر خربزہ رنگ

---

۱ سنان دلخراش۔ منیر شکوہ آبادی، ص ۴۳-۱۴۲

پکڑتا ہے .... اب جو دوسرا ذاکر ذاکر اول کا مد مقابل منبر پر گیا تو اس نے بھی یہ سمجھ کر معمولی مرثیے پر شاید یہ رنگ نہ ہو ایسا ہی پیوندی مرثیہ پڑھ کر کامیابی حاصل کی...... چنانچہ قدیر الدولہ مرحوم اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں:

اپنا ہی کلام ہم تو پڑھتے ہیں قدیر
اور یاروں کا ہر مرثیہ پیوندی ہے''[1]

اس لیے مولوی صفدر حسین مصنف 'شمس الضحیٰ' اور مولوی محمد حسین آزاد مصنف 'آبِ حیات' کے بیانات کو صحیح ماننے میں تامل ہونا چاہیے جو کلام مرزا دبیر کا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ اب تک سامنے آیا ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

مراثی مطبوعہ

افضل حسین ثابت کے پیش نظر مرزا دبیر کا جو مطبوعہ کلام تھا اودھ اخبار کی دو جلدوں اور دفتر ماتم کی بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ غیر مطبوعہ مراثی کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں بعض اب تک شائع ہو چکے ہیں اور بعضوں کا ابھی شائع ہونا باقی ہے۔ ان کے بعد بھی کئی ایسے مرثیے سامنے آئے ہیں جو مرزا دبیر کی تصنیف ہیں اور اب تک نہیں چھپے ہیں۔ اس صورت میں جو مطبوعہ کلام سامنے آیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

اودھ اخبار کی دو جلدیں

افضل حسین ثابت نے مرزا دبیر کے مطبوعہ کلام کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''مطبوعہ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مطبع اودھ اخبار میں دو جلدوں میں چھپا ہے، دوسرا وہ جو اور مصنفوں کے کلام کے ساتھ یا علاحدہ علاحدہ مرثیے چھپے ہیں۔ ان سب مرثیوں میں اکثر کلام غلط اور ایسا پیوندی کلام شامل ہے جس کا چھانٹنا دشوار ہے بلکہ مطبع اودھ اخبار کی جلدوں میں تو بعض مرثیے ایسے ہیں جن کا ایک بند بھی کلام مرزا صاحب سے نہیں ہے جیسے یہ مرثیہ

---

1 حیات دبیر، ص ۲۷۶-۲۷۵

''ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا''[1]

مرزا نظیر اور مرزا دبیر کی تصنیف ہے''[2]

آگے چل کر تحریر کیا ہے:

''تیسری قسم کلام مطبوعہ کی وہ بیس جلدیں دفتر ماتم کی ہیں جو یکجائی میر عبدالحسین صاحب دس روپے میں بیچتے ہیں۔ ان میں بھی بعض کلام غیر بعض مرثیے کے مرثیے اور بعض بند کلام غیر کے شامل ہیں جن کا امتیاز مشکل ہے میں آگے چل کر دفتر ماتم کے بعض مرثیوں کی نسبت مع دلیل یہ رائے ظاہر کرونگا کہ وہ مرزا صاحب کی تصنیف نہیں ہیں البتہ بند جو جابجا مخلوط ہیں ان کی نسبت ایسی رائے ظاہر کرنے سے مجبور ہوں کہ اتنا چھان بین کا وقت و فرصت نہیں ہے۔ ایسے مرثیے چھپ جانے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ جب یہ

---

۱ ثابت کے نزدیک یہ مرثیہ مرزا دبیر کا نہیں ہے لیکن انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ زیرنظر مرثیہ نول کشور جلد اوّل میں شامل ہے جو ۱۶۶ بند پر مشتمل ہے اور اس میں مرزا دبیر کا تخلص بھی درج ہے۔ اسی طرح موصوف نے ''برباد جب مرقع خیر النسا ہوا'' کو نظیر لکھنوی کی تصنیف قرار دیا ہے حالانکہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ مذکورہ مطلع مرزا دبیر کے مرثیہ ''حرزگلوئے مصحف یزداں حسین ہے'' کا ۸اواں مطلع ہے اس کا بند نمبر ۸۷ عربی میں اور بند ۸۸ اس کا ترجمہ ہے دونوں بند ملاحظہ ہوں: بند نمبر ۸۷

قد قالت البتول له روحنا فداك ویل تقاتل قطع الراس من قفاك
یا لیتنی هلك ولم ادرما عزاك اشكوالی ابی والی الله من جفاك
یبكی ابوك یا ولدی اللیل و النهار كالمزن من عزاك خزینا بالاختیار

بند نمبر ۸۸ روح بتولؑ کہتی تھی میں تجھ پہ ہوں فدا۔ اے وائے اس پہ جس نے ترا سر کیا جدا۔ اے کاش میں نہ دیکھتی یہ حادثہ ترا۔ شکوہ کروں گی پیش خدا پیش مصطفٰےؐ۔ بابا تمہارے غم کو شب و روز روتے ہیں۔ باراں کی طرح اشک رواں ان کے ہوتے ہیں۔

۲ حیات دبیر جلد ۱، ص ۲۷۵

مرثیے چھپنا شروع ہوئے تو مرزا اوج صاحب قبلہ کے پاس بہت تھوڑے سے مرثیے تھے۔ انہوں نے جابجا سے مرثیے منگوا کر مطبع کو دیئے۔ وہ اکثر شاگردوں کے پاس تھے جن میں شاگرد پیوند لگا چکے تھے۔ ان کا علاحدہ کرنا امر دشوار تھا۔ وہ اسی طرح چھپ گئے۔ یہ حال مجھے یوں معلوم ہوا کہ اسی زمانے مرزا اوج صاحب نے کچھ مرثیے میرے نانا ظہیر مرحوم سے بھی منگائے تھے۔ ان اکثر مرثیوں میں ترتیب اصلی وقت تصنیف کی قائم نہیں رہی اور بعض مقام سے بعض مرثیے غیر مسلسل نظر آتے ہیں۔ ان دفتر ماتم کی ۱۴ جلدوں کے مرثیوں کی تعداد ۳۶۶ حسب شرح تحت ہے اور یہ سب بجز ایک مرثیہ مربع کے جس کا مطلع یہ ہے ''لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے'' مسدس ہیں۔

تفصیل و ترتیب مرثیہ ہائے دفتر ماتم

نمبر شمار	تعداد مرثیوں کی	نمبر شمار	تعداد مرثیوں کی
۱	۲۵	۲	۲۵
۳	۲۹	۴	۲۷
۵	۲۷	۶	۲۹
۷	۲۵	۸	۳۰
۹	۲۶	۱۰	۲۷
۱۱	۲۵	۱۲	۲۹
۱۳	۳۳	۱۴	۱۹
میزان			۳۶۶''[۱]

آگے چل کر الحاقی مرثیوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''از بسکہ کلام مطبوعہ کا حال لکھ رہا ہوں اس لیے اس موقع پر وہ فہرست بھی پیش

---

۱ حیات دبیر، ص ۲۷۶-۲۷۷

کردوں جو مرثیے سرسری نظر سے دیکھنے پر مجھے مرزا صاحب کے نہیں معلوم ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

نمبر شمار	مطلع	کس جلد میں ہے	کیفیت
۱	جو زائرِ حسین علیہ السلام ہو	جلد دوم	مرزا مرحوم کی زبان معلوم نہیں ہوتی اس لیے ان کا کلام نہیں ہے
۲	شیرِ خدا کا شیر ہے آ ہوئے مصطفےٰ	جلد پنجم	ایضاً
۳	عباس کو جو سبطِ نبی نے علم دیا	جلد ہفتم	نہ مرزا صاحب کی زبان ہے نہ طرز بیان ہے غالباً ان کے کسی شاگرد کا ہے
۴	شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضیٰ	۸	زبان سے بھی مشیر مرحوم کا معلوم ہوتا ہے اور مجھے تحقیق بھی ایسا ہی ہوا ہے
۵	یارو غمِ حسینؑ کی عزت عظیم ہے	۹	مرزا مرحوم کی زبان نہیں غالباً مشیر مرحوم کا ہے
۶	کیا ذاتِ ذوالجلال غفور ورحیم ہے	۱۱	مرزا صاحب کی زبان نہیں معلوم ہوتی‘‘[۱]

اس طرح افضل حسین ثابت کی تحقیق کے مطابق دفتر ماتم میں شائع ہونے والے مراثی جو مرزا دبیر کے تصنیف کردہ ہیں کی تعداد ۳۶۰ رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور چار

---

۱ حیات دبیر، ص ۲۷۵

مراثی دفترِ ماتم میں ایسے ہی ہیں جو میر ضمیر مرحوم کے نام سے "مجموعہ مرثیہ میر ضمیر" میں شامل ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:[1]

شمار	مطلع	دفتر ماتم جلد نمبر بندوں کی تعداد	صفحہ نمبر مجموعہ مرثیہ میر ضمیر بندوں کی تعداد
۱	اے مومنو کس باغ میں عالم ہے خزاں کا	جلد ۱۱/ ۴۹ بند	صفحہ ۲۵۹/ ۴۲ بند
۲	جب فوج حسینی گئی گلزارِ ارم کو	جلد ۱۰/ ۵۶ بند	صفحہ ۴۱/ ۶۱ بند
۳	غل ہے میداں میں کہ عباس علی آتے ہیں	جلد ۸/ ۶۴ بند	صفحہ ۲۴۵/ ۶۸ بند
۴	کیا شور آمد آمدِ عباسؑ رن میں ہے	جلد ۱۳/ ۷۲ بند	صفحہ ۲۳۹/ ۵۰ بند

ان کو اگر کم کیا جائے تو ثابت کی بتائی ہوئی تعداد میں اور کمی ہوجائے گی یعنی اس طرح دفترِ ماتم میں ۳۶۰-۴=۳۵۶ ہی مراثی مرزا دبیر کے ہیں۔ دفتر ماتم سے الگ جو مرثیے شائع ہوئے ہیں اور دفتر ماتم میں نہیں ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مرثیہ مرزا دبیر جلد اول نولکشور پریس[2]

۱ جب عابدِ مریض کو داغِ پدر ملا

۲ جب رن میں بوستانِ پیمبر ہوا تباہ

۳ روانہ نہرِ لبن کو جو شیرخوار ہوا

۴ انگشتریِ عرش کا یارب نگیں دکھا

(۲) مرثیہ مرزا دبیر جلد دوم

۱ جب روزِ نہم ختم ہوا ماہِ عزا کا

---

۱ مجموعہ مرثیہ میر ضمیر جلد اول پہلا ایڈیشن۔ مطبع نامی منشی نولکشور۔ کانپور جولائی ۱۸۹۸ء

۲ منشی نولکشور نے مرزا دبیر کے انتقال کے صرف نو مہینے بعد یعنی دسمبر ۱۸۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں مطبع اودھ اخبار لکھنو سے "مرثیہ مرزا دبیر" کی جلد اول شائع کی تھی اور جلد دوم اسی مطبع سے اس کے تین چار مہینے بعد اپریل ۱۸۷۶ء میں شائع کی۔ اس کے بعد یہ جلدیں مطبع نولکشور سے بھی کئی مرتبہ شائع ہوئیں اور مراثی میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی۔

۲ عاشورہ حسین کا ہے واقعہ شدید

۳ بانو کا ہوا عقد جو سلطانِ امم سے

۴ گلگونۂ رخسارِ فلک گرد ہے رن کی

یہ مرثیہ شاگرد دبیر فقیر حسین عظیم کا ہے۔
(اشاریہ ضمیر اختر)

۵ اے فکر نظم آمدِ مضموں کا وقت ہے

برادر دبیر نظیر کا مرثیہ ہے
(اشاریہ ضمیر اختر)

۶ جب اربعین کو آئے حرم قتل گاہ میں

۷ اے مومنو شبیر دو عالم کے شرف ہیں

شاگرد دبیر میر صفدر علی صفدر کا مرثیہ ہے۔
(اشاریہ ضمیر اختر)

۸ فرزند علی صاحبِ اعجاز ہے واللہ

۹ جب کوچ کی شب قبر نبی پر گئے شبیر

۱۰ کیا اہلِ وفا حضرتِ زینب کے پسر تھے

(۳) نوائب کربلا مطبع یوسفی دہلی [1]

۱ خاتونِ کائنات جنابِ بتول ہیں

۲ کعبہ کے لیے قبلہ نما روحِ حسین ہے

۳ آمد ہے اہل بیتِ پیمبرؑ کی شام میں

۴ جب رن میں باغ فاطمہ تاراج ہوگیا

۵ مظلوم کی سپاہ جو زیر و زبر ہوئی

۶ جب دولتِ اولاد شہہِ دیں نے لٹادی

---

۱ نوائب کربلا ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں افسردہ خلیق، ضمیر، فصیح، دلگیر، میر انیس، میر نفیس، مرزا اوج وغیرہ کا کلام بھی ہے۔ مرزا دبیر کے بھی اس میں کچھ مرثیے شامل ہیں۔

(۴) سبع مثانی[1]

۱ اے صبح کیا ہوا کہ ترا جیب چاک ہے

۲ جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے

(۵) شعار دبیر[2]

۱ ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے

۲ عباس جبکہ جانب کوثر رواں ہوئے

۳ سبطینِ شہِ قلعہ شکن آتے ہیں رن میں (یہ مرثیہ بھی پہلی بار اسی میں شائع ہوا)۔

(۶) شاہکار سخن[3]

۱ جب خونِ ناحق شہدا جوش زن ہوا

---

۱ ۱۴ مراثی کا یہ انتخاب مرزا طاہر رفیع (مرزا دبیر کے پوتے) کی نگرانی میں سید سرفراز حسین خبیر نے کیا ہے اس میں مرزا طاہر رفیع کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔

۲ یہ مہذب لکھنوی کا مرتب کیا ہوا انتخاب ہے اس میں سات مرثیے ہیں اور ۱۹۵۱ء میں "انجمن محافظ اردو لکھنو" کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ دو مرثیے یعنی (۱) ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے (۲) عباس جبکہ جانب کوثر رواں ہوئے۔ غیر مطبوعہ ہیں۔

۳ چھ مرثیوں کا یہ انتخاب مہذب لکھنوی کا مرتب کیا ہوا ہے جسے کمال لکھنوی نے "انجمن محافظ اردو" کی جانب سے سرفراز قومی پریس لکھنو سے شائع کروایا۔ سن طباعت تو اس پر نہیں دیا ہے البتہ مہذب لکھنوی نے "دل کی آرزو" کے عنوان سے جو پیش لفظ لکھا ہے اس میں ۸ فروری ۱۹۵۶ء کی تاریخ پڑی ہے اس کے علاوہ ایک نوٹ کے تحت ۱۱فروری ۱۹۵۶ء کی تاریخ کی ایک خبر دی گئی ہے جس سے سن طباعت صاف ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ انتخاب چھپا ہے۔
اس میں تعشق، دبیر، اوج ، رفیع، انیس اور مونس کا ایک ایک مرثیہ ہے۔ مرزا دبیر کا جو مرثیہ (جب خون ناحق شہدا جوش زن ہوا) اس میں ہے یہ مختار کے حال کا ہے اور اس میں ۱۳۷ بند ہیں گمان غالب ہے کہ یہ بھی اس طویل مرثیہ کا ایک ٹکڑا ہے جس کا مطلع ہے:

(۷) ماہِ کامل[۱]

۱ مہرِ علم سرورِ اکرم ہوا طالع[۲]

(۸) کلام دبیر[۲]

۱ آمد خزاں کی گلشنِ خیرالوریٰ پہ ہے

(۹) نادرات مرزا دبیر[۳]

۱ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے

۲ جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی

''جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی''
اور جس کا ذکر راقم اس مقالے میں پہلے بھی کر چکا ہے اور آگے نادرات مرزا دبیر کے تحت بھی آئے گا۔

۱ یہ مجموعہ بھی مہذب لکھنوی نے مرتب کیا ہے اس میں غیر منقوط کلام شامل ہے جن میں سات رباعیاں، ایک سلام اور ایک مرثیہ ہے۔ مرثیہ کے صرف ۶۹ بند شائع ہوئے ہیں جبکہ راقم نے مرزا صادق صاحب کے پاس جو نقل دیکھی ہے اس میں ۷۳ بند ہیں۔ اس کے ناشر سید حسین میرزا مقرب لکھنوی ہیں۔ آخر میں قطعہ تاریخ دیا ہوا ہے جس سے ۱۳۷۹ء نکلتا ہے۔

۲ اس مرثیہ کے متعلق تفصیل سے اس سے قبل اسی مقابلہ میں بحث کی گئی ہے۔

۳ کلام دبیر اور یوم دبیر کے نام سے یوم دبیر منعقدہ ۲۶ جون ۱۹۶۵ء کی مختصر کارروائی ''ادارۂ یادگار دبیر'' کی جانب سے اگست ۶۵ء میں شائع ہوئی جس میں ایک مرثیہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

۴ مرزا دبیر کے ۵ مراثی کا یہ انتخاب ڈاکٹر سید صفدر حسین نے ۱۹۷۵ء میں لاہور پاکستان سے شائع کیا۔ ہندوستان میں چمن بک ڈپو دہلی نے ۱۹۷۷ء میں اسے شائع کیا۔ اس میں حضرت امام حسین کے حال میں ۱۱۱ بند کا مرثیہ ''کیوں چرخ میں گردوں کی طرح ...'' اور جناب مختار کے کارناموں کے بیان پر مشتمل ۴۷ بند کا مرثیہ: ''جب تیغ انتقام برہنہ...'' پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ ۱۵۷ بند کا مختار کے حال کا مرثیہ'' روشن کیا جو حق نے چراغ انتقام کا'' بھی اس میں شائع ہوا ہے۔ یہ مرثیہ دراصل اس مرثیہ کا حصہ ہے جو 'شاہکار سخن' میں 'جب خون ناحق شہدا جوش زن ہوا'' کے مطلع سے شائع ہوا ہے۔

(۱۰) شاعر اعظم۔ مرزا سلامت علی دبیر[۱]

۱ ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا

اس طرح سے مطبوعہ مراثی کی تعداد ۲۸ + ۳۶۰ = ۳۸۸ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مطبوعہ مراثی کی نشاندہی ڈاکٹر اکبر حیدری نے شاعر اعظم (ص ۱۸۹ ۱۸۷) میں کی ہے۔

ان میں سے جو مندرجہ بالا مطبوعہ مراثی میں نہیں آئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ عباسؑ علی جوہرِ شمشیرِ وفا ہیں
۲۔ مفتاح باغ فضل سخن ہے وفا مری
۳۔ ہاں اے قلم مرقع قدرت دکھا تو دے
۴۔ جب رن میں ابنِ شیرِ خدا حملہ ور ہوا
۵۔ اے مومنو کیا باعث ایجاز میں ہے
۶۔ جب کوزۂ خورشید بھرا نورِ سحر سے
۷۔ جب رن میں شاخِ نخلِ امامت قلم ہوئی
۸۔ جب لالۂ شفق نے دکھائی بہار صبح
۹۔ جب صبح شب قتل نمایاں ہوئی رن میں
۱۰۔ اے طبع رواں سیف قلم جلد علم کر
۱۱۔ مقتل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد
۱۲۔ فولاد کی ضریح میں کس کا مزار ہے
۱۳۔ کوفہ جو ہوا رشک چمن فصلِ چمن میں
۱۴۔ جب نقش کن سے زینت لوح بقا ہوئی
۱۵۔ آمد گل مراد حسن پر خزاں کی ہے
۱۶۔ عزیزو حادثۂ نو فلک دکھاتا ہے

---

۱ ڈاکٹر اکبر حیدری نے "شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر" میں ایک غیر مطبوعہ مرثیہ شائع کیا ہے جس کا مطلع ہے: "ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا" یہی وہ مرثیہ ہے جس پر بقول افضل حسین ثابت میر ضمیر سے بے لطفی پیدا ہوگئی تھی۔

۱۷۔ ماتم کا مرقع ہے کہ خاموش ہے مجلس

۱۸۔ غل ہے کوفہ میں اسیرانِ حرم آتے ہیں

۱۹۔ قربان ملک ہوتے ہیں اس بزمِ عزا کے

۲۰۔ رن میں زوالِ مہرِ منور کا وقت ہے

۲۱۔ سفرِ مرگ کی جب شاہ نے تیاری کی

۲۲۔ جب عریضہ شہ کو صغرا نے بچشمِ تر لکھا

۲۳۔ کرسی نشینِ عرش منور حسین ہے

ڈاکٹر اکبر حیدری کی نشاندہی پر اگر ۲۳[۱] مرثیہ بھی شمار کر لیے جائیں تو مطبوعہ مراثی کی تعداد ۳۸۸+ ۲۳ =۴۱۱ تک پہنچ جاتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر اکبر حیدری نے غیر مطبوعہ مراثی کی ایک طویل فہرست دی ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

مراثی غیر مطبوعہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا دبیر کے مراثی کی تعداد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اس کی تفصیل راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے اب جو اضافہ کی گنجائش باقی ہے وہ ہے غیر مطبوعہ مراثی کا سرمایہ۔ ان کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

---

۱ شاعر اعظم ص۱۸۹۔۱۸۸ پر حیدری صاحب نے ایسے ۳۵ مرثیوں کی نشاندہی کی ہے جو بقول ان کے دفتر ماتم میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ راقم نے جب ان مطلعوں کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک مرثیہ دفتر ماتم کی جلد ۱۱ میں شامل ہے جس کا مطلع ہے "عاشور محرم سے یہ نیرنگ جہاں ہے" اور دوسرے دس مرثیے نولکشوری جلد ۱۔۲ یا 'شعار دبیر' میں شائع ہوئے ہیں چونکہ ان مراثی کا تذکرہ ہو چکا تھا اس لیے وہی مطلعے یہاں درج کیے گئے ہیں جنکو شمار میں اس سے قبل نہیں لایا گیا تھا۔ اس میں یہ گنجائش بھی ہے کہ ممکن ہے یہ ضمنی مطلعے ہوں اور ان میں کوئی مرثیہ دفتر ماتم میں دوسرے مطلع سے شائع ہوا ہو جیسا کہ راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے مگر بالتحقیق ثابت ہونے سے پہلے ان کو شمار کرنا ہی پڑے گا۔

مراثی کی تفصیل

۱۔منیر شکوہ آبادی نے "سنان دلخراش میں مرزا دبیر کے ایک ایسے مرثیہ کی نشاندہی کی ہے جو اب تک مطبوعہ شکل میں سامنے نہیں آیا ہے۔ ہند کے حال کے اس مرثیہ کا مطلع ہے:" نام ان کا جوانانِ نبی عرش نشیں ہے" (سنان دلخراش ص۱۹۴)۔

۲۔ ثابت نے جن مراثی کی نشاندہی کی ہے ان میں سے مندرجہ ذیل ابھی تک زیورِ اشاعت سے محروم ہیں۔

۱۔ کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے۔	ثابت اس کی کیفیت کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک بہت بڑا مرثیہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۰۰۰ بند کا عہد شاہی کی تصنیف ہے اور اس میں اقربائے امام حسینؑ کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔[۱]
۲۔ آمد ہے خداوند شجاعان زمن کی	اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں یہ لاجواب مرثیہ امام حسین کے حال کا ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد تصنیف ہوا ہے۔[۲]
۳۔ اے کلکِ رقم سلکِ قلمداں سے جدا ہو	اس کے بارے میں ثابت لکھتے ہیں کہ یہی ایک مصرع سنا ہے کہ لاجواب مرثیہ ہے۔[۳]

---

۱ حیات دبیر جلد اول، ص ۲۸۱

۲ ایضاً، ص ۲۸۲

۳ ایضاً

۴۔ قبضہ ہے علقمہ کی ترائی پہ شیر کا	ثابت تحریر کرتے ہیں کہ پورا مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال کا ہے۔ شاندار اور لاجواب ہے مگر مشتہر نہیں ہوا۔[۱]
۵۔ کیا رفتہ رفتہ اوج پہ ذہن رسا گیا	ثابت کو اس مرثیہ کا مطلع نہیں ملا تھا انھوں نے اس طرح سے اس کی کیفیت بیان کی ہے: ''مطلع مجھے یاد نہیں رہا۔ حال حضرت امام موسیٰ کاظمؑ میں لاجواب مرثیہ ہے''[۲]

راقم کو ایک مرثیہ امام موسیٰ کاظمؑ کے حال کا مرزا صادق(فرزند مرزا طاہر رفیع ابن مرزا اوج ابن مرزا دبیر) کے پاس ملا۔ اب تک جو چھپے ہوئے مراثی راقم کی نظر سے گزرے ہیں یہ ان میں نہیں ہے۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ثابت نے اسی مرثیہ کا حوالہ دیا ہے مگر مطلع یاد نہیں آیا۔ اس مرثیہ کے ۱۴۴ بند راقم کو ملے ہیں دو بند یہاں ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں:

صدقے جناب موسیٰ کاظمؑ کے نام کے — آٹھوں پہر نثار میں ہفتم امام کے
قربان عبدِ صالحِ ربِ انام کے — میں کیا کلیم بھی ہیں تصدق کلام کے
موسیٰ ہیں دو کلام نہیں اس کلام میں
وہ چار مرسلوں میں یہ بارہ امام میں

آخری بند اس طرح ہے:

اب اے دبیر فاعتبرو کا مقام ہے — نیرنگ اس جہاں کا عجب صبح و شام ہے
مولا سے کہہ کہ وقتِ طلب یا امام ہے — مشتاق کاظمین بہت یہ غلام ہے

۱ حیات دبیر جلد اول ۲۸۳
۲ ایضاً

حیدر کے در کارازل[1] [روز ازل] سے فقیر ہے
اچھا ہے یا برا ہے، تمہارا دبیر ہے

۶۔ اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے[2]

(۳) ڈاکٹر اکبر حیدری نے جن غیر مطبوعہ مرثیوں کی نشاندہی کی ہے[3] ان میں بھی بعض مطبوعہ ہیں۔ یہاں ان ہی مرثیوں کے مطلع دیے جاتے ہیں جو مطبوعہ شکل میں راقم کی نظر سے نہیں گزرے ہیں:

۱۔ اے خالقِ سبحاں تو مری عقل رسا کر
۲۔ جب کوفہ میں پابند بلا ہو گئے مسلم
۳۔ صبح عاشور ہوا گرم جو بازارِ قضا
۴۔ یہ ترجمۂ آیۂ لولاک سنا ہے
۵۔ جب قرب ہوگا آمد شورِ نشور کا
۶۔ اے باغِ طبع رنگِ بہارِ سخن دکھا
۷۔ اے نظم رزم بزم میں عالم پسند ہو
۸۔ ذیقعدہ میں وہ قاعدۂ نو ہو سخن میں
۹۔ اصغر کو جب کہ پیاس کی شدت سوا ہوئی
۱۰۔ قرآن میں اک سورہ و اک آیہ ہے کس کا
۱۱۔ فوجِ خدا ہے یا کہ کتابِ خدا ہے یہ
۱۲۔ مومنو اشک بہاؤ کہ محرم آیا
۱۳۔ اللہ رے شہِ بیکس و بے یار کی آمد
۱۴۔ جب رن میں آستین چڑھائی حسینؑ نے

---

۱ کاتب سے سہو ہوا ہے۔

۲ افضل حسین ثابت نے حیات دبیر جلد ا ص ۴۷ پر اس مرثیہ کی نشاندہی کی ہے مگر کہیں ملتا نہیں ہے۔

۳ شاعر اعظم ص ۱۹۲۔۱۸۹

۱۵۔ آتا ہے رن میں کون کہ ایماں کا زور ہے
۱۶۔ آمد ہے تاجدار ثریا جناب کی
۱۷۔ ہر جلسے میں مشتاق یہی کہتے تھے رو رو
۱۸۔ جب داخل وطن حرم مصطفےٰؐ ہوئے
۱۹۔ اے دشتِ قتل دامن صد کوہ طور ہو
۲۰۔ جب زیب دہ منزل اولیٰ ہوئے شبیرؑ
۲۱۔ پیری میں اگر بخت جواں ہو تو مزا ہے
۲۲۔ پامال جب کہ گلشن خیر الوریٰ ہوا
۲۳۔ آیا خطِ مسلمؑ جو امامِ مدنی کو
۲۴۔ ارشاد مجھے آج ہے یہ لوح قلم سے
۲۵۔ ہے مظہر العجائب معجز نما علی
۲۶۔ جب رو چکے شبیر عزیز و رفقا کو
۲۷۔ کس گھر میں آج حشر بپا ہوگا صاحبو
۲۸۔ دریائے نور کا دُر یکتا حسینؑ ہے

اس طرح ڈاکٹر اکبر حیدری کی ۵۳ غیر مطبوعہ مرثیوں کی فہرست میں ۲۸ مراثی غیر مطبوعہ قرار دیے جاسکتے ہیں کیونکہ ان کے مطبوعہ نسخے نایاب ہیں لیکن اس حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مرزا دبیر کے اکثر مراثی دیگر مرثیہ نگاروں کی تخلیقات کے ساتھ مخلوط ہوگئے ہیں جن پر ہنوز محققانہ نظر نہیں ڈالی گئی ہے اس لیے سردست کوئی حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا کہ یہ واقعی مرزا دبیر کے مرثیے ہیں اور ان کے مطلعے صحیح طور پر درج کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر اکبر حیدری نے بعض قلمی نسخوں سے استفادہ کیا ہو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے لیکن کسی مرثیہ کو غیر مطبوعہ اور مستند قرار دینے کے لیے اتنا

---

۱ کاتب سے سہو ہوا ہے۔

۲ افضل حسین ثابت نے حیات دبیر جلد ۱ ص ۴۷ پر اس مرثیہ کی نشاندہی کی ہے مگر کہیں ملتا نہیں ہے۔

۳ شاعر اعظم ص ۱۹۲۔۱۸۹

ہی کافی نہیں کہ کوئی قلمی مخطوطہ (ممکن ہے کہ وہ مصنف کے زمانۂ حیات کا ہو) دستیاب ہوجائے۔ اس طرح کے قلمی نسخوں کا مطبوعہ مراثی سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کئی طرح کے معنی خیز حقائق سامنے آتے ہیں۔

مرثیہ جب کہیں کسی مجلس میں پڑھا جاتا تھا تو لوگ وہیں سے اس کی نقل کرنا شروع کردیتے تھے، ادھر مرثیہ گو شاعر کے لیے یہ اکثر ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ پورا مرثیہ مطلع اول سے لے کر مقطع تک ایک ہی مجلس میں پڑھ پاتا۔ کیونکہ ایک تو مرثیہ طویل دوسرے بند کے بند لوگ بار بار پڑھواتے تھے، اس لیے اکثر کئی مجلسوں میں بھی ایک مرثیہ کئی بار مختلف مطلعوں سے ربط دے کر پڑھا جاتا تھا اور لوگ اسے پورا مرثیہ سمجھ کر نقل کرتے تھے۔ مرزا دبیر کے مراثی میں اسی وجہ سے ضمنی مطلعوں کی تعداد زیادہ ہے اور ایک ہی مرثیہ کئی کئی مطلعوں سے مشہور ہے۔ پھر ذاکرین اپنا کام چلانے کے لیے الگ نقلیں بھی رکھتے تھے ان میں تصرف اور تحریف سے کام چلاتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ محض دادِ سخن پانے کے لیے ذاکرین ایک مرثیہ گو کا مطلع دوسرے کا مقطع اور پھر اپنے اور دوسروں کے بند ملاکر مرثیہ تیار کرتے تھے۔ کبھی کوئی شخص مجلس میں بیٹھا مرثیہ سن رہا ہے۔ مطلع سے لے کر جو جو بند پسند آتا ہے وہ نقل کرلیتا ہے۔ ایسے قلمی نسخے کافی تعداد میں ہر جگہ مل جائیں گے اور یہ نقل کرنے کا کام جیسے مرزا دبیر کی حیات میں ہوتا تھا اسی طرح اس کے بعد بھی ہوتا رہا۔ اور یہ کام صرف ایک جگہ نہیں بلکہ سینکڑوں مقامات پر ہوتا رہا۔ راقم کے خیال میں صرف لکھنو میں شیعوں کے بہت کم گھر ایسے ہوں گے جن میں قلمی مرثیے موجود نہ ہوں۔ راقم کا تو یہ خیال ہے کہ قلمی مراثی سے بجائے صفائی ذہن اور رفع شکوک کے اور الجھن پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جب تک کہ وہ نسخہ کسی معتبر اور دیانتدار شخص کے ہاتھ کا لکھا نہ ہو اور دیانتداری کی کسوٹی اس کام میں صرف یہ نہیں ہے کہ محبِ اہل بیت اور ایماندار ہو۔ بلکہ یہ کہ شعر و ادب میں ''دیانت متن'' اور ''خیانت متن'' سے واقف ہو اور اس کے علاوہ جو نقل در نقل کا سلسلہ ہوتا ہے اس میں اور بھی غلطیوں کا امکان ہوتا ہے۔

ایسی ہی ایک الجھن کی مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔ لکھنو میں ایک باذوق

شخصیت محمد رشید صاحب کے پاس مطبوعہ و غیر مطبوعہ مراثی کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے ان کے ہاں ایک قلمی مرثیہ کے دو نسخے موجود ہیں جس کا مطلع ہے:

شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضٰی

ایک پر میر انیس کا تخلص ہے اور دوسرے پر مشیر کا اور بقول ان کے وہ مشیر ہی کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ یہی مرثیہ دفترِ ماتم کی آٹھویں جلد میں مرزا دبیر کے تخلص کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے۔ غرض اس معاملے میں الجھنیں بہت ہیں۔ ان چیزوں کو چھانٹنا اور الگ کرنا ایک بہت بڑا کام ہے اور یہ ایک دو آدمیوں کے بس کا نہیں ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ مشیر کا معلوم ہوتا ہے چنانچہ افضل حسین ثابت نے بھی یہ مرثیہ مشیر ہی کا بتایا ہے مگر ایسے موقعوں پر ذمہ داری اپنے سر لینا کوئی آسان بات نہیں۔ اس سلسلے میں راقم منیر شکوہ آبادی کا تحریر کیا ہوا ایک واقعہ پہلے ہی نقل کر چکا ہے۔ ایک بات تو بالکل ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی اس کتاب میں پہلے دفتر ماتم کی جلدوں (سوائے جلد ۱۱ کے) میں چھپے ہوئے مراثی کے مطلعے دیے ہیں اور ان کے بعد غیر مطبوعہ فہرست میں ایسے کئی مطلعے شامل کیے ہیں جن کے مطبوعہ ہونے پر دفتر ماتم کی جلدوں کے علاوہ خود ان کی شہادت بھی ثبت ہے۔ ایک عام قاری تو اس سے یہ اخذ کرے گا کہ یہ دو مصنفوں کی تحریر ہے۔ ممکن ہے انہوں نے رواروی میں اس فہرست سے قبل دیے ہوئے مطلعوں کو دیکھا نہ ہو۔ پھر بھی جن غیر مطبوعہ (اگر یہ غیر مطبوعہ ہی ثابت ہوجائیں) مرثیوں کی نشاندہی انہوں نے قلمی مراثی دیکھ دیکھ کر کی ہے وہ کام کسی طرح غیر اہم نہیں۔

(۴) ڈاکٹر اکبر حیدری سے قبل، سید مرتضٰی حسین فاضل نے اپنے مضمون ''نوادر مرزا دبیر'' (مطبوعہ دبیر نمبر، ماہ نو راولپنڈی۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء) میں سات غیر مطبوعہ مرثیوں کی نشاندہی کی تھی جو بقول ان کے پاکستان میں ادارہ اظہار سنز لاہور شائع کرنے والا ہے۔ ان میں سے راقم کی نظر سے پانچ مطبوعہ صورت میں گزرے ہیں جو دفتر ماتم کی مختلف جلدوں میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں تفصیل نہیں دی جارہی ہے البتہ دو پر غیر مطبوعہ ہونے کا گمان غالب ہے ان کے مطلعے یہ ہیں:

۱۔ جب قرب ہوگا آمدِ روز نشور کا[1]

۲۔ جب موسمِ جوانیِ اکبر گزر گیا

پہلے مرثیے کی نشاندہی حیدری صاحب نے بھی کی ہے اس لیے غیر مطبوعہ کی تعداد میں ایک اور کا اضافہ ہوتا ہے۔

(۵) ان سے بھی قبل ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ایک اور مرثیہ کی نشاندہی کی ہے جو غیر مطبوعہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے مرزا صاحب کا ایک ایسا غیر تقسیمی غیر مطبوعہ مرثیہ بھی ان کے پڑپوتے مرزا صادق صاحب کے پاس دیکھا ہے جس میں تمام صنعتیں ایک ساتھ نظم کی گئی ہیں۔ اس مرثیہ کا مطلع ہے:

لعلِ لبِ شبیر گہر بار ہے رن میں
نیسان برستا ہے شہادت کے چمن میں[2]

(۶) راقم کو بھی مرزا صادق کے پاس بیسیوں قلمی مرثیے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور کافی تلاش و جستجو اور مطبوعہ مراثی سے ملانے کے بعد جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا امکان قوی ہے ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

۱ روشن ہے لوحِ مہرِ مبیں کس کے نام سے (جناب امیر علیہ السلام کے حال کا) اس مرثیہ کے ۲۶۴ بند ہیں اور کئی مطلعے ہیں۔

درِ نجف ہے مدحِ علی میں سخن مرا
گہوارے میں درندۂ اژدر علی علی

اور۔ چاہیں تو آئینے کو سکندر کریں علی

بھی اسی مرثیے کے ضمنی مطلعے ہیں۔ مقطع

---

۱ ڈاکٹر اکبر حیدری نے جن غیر مطبوعہ مراثی کی نشاندہی کی ہے ان میں یہ بھی ہے مگر انہوں نے کوئی حوالہ فاضل مضمون نگار کا نہیں دیا ہے ممکن ہے ان کی نظر سے یہ مضمون نہ گزرا ہو۔ انہوں نے مطلع اس طرح لکھا ہے: جب قرب ہوا آمد شور نشور کا۔ جو بے بحر لگتا ہے۔

۲ دبستانِ دبیر ص ۵۳۔۱۵۲

اس مرثیے کا یہ ہے:

خاموش دبیر اب نہیں تحریر کی طاقت　　کر تو پسرِ ملجم بدکار پہ لعنت
یہ عرض کر اب حیدر صفدر سے بمنت　　مقبول ہو یہ مرثیہ یا شاہِ ولایت
یہ لطف و کرم مجھ پہ بحقِ رمضاں ہو
جاگیر مری حشر میں گلزارِ جناں ہو

۲۔ فرزند ید اللہ کے سب عقدہ کشا ہیں[1]

حضرت امام رضاؑ کے حال کا یہ مرثیہ مرزا محمد جعفر اوج (فرزند مرزا دبیر) کا نقل کیا ہوا ہے اور ۶۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ مقطع یہ ہے:

کر قطع دبیر اب تو سر رشتۂ تقریر　　اور شاہ سے کہہ بہرِ رضائے شہِ دلگیر
کر عرض رضا سے کہ پے حضرت شبیر　　اب نام مرا کیجیو زواروں میں تحریر
آغاز تو یہ ہے کہ میں ذاکر ہوں تمہارا
انجام ہو جنت میں جو زائر ہوں تمہارا

۳۔ جب خلد کو نبی نے صفر میں سفر کیا

وفات پیغمبر آخر الزماںؐ سے لے کر واقعۂ کربلا تک کے حالات اس میں نظم ہوئے ہیں۔ ۳۲۴ بند کا یہ مرثیہ ۵ ذی الحجہ روز سہ شنبہ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء کو نقل ہوا ہے۔ اس کی ایک اور نقل جس میں صرف ۳۰۹ بند ہیں سید محمد مہدی کاتب نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء (انتقال مرزا کے ۲۵ برس بعد) کو کی ہے۔

اس کے آخری بند میں بیت نہیں ہے اور وہ چار مصرعے یہ ہیں:

غل پڑ گیا کہ عاشق اکبر ہوا تمام　　زوار ہم شبیہ پیمبر ہوا تمام
بس اے دبیر بس کہ یہ دفتر ہوا تمام　　تیغ زباں پہ نظم کا جوہر ہوا تمام

۴۔ کیا رفتہ رفتہ اوج پہ دہن رسا گیا

یہ وہی مرثیہ ہے جس کا مطلع ثابت کو ''حیات دبیر'' تصنیف کرتے وقت یاد نہیں

۱　راقم نے مرشد آباد پیلیس لائبریری میں ایک مخطوطہ مراثی موسوم بہ ''برق الامع'' میں بھی یہ مرثیہ دیکھا ہے مگر اس میں صرف ۳۶ بند ہیں۔

آیا تھا۔ اس کا ذکر راقم گزشتہ صفحات میں کر چکا ہے۔

مرشد آباد پیلیس لائبریری میں مراثی کے کئی قلمی مخطوطے ہیں جن میں مرزا دبیر کے مرثیے بھی ملتے ہیں۔ اکثر مخطوطوں کی حالت اچھی نہیں۔ بعض تو اس قدر ناقابل استعمال ہیں کہ کھولے بھی نہیں جاسکتے۔ مخطوطہ نمبر ۹۳ جو ''برق الامع'' کے نام سے موسوم ہے اور کتب خانہ میں ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء سے ہے' میں کچھ مرثیے مرزا دبیر کے بھی ہیں۔ ان میں بعض مرثیے ایسے ہیں جو راقم کی نظر سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزرے ہیں۔ ایک کا مطلع ہے:

محشر کی صبح آج نمایاں ہے شام میں

یہاں پہلا بند پورا نقل کیا جاتا ہے:

محشر کی صبح آج نمایاں ہے شام میں کنبہ شفیع حشر کا ہے اژدہام میں
سرنگی روح فاطمہ ہیں اہتمام میں خاصان ذوالجلال ہیں بلوائے عام میں
جبریل کی خوزادیاں تشریف لائی ہیں
مشکل کشا کی بیٹیاں باندی میں آئی ہیں

اس مرثیہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

''از دست فقیر حقیر سید علی حسن مولوی بنارسی در یک پہر تحریر شدہ از مرزا غلام عباس صاحب مرثیہ خواں کرد شدہ (کذا) بتاریخ ۳۰ ماہ رمضان روز شنبہ وقت صبح انتقال نمود ۱۲۷۱ھ''[1]

اس میں حضرت امام حسینؑ کے حال کا ایک مرثیہ ۷۰ بند پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے:

۲۔ قدرت کے آفتاب کا مطلع حسین ہے

مرزا دبیر کے اور مرثیے جو اس میں دیے ہیں اور جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا گمان ہے' مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جب ہو گئے حسینؑ کے ناموس بے حسینؑ ۲۲ بند
۲۔ اکبرؑ نے کچھ بہار نہ دیکھی شباب کی ۳۵ بند (درحال حضرت علی اکبرؑ)

---

۱ برق الامع۔ مخطوطہ مراثی۔ مرشد آباد پیلیس لائبریری مخطوطہ نمبر ۹۳

۳۔ رن میں جب عونؑ و محمدؑ نے شہادت پائی ۳۱ بند(درشہادت عونؑ و محمدؑ)
۴۔ صدشکر کہ میں نائب نقاش ازل ہوں ۶۲ بند(درحال حضرت علی اکبرؑ)
۵۔ جس دم گلا رسن سے سکینہ بندھا چکی ۲۷ بند(مرثیہ تصنیف مرزا دبیر
درحال انتقال حضرت سکینہؑ و
و بیان حضرت شہر بانوؑ)

اس میں ایسے مرثیے بھی ہیں جو دفتر ماتم میں طبع ہوئے ہیں مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مندرجہ ذیل بالا مراثی مکمل ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں کیونکہ بندوں کی تعداد بہت کم ہے جس سے یہ گمان ہونا بھی ناممکن نہیں کہ یہ اجزائے مرثیہ ہیں بلکہ یہ کہنے کی ذمہ داری بھی آسانی سے نہیں لی جاسکتی کہ یہ پورے مرزا دبیر کے ہی تصنیف کردہ ہیں یا پیوندی ہیں۔

اس طرح مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد یہ ہوسکتی ہے:

۱۔ منیر شکوہ آبادی نے ''سنان دلخراش'' میں جس مرثیہ کا حوالہ دیا ہے اور اب تک مطبوعہ شکل میں سامنے نہیں آیا ہے۔[۱] ۱
۲۔ ثابت کی نشاندہی کے باوجود جو مرثیے غیر مطبوعہ رہے۔ ۶
۳۔ ذاکر حسین فاروقی نے جس مرثیہ کی نشاندہی کی ہے۔ ۱
۴۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل نے جس مرثیہ کی نشاندہی کی ہے۔ ۱
۵۔ ڈاکٹر اکبر حیدری سے جن مراثی کی نشاندہی ہوئی ہے۔ ۲۷[۲]
۶۔ راقم کو جن مراثی پر غیر مطبوعہ ہونے کا گمان غالب ہے ۳(میزان ۳۹)

اس طرح سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مراثی جواب تک سامنے آئے ہیں، کی تعداد ۴۱۱+۳۹ =۴۵۰ تک پہنچ جاتی ہے۔[۳]

---

۱ سنان دلخراش ص ۱۹۴، اس کا مطلع ہے ''نام ان کا جوانان نبی عرش نشیں ہے'' ہند کے حال کا مرثیہ ہے۔

۲ یہ تعداد ۲۸ تھی مگر ان میں سے ایک مرثیہ کی نشاندہی ان سے قبل سید مرتضیٰ حسین فاضل نے کی ہے جسے راقم نے اس سے قبل ان کے حوالہ سے شمار کیا ہے۔

۳ اس تعداد میں ''برق الامع'' مخطوطہ مرشدآباد میں دیے ہوئے مرثیے راقم نے شامل نہیں ہیں۔

(ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

(ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

(ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

مگر یہ کہنے میں تامل ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کے اور غیر مطبوعہ مراثی نہیں ہوں گے۔ مرزا صادق نے راقم سے کہا کہ ابھی ان کے پاس مراثی کا ایک خزانہ ہے جو صندوقوں میں بند ہے۔ اس خزانے پر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے تاکہ ایک دفعہ یہ معلوم ہوجائے کہ ان صندوقوں میں کیا ہے۔ ذاکر حسین فاروقی کو بھی یہی معلوم ہوا تھا مگر وہ بھی اس کو پورے طور کھنگال نہ سکے اور یہ کام تو تنہا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ جو قلمی مرثیے مرزا صادق صاحب کے پاس ہیں ان کی اہمیت زیادہ ہے بہ نسبت ان قلمی مراثی کے جو حیدری صاحب جیسے محققین کو راجاؤں اور مہاراجاؤں کے نجی کتب خانوں سے ملے ہیں کیونکہ یہ گھر میں لکھے اور لکھوائے گئے ہیں، اس لیے ان کے اصل کے مطابق ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

الحاقی کلام کا ذکر تو اس سے پہلے بھی آچکا ہے البتہ ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اکثر مرثیے جو چھپے ہیں ان میں بندوں کی تعداد کم ہے بہ نسبت ان قلمی مراثی کے جو مرزا صادق کے پاس موجود ہیں۔ دو ایک مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ انجیل مسیحِ لبِ شبیر ہیں عباسؑ

اس مرثیے کے دفتر ماتم کی جلد دوم میں صرف ۸۰ بند چھپے ہیں جبکہ مرزا صادق صاحب کے پاس اس کا ایک سو سولہ بند کا قلمی مخطوطہ موجود ہے(مرثیہ پھر بھی نامکمل[1] معلوم ہوتا ہے۔) اس کا آخری بند یہ ہے:

مہمانوں کی جس گھر میں تھی یہ عزت و توقیر — اس گھر کے جو وارث پہ چلی ظلم کی شمشیر
امت نے خوشی کی، عوضِ ماتم شبیر — قدغن یہ کیا لاش پہ منھ ڈھانپے نہ ہمشیر
کفنا یا نہ شہ کے تن صد پاش کو ہے ہے
سر پیٹو کہ پامال کیا لاش کو ہے ہے

۲۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

---

۱ اس مرثیہ کے متعلق راقم ثابت کے حوالہ سے اسی مقالہ میں لکھ چکا ہے کہ مرزا دبیر یہ مرثیہ تصنیف کررہے تھے کہ میر انیس کے انتقال کی خبر آئی اور انھوں نے اس کو نامکمل چھوڑ دیا۔

دفتر ماتم جلد اول میں اس مرثیہ کے ۱۴۳ بند شائع ہوئے ہیں جبکہ مرزا صادق کے پاس سید مہدی علی کا شانز دہم رمضان روز شنبہ ۱۲۹۰ھ کا نقل کیا ہوا یہی مرثیہ ۱۶۶ بند کا موجود ہے[1] اس کا آخری بند یہ ہے:

لو حیدریو وارد مجلس ہوئیں زہراؑ دو فاطمہؑ کی روح کو عباسؑ کا پرسا
اب تک نہیں کفنائے گئے ہیں شہ والا بے گور ہے سردار و علمدار کا لاشا
رونے نہیں دیتے ہیں عدو آلِ نبی کو
تم سب کے عوض روؤ حسینؑ ابن علی کو

۳۔ مہر علم سرورِ اکرم ہوا طالع

''ماہ کامل'' مرثیہ مہذب لکھنوی میں اس کے صرف ۶۹ بند شامل ہیں اور مرزا صادق کے پاس جو نقل ہے اس میں ۷۳ بند ہیں۔

۴۔ کیا روضۂ عباسؑ دلاور کا حشم ہے

دفتر ماتم کی ساتویں جلد میں اس مرثیے کے ۱۳۹ بند شائع ہوئے ہیں اور جناب محمد رشید صاحب کے پاس اس کا ایک قلمی مخطوطہ ہے جس میں صرف ۱۰۵ بند ہیں یہ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء کا نقل کیا ہوا ہے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

''تمت شام شد ایں مرثیہ من تصنیف مرزا دبیر صاحب سلمہ بتاریخ ہفتم شہر رمضان المبارک یوم شنبہ ۱۲۸۱ھ در شہر لکھنو آزوی گومتی محلہ بانس منڈی در مکان مرزا کاظم علی خوش نویس مرحوم بوقت دوپہر بخط خام میر محسن علی قرآن خوان حسین آباد مبارک ولد میر نظام علی مرحوم خلف میر محمد علی مغفور متوطن شاہجہان آباد بہ اختتام رسید فقط۔''

ایسی چیزوں کو فوراً الحاقی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا حالانکہ مخطوطہ دفتر ماتم کی اشاعت سے بہت پہلے بلکہ مرزا دبیر کی حیات ہی میں نقل ہوا ہے۔ راقم نے ایسے سینکڑوں قلمی مرثیے دیکھے ہیں مگر ایک ایک بند کو الگ الگ کرکے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا تقابلی مطالعہ کرنا یا الحاقی کلام کو برہان و دلیل کے ساتھ چھانٹنا اور تحریف و تصرف کو پہچاننا کسی

---

۱ مرزا صادق کے پاس اس کی ایک اور نقل ہے جس میں ۱۷۲ بند ہیں۔

ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ان الجھنوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کے اشعار کی تعداد مرزا دبیر کے اشعار کے برابر ہو۔

اشاریہ دفترِ ماتم

جلد اوّل

نمبر شمار	مطلع (حروف تہجی کی ترتیب سے)	تعداد بند	حال
۱	اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلادے	۱۹۸	واقعہ زعفر جن
۲	اے صبح وفا کون تراشمس الضحیٰ ہے	۱۴۲	حضرت عباسؑ
۳	اے مومنو کیا نامِ علی عقدہ کشا ہے	۳۴	خیام کی تباہی
۴	پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی	۲۴۶	شہادت حضرت عونؑ و محمدؑ
۵	جب غنچۂ خورشید کھلا باغ سحر میں	۵۹	امام حسینؑ
۶	جب رونقِ مرقعِ کون و مکاں ہوئی	۱۲۳	شہادت حضرت علی اکبرؑ
۷	جب قتل گاہ میں سرِ سرور قلم ہوا	۳۱	آتش زنی خیام
۸	جب کربلا کو شام سے اہل حرم پھرے	۳۵	تدفین شہداءؑ
۹	جب کربلا میں عترتِ اطہار لٹ گئی	۳۵	شام غریباں
۱۰	جس وقت شمس شمسۂ چرخ فلک ہوا	۸۵	حضرت حرؑ
۱۱	خط کوفہ سے آیا جو امامِ مدنی کو	۹۹	مدینہ سے امام حسین کی روانگی
۱۲	خورشید کا طلوع ہے برج خیام سے	۷۰	حضرت قاسمؑ
۱۳	خیمۂ چرخ سے خورشید جو باہر نکلا	۴۵	شہادت حضرت حرؑ
۱۴	داغ غم حسین میں کیا آب و تاب ہے	۱۰۲	دربار شام
۱۵	ریاضِ خلد کو جبریل صاف کرتے ہیں	۴۹	خدا سے فریادِ حضرت فاطمہؑ
۱۶	زندانِ شام میں جو حرم کو سحر ہوئی	۳۳	دربار شام
۱۷	شمع طاق حرم لم یزلی ہے عباسؑ	۹۲	حضرت عباسؑ

۱۸	طغرانویس کن فیکوں ذوالجلال ہے	۶۴	حمد و نعت، تعریفِ حکومتِ اودھ واجد علی شاہ
۱۹	عباسؑ نے جس وقت پیا جامِ شہادت	۳۰	شہادت حضرت علی اکبر
۲۰	فردوس بریں گلشن رخسار ہے کس کا	۱۱۴	مدح جناب رسالت مآبؐ
۲۱	کان میں نالۂ زہرا کی صدا آتی ہے	۵۳	حضرت عباسؑ
۲۲	کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے	۱۴۳	ایضاً
۲۳	معراج سخن کو ہے ترے ذہن رسا سے	۱۱۹	جنگ و شہادت حضرت علی اکبرؑ
۲۴	ہیں آج موسنو شہ تشنہ دہن کے پھول	۳۳	دفن شہدائے کربلاؑ
۲۵	یارب مسافری میں کوئی بے پدر نہ ہو	۳۹	شہادت جناب سکینہؑ

جلد دوم

۱	آدم کا داد رس بنی آدم میں کون ہے	۱۶۲	شہادت امام حسینؑ
۲	آ ہوے کعبۂ قربانی داور ہے حسینؑ	۳۱	احکام متعلقہ ذبح عظیم
۳	اکبرؑ نے طلب کی جو رضا دشت وغا کی	۳۹	شہادت حضرت علی اکبر
۴	اللہ نے پیدا جو کیا رنج و بلا کو	۱۳۴	شہادت امام حسینؑ
۵	انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں عباسؑ	۸۰	عقد حضرت علیؑ و ام البنینؑ
۶	اے روزہ دارو آہ و بکا کے یہ روز ہیں	۴۰	شہادت حضرت علیؑ
۷	جب پریشان ہوئی مولا کی جماعت رن میں	۳۶	شہادت امام حسینؑ
۸	جب خواب میں بانو کو نظر آ گئیں زہراؑ	۴۳	حالات شیریں
۹	جب دولت اولاد شہ دیں نے لٹادی	۵۲	شہادت امام حسینؑ
۱۰	جب رن میں بعد فتح عدو ایک شب رہے	۵۴	بعدِ شہادت، کربلا میں ایک نصرانیہ کا ورود

مراثی کی تفصیل

جلد سوم

۳	بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے	۹۶	شہادت علی اصغرؑ
۴	بخدا تاج سرِ عرشِ خدا ہے شبیرؑ	۳۸	شہادت امام حسینؑ
۵	بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب ہے	۱۰۱	حالات حضرت فاطمہ زہراؑ
۶	پڑھتا ہے رجز رن میں رجز خوانِ پیمبرؐ	۷۱	شہادت امام حسینؑ
۷	پہنچے جو خط حسینؑ کو اہلِ نفاق کے	۴۲	راہ میں شہادتِ مسلمؑ کی اطلاع
۸	جب بہرِ وغا عازمِ میداں ہوئے اکبرؑ	۴۹	جنگ و شہادت حضرت علی اکبرؑ
۹	فارغ کوئی دنیا میں نہیں قیدِ الم سے	۵۲	تاراجیِ خیام، تنہائی اہلِ حرم
۱۰	جب قتل ہوئی تشنہ وہاں فوجِ حسینیؑ	۲۸	شہادت امام حسینؑ
۱۱	جبکہ زنداں سے چھٹے راحتِ جانِ مسلمؑ	۵۳	شہادت پسرانِ مسلمؑ
۱۲	جبکہ سجادؑ حزیں قیدِ ستم سے چھوٹے	۴۴	تدفینِ شہداءؑ
۱۳	جبکہ عباسؑ شہِ دیں کے علمدار ہوئے	۴۴	شہادت حضرت عباسؑ
۱۴	جبکہ نزدیک وطن عابدِؑ بیمار آیا	۳۰	مدینہ میں اہل حرم کی واپسی
۱۵	جب ماہ نے نوافلِ شب کو ادا کیا	۱۸۹	جنگ و شہادت حضرت حرؑ
۱۶	جب یزید اپنے گناہوں سے پشیمان ہوا	۷۲	اہل حرم کی قید رہائی
۱۷	خیمہ سے شہ کے قدرتِ حق کا نزول ہے	۶۸	جنگ و شہادت حضرت قاسمؑ
۱۸	روزِ دہم کا یہ ماجرا ہے	۶۵	شہادت امام حسینؑ
۱۹	زنداں میں چہلم جو ہوا اہل حرم کو	۸۷	اہل حرم کی قید سے رہائی

جلد چہارم

۱۰	جب مدینے میں شہیدوں کے عزادار آئے	۵۳	مدینہ میں اہل حرم کی واپسی
۱۱	جب رہے میدان میں تنہا حسینؑ	۳۶	جنگ و شہادت امام حسینؑ
۱۲	جو زائر حسین علیہ السلام ہو	۴۵	(مرزا دبیر کا مرثیہ نہیں ہے)
۱۳	دشت جنگاہ میں جب آمدِ نو شاہ ہوئی	۷۱	شہادت حضرت قاسمؑ
۱۴	رن کی زمیں نمونۂ عرشِ جلیل ہے	۱۵۵	جنگ و شہادت حضرت علی اکبرؑ
۱۵	شبیرؑ غزالِ حرمِ لم یزلی ہے	۷۷	شہادت حضرت امام حسینؑ
۱۶	عباسؑ کے حصہ میں وفا حق نے عطا کی	۳۸	شہادت عباسؑ
۱۷	قائل ہے سب زمانہ کہ محشر نہیں ہوا	۳۵	شہادت حضرت امام حسینؑ
۱۸	قریب کوفہ جو رانڈوں کا کارواں آیا	۴۴	کوفہ میں اہلِ حرم کی آمد
۱۹	کیا باکمال ذاتِ جناب امیرؑ ہے	۶۱	شہادت حضرت علیؑ
۲۰	کیا خلقِ حسن تھا حسنؑ سبز قبا میں	۸۵	واقعات و شہادت حضرت امامؑ
۲۱	کیا شان روضہ خلفِ بوترابؑ ہے	۴۱	زیارت ناحیہ کے فقرات کی تشریح
۲۲	لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے	۳۹	(مربع) شہادت امام حسینؑ
۲۳	مجموعۂ صد واقعہ یہ ماہ صفر ہے	۱۷۰	شہادت حضرت حسنؑ
۲۴	محبوبِ خدا فخر رسولانِ سلف ہے	۱۰۸	شہادت حضرت امام حسینؑ
۲۵	میدان میں آمد ہے گلِ باغ حسنؑ کی	۵۶	شہادت حضرت قاسمؑ

جلد پنجم

۱۷	شفقِ شامِ غریباں جو نظر آتی ہے	۴۷	شہادت حسینؑ کے اثرات
۱۸	شیر خدا کا شیر ہے آہوئے مصطفٰےؐ	۱۱۳	(مرزا دبیر کا مرثیہ نہیں ہے)
۱۹	عزیزو آج شہادت کی رات آئی ہے	۴۰	حالات امام حسینؑ
۲۰	کیا آمدِ جبریل تھی مرغوب نبیؐ کو	۱۲۳	حالات حضرت حرؑ
۲۱	لختِ جگر احمدِ مختار ہے شبیرؑ	۴۹	حالات امام حسینؑ
۲۲	لشکر شاہ شہیداں کی نظر ثانی ہے	۵۸	شہادت امام حسینؑ
۲۳	مغرب سے ہویدا ہوئی جس دم شب عاشور	۱۱۲	حالات امام حسینؑ
۲۴	ممکن نجوم ہفت فلک کا شمار ہے	۶۷	حالات حضرت علیؑ
۲۵	مومنو بیکس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ	۹۷	حالات وہب ابن عبداللہ
۲۶	ہائے کیا آلِ پیمبرؐ پہ مصیبت آئی	۵۱	حالات دربار شام
۲۷	یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا	۱۰۹	شہادت امام حسینؑ

جلد ششم

۱	آمدِ شیر نیستان علی ہے رن میں	۹۷	شہادت عباسؑ
۲	آہوئے حرم قافلہ سالار حرم تھے	۹۵	قید سے اہل حرم کی رہائی
۳	اکبرؑ نے کیا عزم جو میدانِ ستم کا	۳۸	شہادت علی اکبرؑ
۴	اے مومنو کرلو علی اکبرؑ کی زیارت	۸۷	شہادت حضرت علی اکبرؑ
۵	اے مومنو کیا رتبۂ ماہِ رمضاں ہے	۴۱	شہادت حضرت علی اکبرؑ
۶	بعد عباسؑ کے اکبرؑ کی جو باری آئی	۴۰	شہادت علی اکبرؑ
۷	بیمار کربلا کا بھی کیا فیض عام ہے	۶۳	شہادت سید سجادؑ
۸	تقسیم وفا روزِ ازل کی جو خدا نے	۸۲	شہادت محمد بن عباسؑ
۹	توڑا غمِ عباسؑ نے جب شہ کی کمر کو	۸۸	شہادت علی اکبرؑ

مراثی کی تفصیل

۲۶	مصروف نگہداشت شہنشاہِ قلم ہے	۱۴۰	حالات حضرت حبیب ابن مظاہر
۲۷	ملتا ہے مزہ روح کو حیدرؑ کی ثنا سے	۲۴	شہادت حضرت علیؑ
۲۸	وہ درد ہے کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا	۱۱۱	شہادت علی اکبرؑ
۲۹	ہونے لگی سحر جو شبِ قتل شاہ کی	۴۱	شہادت حضرت حرؑ

جلد ہفتم

۱	باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے	۵۲	قبرامام حسینؑ پر مظالم
۲	برہم ہیں صفیں شاہ شہیداں کی ہے آمد	۱۱۷	شہادت امام حسینؑ
۳	جب اکبرؑ و عباسؑ کو بھی رو چکے شبیرؑ	۳۳	لاشِ علی اکبرؑ پر ماں کے بین
۴	جب تیغ فاطمہؑ کے کلیجے پہ چل گئی	۵۱	لاشِ امام حسینؑ پر شیر کا آنا
۵	جب خواب میں حاکم کو پیمبرؐ نظر آئے	۹۸	روز چہلم کربلا میں اہل حرم کی آمد
۶	جب رن سے کربلا کے مسافر گزر گئے	۲۷	رودادِ شامِ غریباں
۷	جب زائرانِ شاہِ غریب الوطن پھرے	۸۴	مدینہ میں اہل حرم کی واپسی
۸	جب قتل گہ میں قتلِ امامِ زمن ہوا	۴۴	شہادت امام حسینؑ
۹	جب لوٹ لیا باغ محمدؐ کو قضا نے	۶۳	شہادت امام حسینؑ
۱۰	حرزِ گلوئے مصحفِ یزداں حسینؑ ہے	۸۹	شہادت امام حسینؑ
۱۱	خورشیدِ آسماں نے جو الٹا نقاب کو	۶۵	شہادت حضرت حرؑ
۱۲	روشن ہے سب پہ فقر و توکل بتولؑ کا	۶۳	شہادت امام حسینؑ
۱۳	عابد کو جب یزید سے بابا کا سر ملا	۲۳	چہلم کو اہل حرم کا کربلا پہنچنا

جلد ہشتم

۶	جب اہل بیتؑ آئے لاشوں پہ اقربا کی	۳۱	اہل حرم کی مقتل میں آمد
۷	جب دخترِ خاتونِ قیامت ہوئی پیدا	۶۷	ولادت و واقعات زینبؑ
۸	جب سرنگوں ہوا علم کہکشانِ شب	۱۵۸	حالات حضرت حرؓ
۹	جب سے مدینہ مسکنِ خیر الورا ہوا	۴۶	اہل حرم کی مدینے واپسی
۱۰	جب شامیوں میں صبح کی نوبت کا غل ہوا	۱۴۰	شہادت امام حسینؑ
۱۱	جب شاہِ کم سپاہ کا لشکر ہوا شہید	۶۱	شہادت امام حسینؑ
۱۲	جب شبِ عاشور سے نورِ سحر پیدا ہوا	۶۴	شہادت علی اکبرؑ
۱۳	جس دم اسیر، عترت مشکل کشا ہوئی	۳۳	کربلا کی کہانی جناب زینبؑ کی زبانی
۱۴	جعفرِ صادقؑ کا رتبہ خلق میں مشہور ہے	۳۱	شہادت امام جعفرؑ صادق
۱۵	خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبرؐ پہ چل گیا[1]	۵۸	روایت شام غریباں
۱۶	خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم	۱۰۶	شہادت حضرت حرؓ
۱۷	دیکھا ہلالِ ماہِ محرم جو راہ میں	۱۳	شہادت علی اصغرؑ
۱۸	شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضیٰ	۶۱	(مشیر کا مرثیہ ہے)
۱۹	شبیرؑ کے خیمے میں عجیب لوٹ پڑی ہے	۶۲	لاشِ امام حسینؑ پر جناب زینبؑ کا آنا
۲۰	صبح عاشور نے جب چاک گریبان کیا	۴۸	مدینہ میں خبرِ شہادت کا آنا
۲۱	عزیز و فکر کرو تعزیہ اٹھانے کی	۷	تعزیہ داری کی اہمیت (کسی اور مرثیہ کے بند معلوم ہوتے ہیں مقطع بھی اس میں نہیں ہے)
۲۲	غل ہے میداں میں کہ عباسؑ علی آتے ہیں	۶۴	(میر ضمیر کا مرثیہ ہے)

---

۱ یہ مطلع میر انیس سے بھی منسوب ہے۔س

جلد نہم

	جب رن میں صبح خاتمۂ پنجتن ہوئی	۵۰	حالات شام غریباں
۱۰	جب سواری علی اکبرِ ذیشان چلی	۷۴	شہادت علی اکبرؑ
۱۱	جب کہ تاراج کیا مرگ نے گلزار حسینؑ	۴۸	شہادت عباسؑ
۱۲	حلالِ مشکلات جناب امیرؑ ہیں	۸۸	شہادت حضرت علیؑ
۱۳	درپیش جسے ماتمِ فرزندِ جواں ہو	۱۲۵	جنگ و شہادت حضرت علی اکبرؑ
۱۴	زنداں سے جب رہائی آلِ عباؑ ہوئی	۴۳	قید سے اہل حرم کی رہائی
۱۵	شرف ازل سے جو ازواجِ مرتضیٰؑ کو ملا	۷۷	حالات ام البنین
۱۶	عزیز و عقدۂ زخمِ جگر نہیں ہوتا	۳۵	شہادت علی اکبرؑ
۱۷	قتل کیا فوج حسینی کے جواں ہوتے ہیں	۷۰	شہادت حضرت عونؑ و محمدؑ
۱۸	قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے	۶۰	حالات قید خانۂ شام
۱۹	کسی کا دل غمِ فرقت سے بے قرار نہ ہو	۷۷	مدینہ میں نامہ بر کی آمد
۲۰	کیا خاطر شبیر ہے درگاہِ خدا میں	۵۱	شہادت علی اصغرؑ
۲۱	کیا فضلِ حق سے فوجِ حسینی کا اوج ہے	۸۵	شہادت امام حسینؑ
۲۲	کیا موسیِ کاظم کے فضائل کا بیاں ہو	۳۴	حالات امام موسیٰ کاظمؑ
۲۳	ناجی بخدا فرقۂ اثنا عشری ہے	۱۰۷	مرتبۂ شہدائے کربلا
۲۴	یا الٰہی کوئی پردیس میں بے یار نہ ہو	۴۰	تاراجیِ خیام
۲۵	یا رب گل امید کسی کا خزاں نہ ہو	۷۸	جناب ام البنینؑ اور جناب زینبؑ کی ملاقات
۲۶	یارو غمِ حسینؑ کی عزت عظیم ہے	۵۵	(مشیر کا مرثیہ ہے)

جلد دہم

۲۰	صغراؑ کو عجب فرقتِ شبیرؑ کا غم تھا	۷۴	اہل حرم کی مدینے میں واپسی
۲۱	عصیاں کے عارضہ سے جو دل ناتواں ہوا	۱۱۱	شہادت امام حسینؑ
۲۲	کعبہ صدفِ گوہرِ یکتائے علی ہے	۸۹	شہادت حضرت علیؑ
۲۳	کوہِ رقیم پر جو علیؑ کا گزر ہوا	۸۵	حالات حضرت سید الشہداءؑ
۲۴	کیا شاہ خراساں کی زیارت کا شرف ہے	۴۳	حالات امام علی رضاؑ
۲۵	منبر نشینِ انجمنِ شاہ دیں ہوں میں	۱۳۲	روایت خورشید بانو
۲۶	مومنو احمد مرسلؐ پہ نبوت ہے ختم	۳۲	شہادت سید سجادؑ
۲۷	یثرب سے شہِ صابر و شاکر کا سفر ہے	۳۹	مدینہ سے سفر امام حسینؑ

جلد یازدہم

۱	اے مومنو زنداں کی طرف ہند رواں ہے	۱۰۳	حالات قید خانۂ شام
۲	اے مومنو کس باغ میں عادت	۵۴	جنگ و شہادت امام حسینؑ
۳	اے مومنو کیا مرتبۂ خیر نساء ہے	۳۰	کوفہ میں اہل حرم کا داخلہ
۴	تھی فوج حسینی جو طلبگار شہادت	۵۴	جنگ و شہادت امام حسینؑ
۵	جب زہر سے شہید جناب رضاؑ ہوئے	۲۵	شہادت امام محمد تقیؑ
۶	جب قبرِ سکینہؑ پہ حرم آئے سوم کو	۳۰	قبر جناب سکینہؑ سے اہل حرم کی رخصت
۷	جب کہ زخمی ہوا ہمشکلِ پیمبرؐ رن میں	۶۰	شہادت علی اکبرؑ
۸	جب محفل حاکم میں شہِ دیں کا سر آیا	۸۳	اہل حرم دربار یزید میں

مراثی کی تفصیل

۹	جب نقشِ کن سے زینتِ لوحِ بقا ہوئی	۱۲۴	جنگ و شہادت زہیرؓ بن قین
۱۰	جواں پسر کا الٰہی پدر کو داغ نہ ہو	۴۶	شہادت علی اکبرؑ
۱۱	زنداں سے اسیروں سے رہا کرتے تھے حیدرؑ	۷۶	روز عاشور اہل حرم کی اسیری
۱۲	زنداں میں جب کہ بند غزال حرم ہوئے	۵۲	قید خانہ میں ہند کا ورود
۱۳	ستر دو تن کے بعد جو تنہا رہے حسینؑ	۵۴	حالات بعد شہادت تاراجی خیام
۱۴	سرسبز ہو یارب سخن اس ہیچداں کا	۱۱۹	ہند کی ولادت اور عقد
۱۵	شبیرؑ وقار شرفِ آلِ عباؑ ہے	۵۰	امام حسینؑ کی امداد مسافر
۱۶	صغرا کو نہ امید رہی جبکہ شفا کی	۲۵	صغرا کا خواب میں واقعۂ کربلا دیکھنا
۱۷	عاشور محرم سے یہ نیرنگ جہاں ہے	۱۳۰	قید خانے میں ہند کا ورود
۱۸	عباسِ علیؑ طالعِ بیدار علی ہے	۱۲۰	شہادت عباسؑ
۱۹	عزیزو شاہ خراساں کی کیا فضیلت ہے	۴۲	محشر میں عزاداروں کا وقار
۲۰	عندلیب چمن رنج و بلا ہے زہراؑ	۶۶	وفات جناب فاطمہ زہراؑ
۲۱	غربت کا داغ یوسفِ کنعاں سے پوچھیے	۲۵	تنہائی و شہادت حضرت سید الشہداؑ
۲۲	قرآن مبیں سورۂ یک آیہ ہے کس کا	۱۹۴	واقعۂ غدیر خم
۲۳	کس مالک شمشیر کے ماتم میں سپر ہے	۱۱۸	شہادت علی اکبرؑ
۲۴	کیا ذاتِ ذوالجلال رحیم و غفور ہے	۵۵	(مرزا دبیر کا مرثیہ نہیں ہے)
۲۵	گردوں پہ جب زوال ہوا آفتاب کا	۴۶	شہادت امام حسینؑ

۲۶	ہوتا ہے عیاں مصحفِ ربِ دوسرا سے	۱۰۲	امام حسینؑ کی امدادِ مسافر
۲۷	یا رو غمِ شہ کے لیے اعضائے بشر ہیں	۵۳	(میر ضمیر کا مرثیہ ہے)

جلد دوازدہم

۱	آمد ہے وطن میں حرم شیر خدا کی	۴۷	اہل حرم کی مدینے میں واپسی
۲	امت پہ پسر اپنے فدا کرتی ہے زینبؑ	۴۴	شہادت حضرت عونؑ و محمدؑ
۳	اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر	۱۲۴	ترکوں کے ہاتھوں عراق میں علماء کے واقعاتِ قتل
۴	اے مومنو کرلو علی اکبرؑ کی زیارت	۷۹	شہادتِ علی اکبرؑ
۵	پیدا ہے محرم کا ہلال آج فلک پر	۵۱	عظمت و شانِ عزادار
۶	تنہائی کا عالم ہے امامِ دوسرا پر	۳۳	شہادت امام حسینؑ
۷	تیغوں سے جب قلم چمنِ مرتضیٰ ہوا	۲۷	اہل حرم کی مدینے میں واپسی
۸	جب اصغر بے شیر گئے نہرلبن کو	۳۶	امام حسین کی مناجات
۹	جب رن میں لٹا باغ شباب علی اکبرؑ	۴۳	شہادت علی اکبرؑ
۱۰	جب رن میں ہوا خاتمہ ہفتاد دوتن کا	۴۳	لاشِ حضرت امام حسینؑ پر جناب فاطمہؑ کا آنا
۱۱	جب سراسیمہ وطن سے شہ ابرار چلے	۶۵	مدینہ سے امام حسینؑ کا سفر
۱۲	جب صف آرائی کی میدان میں سپاہِ شام نے	۵۴	شہادت حضرت قاسمؑ
۱۳	جب طے سفرِ شام ہوا ماہ صفر میں	۶۴	حالات قید خانۂ شام

مراثی کی تفصیل

جلد سیزدہم

مراثی کی تفصیل

جلد چہار دہم

۱۴	دنیا میں برادر نہ برادر سے جدا ہو	۵۵	شہادت عباسؑ
۱۵	دنیا میں بتِ خسرو کنعاں کا نام تھا	۱۱۵	شہادت امام حسینؑ
۱۶	رن میں باندھے ہوئے سہرے کو جو قاسم آئے	۴۷	شہادت حضرت قاسم
۱۷	سبطین علیؑ رونقِ میدان وغا تھے	۸۱	جنگ و شہادت حضرت عون و محمدؑ
۱۸	عباس کو کیا کیا ہنر اللہ نے بخشا	۵۵	جنگ و شہادت حضرت عباسؑ
۱۹	میدان میں اے مومنو اکبر کی ہے آمد	۱۰۰	شہادت علی اکبرؑ

باب ششم

مرزا دبیر کی نثر نگاری

ملا اہلی شیرازی (برادر ملا ہاشم شیرازی جو مرزا دبیر کے جدِ اولی تھے) کو مبدۂ فیاض سے خلاقانہ ذہن عطا ہوا تھا۔ مرزا دبیر کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔

مرزا دبیر کی نثر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خاندان کی یہ دونوں خصوصیات بیک وقت موجود تھیں۔ مذاق زمانہ کا اثر پسند و ناپسند معیار حسن و قبح، مقیاس تلخی و شیرینی وغیرہ پر ضرور پڑتا ہے۔ مرزا دبیر کے دور میں شعر گوئی اور شعرفہمی عام تھی جس کے معیاروں پر شخصیت کے حسن ذوق کو اعتبار حاصل ہوتا تھا۔ روزمرہ کی گفتگو میں شعری صلاحیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ نثری عبارتیں شعری محاسن فن سے عبارت ہوتی تھیں۔ جس کا اندازہ فسانۂ عجائب کی طرح کی نثری تصنیف کے اسلوب اور انداز زبان و بیان سے بھی بآسانی ہوسکتا ہے۔ لکھنؤ تو خاص طور پر زبان دانی اور زبان فہمی کے لیے مشہور تھا۔ عام زندگی پر شعر زدگی غالب تھی۔ باہر کے اساتذۂ کمال اپنا متاع سخن آزمانے کے لیے دور دور سے اس شہر میں آئے جو لکھنو کے قدیم باشندوں کے ساتھ نہ صرف شیر و شکر ہوگئے بلکہ ان کی مقامی روایتوں سے ہم آہنگ ہوگئے۔

مرزا دبیر نے اگرچہ آنکھیں دلی میں کھولی تھیں مگر جب نگاہ نصیب ہوئی تو ان کے گرد و پیش کا ماحول لکھنو کا تھا۔ انھوں نے لکھنوی زبان میں باتیں کرنا سیکھیں۔ وہیں کی عادتوں کو اپنے بچپنے میں ڈھال لیا۔ ان کا بچپن یہاں کی عادتوں کے ساتھ لڑکپن میں بدل گیا۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ عادتیں بھی پختہ ہوتی گئیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ شاعری اور نثر کی طرف یکساں توجہ نہ دے سکے لیکن ان کے اندر جو gene اس خصوصیت کا ذمہ دار تھا، اس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا راستہ پیدا کرلیا۔

نثر فارسی

مرزا دبیر کے زمانہ میں اردو نثر ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی، جس میں فارسی زدگی علم و فضل کا معیار بنی ہوئی تھی۔ اس دور کی اردو نہ صرف فارسی آمیز تھی بلکہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی شامل رہتی تھی۔ عام طور پر خط و کتابت بھی فارسی میں ہوتی چنانچہ مرزا دبیر نے بھی خطوط فارسی ہی میں لکھے جو دستبرد زمانہ کی بنا پر زیادہ تر نایاب

ہوگئے ہیں البتہ ان کی بعض فارسی نثری تصانیف دستیاب ہوئی ہیں جن کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔ افضل حسین ثابت تحریر کرتے ہیں:

"مرزا صاحب خط تو ہمیشہ فارسی میں لکھا کرتے تھے اور بہت کم لکھتے تھے۔ اس لیے ان کا اردو بلکہ فارسی کا بھی کوئی خط اب تک نہیں ملا۔"[1]

مگر سید مرتضٰی حسین فاضل نے مرزا دبیر کے تین مراسلوں کا سراغ دیا ہے جو فارسی میں ہیں۔[2] ان میں سے ایک اودھ اخبار (۹ فروری ۱۸۷۵ء) میں چھپا تھا۔ اس میں اس قطعہ تاریخ کے مصرع مادہ تاریخ پر بحث کی ہے جو انھوں نے میر انیس کی وفات پر کہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مادہ تاریخ پر بعضوں نے اعتراضات کیے تھے۔ اس خط میں مرزا دبیر نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

سال تاریخش بز بروبینہ مرقوم شد
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

درمصرع تاریخ ارباب اشغال کثیرہ فرصت ملاحظہ قواعد تاریخ و معمائی دارند، شاید بتکمیل اعداد کہ فی الحقیقت کامل است گمان تنقیص می نمایند، لہٰذا جہت رفع تو ہم اعداد و حروف مرقوم شود در زبر و بیّنات۔

طور سینا	بے منبر	کلیم اللہ		و بے انیس	
۸۶	۹۰	۵		۳	
آحاد	عشرات	مأت	آحاد	عشرات زبر	
۴۰۶	۴۰	۴	۵	۳	۰

در کتب مورخان مستند مصنف را مخیّر ساختہ کہ اختیار است خواہ بلفظی زبر و بیّنہ بگیر خواہ بلفظی فقط بیّنہ بگیرد، جواز است، جواز است۔ و قطعہ ثانیہ انشاء اللہ تیار میشود۔ قدم رنجہ فرمایند تا التماس ضروری بمعاینہ نمودہ شود۔"[3]

دوسرا خط جناب مولانا عنایت علی صاحب سامانوی (التوفی ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۷ء کے نام

---

۱ حیات دبیر ص ۲۸۱

۲ نوادر مرزا دبیر ماہ نو ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء سید مرتضٰی حسین فاضل

۳ دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی ص ۶۱

اودھ اخبار کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے کہ یہ خط مرزا دبیر نے زندگی کے آخری ایام میں تحریر کیا ہے۔

ہے۔ خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے:

''۰۰۰۰۰۰طائر ان دل ہمہ تن در دام عقیدت خدام وہمائے ارادت محو اوج ترقی مدام،زلال اشتیاق درکام و بادۂ تمنا در جام است۔ مگر درینولا بسبب تردد عزم سفر در تقدیم لوازم عیادت معذور و از خدمت سراپا برکت دور ماندم تا صبح سواری شوم و اگر حیات مستعار باقی است بعد معاودت استفادۂ صحبت سراسر افادت می کنم۔ شافی حقیقی صحت کامل و شفاء عاجل کرامت و طول حیات عنایت فرماید۔''[1]

لفافے پر یہ عبارت تحریر ہے:

''بنظر رفعت اثر عرش معراج پیغمبر فصاحت وطور ابد، نورکلیم بلاغت وبلمس اصابع تقدس منابع، ضیاء المشرقین کہف الثقلین فرازندہ چتر دین مبیں فروزندہ شمع شرح متین جناب کرامت انتساب حضرت مولوی سید عنایت علی صاحب حسینی دام مجدہ فائز باد۔

داعی بقا مشتاق لقا

دبیر عفاعنہ''[2]

تیسرا خط مرزا دبیر نے اپنے ایک شاگرد مولوی سید علی صاحب مجالس علویہ کو تحریر کیا تھا۔[3] مرزا کاظم علی خان نے مرزا دبیر کے ایک اور خط کا عکس[4] شائع کیا ہے جو مولوی کمال الدین صاحب کے نام ہے۔ اس خط میں بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس خط میں مرزا دبیر نے عظیم آباد جانے کا ذکر کیا ہے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ خط ۱۸۵۷ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

مذکورہ فارسی مراسلات کے علاوہ کسی فاضل محقق نے بلند بانگ دعووں کے

---

۱ دبیر نمبر ماہِ نو راولپنڈی ص ۶۲

۲ دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی ص ۶۲ لفافہ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کو مولوی سید عنایت علی سے گہری عقیدت تھی۔

۳ دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی ص ۶۴ کے بعد، پانچواں عکس ملاحظہ فرمائیں۔

۴ آج کل ستمبر ۷۶ ص ۴۰ یہی خط انھوں نے سرفراز لکھنو کے دبیر نمبر میں بھی شائع کیا ہے۔

باوصف مرزا دبیر کی کسی فارسی نثری تصنیف کی ہنوز نشاندہی نہیں کی ہے۔ ہمارے لیے یہ احساس محل استعجاب ہے کیونکہ مرزا دبیر کے فارسی نگارشات کے مخطوطے ان کے خاندان میں اب تک محفوظ ہیں۔ راقم اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہے کہ اسے مرزا دبیر کے، نثری تصانیف کے دو مخطوطے، مطالعہ اور استفادہ کے لیے دستیاب ہوئے جن کو مرزا دبیر کے نگارشات میں نودریافت کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ دونوں مخطوطے مرزا دبیر کے پڑپوتے مرزا محمد صادق صاحب صادق ساکن کوچہ مرزا دبیر نخاس لکھنو کی ملکیت ہیں۔ ذیل میں ان مخطوطات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

رسالۂ دبیر

یہ مخطوط پندرہ صفحات پر مشتمل ہے جس کا سائز "۸،۸ x "۶،۶ ہے۔ مخطوطے کے ابتدائی اور آخری صفحات سادہ ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان پر سرورق اور ترقیمہ بنانے کا خیال تھا جو کسی بنا پر تیار نہ کیا جاسکا۔ اس کے علاوہ یہ رسالہ ہر طرح سے مکمل ہے۔ اس مخطوطے کا نام درج نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ ابتدائی مسودہ ہو جس کو ترمیم و اضافہ کے ساتھ دوبارہ لکھنے کا خیال رہا ہو۔ اس مسودے سے مرزا دبیر کے تخلیقی عمل کے بعض نادریافت پہلوؤں کی طرف رہنمائی ہوسکتی ہے کہ وہ کس طرح مسودہ کی ابتدا کرتے تھے؟ اپنے بیان میں استدلال کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کرتے تھے؟ ترمیم و اصلاح میں کن امور کی طرف توجہ کرتے تھے؟ وغیرہ۔ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مسودہ مکمل کرنے کے بعد اس کا نام رکھتے تھے۔ اس بعد میں نام رکھنے کے عمل کو مرثیہ گوئی کے تخلیقی عمل سے وابستہ کرکے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کے دور میں بلکہ ماقبل اور عصر حاضر تک مراثی کا عنوان یا نام رکھنے کا رواج نہیں رہا ہے اس لیے مرزا دبیر تخلیق کے نام کو ثانوی درجہ دیتے تھے۔ قدماء میں کتاب کی شناخت مصنف کے نام سے ہوتی تھی۔ عین ممکن ہے کہ زیرنظر رسالہ بھی 'رسالۂ مرزا دبیر'' کے نام سے موسوم ہوتا۔ سردست چونکہ اس رسالہ کا کوئی نام نہیں اس لیے ہمارے نزدیک 'رسالۂ مرزا دبیر' کہنا بیجا نہ ہوگا۔

زیرنظر مخطوطے کی پیشانی پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' تحریر ہے اس کے بعد حمد و

صلوٰۃ کے ساتھ عبارت یوں شروع ہوتی ہے:

''حمد و ستائش سزاوار صانعی است کہ گوہر نفس ناطقہ را در معدن ذات انسان ریختہ و شکر و نیازش قادری راست کہ آدم خاکی بنیان را بقدرت ابدائی خود تشریف نطق بخشیدہ تا در محامداوکلید زبان را بقفل دہاں بجنباند و جواہر زواہر وعلمنا آدم الاسماء را از داماء ضمیر بر ساحل بیان اندازد۔''

اس رسالہ کا موضوع مرثیہ کے موضوع اور ہیئت سے متعلق ہے جس پر مرزا دبیر نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور واضح دلائل کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہ رسالہ مرزا دبیر کے تنقیدی شعور کے مطالعہ میں خاص طور پر معاون ہوسکتا ہے۔ انھوں نے قدماء کے طریقۂ کار کا احترام کرتے ہوئے دلیل کے طور پر شعرائے فارسی سے مثالیں پیش کی ہیں لیکن ان کے نزدیک صرف شعراء فارسی کا تتبع کافی نہیں ہے۔ انھوں نے نہ صرف دیگر مرثیہ گویوں کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں بلکہ بڑی فراخدلی سے اپنے ہمعصر اور معروف مرثیہ گویوں کا کلام بھی پیش کیا۔ جس سے ان کی وسعتِ ذہن و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ہم عصر احقر جناب مرزا جعفر علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کہ در مرثیہ مصرع مطلعش این ست ع کربلا میں جو صفِ جنگ کا سامان ہوا۔ ع لاش نوشاہ کی میدان سے لاتے ہیں حسین۔ مرثیہ مذکور را مطالعہ نمایند کہ مضامین خیالی است و میر خلیق صاحب می گویند ع تھا تاش کے جوڑے پہ عجب برق کا عالم۔ ایں لباس در عرب کجا بود و میاں دلگیر صاحب ارشادی نمایند در مرثیہ کہ مطلعش اینست:

کہدی یہ خبر آ کے کسی نے جو دلہن سے ۔۔۔ داماد کو شبیر لیے آتے ہیں رن سے
مل مل کے دہن اپنا سکینہ کے دہن سے ۔۔۔ آہستہ یہ کبریٰ نے کہا چھوٹی بہن سے

دن پھرتے نظر آتے ہیں واللہ ہمارے
میداں سے پھرے آتے ہیں نوشاہ ہمارے

ایں از کدام کتب است''۔

مرثیہ کے موضوع کی یہ بحث انتہائی معنی خیز اور فنکار کی ذہنی بالیدگی کی دلیل ہے۔ مرزا

دبیر کے بہت بعد اردو ناقدوں نے مرثیہ پر اسی طرح کے اعتراض وارد کیے کہ اردو مراثی میں واقعات اور کردار تو عربی ہوتے ہیں مگر ان کرداروں کی پیش کش مقامی رسم و رواج کے اعتبار سے ہوتی ہے جبکہ صحیح صورت حال اس سے مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ کے واقعات اور حالات عربی اور ان کی پیشکش ہندوستانی ہونے کی بحث مرزا دبیر کے دور میں عام تھی جس کا اندازہ اس رسالہ کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مرزا دبیر اس کے معترضوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

> "اگر حقیر ہم تقلید علماء خود تحقیق تام کردہ چہ مضائقہ وسوائے ازیں طلب نام و مہر محض برائے قابلیت بود کہ اگر اعتراض اہل علم باشد بجوابش استفادہ فیما بین است وگر نہ چہ ضرور زیرا کہ بعض سگان بے دم و خران بے سم وزاغان جہالت پرواز چغدان تفرقہ پرداز کہ محض بمکر و ریا بصحبت علماء می مانند۔"

کسی واقعہ جذبہ یا تاثر کو شاعرانہ صداقت کے بغیر نظم کرنا مرزا دبیر کے لیے قابل قبول نہیں تھا کیونکہ اس سے فنکار کی تخلیقی قوتیں سلب ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے فارسی شاعری سے مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "عرفی بتعریف میرابوالفتح می گویند دست او جہد اگر دست قضا گردید شل، وہم بتعریف جناب رسالت مآب گفتہ تقدیر بیک ناقہ نشانید دومحمل سلمائے حدوث تو ولیلائے قدم را۔ قدم نیز از صفات ثبوتیہ جناب او تعالےٰ است۔ بجناب رسول خدا ﷺ چہ گونہ ایں صفت صادق می آید"

یہ رسالہ معترضوں کے جواب تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے اعتراضات کی نوعیت پر معروضی زاویۂ نظر سے بحث کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے خط لکھ کر مرزا دبیر کو اس رسالہ کی تصنیف کی طرف متوجہ کیا تھا لیکن مرزا دبیر نے کسی کی عیب جوئی یا منقصت کے بجائے علمی مسئلے کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رسالہ میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ معترضوں نے اس وقت کے علمائے دین سے مرثیہ میں واقعات کربلا، عربی واقعات اور کردار کے عین مطابق پیش نہ کیے جانے کی شکایت کی تھی۔ اس طرح کے لوگوں نے مرثیہ گویوں کے خلاف صف آرائی

کر رکھی تھی اور علماء دین کو درمیان میں ڈال کر محاذ آرائی کرنا چاہتے تھے لیکن علماء نے بقول مرزا دبیر قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق "لا تلقوا بایدیکم الی التهلکة" دستخط نمی نمایند۔"

اس رسالہ میں زبان و بیان سے متعلق کئی اہم نکتوں پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر طوالت کے خوف سے یہاں ترک کیا جاتا ہے۔ مدنظر رہے کہ اس دور میں مرثیہ کے فنی معیاروں پر زبان و بیان کے مختلف مباحث زیر بحث تھے جن پر اس دور کے کئی اساتذہ نے رسالے تحریر کیے۔ ان میں رسالہ میر عشق کا ذکر ڈاکٹر جعفر رضا نے کیا ہے اور اس کی تفصیل پیش کی ہے[1]۔ رسالہ مرزا دبیر اور رسالہ میر عشق کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا ہمارے حیطۂ عمل سے باہر ہے لیکن اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ میر عشق نے اپنے رسالہ میں صحت زبان، متروکات محاورات اور عروض و بیان کے مسائل پر بحث کرنے پر اکتفا کی ہے جبکہ مرزا دبیر نے ان تمام مباحث کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ مرثیہ کے موضوع سے متعلق مباحث پر بھی نتیجہ خیز اور پر مغز بیانات پیش کیے ہیں۔

معجزۂ جناب امیر المومنین علیہ السلام

یہ مخطوطہ "۶٫۱ x "۶٫۲ کے ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسطر ۱۳ سطری ہے۔ ترقیمہ کے مطابق ۱۲۴۷ھ میں نقل ہوا ہے۔ ابتدأ سرخی میں ''معجزہ جناب امیر المومنین علیہ السلام'' درج ہونے کے بعد دوسری سطر میں حسب ذیل سرخی ہے

''زرگر را زندہ فرمودند و نیز قاتلش را قتل نمودند''

اس سے مخطوطہ کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے یعنی پسر زرگر کو زندہ کرنے کے متعلق حضرت علیؑ کا معجزہ تحریر کیا گیا ہے غالباً یہ معجزہ صلابت جنگ کی فرمائش پر تحریر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں صلابت جنگ کی مدح بھی شامل ہے۔ حمد و نعت و منقبت کے ساتھ صلابت جنگ کی مدح میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بضرب سکہ نقش حروف بسم اللہ   چو مہر تافت زردیں و سیم شرع چو ماہ
پے دراہم دلہای دوستان خدا   بجاست سکہ نعت رسولؐ ہر دوسرا

---

[1] دبستان عشق کی مرثیہ گوئی

ولے کہ نقش زنعت و ز منقبت دارد بدار ضرب شریعت مداخلت دارد
بخالقی کہ در آرد ز بحر و لعل از سنگ بدیں صفات شدہ متصف صلابت جنگ
ہمیشہ طالع یاور غلام او باشد رواج سکۂ نیکی بنام او باشد
دبیر تا بہ کجا مدح آں محبّ علی کنوں ز معجزہ تازہ کن شگفتہ دلی

ان اشعار کے بعد نثر میں معجزہ شروع ہوتا ہے۔

"بزرگران و کاکین حکایات رنگین امیر المومنین و مرصع کاران کارگاہ روایات فیض خاتم النّبیین وصرافان دارالعیار زر خالص اخبار صداقت تضمین و نقادان بازار نقود مروج آثار و تاقت آئین پوشیدہ نماند کہ دریں جزو زمان اعجاز نشان دری از درر غرر معجزات بحر محیط ولایت ولولوی از لالی متلالیں کرامات قلزم بسیط امامت امام المشارق و المغارب جناب علیؑ ابن ابی طالبؑ فروغ ظہور یافتہ درج دہان عالمیان و اصداف اذان جہانیان ذخائر اندوز عمان حاصل باب کان گردانید...."

اس کے بعد معجزے کی دیگر تفصیلات تحریر ہیں۔ آخر میں چند شعر دعائیہ ہیں۔ کچھ شعر پیش ہیں:

"ای کریم و رحیم و رب عباد بمحمد و آلہ الا مجاد
زود شو ناصرِ صلابت جنگ شاد کن خاطر صلابت جنگ
چونکہ ایں ہست عاشق شبیرؑ ہم محب امیر خیبر گیر
لطف فرما بایں محبّ علی فضل افزا بایں محب علیؑ
گل اقبال او شگفتہ بدار بجناب رسول عرش وقار
وقت آمیں است ای دبیر حزیں کہ ہمیں گفت جبرئیل امیں"

ترقیمہ کی عبارت یوں ہے: "گر قبول طبع پاک افتد زہے عزو شرف ۱۲۴۷ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ"

(عکس مخطوطہ رسالہ مرزا دبیر ص۱۴)

دبیر کے قلم کا تحریر کردہ ایک خط جو انہوں نے اپنے ایک شاگرد عزیز
مولوی سید علا صاحب عالی حسن علویہ کو تحریر فرمایا تھا

[illegible]

(ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

دبیر کے قلم سے مولوی حمایت علی سامانوی کے لئے
انجانا عزت و احترام کے القاب

[illegible]

(ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

(عکس تحریر دبیر ماخوذ از دبیر نمبر ماہ نو راولپنڈی)

نثر اردو

مرزا دبیر نے عصری رواج کے مطابق فارسی نثر کو اظہار کا ذریعہ قرار دیا تھا جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے لیکن انھوں نے عام رواج کے برعکس اردو نثر کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اسے فارسی کے پہلو بہ پہلو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اردو نثر میں ایک مستقل تصنیف ''ابواب المصائب'' یادگار چھوڑی ہے جو کئی اعتبار سے اردو نثر کی تاریخ میں اہمیت کی مالک ہے اور لکھنو کے نثری دبستان کے مطالعہ میں ناگزیر ہے۔[1]

یہ کتاب مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ دیباچہ اور ترقیمہ سے ۱۲۴۵ھ(۱۸۲۹ء) سال تصنیف قرار پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب اردو نثر کے محققوں اور ناقدوں کی نظروں سے اوجھل تھی کیونکہ اردو نثر کی تاریخ کے اولین دور کے بیان میں ''ابواب المصائب'' کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کتاب کے متعلق افضل حسین ثابت لکھتے ہیں:

> ''جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے پس یہ کتاب بالتحقیق ان ہی کی تصنیف پائی جاتی ہے۔''[2]

موجودہ صورت میں دست برد زمانہ کی بنا پر ''ابواب المصائب'' کا مسودہ خاندان دبیر میں

---

۱ اس موضوع پر اس دور کی ایک دیگر تصنیف 'نخل ماتم' مصنف مرزا جعفر علی فصیح دستیاب ہے جو ۱۲۶۲ھ(۱۸۴۶ء) میں شائع ہوئی۔ مرزا دبیر کی تصنیف 'ابواب المصائب' کی طرح اردو نثر کی ابتدائی کاوشوں میں اس کا ذکر بھی ناگزیر ہے جس پر اہل نظر نے توجہ نہیں کی ہے۔ ابواب المصائب اور نخل ماتم دونوں تصانیف مقصد کی یکسانیت کے باوجود انداز بیان میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فصیح نے ابواب المصائب کا مطالعہ نہیں کیا تھا یا دوسری صورت میں اس کے اسلوب سے عمداً پرہیز کیا۔ راقم کو نخل ماتم کے دو مطبوعہ نسخے حاصل ہوئے جو سید محمد رشید (جعفر منزل لکھنو) کی ملکیت ہیں۔ اس طرح کے دو نسخے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (لکھنؤ) کے کتب خانے میں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ جس پر تقدم کا غالب گمان ہے، ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ میں مرزا جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری لکھنو سے شائع کیا۔ نخل ماتم کی تفصیل اس باب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲ حیات دبیر ج ۱ صفحہ ۸۱۔۲۸۰

محفوظ نہیں رہ سکا۔ راقم کے استفسار پر ان کے خاندان کے لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ابواب المصائب پہلی بار مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ طبع اول پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ اشاعت اول ۱۶۸ صفحات ۱۵ سطری مسطر اور "۵ x ۲/۱ ۸ سائز پر مشتمل ہے۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

"فلیضحکوا قلیلاً و لیبکوا کثیرا

الحمد اللہ کہ درین ایام حزن القیام رسالہ عجائب و غرائب اعنی ابواب المصائب"

اور مصنف کا نام اس طرح درج ہے:

"من تصنیفات شاعر بیعدیل ونظیر مرجع ہر صغیر و کبیر جناب مرزا دبیر بمطبع یوسفی دہلی طبع شد"[۱]

کتاب کے آخر میں قطعہ تاریخ تصنیف درج ہے۔ ملاحظ ہو:

اے زہے ایں کتاب حزن اثر — کہ مزین بنام آل عباً ست
در معانی و لفظ ہر ورقش — محضرِ خونِ سید الشہدا ست
سطر سطرش بجلوہ تاثیر — مَدِ آہِ جناب خیرِ نسأ ست
ہست عاری عبارت از اغراق — چوں الف ہست حرف حرف راست
در کتابِ زمانہ ایں اوراق — یادگار دبیر بے سر و پاست
چوں بلطف ائمہؑ گشت تمام — اے ہمیں لطف خضر منزل ماست
غور کردم بسال تالیفش — کہ ز آئین فرقۂ شعر است
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل — از چپ و راست داد مژدۂ راست
گفت بامن کہ سال تاریخش — مصحف طاق چشم اہل عزاست"[۱]

۱۲۴۵ھ [۱۸۲۹ء]

اس کتاب میں مصنف نے منظوم دعائیہ کے بعد خاتمہ تحریر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک ہفتہ کی مدت میں تصنیف ہوئی۔ لکھتے ہیں:

---

۱ ابواب المصائب صفحہ ۱۶۸

''بخدائے لایزال کہ لشطط حواس اور تردد بے قیاس من تعجیل تمام اور بعجلت الکلام مدت یک ہفتہ میں اس خود غلط نے یہ اوراق سفید سیاہ کیے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اکثر اکتساب ثواب مجلس عزا میں اور تحصیل سعادت ملازمت احباء میں حاضر اور موجود رہا ہے۔''[1]

اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں مرزا دبیر تحریر کرتے ہیں:

''باعث تالیف اور سبب تصنیف یہ ہے کہ درنیولا بتائید غیبی او بالہام لاریبی بندہ حقیر کثیر التقصیر اعنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمہ سورہ یوسف کا مشتمل بمصائب جناب سید الشہدا علیہ التحیتہ و الثنا بطریق تازہ اور بحسن بے اندازہ از روئے تفاسیر معتبرہ اور احادیث معتمدہ کے تعزیہ داران جناب ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کے مطالعہ کے واسطے زبان اردوئے معلیٰ میں کرے .... برادران مومنین و شیعیان ائمۂ معصومین علیہم السلام پر واضح ہو کہ بنا تالیف اس کتاب ابواب المصائب کی مقرر کی گئی کیفیت نزول سورہ یوسف علیہ السلام پر اور مطابقت مصائب یوسف آل عبا اعنی جناب سید الشہدا علیہ التحیتہ والثناء و اہل بیت رسولؐ خدا پر اور مصائب حسین ابن علی علیہ السلام۔''[2]

اس طرح ابواب المصائب کی تصنیف کا سبب مرزا دبیر کے نزدیک بتائید غیبی اور بالہام لاریبی ہے۔ انھوں نے سبب تالیف میں یا کسی دوسری جگہ کسی دیگر مماثل تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اسے ایک آزاد تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن اگر ابواب المصائب کا تقابلی مطالعہ ملا حسین کاشفی کی کتاب ''روضتہ الشہداء'' سے کیا جائے تو یہ دلچسپ مطابقت نظر آتی ہے کہ روضتہ الشہداء میں بھی ''ابواب المصائب'' کی طرح سورۂ یوسف کا بیان اور اس سے ربط مصائب سید الشہداء درج ہے۔ روضتہ الشہداء اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہم اور مقبول تصنیف سمجھی جاتی ہے، جسے کاشفی نے ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں:

---

۱ ایضاً

۲ ابواب المصائب صفحہ ۶۔۵

"روضۃ الشہدا وز کہ مصائب حضرت امام حسین و یاران او است و می
تواں گفت قدیم ترین کتاب است کہ بدیں تفصیل مصیبت ائمہ را ذکر کردہ
مدت ہا در مجالس عزا ازآں کتاب نقل می کروند و گویا اصطلاح روضہ خوانی، از
نام ہمی کتاب آمدہ باشد۔"[1]

یہی ڈاکٹر سید محمد کاظم کا بیان بھی ہے:

"کتاب روضۃ الشہدا بعد ہا کلمۂ روضہ خوانی از نام ایں کتاب گرفتہ شدہ"[2]

گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ ہندوستان میں عزاداری کی ابتدا ایرانی اثرات کے تحت ہوئی تھی اس لیے فطری طور پر مجالس عزا میں بھی روضۃ الشہداء پڑھی جاتی تھی اور ابتداء میں مجالس عزا کے لیے مجالس روضہ خوانی کی اصطلاح بھی مستعمل تھی۔ ہندوستان میں اس کی مقبولیت کا اندازہ حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے:

"روضۃ الشہداء کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس کے نسخوں کی کثرت سے کیا جاسکتا ہے۔ ایران، ہندوستان اور یورپ کے تقریباً تمام اہم کتب خانوں میں اس کے خطی نسخے ملتے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان اور ایران میں بارہ بار چھپی۔"[3]

ہندوستان میں روضۃ الشہداء کا پہلا منظوم ترجمہ گلبرگہ کے سیوا نے ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں کیا اس کے بعد دکن میں ہی حسن بیگ نے "وسیلۃ النجات" کے نام سے کیا۔ اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ لائبریری حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ سید علی نے ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں منظوم ترجمہ اور میر ولی خان مونس نے ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں نثری ترجمہ حادثات کربلا کے نام سے کیا۔ علاوہ برایں سید ہدایت علی واسطی بلگرامی نے ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں وہ مجلس کے نام سے اور سید حیدر بخش حیدری نے ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں گلستان شہیداں کے نام سے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا۔ روضۃ الشہداء کا ترجمہ اسی

---

۱ تاریخ ادبیات ایران ص ۳۲۲ (تہران ۱۳۲۱ھ) ۱۹۰۳ء

۲ روضات الجنات فی اوصاف مدینۃ ہرات۔ سید محمد کاظم استغراری۔ تہران ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء حاشیہ ۴۷۸

۳ کربل کتھا ص ۸۷۷

نام سے عبداللہ اور علاؤ الدین نے مشترکہ طور پر ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں کیا۔ اسی طرح کے متعدد ترجمے ہندوستان کی مختلف لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں میں موجود ہیں جن کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں۔

اردو کی اولین نثری تصنیف فضل علی فضلی کی کربل کتھا (تصنیف ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ـ۳۳ء) جو روضۃ الشہدا سے ماخوذ ترجمہ ہے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ شائع کردیا ہے۔[1] اس کے علاوہ اردو کے دیگر شاعروں اور مصنفوں نے بھی روضۃ الشہداء سے متاثر ہوکر اسی طرز میں اپنے طور پر کتابیں لکھیں جن میں چند کے نام درج ذیل ہیں:

۱	روضۃ الاطہار	از نوازش علی شیدا ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء)
۲	روضۃ الشہداء	از میر حسن جعفری تصنیف بعد ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء)
۳	ضیاء الابصار	مرزا اکبر علی ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۶ء)
۴	بستان شہادت	از سید احمد مدراسی ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء)
۵	نفحات الشہادت	از سید سلطان محی الدین بادشاہ قادری ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء)

ملحوظ خاطر رہے کہ روضۃ الشہداء کے ترجمہ اور اس سے متاثر تصانیف کے ذکر میں کسی فاضل محقق نے مرزا دبیر کی ابواب المصائب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ خود مرزا دبیر نے بھی سبب تالیف بیان کرتے ہوئے روضۃ الشہداء کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ روضۃ الشہداء اس دور میں انتہائی مقبول تصنیف تھی جسے تقریباً تمام مجالس عزا میں پڑھا جاتا تھا اور جس کے نام پر مجالس عزا کو مجالس روضہ خوانی قرار دیا جاتا تھا، اس لیے اس کا خاص طور پر ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا۔ ہمارے نزدیک مرزا دبیر کے عصری رجحانات کے پیش نظر ان کا سبب تالیف میں روضۃ الشہداء کا ذکر نہ کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ یہ بدیہی امر تھا جس سے ہر شخص واقف تھا۔ مرزا دبیر نے روضۃ الشہداء سے متاثر ہوکر ابواب المصائب تصنیف کی جسے دبستان لکھنو کے نثری

---

۱ کربل کتھا مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ مطبوعہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

نگارشات کے اولین نقوش میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ابواب المصائب کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

باب اوّل

اس باب میں ابتدائے سورۂ یوسف سے وداع یوسفؑ و یعقوبؑ کے واقعات بیان ہوئے ہیں جو حضرت یوسفؑ کے حسن کی تعریف اور صفات امام حسین علیہ السلام حال ولادت حضرت یوسفؑ اور ولادت امام حسین علیہ السلام برادران یوسف کا حضرت یوسفؑ کے ساتھ سلوک اور امام حسینؑ کے ساتھ کوفیوں کے سلوک پر مشتمل ہے۔

باب دوم

اس باب میں ''دنیا'' خواہر حضرت یوسفؑ کے خواب، برادران یوسف کی پشیمانی، ''دنیا'' کی بے قراری، اس چاہ کے پرندوں کی کیفیت جس میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے پھینکا تھا۔حضرت جبرئیلؑ کا اس کنویں میں آنا اور حضرت زینبؑ کی نوحہ وزاری، کوفیوں کی پیماں شکنی، طائروں کا شہادت حسینؑ کی خبر مدینہ اور دوسرے علاقوں میں پہنچانا، خون حسینؑ کے اثر سے یہودی کی بیٹی کا صحت مند ہوجانا اور اس قبیلہ کا مسلمان ہونا بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم

اس باب میں فرزندانِ یعقوبؑ کا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کا خون آلودہ پیراہن دکھانا۔ حضرت یوسفؑ کے ساتھ سیاہ رنگ غلام کا بے ادبی کرنا۔حضرت یعقوبؑ کا نوحہ کرنا۔ حضرت جبرئیلؑ کا حضرت یعقوبؑ کو تشفی دینے کے لیے آنا۔ قبر مادر سے حضرت یوسفؑ کا خطاب، ایک شیعہ کا خواب جس میں وہ خون امام حسینؑ سے حضرت فاطمہؑ کو پوشاک آلودہ کیے ماتم کرتے دیکھتا ہے۔ جناب زینب اور امام زین العابدینؑ کا آہ و زاری کرنا۔ اہل بیتؑ پر اشقیاء کے ظلم و تشدد اور قتل گاہ میں اہل بیتؑ کا نوحہ و نالہ بلند کرنا بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم

اس باب میں مالکِ حضرت یوسفؑ کا حضرت یوسفؑ سے معذرت کرنا۔ حضرت یوسفؑ کا قافلہ کے ساتھ مصر میں داخل ہونا اور بعض معجزات حضرت یوسفؑ۔ ساربان کا لاشۂ سید الشہداء کے ساتھ ناروا سلوک۔ حرم محترم رسولِ خداؐ کا کوفہ میں آنا۔ اہل بیتِ طاہرینؑ کی شام میں پریشان حالی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

باب پنجم

اس میں حضرت یعقوبؑ کی دعا حضرت یوسفؑ کی زنداں سے رہائی۔ حضرت یعقوبؑ کا خواب میں حضرت یوسفؑ سے ملاقات کرنا۔ حضرت سکینہؑ کا حال زار، زندانِ شام میں ان کی وفات، حرم اہل بیتؑ کا دربار یزید میں داخل ہونا۔ زوجۂ یزید (ہند) کا خواب دیکھنا۔ حضرت زین العابدینؑ کو زیارت سر امام حسینؑ کی اجازت نہ ملنا۔ اہل بیتؑ کی مدینۂ منوّرہ کو واپسی اور اربعین کو کربلا میں ان کی عزاداری کا حال بیان کیا گیا ہے۔

باب ششم

اس میں یوسف کی بھائیوں سے ملاقات۔ یہودا کو حضرت یوسفؑ کا جامہ لے کر یعقوبؑ کے پاس بھیجنا اور عودِ بصارتِ یعقوبؑ۔ حضرت یعقوبؑ کا مصر جانا اور ان کا شایانِ شان استقبال۔ اہل بیتؑ کا واپس مدینہ پہنچنا۔ امام زین العابدینؑ کا بشیر کو بلاکر مرثیہ نظم کرنے کے لیے کہنا۔ اہل یثرب کو شہادت حسینؑ کی خبر ملنا اور ان کا ماتم میں مصروف ہوجانا۔ حضرت حمزہؓ کے واقعۂ شہادت اور ہند کی ان کی لاش کے ساتھ بدسلوکی بیان کی گئی ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرزا دبیر نے اس تصنیف میں واقعات کو ربط دینے میں اپنی فطری ذہانت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مختلف واقعات باہمی طور پر مربوط ہوگئے ہیں جس سے تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

''ابواب المصائب'' کی زبان اتنی آسان اور عام فہم ہے کہ آج جبکہ ڈیڑھ سو

سال سے زیادہ مدت اس تصنیف کو ہوئی اس سے وہی تاثر لیا جائے گا۔ اس میں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال عبارت کو بوجھل نہیں بناتا بلکہ ان کا فطری استعمال اردو کی لسانی و ادبی روایت سے ہمکنار کردیتا ہے۔

''ابواب المصائب'' میں تاریخی واقعات ہیں جنہیں احادیث و روایات کی روشنی میں ہی پیش کیا گیا ہے۔ اس پر شریعت کی فقہی پابندیاں سونے پر سہاگہ کا درجہ رکھتی ہیں مگر مرزا دبیر نے تمام پابندیاں قبول کر کے واقعات ایسی زبان میں پیش کیے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی آنکھوں دیکھے واقعات بیان کررہا ہے۔ جہاں انھوں نے عربی عبارتوں کو نقل کیا ہے وہاں ان کی مختصر تشریح بھی سادہ اور آسان لفظوں میں کردی ہے جہاں اشعار کا استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی زبان کا خیال رکھا ہے۔ نظم کی زبان بھی آسان اور سادہ ہے۔ مرزا دبیر ایجاد مضامین خوبصورت تشبیہوں اور عالمانہ خیالات کے لیے بہت مشہور ہیں مگر اس تصنیف میں شامل نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کمال نہیں دکھانا چاہتے بلکہ آسان لفظوں میں صرف اپنا مقصد بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانہ کے مذاق کے خلاف اس میں مسجع اور مقفیٰ عبارتیں بھی نظر نہیں آتیں۔

''ابواب المصائب'' میں واقعات کا تسلسل قابل توجہ ہے جس میں بتدریج قصہ آگے بڑھتا ہے۔ واقعات سامنے آتے جاتے ہیں اور انسان کے تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک فصل سے دوسری فصل اور دوسری فصل سے تیسری فصل کی طرف بڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے کچھ کھودیا ہے یا یہ کہ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلا گیا ہے۔ کہیں کہیں ضرور یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعات میں زبردستی ربط پیدا کیا جارہا ہے مگر اس کا سمجھنا مشکل نہیں کہ جو گنجائش واقعۂ کربلا میں ہے جتنے پہلو اس واقعہ عظیم کے ہیں مصائب کی جو داستان اس واقعہ سے منسوب ہے، واقعۂ حضرت یوسفؑ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ واقعۂ کربلا زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دنیا کی کسی بھی مصیبت، کسی بھی قربانی اور پریشانی کا میدان کربلا آئینہ ہے۔ یہ انسان کی قربانی پرکھنے کی ایک کسوٹی بھی ہے اور وجہ تسلی بھی۔ اگر مرزا دبیر کربلا کے واقعات کو پہلے بیان کرتے تو اس سے یہ تصنیف غیر متوازن ہوجاتی۔ مصائب حضرت یوسفؑ کی توجیہ اور تشریح مصائب اہل بیتؑ کے مقابلے میں کیا ہوسکتی ہے۔ دوسرا فائدہ

اس سے یہ ہوا کہ مرزا دبیر عزاداران حسینؑ کے پڑھنے اور انھیں کی مجلسوں میں پڑھنے کے لیے یہ کتاب تالیف کررہے تھے۔ اس طرح واقعات حضرت یوسفؑ نے تمہید کا کام کیا۔ سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس تالیف کا حجم نہیں بڑھنے پایا۔ واقعات یوسفؑ نے اس کی حدیں خود بخود مقرر کردیں، ورنہ جو مرثیہ گو مختصر واقعات کے جزئیات تین تین سو بند میں پیش کرتا ہو، ایک ساتھ دو دو کاتبوں کو دو مختلف مرثیے لکھواسکتا ہو، ایک رات میں پورا مرثیہ نظم کرسکتا ہو اس سے نثر میں اتنی مختصر سی تالیف کی امید رکھنا کیسے ممکن ہے۔ اس نے اس تالیف میں تسلسل قائم رکھنے میں بھی مدد دی۔

اکثر و بیشتر مرزا دبیر قصہ کے درمیان ایک جملہ ایسا لکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والے کو جذبات پر قابو نہیں رہتا لیکن یہ عمل فطری انداز میں ہوتا ہے۔ شدت جذبات سے مجبور ہوکر وہ آہ بھرتے ہیں یا نالہ سر کرتے ہیں اور اسی میں ان کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

''ابواب المصائب'' میں تفنن طبع کے مضامین بھی ہیں۔ مرثیہ گویوں کا موضوع اگرچہ تاریخی ہے مگر شاعر کا کام صرف واقعہ میں رنگ بھرنا نہیں ہے۔ وہ خوش ذوق مصور کی طرح اس میں اپنے موقلم سے جان ڈال دیتا ہے، اپنے رنگوں سے حیات بخشتا ہے۔ شاعر واقعہ کا ایک خاکہ لے لیتا ہے اور پھر اس میں جزئیات کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ بے شک وہ اس واقعہ کی حدود کے اندر رہنے کی سعی کرتا ہے مگر اپنی نزاکت حس سے وہ ایسے باریک پہلوؤں کو بھی ابھارتا ہے جو بادی النظر میں سامنے نہیں آتے اور جب سامنے آجائیں تو واقعہ کا ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔ مرثیہ گویوں کا واقعہ چونکہ مذہبی بھی تھا اس لیے اس میں احتیاط سب سے پہلی شرط تھی کیونکہ مذہب میں تصرف اور تحریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں تو بعض لوگ اپنے مطلب کے لیے یا اپنی جہالت کے سبب سے غیر معتبر فتوے بھی صادر کرتے ہیں مگر مرثیہ گویوں کے سامنے ذاتی مفاد کی کوئی اہمیت ہی نہیں اگر ہوتی تو وہ قصیدے کہتے۔ مرثیہ گویوں کے بارے میں خاص طور پر میر ضمیر، مرزا دبیر، میر انیس کے متعلق یہ بغیر کسی مبالغہ کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کے عالم تھے اس لیے اسلامی عقائد، تعلیمات اور واقعات تاریخی سے تصادم روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ ''ابواب المصائب'' میں سورۂ یوسف کی تشریح کا معاملہ تھا۔ یہ جو

ایک طرف مذہبی تھا تو دوسری طرف تاریخی بھی تھا۔ مرزا دبیر نے نہ صرف ایک تاریخی خدمت کی بلکہ خود تاریخ کی بھی ایک خدمت انجام دی ہے۔

مرزا دبیر عصری تاریخ اور عصری واقعات کا بھر پور شعور رکھتے تھے۔ ''ابواب المصائب'' میں انھوں نے ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ عزاداری کو زیادہ عروج کب سے ملا اور غرۂ محرم سے اربعین تک اودھ میں یہ مستقل طور پر کس عہد سے شروع ہوئی۔ دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''ہمارے بادشاہ عصر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کو جناب احدیت نے فخر سلاطین سلف اور رشک بادشاہان عصر پیدا کیا کہ ازل سے آج تک کسی نے بنائے تعزیہ داری تا اربعین نہ رکھی الا اس بادشاہ خلائق پناہ نے یہ رسم حسنات مقرر فرمائی۔''[1]

عصری تاریخ کا مواد اس طرح بھی فراہم کیا ہے:

> ''بادشاہ اس عصر کا کہ جمیع خوبیوں سے آراستہ اور تمام نیکیوں سے پیراستہ ہے .... تھا کہ آباء و اجداد اس بادشاہ سلیماں جاہ دارا اور دربان سکندر ایوان یوسف عہد نوشیروان عصر ابوالنصر قطب الدین بادشاہ غازی نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے بانی خیر و حسنات تھے۔ چنانچہ نہر آصفی بنائی ہوئی جناب نواب آصف الدولہ مرحوم قریب نجف اشرف کے مثل چشمۂ کوثر جاری ہے۔ ازیں قبل ہر ایک کی ذات بابرکات سے بنیاد فیض یادگار آفاق ہے۔''[2]

اس طرح سے عصری تاریخی حالات کا اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم تاریخ کے واقعات بلحاظ موضوع اہم ہیں مگر موقع پیدا کر کے عصری تاریخ کے بارے میں کچھ لکھنا ان کی اس تمنا کی دلیل ہے کہ عصری تاریخ کا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے محفوظ رکھنے کے بھی مشتاق تھے۔

''ابواب المصائب'' میں موازنہ کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ موازنہ اگرچہ

---

۱ ابواب المصائب (دیباچہ) ص ۵۔۴

۱ ابواب المصائب ص ۴

واقعاتی ہے مگر اس میں ایک کشش ہے کہ دونوں قسم کے واقعات میں ایک خصوصیت مشترک ہے جو ایک طرف شدت اختیار کرتی ہے اور دوسری طرف اس میں اتنی شدت نہیں۔ مرزا دبیر نے اگرچہ اعلان نہیں کیا ہے اور نہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے مگر پوری کتاب میں موازنہ اور میزان کا پہلو واضح ہے۔ ''نخل ماتم'' یا ''فسانۂ عجائب'' میں یہ بات نہیں۔ ایک ہی کردار یا شخصیت کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو رقم کرنا یا ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلوؤں میں موازنہ کرکے ان کے اسباب و علل کو سامنے رکھنا تو ایک عام چیز ہے مگر دو مختلف واقعات بلکہ دو مختلف داستانوں کی مشترک خصوصیات کو پیش کرکے یہ تاثر پیدا کرنا کہ شدت کی منزل کہاں ہے اور قاری کے ذہن پر اپنے تاثرات نقش کرنا دشوار ہے اور مرزا دبیر اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اول الذکر کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے :

> ''جب یعقوب علیہ السلام مایوسی جمال یوسفؑ سے بیہوش ہوکر ہوش میں آئے تو فی الفور اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ گرگ کو حاضر کرو۔ فرزندان یعقوبؑ طرف صحرا کے جاکر ایک گرگ کو پکڑ لائے اور منھ اس کا خون سے بھر کر اپنے باپ کو دکھایا یعقوبؑ نے گرگ کی طرف متوجہ ہوکے فرمایا کہ تو نے میرے نورنظر کو کھایا ہے۔ گرگ نے زبان فصیح سے عرض کی.......... مجھ سے یہ فعل زبوں ظاہر ہوتا جس وقت مجھ کو یہ طاقت ہو کہ گوسفندوں کو تیری ضرر نہ پہنچاؤں کس طرح فرزند عزیز کو تیرے کھاؤں اور سوا اس کے گوشت نبیوں کا اور ولیوں کا ہم پر حرام ہے اور آزار پہنچانا اور اذیت دینا اون کو ہمارے مذہب میں گناہِ عظیم ہے اور خطا ہے۔ اے مومنو جس وقت حیوانات، دل دکھانا انبیاء کا اور اولیاء کا اپنے مذہب میں حرام جانیں اور گناہ کبیرہ سمجھیں و اصیحبا کس امت بے حیا نے کس دلیل سے اور کس طریق سے ذبح کرنا فرزند رسولِ خداؐ کا حلال و جواز جانا۔ القصہ بعد انکار گرگ نے زمین خدمت کو بوسہ دے کر عرض کی یا نبی اللہ میں اس دیار میں غریب الوطن ہوں اور مصر کی طرف سے ملاقات کو اپنے بھائی کی کہ صفا میں ہے مشقت سفر کی اٹھاکر اس ولایت میں گیا تھا وہاں سے عزم وطن کرکے آج

یہاں وارد ہوا تھا کہ تمھارے بیٹوں نے ناحق مجھے پکڑ لیا اور گردن اور ہاتھ میرے باندھ کر آپ کی حضور میں حاضر کیا اور متہم کیا یوسفؑ کی اذیت رسانی سے مجھے۔ یعقوبؑ نے باتیں اس گرگ کی گوش حسرت و افسوس سے سن کر اپنے بیٹوں کی طرف منھ کیا اور کہا گرگ مصر اپنے بھائی کے ملنے کے لیے کہ صفا میں رہتا ہے رنج سفر دور دراز کا اختیار کرے اور تم بے جہت اپنے عزیز بھائی یوسف کو صحرا میں لے جاؤ اور اسے غافل ہو کر ضائع کرو۔"[1]

"ابواب المصائب" کے دیباچہ میں سورۂ یوسف کے نزول کے اسباب بیان کیے گئے ہیں کہ ایک روز پیغمبر آخر الزماںؐ حسنینؑ کو اپنے زانوؤں پر بٹھلا کر پیار کر رہے تھے کبھی لبوں کا بوسہ لیتے تو کبھی حلقوم کا۔ ناگاہ اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور دریافت کیا کہ آپ کو اپنے دونوں نواسوں میں کون زیادہ عزیز ہے۔ جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ دونوں میرے لختِ جگر اور نورِ نظر ہیں۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ خالق مختار نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں آپ کے نواسے شہید ہوں گے۔ یہ سن کر حضرت رسالتمآبؐ پر گریہ طاری ہوا اور دریافت فرمایا کہ انہیں کون شہید کرے گا۔ حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ وہ لوگ آپ کی امت سے ہوں گے، اور آپ سے شفاعت کی امید بھی رکھتے ہوں گے۔ وہ لوگ انہیں بے قصور قتل کریں گے۔ یہ سن کر حضرت رسالتمآبؐ کے ملال میں مزید اضافہ ہوا پھر جبریلؑ نے تسلی کے لیے یہ مژدہ دیا کہ ان فرزندوں کا خوں بہا روز قیامت شفاعت امت ہوگا۔ اس کے بعد قصۂ یوسف تسکین رسولِ مقبولؐ کے لیے بیان کیا۔[2]

روضۃ الشہداء میں بھی سورہ یوسف کے نزول کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے[3] غرض مرزا دبیر کی یہ تصنیف کئی خصوصیات کی حامل ہے اور اس کی رواں نثر کو دیکھ کر یہ بتانے میں کسی قسم کا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور وہ جہاں جیسی زبان چاہتے استعمال کر سکتے تھے۔ اتنی مدت گزر جانے کے باوجود اس

---

۱ ابواب المصائب ص ۹۰۔۸۸ باب ۳ فصل ۲

۲ ابواب المصائب باب ا فصل ا ص ۱۱۔۱۰

۳ روضۃ الشہداء ص ۳۲ امام رکن الدین مسعود بن محمد معروف بہ امام زادہ

تصنیف کی کہ زبان اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مرزا دبیر کے لیے یہ تصنیف کوئی سرمایۂ افتخار نہیں تھی لیکن اس اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انھوں نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مرزا غالب[1] کی طرح مقبولیت حاصل کی۔

آخر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"بادشاہ مصر نے باعزاز و اکرام یوسف کو قید سے طلب کیا۔ جس وقت یوسف علیہ السلام آئے تو وہ پاپیادہ ہوا اور شروط استقبال بجا لایا۔ یوسف نے زبان عربی میں سلام کیا۔ مالک نے کہا یہ کیا زبان ہے حضرت نے فرمایا کہ یہ زبان ہے میرے عم اسمٰعیل ذبیح اللہ کی۔ مالک نے یوسف کو کرسی زرین پر بٹھلایا اور چتر زرنگار بالائے سر پیشوائے ابرار پر رکھا اور خلع خلعتِ گرانمایہ فرمایا اور زبان بیان معذرت میں کھولی۔ واویلا غریبی یعقوبِ آل عبا سے جس وقت بیمار کربلا روبروئے یزید آئے تو لکھا ہے کہ اس بے حیا نے چار گھڑی روبروئے تخت استادہ رکھا کہ حرارت آفتاب سے پوست اہل بیتؑ کے چہروں کا گر پڑا تھا اور بعد اوسکے اوس مکان میں قید کیا کہ نہ فرش تھا نہ سایہ۔"[2]

کچھ نخل ماتم کے بارے میں

ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مضمون "مرزا جعفر علی فصیح"[3] میں "نخل ماتم" کا ذکر کرتے ہوئے اس کے تین قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے جس میں سے ایک کتب خانہ آصفیہ میں ہے جس کے آخر میں یہ ترقیمہ دیا ہوا ہے:

"تمام ہوا یہ نسخہ مسمی نخل ماتم تصنیف حاجی مرزا جعفر علی فصیح
ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندہ گنہ گارم

---

1 جب مرزا دبیر نے ابواب المصائب تصنیف کی اس کے ۳۲ سال بعد غالب نے اردو میں خط لکھنا شروع کیے جو اس کے برسوں بعد جمع ہوکر طبع ہوئے اس کے باوجود ان کو باقاعدہ تصنیف نہیں کہہ سکتے۔

2 یہ مضمون تحقیقی نوادر میں شامل ہے۔

3 ابواب المصائب باب ۵ فصل ۴ ص ۱۵۳

کاتب الحروف ایں جلد معظم مظفر علی خاں پسر مصطفےٰ علی نیزہ برادر شاہ سوار جنگ بہادر برادر طالب الدولہ در ماہ شعبان المعظم در ۱۲۸۴ھ مقدسہ ۱۲۷۸ھ فصلی زیب تحریر یافت۔''[1]

دو اور نسخے رام پور کے کتب خانے میں ہیں جن میں سے ایک کی کتابت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۸۱ھ کو ہوئی ہے اور دوسرے نسخے کی تاریخ کتابت کا ذکر ڈاکٹر اکبر حیدری نے نہیں کیا ہے۔[2]

راقم کو اس کے دو مطبوعہ نسخے ملے جو محمد رشید صاحب کے ذاتی کتبخانہ میں موجود ہیں۔ یہی دو نسخے ڈاکٹر شبیہہ الحسن[3] کے نجی کتب خانہ میں بھی دستیاب ہوئے۔

سن تصنیف ''نخل ماتم''

ان میں سے ایک جس پر تقدم کا گمان غالب ہوتا ہے۔ ۱۲۶۲ھ میں مرزا جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری لکھنو سے شائع کرایا ہے۔ دوسرا مطبع جعفری نخاس جدید لکھنو سے شائع ہوا ہے۔ اس پر سن اشاعت نہیں دیا ہے جن مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ ''نخل ماتم'' کا سن تصنیف کیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری بھی اس ضمن میں خاموش ہیں کہ موصوف ''ابواب المصائب'' تصنیف مرزا دبیر کو دبستان لکھنو کی دوسری نثری تصنیف قرار دیتے ہیں اور پہلی نثری تصنیف ان کے نزدیک فسانۂ عجائب ہے۔[4]

اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ ''نخل ماتم'' ابواب المصائب کے بعد تصنیف ہوئی جو قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا اور اس سلسلہ میں شواہد کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ صادر کرنا گمراہی کا باعث ہوسکتا ہے۔

سید سبط محمد نقوی اپنے ایک مضمون مرزا فصیح کی نثری تصنیف ''نخل ماتم'' میں اس

---

۱ تحقیقی نوادر ص ۳۱۲

۲ ایضاً

۳ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو لکھنو یونیورسٹی۔

۴ شاعر اعظم ص ۱۶۰

کے سن تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فصیح کے سفر زیارت کا سال ۱۲۲۷ھ ہوتا ہے اور دوسرے سفر کی آرزو کم سے کم سولہ سال یعنی ''نخل ماتم'' کی تصنیف کے وقت تک نہیں ہوئی اور اسے کم و بیش ۱۲۴۳ھ ہونا چاہیے۔ اس لئے ''نخل ماتم'' باعتبار زمانہ ابواب المصائب سے کم و بیش دو سال مقدم ٹھہرتی ہے اور اسے دبستان لکھنو کی نثر نگاری میں ''ابواب المصائب'' سے سابق قرار دینا چاہیے۔''[1]

انھوں نے جس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا ہے اس میں شک کی کافی گنجائش ہے کیونکہ ''نخل ماتم'' مطبع حیدری مطبوعہ ۱۲۶۲ھ کے صفحہ ۱ پر مرتب نے تحریر کیا ہے:

''یہ نسخہ ''نخل ماتم'' تصنیف افصح الفصحا افضل الشعراء مرزا جعفر علی فصیح مدظلہ کی بارہ رطب پر مرتب تھا۔ احقر نے چودہ رطب ترتیب دیا اور بعض رباعیات و احوال متفرقات مختصرات سے حاشیہ کتاب کو مزین کرکے جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری میں چھپوایا۔ بفضلہ تعالی وحسن توفیقہ بتاریخ نہم شہر ذی حجہ الحرام ۱۲۶۲ھ در رکاب گنج جدید بحسن سعی کار پردازان مطبع حیدری سید محمد زماں صفوی برلبۂ اختتام پوشید۔''[2]

اس مطبوعہ نسخے کے ص ۱۶۱ کے حاشیہ پر ''تمت تمام شد'' کے بعد درج ہے۔ ''در شہر ذی قعد ۱۲۶۲ھ بمطبع حیدری جناب فیض مآب مسیح الزماں ارسطو دوراں حکیم سید محمد زماں صاحب دام ظلہ العالی بتوفیق ایزدی بارادت و سعی مرزا جعفر علی صاحب کربلائی حلیہ طبع پوشید۔''[3]

اور سن تصنیف کی بنیاد جن اشعار پر رکھی گئی ہے وہ دوسرے مطبوعہ نسخے میں چودھویں رطب کے بعد درج ہیں۔

---

۱ مرزا فصیح کی نثری تصنیف ''نخل ماتم'' ص ۲ مطبوعہ ہماری زبان دہلی۔ اس مضمون کا اصل مسودہ راقم کو محمد رشید صاحب لکھنوی کے کتب خانہ میں ملا ہے اور راقم نے اس سے استفادہ کیا ہے چنانچہ صفحہ نمبر کا حوالہ بھی اسی مسودہ سے دیا گیا ہے۔

۲ ''نخل ماتم'' مطبوعہ مطبع حیدری ص ۱

۳ ایضاً، ص ۱۶۱

یہ دراصل پندرہ اشعار پر مشتمل دعائیہ ہے جس کا پہلا شعر ہے[1]:

عزاداروں بہ ہنگام بکا ہے ولے ہر درد و غم کی انتہا ہے

اور آخری تین شعر ہیں جن سے سن تصنیف کے بارے میں سید سبط محمد صاحب نقوی نے رائے قائم کرلی ہے۔

فصیح ناتواں کو بار الہا دوبارہ آرزو ہے باد شاہا

ہے اس امید میں سولہ برس سے نہ باز آوے گا ہرگز اس ہوس سے

مشرف کر اسے بھی نیم جاں ہے حسین ابن علی کا مدح خواں ہے

اس میں چونکہ اصل رطب بارہ ہیں اور مرتب نے اضافے کیے ہیں اس لیے یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ جس طرح انھوں نے حاشیوں کا اضافہ کیا۔ بارہ سے چودہ رطب کر دیے اس طرح فصیح کے اس دعائیہ کا اضافہ بھی کیا ہو۔ قدیم مطبوعہ نسخہ جس کا راقم نے ذکر کیا ہے اس پر بھی آخر میں ''تمام شد''[2] تحریر کیا ہوا ہے مگر گمان غالب ہے کہ وہ بھی ناکمل ہے اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ دعائیہ اس میں شامل نہیں ہے۔ عبارتیں دونوں نسخوں کی اس کے بعد بھی مشابہ ہیں مگر نقش اول (مطبوعہ ۱۲۶۲ھ) میں یہ دعائیہ غائب ہے۔

بہرکیف یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں کتابوں یعنی ''ابواب المصائب'' اور ''نخل ماتم'' میں تقدم کس کو حاصل ہے۔

نخل ماتم کی تفصیل

''نخل ماتم'' فضائل و مصائب اہل بیت کے بیان میں ایک نثری تصنیف ہے جس میں جگہ جگہ ربط دینے کے لیے نظم سے کام لیا گیا ہے۔ عنوان کتاب کی نسبت سے ہر باب کو مصنف نے ''رطب'' کا نام دیا ہے اس کے متعلق ابتدا میں کہا ہے:

نبی تو نخل ہیں زہرا ہیں شاخ گل حیدر حسن حسین رطب ہیں محب ہیں برگ شجر[3]

اور پہلے رطب میں اس عنوان کی وضاحت اس طرح بھی کی ہے:

---

۱ نخل ماتم۔ مطبوعہ مطبع جعفری نخاس لکھنؤ ص ۶۷۔۱۶۶

۲ نخل ماتم مطبوعہ مطبع حیدری ص ۳

۳ نخل ماتم مطبوعہ حیدری ص ۲ (نوٹ۔ کتابت کی غلطی سے صفحہ ۲ اور ص ۳ دوبارہ چھپ گیا ہے مگر عبارت منفرد ہے۔ یہاں صفحہ ۲ (دوم) مراد ہے) راقم

''جناب رسول خداؐ نے یوں فرمایا ہے انا الشجرۃ و فاطمتہ فرعھا و علی لقاحھا یعنی میں ایک درخت ہوں سرسبز اور فاطمہ زہرا اس کی شاخ تر و تازہ ہے اور علی مرتضیٰ اس کا پھول ہے شگفتہ و شادات والحسن و الحسین ثمرتھا اور میرے نواسے حسن و حسین اس نخل کے رطب ہیں و شیعتھا اھل البیت اور اتبھا اور شیعہ و موالی اہل بیت اس درخت کے پتے ہیں۔''[1]

پوری تصنیف میں چودہ رطب ہیں جن کا مختصر سا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے:

پہلا رطب۔ فضیلت پنجتن پاک اور شیعہ کی اور حکایت حجاج کہ ایک سید کا قتل چاہتا تھا۔ سید نے اثبات حق کر کے قتل سے نجات پائی۔

دوسرا رطب۔ فضیلت جناب امام حسین بہشت سے پوشاک کا آنا حسین کے لیے اور شہادت امام حسین کا بیان۔

تیسرا رطب۔ شہادت چہار دہ معصومین کا ذکر اور بیان یہودی کا۔

چوتھا رطب۔ فضائل و مصائب حضرت فاطمہ زہرا۔

پانچواں رطب۔ گریہ و فریاد جناب فاطمہ زہرا۔

چھٹا رطب۔ جناب امیر المومنین کے فضائل اور ان کی شہادت کا بیان۔

ساتواں رطب۔ معصومین پر بنی امیہ کے ظلم کا بیان۔

آٹھواں رطب۔ بیان جو رہنی عباس مکالمہ امام حسین کا شمر کے ساتھ اور شہادت امام حسین۔

نواں رطب۔ فضائل تعزیہ دار اور شیعہ۔

دسواں رطب۔ بیان یوم شہادت امام حسین۔ آسمان سے خون برسنا۔ بیان احوال سر اطہر۔

گیارھواں رطب۔ بیان فضائل گریہ اور سرہائے شہدا کا شہر عسقلان میں پہنچنے کا۔

بارھواں رطب۔ بیان فضائل شیعہ اور ایام محرم اور حضرت سکینہ کے خواب کا بیان۔

---

1 نخل ماتم مطبوعہ حیدری ص ۲ (نوٹ۔ کتابت کی غلطی سے صفحہ ۲ اور ص ۳ دوبارہ چھپ گیا ہے مگر عبارت منفرد ہے۔ یہاں صفحہ ۲ (دوم) مراد ہے) راقم

تیرہواں رطب۔ روایت مومن بلخی کا بیان (معجزات امام۔ مومن کا پانی موتیوں میں بدلنا اور اس کی زوجہ کا زندہ ہونا)۔

چودہواں رطب۔ بیان ثواب گریہ۔

"نخل ماتم" ایک ایسی نثری تصنیف ہے جس کی اہمیت فقط اتنی ہے کہ یہ اس زمانے کی ہے جب اردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ اور موضوع کے لحاظ سے تو خاص طور پر نثر میں ایسی چیزوں کے آنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ نثر میں علماء کی توجہ فارسی کی طرف زیادہ تھی اور اردو میں مصائب کا ذکر نظم ہی میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ نظم سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ نظم کو سامعین کی دلچسپی کے لیے شامل کرلیا گیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نثر جو اس میں ملتی ہے نظم ہی کی تشریح کے طور پر کی گئی ہے۔ یا ایک بات کو نثر اور نظم دونوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی زبان اس زمانے کے لحاظ سے تو اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتی ہے کیونکہ اس طرح کی اردو نثر کی کوئی روایت ہی سامنے نہیں تھی مگر آجکل کی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کے قاری کو اسے پڑھتے ہوئے ایک خاص الجھن ہوگی۔ اس کی عبارت اور واقعات میں ناہمواری کا احساس بھی ہوگا۔ فارسی کے الفاظ اس میں مذاق زمانہ کے مطابق تو ٹھیک ہیں مگر عربی کی بھی بہت عبارتیں ہیں اور قریب قریب ہر صفحہ پر روایات اور احادیث پر مشتمل پانچ پانچ چھ چھ جملے عربی کے ہیں۔ اس سے مرزا فصیح کے باکمال ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مرثیہ گوئی میں ان کا ایک مقام ہے اور ان کے باکمال ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ ان کی تین مثنویاں بھی اب تک سامنے آئی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: "برق لامع" "مثنوی نان و نمک" اور "مثنوی چشمۂ زمزم"۔

ذیل میں نمونہ کے طور پر "نخل ماتم" کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"اے شیعان علی ابن ابی طالب، اے محبان اسد اللہ الغالب تمہارا مولا مقبول رب جلیل ہے۔ فخر ابراہیم و اسمٰعیل ہے۔ فضائل جناب رسالت مآب بیان کرنا امر محال ہے۔ علی صاحب فضل و مجد و کمال ہے۔ علی کے رتبے نبی جانتے تھے۔ خاتم الاولیا کو خاتم الانبیا پہچانتے تھے۔ روایت ہے ابن عباس

ہے کہ جناب رسول خداؐ نے جناب امیر کی شان میں فرمایا لو ان الریاض اقلام و البحر مدار و الجن حساب والانس کتاب ما احصو من فضائل علی ابن ابی طالب فضیلت واحدۃ اگر سارے باغوں کے درختوں کے قلم بنادیں اور دریائے محیط کو سیاہی کے بدلے مصرف میں لاویں اور سب جن جمع ہوکر حساب کریں اور سب آدم کتابت میں شتاب کریں ہرگز نہ لکھ سکیں گے فضیلت میں سے علی مرتضیٰ کی ایک بھی فضیلت۔ ابن عباس سے روایت ہے کہا دیکھا میں نے ابو ذر کو کہ پردے سے کعبہ کے لپٹا ہوا پکارتا تھا کہ ایھا الناس جو مجھے پہچانتا ہے جانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہے اس کو معلوم ہو کہ میں ابو ذر غفاری نبی کا صحابی و خادم ہوں قال لو صمتم حتی تکونو کا الاوتار وصلیتم حتیٰ کونوا کالحنایا ماینفعکم حتیٰ تحبو اعلیاً۔ پھر کہا اگر روزے رکھتے رکھتے تار سے دبلے ہوجاؤ گے سو کہہ کر اور نماز و رکوع و سجود کرتے کرتے پیروں کی طرح دوہرے خمدار ہوجاؤ گے۔ اس روز نماز کا نفع نہ ملے گا جب تک علی مرتضیٰ کی محبت نہ ہوگی شرط صحت عبادت محبت شاہ ولایت ہے:

علی کی دوستی ہے جزو ایماں جسے الفت نہیں ہے نا مسلماں
ہے شرط صحت طاعت یہ الفت نہ ہو الفت تو پھر طاعت ہے کلفت
وہ مومن ہے جسے ہے حب حیدر جسے الفت نہیں سگ سے ہے بدتر[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے چھٹے رطب کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے شروع میں جناب امیر کی فضیلت کا ذکر ہے۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ مصنف نے قافیہ کا بھی خیال رکھا ہے۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل اجزائے کلام ملاحظ فرمائیں:

علی ابن ابی طالب	اسد اللہ الغالب
مولا مقبول رب جلیل ہے	فخر ابراہیم و اسمٰعیل ہے
امر محال ہے--------	کمال ہے
جانتے تھے--------	پہچانتے تھے
قلم بنادیں--------	میں لاویں

---

1 نخل ماتم مطبوعہ مطبع جعفری لکھنوص ۶۰-۵۹

حساب کریں　　　　　شتاب کریں

نخل ماتم کی تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی کہ یہ کتاب اب تقریباً نایاب ہے اور دوسرے مرزا دبیر کے ہمعصر مرزا جعفر علی فصیح کی تصنیف ہے۔ دونوں کتابوں یعنی ابواب المصائب اور نخل ماتم کا مقصد اور موضوع ایک ہے البتہ ایک میں واقعات یوسف کو بنیاد بنا کر کے اصل مقصد کو پیش کیا گیا ہے اور دوسری کتاب میں براہ راست گفتگو کی گئی ہے۔ ایک میں نیا پن بھی ہے اور سادگی بھی اور دوسری میں کوئی نیا پن نہ ہونے کے باوجود پیچیدگیاں ہیں۔ ایک میں روانی کا احساس ہوتا ہے اور دوسری میں تصنع کا۔

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ مرزا جعفر علی فصیح کی تصنیف نخل ماتم کے مقابلے میں مرزا دبیر کی تصنیف ابواب المصائب اردو کے نثری کارناموں میں زبان و بیان اور ترتیب و تسلسل کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ یہ کارنامہ مرزا دبیر نے اس وقت انجام دیا ہے جب وہ صرف ستائیس برس کے تھے اور طبیعت بہار پر تھی۔ اس وقت کے علمی تقاضے کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں اور مرزا دبیر نہ صرف اس میدان کے ایک شہسوار تھے بلکہ ان کا رتبہ نوجوانی میں ہی ایسا تھا کہ پورے میدان پر نگاہ تھی۔ ان کے علم اور ان کے رنگِ طبیعت کی قدر ہوتی تھی لوگ سننے کے مشتاق رہتے تھے مگر قدرت نے انہیں ایسی ایسی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں جن کو ایک آدمی سمیٹ نہیں پاتا اور اگر وہ لے لیتا ہے یعنی اس کے اندر وہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں تو وہ ان سے کام نہیں لے پاتا مگر مرزا دبیر اپنی صلاحیتوں سے کام لینا جانتے تھے، ان کے طریقۂ اظہار سے واقف تھے اور ایسے پہلوؤں پر نظر جاتی تھی جو عام طور پر اوسط درجہ کے لوگوں کے سامنے نہیں آتے اور بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سامنے کی چیز تھی اور فنکاری بقول غالب یہی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس جذبہ اور اس صلاحیت نے مرزا دبیر سے "ابواب المصائب" تصنیف کرائی جس کی تفصیلات آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے۔

○

باب ہفتم

مرزا دبیر اور میر انیس
ایک تقابلی مطالعہ

مرثیہ نے جو دو بلند قامت شخصیتیں اردو ادب کو دی ہیں وہ مرزا دبیر اور میر انیس کی ہیں۔ دونوں کی تخلیقات کو اردو شاعری سے الگ کردیا جائے تو جانے کتنی چیزوں کی کمی محسوس ہوگی۔ دونوں اساتذہ نے ''اردو مرثیہ'' کو از سرنو دریافت کیا۔ اس صنف کو ایک نئی صورت عطا کی۔ بزرگوں کی تکنیک میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں اساتذہ نے اس صنف سخن کو ایک انفرادی شخصیت عطا کردی۔ اپنے افکار و خیالات سے موضوعات میں تنوع پیدا کرکے نئی جہتیں پیدا کیں۔ اردو شاعری میں مرثیہ کی روایت بہت قدیم ہے میر مظفر حسین ضمیر اس روایت کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے فرمایا ہے کہ اگر ضمیر پیدا نہ ہوتے تو مرزا دبیر اور میر انیس بھی نہ ہوتے[1] یہ بات راقم کے نزدیک اس طرح ہے کہ اگر میر نہ ہوتے تو غالب بھی نہ ہوتے۔ میر ضمیر کی حیثیت مرثیہ میں وہی ہے جو میر تقی میر کی غزل میں ہے۔ میر کی روایت میں غالب نے اضافے ضرور کیے اور اردو غزل کو ایک تہہ دار شخصیت عطا کی مگر میر کی اہمیت باوجود ان اضافوں کے جو غالب نے کیے اردو غزل میں مسلم ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر اور میر انیس نے اردو مرثیے کو ایک پہلودار شخصیت سے نوازا اور میر ضمیر سے اس صنف کو بہت آگے لے جا کر اس صنف کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس صنف کی نئی وسعتوں کو اس انداز سے لوگوں کے سامنے رکھا کہ وہ یہ کہاوت بھول گئے کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے''۔ ایک صدی کا زمانہ گزر گیا مگر اب بھی مرثیہ گو پریشان ہیں کہ کون سا پہلو ایسا ہے جس پر مرزا دبیر اور میر انیس کی نگاہ نہیں گئی۔ کون سا مضمون ایسا ہے جو ان دونوں فنکاروں نے نہیں باندھا۔ حد تو یہ ہے تشبیہوں اور استعاروں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ آج زبان اپنی بے پناہ وسعتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگیا ہے۔ نئے نئے خیالات آگئے ہیں لیکن ان کا کلام آج بھی معجزے کی تاثیر رکھتا ہے۔ اب بھی لوگ پڑھتے ہوئے وہی لطف لیتے ہیں جو ان اساتذہ کے زمانۂ حیات میں لیا جاتا تھا۔ اس ایک صدی کے اندر ان کے مقابلے میں کسی کے قدم نہیں جم سکے۔ ان کے کلام سے خود اردو زبان نہ صرف یہ کہ مالا مال ہوگئی بلکہ اس میں وہ دم خم

---

۱ شاہکار انیس ص ۳

آ گیا کہ اس کے اندر ایک مکمل اور ترقی یافتہ زبان کی خصوصیات پیدا ہوگئیں۔ اس میں ہماری تہذیب محفوظ ہوگئی۔ ہمارے عقائد جذب ہوگئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے ذوق کو جلا ملی۔ دونوں اساتذہ کے احسانات اس قدر ہیں کہ ان کے احترام میں اب تک فرق نہ آیا۔ دونوں کا نام ساتھ لیا جاتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے تحریر کیا تھا:

> ''یہ پاک روحیں جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی۔ صلہ ان کا سخن آفرین حقیقی عطا کرے۔ ہمارے شکریہ کی کیا بساط ہے۔''[1]

یہ کوئی آسان کام نہیں کہ کوئی ایک آدمی دونوں کا کلام پڑھ ڈالے پھر اس کے ایک ایک جز پر غور کرکے دونوں کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرے اور تمام خصوصیات ترجیح کے طور پر پیش کرے۔ اگر کسی ایک شہید کا دونوں کا ایک ایک مرثیہ بھی سامنے رکھے اور اس کے رموز و نکات کو موازنہ کے طور پر پیش کرے، اس سے بھی مطالعہ مکمل نہیں ہوتا کیونکہ دونوں اساتذہ نے ایک ہی شہید کے حال کے کئی کئی مرثیے کہے ہیں اور ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ آخر ایک ہی واقعہ تو تھا ان کے سامنے جس کے مختلف پہلو وہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس کی مختلف جہتیں دیکھ کر ان کو نظم کرتے رہتے تھے۔ اگر کہیں یہ گمان ہو کہ مرزا دبیر کا کوئی ایک مرثیہ میر انیس کے کسی ہم موضوع ایسے ہی مرثیے سے بہتر ہے تو میر انیس کا دوسرا مرثیہ اس گمان کو رد کردیتا ہے۔ یہی حال میر انیس کا ہے بلکہ راقم تو یہ سمجھتا ہے کہ دونوں کا موازنہ کرنا زیادتی ہے۔ ہر پھول میں پتیاں ہیں خوشبو ہے اپنی خصوصیات ہیں بھلا ایک پھول کا دوسرے سے کیسے مقابلہ کیا جائے اور پھر ترجیح کی بنیاد کس پر رکھی جائے گی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں میر انیس کے ترجمے میں انیسیوں اور دبیریوں کی ایک بحث پیش کی ہے یہ بحث اس اعتبار سے اہم ہے کہ ظاہراً آزاد نے اس طرح کی بحثیں خود لکھنو میں سنی تھیں۔ وہ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنو آئے[2] وہ

---

۱ آب حیات ص ۵۴۶ (ناشر رام لعل بینی مادھو۔ الہ آباد)

۲ آب حیات (اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۲ء) ص ۱۴۴

حکومت کے معتوب تھے اور ان کے والد کو سزائے موت دی جا چکی تھی۔[1] آزاد کا یہ سفر مجبوری اور پریشان حالی کا تھا اور انھوں نے اپنا حال بہت کم لوگوں پر ظاہر کیا مگر اس کے باوجود ان کی تلاش اور جستجو کا اندازہ آب حیات کے بیانات سے بآسانی ہوتا ہے۔ میر انیس سے انھوں نے ملاقات ضرور کی۔[2]

یہ وہ زمانہ ہے جب مرزا دبیر اور میر انیس دونوں بقید حیات تھے جب لکھنو میں ان کے بارے میں بحثیں ہورہی تھیں۔ ان بحثوں سے اگرچہ کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا مگر اس اہمیت کے پیش نظر کہ ان دونوں اساتذہ کے زمانۂ حیات میں ان کے بارے میں لوگ کس طرح کی گفتگو کرتے تھے اس بحث کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

دونوں اساتذہ کے طرفدار یعنی انیسیے اور دبیریے ایک دوسرے سے بحث کرتے تھے۔ انیسی امت کا کہنا تھا کہ انیس کے ہاں صفائی کلام، حسن بیان اور لطف محاورہ ہے اور دبیریے شوکت الفاظ، بلند پردازی اور تازگی مضامین کو مقابلے میں پیش کرتے۔ انیس کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ شوکت الفاظ وغیرہ دربار فصاحت میں نامقبول ہوکر کے خارج ہوچکی ہیں۔ دبیریے اس پر اصرار کرتے کہ یہ علم کے جوہر ہیں میر انیس کے بازوؤں میں علم کی قوت ہوتو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے۔ غرض اس طرح کی کئی باتیں مولانا آزاد نے نقل کی ہیں[3] اور آخر میں اس بحث کو یہ لکھ کر ختم کردیا کہ:

"غرض جھگڑا لو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کرسکتی تھی البتہ مجبوری کہ دونوں کے گلے تھکا کر آوازیں بند کردیتی تھی اور منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی۔ دونوں اچھے، دونوں اچھے کبھی کہتی وہ آفتاب ہیں یہ ماہ، کبھی یہ آفتاب وہ ماہ۔"[4]

محمد حسین آزاد نے مرزا دبیر اور میر انیس کے زمانۂ حیات میں ہونے والی جن

---

۱ محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف، حصہ اول از ڈاکٹر اسلم فرخی (انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۵ء) ص ۱۱۳

۲ آب حیات (اترپردیش اردو اکادمی) ص ۴۵۷

۳ ایضاً ص ۵۲۱-۲۳

۴ آب حیات۔ یوپی اردو اکادمی ص ۵۲۳

بحثوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں بھی یہ پہلو اہم ہے کہ فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا کہ ترجیح کس کو دی جائے۔

مولانا شبلی کی تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" اس لحاظ سے ضرور اہم ہے کہ اس سے تنقید کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور تقابلی تنقید کے کچھ اصول سامنے آتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کتاب میں مولانا شبلی نے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کیے۔ اسے پڑھ کر جس جانبداری کا احساس ہوتا ہے وہ کسی طرح مناسب نہیں تھی خواہ مولانا شبلی سے سہو ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ کوئی بھی باذوق شخص مرزا دبیر کے کلام کے سرسری مطالعہ کے بعد بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مولانا کے موازنہ نے مرزا دبیر کے کلام کی بہتر خصوصیات کو ابھرنے نہیں دیا۔[1]

راقم کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ نساخ کی "انتخاب نقص" محمد حسین آزاد کی "آب حیات" شبلی کی "موازنہ انیس و دبیر" یا ایسی اور کتابوں کا جواب لکھا جائے کیونکہ ان کے جواب مندرجہ ذیل کتابوں میں دیے جا چکے ہیں:

۱	گستاخی معاف	سید مرتضیٰ بن سید علی صاحب امروہوی	۱۲۹۶ھ
۲	تطہیر الاوساخ نسخ نساخ	مرزا محمد رضا معجز	۱۲۹۶ھ
۳	تفضیح	مولوی آغا علی صاحب	۱۲۹۸ھ
۴	تقریظ مسکت شائستہ	سید محمد تقی صاحب فیض آبادی	۱۳۰۱ھ
۵	جلوۂ خضر	صفیر بلگرامی	۱۸۸۴ء

---

۱ عابد علی عابد لکھتے ہیں "شبلی نے انیس کے کلام سے بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے اور اس کے مقابلے میں جو شعر دبیر کے درج کیے ہیں وہ دبیر کے دوم درجے کے مرثیوں سے لیے گئے ہیں۔ اگر ایسا قصداً کیا گیا ہے تو یہ انتقادی بددیانتی ہے۔ جس کی سزا اس سے کم نہیں ہو سکتی کہ نقاد کو دوائر ادب سے اور حدود ذوق سلیم سے دیس نکالا دیدیا جائے۔ اگر انتخاب اشعار میں سوئے نیت کو دخل نہیں ہے تو صورتحال کی قباحت پھر بھی واضح ہے یعنی شبلی نے غفلت برتی ہے اور احتیاط سے دبیر کا کلام نہیں کھنگالا کہ انیس کے کلام سے صحیح موازنہ کیا جا سکے۔" موازنہ انیس و دبیر" شبلی مرتبہ سید عابد علی عابد۔ حاشیہ ص ۲۷۸ پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۶۴ء ناشر سید امتیاز علی تاج۔ ناظم مجلس ترقی ادب لاہور۔ مطبع عالیہ لاہور

۶	تنقید آب حیات	سید محمد رضا ظہیر	۱۳۰۳ھ
۷	تردید موازنہ	شیخ محمد جان عروج	
۸	سنان دلخراش	منیر شکوہ آبادی (غیر مطبوعہ)	
۹	رد واقعات انیس	سردار میرزا صاحب	۱۳۲۶ھ
۱۰	ردالموازنہ	افضل علی ضو	۱۳۲۶ھ
۱۱	حیات دبیر	افضل حسین ثابت	۱۹۱۳ء
۱۲	المیزان	چودہری سید نظیر الحسن فوق	۱۹۱۴ء
۱۳	شکوہ شاکی	سرفراز حسین خبیر	۱۳۴۰ھ
۱۴	سبع مثانی (دیباچہ)	سرفراز حسین خبیر	۱۳۴۹ھ
۱۵	مقدمہ وحواشی موازنہ انیس و دبیر شبلی	از سید عابد علی عابد	۱۹۶۴ء
۱۶	شاعر اعظم	ڈاکٹر اکبر حیدری	۱۹۷۶ء
۱۷	اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام	ڈاکٹر مظفر حسن ملک	۱۹۷۶ء
۱۸	تلاش دبیر	کاظم علی خاں	۱۹۷۹ء

اب تک سرمغزنی کے باوجود کوئی یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ دو میں ترجیح کس کو دی جائے نہ ان کے زمانے میں نہ ان کے بعد۔

ایک مرتبہ مفتی میر محمد عباس کی خدمت میں ایک سوال بھیجا گیا کہ لوگوں میں اختلاف ہے کہ میر صاحب (میر انیس) کا مرتبہ شعرگوئی ونظم مرثیہ میں زیادہ بلند ہے یا مرزا صاحب (مرزا دبیر) کا۔ لہٰذا اس کا فیصلہ آپ کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میر صاحب کا کلام فصیح اور شیریں ہے اور مرزا صاحب کا کلام دقیق اور ملیح۔ دونوں کا ذائقہ الگ الگ ہونے کی وجہ سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض شیرینی کو۔[1]

مطلب یہ کہ وہ کسی ایک کو ترجیح نہ دے سکے یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی

---

۱ تجلیات ص ۱۹۱

فیصلہ صادر کرنا صحیح نہ ہوگا۔ راقم صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے ان دونوں اساتذہ کا کلام سامنے رکھنا تو لازمی ہے ہی مگر اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ دونوں اساتذہ کا موضوع سخن ایک تھا اور طبع آزمائی بھی زیادہ تر انھوں نے ایک صنف سخن (مرثیہ) میں کی۔

۲۔ دونوں کا شاعرانہ جذبہ نیک اور پاک تھا۔

۳۔ دونوں اپنا کلام مجمع میں سناتے تھے۔

۴۔ دونوں کے سامعین ایک ہی مقصد سے سننے کے لیے آتے تھے گو کہ طرز کلام میں سننے والوں کی پسندیدگی کے معیار مختلف تھے۔ کلام کی ادبی لطافت سے بھی وہ محظوظ ہوتے تھے مگر مرثیہ کا اصلی مقصد بکا ہے اور دونوں کے سامعین اس پر متفق تھے اور زیادہ تر یہی مقصد یعنی بکا مرثیے سنتے وقت پیش نظر رہتا تھا۔

۵۔ دونوں نے مجالس کی کثرت اور لوگوں کے ذوق کی وجہ سے ایک ایک واقعہ کو کئی طرح سے نظم کیا۔

۶۔ دونوں فن کی نزاکتوں سے واقف تھے۔

۷۔ دونوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اکثر الفاظ یکساں ہیں۔

۸۔ دونوں ایک ہی زمانہ میں رہے اور دونوں کو ایک ہی تہذیب سے واسطہ پڑا[1]

ان مشترکہ خصوصیات کے سبب سے دونوں اساتذہ کے کلام کی ایسی خصوصیات سامنے آتی ہیں جن سے تقابلی مطالعہ کرنے والے کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ مثال کے طور پر:

۱ دونوں کے مضامین اکثر لڑ گئے ہیں اور لوگ سمجھ بیٹھے کہ یہ جواب الجواب والا معاملہ ہے۔ راقم کو اس سے انکار نہیں کہ کبھی ایسا ہوا ہوگا مگر تجربہ یہی بتاتا ہے کہ جب دو آدمی ایک ہی طرح کا کام کر رہے ہوں تو ان کے سوچنے کے انداز میں بھی مماثلت

---

۱ میر انیس اگرچہ لکھنو بعد میں آئے مگر یہاں کے اثرات کو ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

پائی جاتی ہے البتہ کسی کی طبیعت ایک جہت کو پسند کرتی ہے اور کسی کی طبیعت دوسری جہت کو ترجیح دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ مطلب لینا مناسب نہ ہوگا کہ متحد المضامین اشعار یا اجزائے کلام صرف ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہیں۔ مولانا شبلی اس سے دھوکا کھا گئے اور لوگ اب تک برابر ان کے خلاف لکھ رہے ہیں۔

اس طرح سے تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک ہی شاعر کے سب ہی متحد المضامین شعر جب تک سامنے نہ ہوں اور ان میں سے خوب تر کا انتخاب نہ ہو، اس وقت تک اس کا دوسرے شاعر سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ان شاعروں کا میدان اتنا تنگ تھا کہ یہ مختلف زاویوں سے اور مختلف دائروں میں اسی میدان میں دوڑتے تھے۔ بادی النظر میں ان کے بارے میں ہر وقت یہی معلوم ہوگا کہ ایک ہی میدان میں ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ وہ کہاں پر کھڑے ہیں، کس زاویے سے دوڑ رہے ہیں، کس رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں اور جہاں ان کی رفتار زیادہ تیز رہی ہو، اس میدان کا کوئی نیا گوشہ ان کے سامنے آیا ہو اس وقت کا ان کا کلام ملاحظ فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ جو کہہ گئے ہیں اس کا جواب نہیں۔ ہمارے غزل گویوں کا بھی یہی حال رہا ہے کہ اگرچہ غزل میں موضوع کی کوئی قید نہیں اور ہر طرح کے خیالات نظم ہوسکتے ہیں مگر حسن و عشق اور ہجر و وصال کے موضوع کو سبھی غزل گویوں نے اپنے کلام میں جگہ دی ہے اور کتنے ہی متحد المضامین شعر ملتے ہیں۔ کبھی کسی نے ایک مضمون اچھے انداز مین نظم کیا اور دوسرے نے کوئی دوسرا مضمون بہتر صورت میں موزوں کیا۔ میر اور سودا، میر اور غالب، غالب اور مومن وغیرہ کے یہاں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان چند ہم مضمون شعروں کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔

سودا: سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

میر کہتے ہیں: سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

غالب کا شعر ہے:
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مومن کہتے ہیں:
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

افسوس کہتے ہیں:
سمجھ لے آنکھوں ہی آنکھوں میں گر سمجھنا ہے
ہمارے منہ سے نہ کہلا کہ آرزو کیا ہے

حسرت کا شعر ہے:
گراں گذرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
نگاہ شوق اس مضمون رنگیں کو ادا کردے

آرزو کا کہنا ہے:
ملا کے آنکھ سمجھ لو نہ مدعا پوچھو
وہی ہے دل میں جو حسرت بھری نگاہ میں ہے

اگر ایسے اشعارکو سامنے رکھ کر شاعروں کی درجہ بندی اور ترجیح کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً کوئی فیصلہ کن بات کہنا گمراہی کا باعث ہوسکتا ہے۔

متحد المضامین اشعار اور اجزائے کلام میں اس بات کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ کسی مضمون کے ادا کرنے میں تقدم کس کو حاصل ہے کیونکہ بنیادی طور پر کسی چیز کو پہلی مرتبہ پیش کرنا دریافت اور ایجاد کا درجہ رکھتا ہے۔ نقش ثانی میں اس کی تجدید و ترقی ہوتی ہے مگر اس کی حیثیت اجتہاد کی نہیں۔ جب ایک نقش سامنے آجاتا ہے تو اس کو بہتر بنانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی اور خیال یقیناً اس کے سہارے آگے بڑھے گا۔ مصنف خود اپنی جگہ بھی موازنہ اور مقابلہ کرے گا۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس بات کو دہراکر جاذب توجہ نہیں بناسکتا تو شاید وہ اسے منظر عام پر نہ لائے۔ آسٹن کی بنائی ہوئی موٹر کا ڈیزائن اگر آجکل کے مذاق کے لحاظ سے صرف میوزیم (Museum) میں جگہ پاسکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ڈیزائن نے موٹر کار کے بیسیوں موجودہ ڈیزائنوں کے سامنے آنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے۔ اس لیے اگر تقدیم و تاخیر کا فیصلہ ہوجائے کہ کون سا مضمون سب سے پہلے کس نے پیش کیا اور کس نے بعد میں' تو اس سے مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ مولانا شبلی نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

مرزا دبیر اور میر انیس کے متحدالمضامین اشعار کے بارے میں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ نقش اول کس کی دین ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''افسوس کہ ان موقعوں پر یہ پتہ نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا۔''[1]

لیکن یہ کہنے کے بعد انھوں نے قیاس کیا کہ مرزا دبیر نے جواب میں ایسے مضامین باندھے اور پہل میر انیس کی طرف سے ہوئی۔ اس سلسلہ میں صاحب حیات دبیر تحریر کرتے ہیں:

> ''مرزا صاحب (مرزا دبیر) کو میر صاحب (میر انیس) سے بہت عرصہ پہلے لکھنو میں شہرت ہوچکی تھی اور وہ استاد مان لیے گئے تھے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مرزا صاحب کے مقابلے پر بڑے بڑے کامل شاعر برسوں کوشش کرتے رہے مگر ملک نے ان کو مرزا صاحب کا مدِ مقابل نہیں مانا جیسے جناب امانت مرحوم[2] جناب عشق مغفور، اختر مرحوم[3] جناب منشی مظفر علی خانصاحب اسیر مبرور، شہرت مرحوم[4]۔ یہ شاعر بہ جز شہرت مرحوم کے جن کا حال مجھے معلوم نہیں ہے اپنی اپنی طرز میں کامل تھے معلومات بھی سب کی اعلیٰ درجے کی تھیں زمانہ بھی موافق تھا مگر دبیر کے مقابلے پر کوئی مرثیہ گو نہیں مانے گئے۔ میر انیس صاحب کا یہ بھی کمال سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے مقابلہ فرمایا اور کامیاب ہوئے۔ ملک نے مان لیا کہ دبیر و انیس آسمان مرثیت کے دو آفتاب ہیں۔''[5]

اس ضمن میں افضل حسین ثابت نے فسانۂ عجائب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مرزا دبیر کا ذکر تو ہے مگر میر انیس کا نہیں ہے۔ راقم اس مقابلہ کے پہلے باب میں اس کا حوالہ

---

۱ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۸۸ (چمن بکڈپو دہلی)

۲ بے شک ان کی اندر سبھا کو شہرت ہوئی مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ کھلے بندوں اپنے نام سے اسے منسوب نہ کرسکے۔

۳ انھوں نے ایک بے نقط مرثیہ بھی کہا ہے ؏ ہم طالع ہما مراوہم رسا ہوا۔ جس کا حوالہ راقم اس سے قبل دے چکا ہے۔

۴ یہ بھی میر ضمیر کے شاگرد تھے۔

۵ حیات دبیر ص ۴۹۶

دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات غور طلب ہے کہ مولانا شبلی نے جس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ فیصلہ صادر کرنے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ متحد المضامین اشعار میں پہل میر انیس نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''میر انیس نے فخر کے ساتھ زمانے کی ناقدری کی شکایت کی تھی اس کے ایک بند کی ٹیپ یہ ہے :

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اسی بحر میں مرزا دبیر کا بھی مرثیہ ہے اس میں بھی فخریہ اظہار ہے اور ایک بند کی ٹیپ یہ ہے:

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

دونوں شعروں کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ کس نے کس کا جواب لکھا ہے۔[1]

اس قیاس کو بنیاد بنا کر انھوں نے ایسے سب ہی اشعار کے متعلق فیصلہ صادر کردیا ہے کہ میر انیس نے مرزا دبیر کو مخاطب کرکے کہے ہیں اور مرزا دبیر نے ان کا جواب دیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے انیس کے درج ذیل شعر پیش کیے ہیں۔[2]

۱ لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
۲ پیاسو! پیو سبیل ہے نذر حسین کی
۳ نوا سنجیوں نے تری اے انیس ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

اور یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا دبیر نے برابر کا جواب نہیں دیا ہے بلکہ وہ بھی فخریہ ایسے مضامین نظم کرتے ہیں۔[3]

---

۱ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۸۸ (چمن بکڈپو دہلی)

۲ اس ضمن میں انھوں نے یہ شعر بھی پیش کیا ہے :

بھلا تردد بیجا سے کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں سے

یہ شعر دراصل میر مونس کا ہے اور گزشتہ صفحات میں اس پر بحث ہو چکی ہے۔

۳ موازنہ انیس و دبیر ص ۲۸۹۔۲۸۸ (چمن بک ڈپو دہلی)

چنانچہ ایسے مضامین مرزا دبیر نے کثرت سے نظم کیے ہیں۔ اگر میر انیس سے مخاطب ہوکر نہیں کہے تو ممکن ہے ان شعرا کی طرف ان میں اشارے ہوں جن کا ذکر افضل حسین ثابت نے کیا ہے۔ وہ تمنا کرتے تھے کہ مرزا دبیر کے ہم مرتبہ قرار دیے جائیں۔ راقم ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں کرچکا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہے سست کہ چست پر کلام اپنا ہے
لاریب خطا پوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کرلیتے ہیں
ان مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے
(رباعی)

سرقہ مضمون کا زبوں ہوتا ہے
یعنی علم نظم نگوں ہوتا ہے
پر ان میں مندرج ہے حال شہدا
اس سے مرے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے
(رباعی)

شیران مضامیں کو کہاں بند کروں
گونجیں گے ڈکاریں گے کہاں بند کروں
خلاقیِ مضمون کا ہے دعویٰ سب کو
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں
(رباعی)

ہیں وقف ہمیشہ میرے الفاظ و معانی
ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی

لاریب توارد سے بری کوئی کہاں ہے
افراط توارد ہو تو سرقے کا گماں ہے

جو مصرع موزوں مرا مشہور جہاں ہے
البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے
سرقہ ہے کہ تالیف ہے مضمون کہن کی
یہ سب ہے زکواۃ اپنے زر نقد کی

گو دزد سخن سرقہ کرے میرے بیاں سے ملک سخن تازہ میں لوں تیغ زباں سے

ہر باغ ہے گلچیں مرے مضموں کے چمن کا ہر بحر ہے قطرہ مرے دریائے سخن کا

شاکر ہو دبیر آل نبی کی ہے یہ تائید تازہ ہے تمامی سخن اور تازہ ہے تمہید
دزدان مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید تو مجتہد نظم ہے فرض ان پہ ہے تقلید

مرزا دبیر کے کلام میں یہ سب مضامین ملنے کے باوجود یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں چوٹیں کی گئی ہیں بلکہ میر انیس کے بارے میں بھی اس طرح سے سوچنا صحیح نہیں ہوگا[1] کیونکہ یہ اس زمانے کا دستور بھی تھا کہ شاعر تعلّی سے کام لے۔ فخریہ مضامین کلام میں نظم کرے جن میں سخن گسترانہ انداز پایا جائے۔ فوق مہا نبی اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "ایک دوسرے کا جواب لکھنا یہ تو شعرا کیا ہی کرتے ہیں لیکن یہ خیال کہ ہمیشہ مرزا صاحب ہی جواب لکھا کرتے تھے دعویٰ بے دلیل اور صریح ہٹ دھرمی ہے۔ ہماری رائے میں جس زمانے میں ان نامور شعرا کی معرکہ آرائیوں کا بازار گرم تھا۔ پرزور طبیعتیں جولانیوں پر آئی ہوئی تھیں۔ اس وقت جب ان میں سے کسی کا جدید مرثیہ نکلتا ہوگا خاص شہرت ہوجاتی

---

1 ڈاکٹر نیر مسعود، جنھوں نے میر انیس کی سوانح پر کام کیا ہے، کا فرمانا ہے کہ انیس کے ہاں مرزا دبیر کے تئیں تیغ کلامی کی مثالیں ملتی ہیں مگر مرزا دبیر نے اس طرز تخاطب سے کام نہیں لیا۔

ہوگی۔ پس لامحالہ دوسرے صاحب کسی دوسری مجلس میں اس کا جواب پڑھ کر
حریف کے رنگ کو پھیکا کر کے اپنے لیے دادِ تحسین کا خلعت حاصل کرتے
ہوں گے یہ امر نہ مرزا صاحب کے واسطے خاص ہوگا نہ میر صاحب کے لیے
بلکہ دونوں صاحب ایک دوسرے کا جواب لکھ کر جادو بیانی کا ثبوت دیتے
ہوں گے یہ بات نہ قابل اعتراض ہے نہ کسی شاعر کی سبکی کا باعث۔''[1]

بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کہ متحد المضامین اشعار میں سے کون کس نے پہلے کہا اور کس نے بعد میں۔ مولانا شبلی بھی اس نتیجے پر پہونچے تھے مگر وہ کلام دبیر کو دیکھ کر خوب تر مثالیں تلاش نہ کر پائے بلکہ اکثر وہی اشعار جو غلط شائع ہوئے تھے یا مرزا دبیر کے کلام سے نہ تھے بلکہ ان کی طرف اوروں نے منسوب کیے تھے پیش کر کے دھوکا کھا گئے۔

یہاں مرزا دبیر کی شخصیت کے ایک اور پہلو کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ وہ سادات کی بہت قدر کرتے تھے[2] جیسا کہ اس مقالہ کے ابتدائی صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ میر انیس صاحب کی بھی بہت قدر کرتے تھے اور ہمیشہ احترام سے یاد کرتے تھے۔ قبلہ میر صاحب کہہ کے نام لیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے جہاں فخریہ مضامین نظم کیے ہیں اور حریفوں کی طرف اشارے کیے ہیں لگتا ہے وہ انہی لوگوں کی طرف کیے گئے ہوں گے جن کا ذکر صاحب حیات دبیر نے کیا جس کا حوالہ راقم گذشتہ صفحات میں دے چکا ہے اور میر انیس کا بھی مطلب وہاں ان ہی لوگوں سے رہا ہوگا جہاں انھوں نے ایسے مضامین نظم کیے ہیں کیونکہ سوا میر انیس کے کوئی مرزا دبیر کے مقابلے میں جمنے نہیں پایا تھا اس لیے دوسرے شعرا نے ضرور میر انیس کا بھی تتبع کیا ہوگا۔

بہرحال مماثلت کی جو وجہ راقم اس سے قبل عرض کر چکا ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اب کچھ ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں مماثلت کے پہلو صاف نظر آتے ہیں اور دونوں اساتذہ کے جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں مگر ترجیح کا فیصلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

---

۱ المیزان ص ۲۹

۲ دیباچہ سبع مثانی۔ افضل حسین ثابت ص ۶۷-۶۶

حضرت امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی کا واقعہ اور حضرت صغرا کی بے چینی:

مرزا دبیر

ساعت سفر کی نکلی ہے حضرت کے واسطے جس میں خزاں ہے باغ رسالت کے واسطے
زندان ہے حسین کی عترت کے واسطے یاں نار سے رہائی ہے امت کے واسطے
یہ درد روح حضرت زہرا سے پوچھیے
زہرا کے بعد فاطمہ صغرا سے پوچھیے

تنہائی چھا رہی ہے مزار رسول پر بے وارثی برستی ہے قبر بتول پر
کنبے کا ہے ہجوم شہ دل ملول پر جھرمٹ ہے عندلیبوں کا زہرا کے پھول پر
آگے نبی کے خلد میں زہرا تڑپتی ہے
یاں سامنے حسین کے صغرا تڑپتی ہے

جب گل نہ ہو تو بلبل شیدا کی موت ہے سبزہ نہ ہو آ ہوئے صحرا کی موت ہے
پانی بغیر ماہی دریا کی موت ہے چھٹنا مرض میں باپ سے صغرا کی موت ہے
اک آن بھی رہیں نہ زمانے میں چین سے
زہرا نبی سے چھوٹ کے صغرا حسین سے

کہتی ہے باپ سے کہ نہ کیونکر ہو بے کلی زہرا چھٹی نبی سے تو موجود تھے علی
لیکن عجیب قلق میں ہے اس دم یہ دل جلی ہے ہے فضا مدینے کی رونق کو لے چلی
بچپن بھی تپ بھی اور یہ غضب کی جدائی بھی
ماں باپ بھی بچھڑے ہیں، بہنیں بھی بھائی بھی

دامن پکڑ کے کہتی ہے بابا کب آؤ گے لے جاؤ گے ہمیں کہ یہیں چھوڑ جاؤ گے
بیمار کی خبر بھی کسی سے منگاؤ گے یا پیار میں سکینہ کے ہم کو بھلاؤ گے

لینے کے میرے بھیجو گے کس کو مدینے سے
بابا امید ہی میں رہوں اپنے جینے سے

دیکھیں تو آپ حال تپش کے وفور کا   لو سے ہے دل کباب و حوش و طیور کا
نزدیک کا سفر ہے میں واری کہ دور کا   کل تیس دن کا ہے علی اصغر حضور کا
اس سن کے بچے چین سے جھولے میں سوتے ہیں
یہ اک مہینے کے وطن آوارہ ہوتے ہیں

بابا ابھی نہ حکم سواری کا دیجیے   نادان کی بھی بات یہ اک مان لیجیے
قرآن لاؤں مشورہ خالق سے کیجیے   لاکھوں برس حبیب نبی و علی جیے
رستے کی آفتوں سے خدا ہی پناہ دے
بسم اللہ، استخارہ سفر کو جو راہ دے

میر انیس[1]

شب سے ہیں تردد میں سفر کے شہ ابرار   گھوڑے بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہے تیار
اسباب سفر باندھتے ہیں یاور و انصار   عباس نکلواتے ہیں صندوقوں سے ہتھیار
ہر فرد پہ الطاف و کرم کرتے ہیں شبیر
ہمراہیوں کے نام رقم کرتے ہیں شبیر

خلقت کا ہے مجمع در دولت پہ سحر سے   جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدۂ تر سے   چھپ جائے گا اب فاطمہ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اجالا نہ رہے گا

---

۱ مراثی انیس جلد دوم آٹھواں ایڈیشن مطبع نول کشور نومبر ۱۹۵۸ء
مطلع کنعان محمد کے حسینوں کا سفر ہے

ثابت ہوا صغرا پہ کہ اب ہم رہے گھر میں بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں صدمے سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں
شکل اپنی غم ہجر جو دکھلا گئی اس کو
کانپا یہ تن زار کہ تپ آگئی اس کو

تھرائی ہوئی اٹھ کے گری شہ کے قدم پر کی عرض کہ مرجاؤں گی یا سبط پیمبر
تنہائی میں بابا مرا دل بہلے گا کیوں کر سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپ کی دختر
بے آپ کے اس گھر میں نہ یا شاہ رہوں گی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہوں گی

صغرا نے کہا آپ کی باتوں کے میں قرباں تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جاں
بیٹے ہو علی کے میری مشکل کرو آساں جیتی رہی صغرا تو نہ بھولے گی یہ احساں
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

پیاری ہیں جو دو بیٹیاں جائیں گی وہ ہمراہ کیا انس کہ میں گور کنارے بھی تو ہوں آہ
بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ
بھولے سے اب نہ خاطر ناشاد کریں گے
میں قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کریں گے

شبیر نے روکر کہا لو جاتے ہیں صغرا جلد آتے ہیں یا خود تمھیں بلواتے ہیں صغرا
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغرا جان اپنی نہ کھونا تمھیں سمجھاتے ہیں صغرا
قربان پدر آب و غذا ترک نہ کیجیو
بڑھ جائے گا آزار دوا ترک نہ کیجیو

پردے کا اہتمام

مرزا دبیر

ناگہ پکارے آ کے یہ عباس نیک نام　　اسوار ہو چکے حرم محترم تمام
باقی ہے اک سواری مخدومۂ انام　　جس کا حضور سے متعلق ہے اہتمام
فراش قاعدے سے قناتیں لگاتے ہیں
در پر کھڑے حضور کو اکبر بلاتے ہیں

فرمایا شہ نے چلتے ہیں اے حامل علم　　اپنی بہن کا آنکھوں سے پردہ کریں گے ہم
کچھ اماں جائی کہتی ہیں اپنا غم و الم　　منہ ڈھانپتی ہیں میری غریبی پہ دم بہ دم
عباس جھک کے بولے کہ مجرا مرا کہو
آئی ندا ہماری طرف سے دعا کہو

یہ سن کے پردہ پوش خلائق ہوا رواں　　دیکھا قناتیں پردے کی ہیں گرد آستاں
گہری گھٹا ہو قبلہ سے جیسے کبھی عیاں　　پردہ اٹھا کے فضہ سے بولے شہ زماں
ہاں عرض کر بہن سے کہ تیار ہو چلے
ہم آئے اہتمام کو اسوار ہو چلے

ہمراہ میں کھڑے ہوئے پھر شاہ حق پسند　　ہر بام کی طرف سر اقدس کیا بلند
یہ دیکھ کر پکارے نقیبان ہوش مند　　رستے دریچے غرفے جھروکے ہوں سارے بند
ہشیار کوئی بے ادبی اس گھڑی نہ ہو
لڑکے کو لے کے کوٹھے پہ عورت کھڑی نہ ہو

پھر تو نہ شہر میں کوئی دروازہ وا رہا　　اللہ کا مگر در رحمت کھلا رہا
دنیا میں نام کو بھی نہ مرغ ہوا رہا　　بہر نماز طائر قبلہ نما رہا

ہیبت نے آفتاب کے منہ کو پھرا دیا
پردہ کرن کا چشم قمر پر گرا دیا

راہ گیر بیٹھ بیٹھ گئے یاں وہاں تمام چھپ چھپ گئے مکانوں میں خورد و کلاں تمام
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے ہٹا کارواں تمام ناقوں سے کود کود پڑے سار باں تمام
سب حق شناس عترت اطہار ہٹ گئے
سرکے پیادے راہ سے اسوار ہٹ گئے

میر انیس[1]

عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا چلنے کے لیے قافلہ تیار ہے آقا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دو بارا اٹھے شہ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پر نم نظر آئی
اک مجلس ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو تو اتر جائے آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے دیتے رہو آواز جہاں تک بھی نظر جائے

---

1 مراثی انیس جلد اول ص ۱۷ نول کشور پریس۔ ساتواں ایڈیشن اپریل ۱۹۳۷ء
مطلع فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے

مریم سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

عباس علی سے علی اکبر نے کہا تب — ہیں قافلہ سالار حرم حضرت زینب
پہلے وہ ہوں اسوار تو محمل میں چڑھیں سب — حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنت علی ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

آ پہونچیں جو ناقہ کے قریں دختر حیدر — خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھیں گوشۂ چادر — تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

حضرت حر کے حال میں

مرزا دبیر

پہونچا قریب فوج خدا جب وہ باوفا — چرچا ہوا حسین کے لشکر میں جابجا
ہشیار اے امام کے اصحاب و اقربا — ہاں نیزے تانو تیغیں سنبھالو غضب ہوا
آتا ہے وہ فرس کی ادھر باگ پھیر کے
لایا ہے کربلا میں جو سید کو گھیر کے

خود منفعل ہوں مجھ کو گنہ کا نہ طعنہ دو — ٹکڑے کرو تو عذر نہیں اس غلام کو
جن کا گنہگار ہوں پر ان سے پوچھ لو — مالک تو نیک و بد کے ہیں سلطان نیک خو
آقا کے پاؤں پڑ کے خطا بخشوانے دو
میں اپنا خون کرتا ہوں اچھا نہ جانے دو

دل صاف سینہ صاف بدن صاف واہ واہ　　تن پر زرہ بتاتے ہیں گو صاحب نگاہ
پر عقل کہہ رہی ہے کہ سب کو ہے اشتباہ　　حر کی صفائے قلب ہے اس بات پر گواہ
دل حرؔ کا مضطرب غم شاہ زمن میں ہے
یہ دل کا پیچ و تاب نمایاں بدن میں ہے

اس رخش پر سوار جو آیا یہ صف شکن　　یوں دفعتاً کھڑے ہوئے اعدا کے موئے تن
جو صورت زرہ ہوئے سوراخ پیرہن　　بسمل کی نبض بن گئے سر تا قدم بدن
میداں سے پاؤں اٹھنے لگے خود گر گئے
مارا طمانچہ خوف سے منہ سب کے پھر گئے

کھولا کسی نے جینے سے ہوکر بہ تنگ تنگ　　گوشہ میں کوئی رکھ کے کوئی کمان و خدنگ دنگ
بس وقفہ ہوش اڑ گیا اور بید رنگ رنگ　　یہ کیا تھے منزلوں ہوئے پائے پلنگ لنگ
گو مکر و حیلہ ظالموں کے آب و گل میں تھا
اس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل میں تھا

ہر صف میں غل تھا کون ہے یارب یہ باوقار　　یوسف کا ہموطن کہ سلیماں کا ہم دیار
بو زر کا ہم نسب ہے کہ سلماں کا رشتہ دار　　ایراں کا پہلواں کہ عرب کا ہے شہسوار
حر کو کبھی نہ دیکھا تھا اس زیب و زین سے
انساں فرشتہ بن گیا مل کر حسین سے

اللہ رے شناور شمشیر آب دار　　دکھلادیے صفائی کے سب ہاتھ ایکبار
دریائے خوں میں دھوم ہوئی اس کی بار بار　　جو حر کا ایک بال بھی ڈوبا نہ زینہار

خود وجد حر کے دل کو صفا دیکھ کر ہوا
ہاتھ اک طرف نہ تیغ کا ناخن بھی تر ہوا

غواص تھی یہ تیغ کہ دریا تھی یہ حسام　　دریا بھی وہ کہ جس کا سمندر ہے ایک جام
مرغابیوں کی طرح سے ارواح فوج شام　　دریائے آب تیغ میں تھیں غوطہ زن تمام
یوں غرق آب تیغ میں کم ظرف ہوتے تھے
جد و پدر کا نام بھی بالکل ڈبوتے تھے

مشتاق مرگ رن میں گیا حر با وفا　　جلادوں کو پکارا کہ اب سر کرو جدا
لو میں نے وقف راہ حسین آپ کو کیا　　تن ہو کہ سر ہو دل ہو کہ سینہ ہو سب فدا
لے لو قسم غریبی سبط رسول کی
لو نیزے مارو میں نے شہادت قبول کی

یہ کہہ رہا تھا ظالموں سے حر نامور　　جو آیا چھپ کے پشت پہ سفیان کا پسر
برچھی غضب کی اس نے لگائی وہ تان کر　　جس کی انی ہوئی جگر حر پہ کارگر
فوارۂ خون دل کا بہا آہ، زمین پر
اور یا حسین کہہ کے گرا وہ زمین پر

رومال فاطمہ کا جو لائی وہ دل حزیں　　شہ نے لپیٹا حلق پہ مہمان کے وہیں
حر نے نگاہ یاس سے کی سوئے شاہ دیں　　لطف و کرم پہ ہو گیا صدقے وہ خوش یقیں
روئے حرم عزیز اسے شہ کا جان کے
کھولے سر اپنے سوگ میں اس مہمان کے

میر انیس[1]

حر نے نعرہ کیا یا حیدر صفدر مددے وقت امداد ہے یا فاتح خیبر مددے
روح زہرا مددے نفس پیمبر مددے بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مددے
تن تنہا ہے غلام اور بہت اظلم ہیں
آئی آواز کہ اے حر ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہ خدا واہ رے اقبال ترا پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جرم ماضی ہوئے سب عفو خوشحال ترا جلد جا جلد کہ شائق ہے مرا لال ترا
مرد ہے جس کو یہ ہمت یہ ارادہ ہوئے
ہاں مراد تری توفیق سے زیادہ ہوئے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار الغیاث اے جگر و جان رسول مختار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار عفو کر کہ اے چشمۂ فیض غفار
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہوجائے
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہوجائے

واہ کیا فیض ہے سرکار شہ عالم میں ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں یہ وہی حر جری ہے جو ابھی تھا ہم میں
تن ہے خوشبو رخ گلرنگ تر و تازہ ہے
خاک نعلین مبارک کی عجب غازہ ہے

مہر ذرہ ہے جہاں چہرۂ روشن ایسا چاندنی جس سے کرے کسب ضیا تن ایسا
حرز ہو بازوئے داؤد کا جوشن ایسا ہوش پریوں کے اڑے جاتے ہیں تو سن ایسا

---

1 مراثی انیس جلد اول ص ۱۲۹ نول کشور ساتواں ایڈیشن اپریل ۱۹۳۷ء

گلشن دہر میں لو باد بہاری آئی
قاف میں غل ہے سلیماں کی سواری آئی

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا　　غیظ و آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوج مخالف پہ جھپٹ کر آیا　　روند ڈالا اسے دم میں جسے سرکش پایا
اس کا قاتل تھا جو دشمن شہ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیر ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغ حر ذی جاہ چلی　　آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کسی گوشہ سے وہ لیلیٰ ظفرراہ چلی　　گہہ بڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح بہتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی　　کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھاٹ اور وہ لگاوٹ وہ رکھائی نہ گئی　　سینکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق لیے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے　　رکھ دیا تیر نے قربوس پہ سر نہوڑا کے
علی اکبر نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے　　گر ہو ارشاد تو مہماں کو بچاؤں جا کے
خادم حضرت زہراؑ و علی گرتا ہے
خاک پر اب وہ سعید ازلی گرتا ہے

شاہ رونے لگے سنتے ہی مہماں کی خبر　　ہوگئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
علی اکبر سے کہا تم ابھی ٹھہرو دل بر　　حر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نور نظر

کس سے اس وقت کہوں میں جو قلق مجھ پر ہے
لاش اٹھاؤں گا کہ مہمان کا حق مجھ پر ہے

نیم وا چشم سے حر نے رخ مولیٰ دیکھا   زیر سر زانوئے شبیر کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرف عالم بالا دیکھا   شہ نے فرمایا کہ اے حر جری کیا دیکھا
عرض کی حسن رخ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

حضرت عون و محمد کی جنگ و شہادت

مرزا دبیر (جب شمر حضرت عون و محمد کو بہکانے کے لیے انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ علم آپ کا حق تھا اور حضرت عباس کو ملا اور دو علم بھیج کر حضرت حسین سے الگ ہونے کی ترغیب دیتا ہے تو وہ اس کو ٹھکرا کر جواب دیتے ہیں۔ اس موقعہ کے تین بند پیش کیے جاتے ہیں۔)

نعرہ کیا علی کے نواسوں نے یک بیک   بس بس زیادہ منہ سے نہ واہیات بک
چپ نابکار چپ سرک او بے ادب سرک   تیرے فریب و مکر سے اب کانپ اٹھے فلک
بہکا انہیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
ظالم یہ ان سے کہہ جو تجھے جانتے نہ ہوں

لایا ہے دو علم بھی تو مکار ہے بڑا   سیدھی تو ہے یہ بات عقیدے میں بل پڑا
پیغمبری علم سے نہ ذہن غبی لڑا   سدرہ ہے اس کے سامنے اک پاؤں سے کھڑا
رتبہ ترے نشانوں کا ایسا ہوا بھی ہے
جعفر نے اور حمزہ نے ان کو چھوا بھی ہے

اس بار کے اٹھانے کو طاقت بھی چاہیے   طاقت بغیر حسن لیاقت بھی چاہیے

حامل کو اس، علم کی رفاقت بھی چاہیے دل کو وفا زباں کو صداقت بھی چاہیے
ایسا ہے منتظم کوئی تیرے قیاس میں
لاکھوں سے جو لڑائے بہتر کو پیاس میں

جنگ

نقارے پر جو چوب پڑی صاف اٹھی یہ دھوم دوں دوں عمر کمینہ کمینہ یزید شوم
یاں شوق حرب و ضرب کا دل پر ہوا ہجوم بڑھتے ہی تازیوں کے ہوئے گرد شام و روم
تھے دلدل و براق کہ دو راہوار تھے
دو نیمچے جو مل کے چلے ذوالفقار تھے

چمکا وہیں کو نیمچۂ خون نامور سوئے یسار تیغ محمد ظفر اثر
بجلی سیاہ چیز پہ گرتی ہے بیشتر تیغیں گریں سپاہ کے بخت سیاہ پر
کیسی کڑک کڑک کے یہ دو بجلیاں گریں
پر بخت خفتہ یہ بھی نہ سمجھے کہاں گریں

آئے تھے دو گروہ ادھر سے جو بہر جنگ نکلے قضا کی لہر میں ان میں سے دو نہنگ
شانے پہ گرز گاؤ سر اور زیر ران زرنگ سبطین شیر حق کے حضور آئے بید رنگ
یاں ان کے واسطے تھا بجز انحطاط کیا
عرش علیٰ کے آگے زمیں کی بساط کیا

منہ دیکھ کر محمد عالی مقام کا بولے یہ عون معرکہ ہے دھوم دھام کا
کی عرض اس نے شکر خدائے انام کا وہ آپ کا شکار ہے اور یہ غلام کا
لو ہاشمی و پـــنجتنـی رن پہ چڑھتے ہیں
دو نیمچے غرور کی گردن پہ چڑھتے ہیں

ناگاہ تیرہ بختوں نے کی ابتدائے حرب　　سرگرم جنگ یاں ہوئے شمسین شرق و غرب
دونوں کے مغز سر سے کیا نیچوں کو چرب　　اک خیرہ سر نے عون کے سر پر لگائی ضرب
پر عون حق جو عون سر عون ہوگئی
یوں رد کیا یہ وار کہ عقل اس کی کھوگئی

شہادت

یہ سن کے مطمئن ہوئے وہ غازی و غنی　　منکا ڈھلا نہ اشک بہے وقت جانکنی
لو کان کی مڑی نہ پھری منہ پہ مردنی　　پتھرانا کیسا آنکھ میں دونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے
رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مسکراتے تھے

پھر اپنے خوں میں کلمے کی انگلی کو کر کے تر　　کچھ لکھ کے دست چپ کی ہتھیلی پہ کی نظر
کیا دیکھتی ہیں حضرت زینب جھکا کے سر　　لکھا ہے اسم اقدس شبیر نامور
دیکھا کیے حسین کا نام اور مر گئے
آئی ندا کہ خاتمہ الفت کا کر گئے

پیٹے عمامہ پھینک کے لاشوں پہ شاہ دیں　　بیویوں کے لوٹنے سے لرز نے لگی زمیں
اکبر نے در پہ خیمہ کے ٹکرائی یوں جبیں　　دوڑے سروں کو کھول کے اصحاب خوش یقیں
اکبر پکارے عون و محمد گزر گئے
ہمشیر زادے قبلہ و کعبہ کے مر گئے

میر انیس[1]

(اس مرثیہ میں حضرت عون و محمد اور علم کے تعلق کو دوسرے انداز سے نظم کیا گیا ہے مگر

1　مراثی انیس جلد اول نول کشور ساتواں ایڈیشن
مطلع۔　جب زلف کو کھولے ہوئے لیلیٰ شب آئی

ذکر ہے)

اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار　　بچو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی زنہار
دیکھو ابھی تم دونوں سے ہوجاؤں گی بیزار　　کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار
کیا دخل تمہیں امر میں سلطان امم کے
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے

کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے　　تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
استادہ ہو جاکر عقب شاہ ادب سے　　عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے شب سے
اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علی کی

دو روز سے بھائی پہ مرے ظلم وستم ہے　　تم فکر علم میں ہو مجھے سخت الم ہے
چھوٹے سے ہیں قدسن بھی تمہارا ابھی کم ہے　　کھیل اس کو نہ سمجھو یہ محمد کا علم ہے
ہرگز نہ ابھی کچھ شہ ذیجاہ سے کہنا
کہنا بھی تو رخصت کے لیے شاہ سے کہنا

مانا کہ پہونچتا ہے تمہیں منصب جعفر　　آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر
چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر　　عاشق کا تو عاشق برادر کا برادر
پکڑوں گی گلہ گر کبھی اسلوب کروگے
عباس سے کیا تم مجھے محجوب کروگے

اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ　　اجلال حسن شوکت شبیر دکھاؤ
جعفر کی طرح جوہر شمشیر دکھاؤ　　تن تن کے ید اللہ کی تصویر دکھاؤ
خورشید امامت سے قرابت میں قریں ہو
تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جنگ

ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکر سفاک　　تا چرخ گیا غلغلہ کوس غضبناک
فریاد سے قرنا کی ہلا گنبد افلاک　　تھرا گیا آواز دہل سے کرۂ خاک
نوبت تھی تو بس قتل امام مدنی کی
صاف آتی تھی تاشوں سے صدا سینہ زنی کی

جس دم یہ سنی قبلۂ کونین کی گفتار　　جانباز بڑھے فوج سے چلنے لگی تلوار
تھے پیاسوں کے حملے غضب حضرت قہار　　چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے تلوار
کون آنکھ ملا سکتا تھا شیروں سے عرب کے
جب کرتے تھے نعرے قدم اٹھ جاتے تھے سب کے

لشکر میں تلاطم تھا غضب چلتی تھی تلوار　　بیتاب تھے یاں زینب ناشاد کے دلدار
منہ دیکھ کے حضرت کا یہی کہتے تھے ہر بار　　ہم جائیں بعد ان کے سوئے لشکر کفار
جی جائیں جو مولا ہمیں مرنے کی رضا میں
ایسا نہ ہو قاسم کو حضور اذن وغا دیں

ان چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے　　تھیں کہنیاں پہونچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
مثل اپنی جمائے تھے جو بے مثل رسالے　　تھے جائزہ ان سب کا یہی دیکھنے والے
ناز اپنے ہنر پر تھا شجاعان عرب کو
نیزوں کو قلم کرکے ندارد کیا سب کو

دو لاکھ کو دونوں نے کیا تھا تہہ و بالا　　تیغ ایک کی چلتی تھی تو اک بھائی کا بھالا
اک بڑھ گیا گر ایک نے گھوڑے کو نکالا　　دم اس نے لیا اس نے لڑائی کو سنبھالا

یکجا فرس تیز قدم سفر کو گئے دونوں
جب بھیڑ پڑی کچھ تو بہم ہو گئے دونوں

یہ کہہ کے لگے ہچکیاں لینے جو وہ پیارے　　بس موت کے آثار نمایاں ہوئے سارے
سر پیٹ کے ہاتھوں سے یہ شبیر پکارے　　ماموں سے بچھڑتے ہو میں قربان تمہارے
پھر کی نہ کوئی بات سے اور مر گئے دونوں
آنسو تھے رواں آنکھوں ہو گئے دونوں

جناب حضرت قاسم کی جنگ و شہادت

مرزا دبیر

رن میں باندھے ہوئے سہرے کو جو آئے قاسم　　تھے کفن بیاہ کے جوڑے کو بنائے قاسم
فوج اعدا ہوئی مصروف ثنائے قاسم　　واہ کس شان سے تشریف ہیں لائے قاسم
اک براتی کو بھی ہمراہ نہیں لائے ہیں
لشکر حسن جلو میں وہ لیے آئے ہیں

کہہ کے یہ سہرے کی لڑیوں کو لپیٹا اکبار　　تیغ کو کھینچ کے حملہ کیا سوئے کفار
صورت برق شرر بار جو چمکی تلوار　　ہوگئیں خاک سیہ جل کے صف بدکردار
منہ سوئے خیمہ جو نوشاہ پھرا دیتے تھے
بارک اللہ کی شبیر صدا دیتے تھے

مرحبا کہتے تھے جس وقت امام ابن امام　　جھک کے تب ابن حسن کرتے تھے عمو کو سلام
اور لب خشک دکھا کر یہی کرتے تھے کلام　　اے چچا پیاس کیے دیتی ہے قاسم کو تمام
شاہ کہتے تھے کہ ممکن نہیں جانی پانی
آج سب خورد و کلاں کرتے ہیں پانی پانی

ناگہاں مرگ نے مجرا یتیے قاسم کو کیا   پھل ملا باغ شہادت سے اسے نیزے کا
لشکر شام میں اس دم یہ ہوا غل بر پا   رانڈ دکھیارن بیوہ کا پسر قتل ہوا
ہیں حسن بھائی اڑھاتے تھے چادر پیارے
کس طرح دیکھ سکیں تجھکو کھلے سر پیارے

چشم خونبار کو نوشاہ نے اس دم کھولا   قدم سرور کونین پہ رگڑا ماتھا
پھر نشاں نعلوں کے دکھلا کے چچا سے یہ کہا   آپ اس جسم کا لے لیتے تھے اکثر بوسا
تیر سے پہلے یہ تن خانۂ زنبور کیا
گھوڑوں کی ٹاپوں سے پھر سارا بدن چور کیا

سن کے یہ گلشن جنت کو سدھارے نوشاہ   لاش کو لے کے چلے خیمے کو شاہ ذی جاہ
تھا در خیمہ پہ فرزند حسن عبداللہ   اس نے چلا کے کہا ماں سے بصد نالہ و آہ
عرش پہ دادی کے رونے کی صدا جاتی ہے
رن سے لوٹی ہوئی قاسم کی برات آتی ہے

میر انیس [1]

جب ہوئے عازم گلگشتِ شہادت قاسم   جھک کے مجرا کیا شہ کو ہوئے رخصت قاسم
چڑھ کے تازی پہ بصد شوکت وصولت قاسم   فوج اعدا پہ چلے شیر کی صورت قاسم
غل پڑا جنگ کو فرزند حسن آتا ہے
لاکھ سے لڑنے کو اک تشنہ دہن آتا ہے

سب پکارے بخدا قدرت یزداں ہے یہ   فلک عزو شرف کا مہ تاباں ہے یہ

---

۱   مراثی انیس جلد دوم مطبع نول کشور پریس، آٹھواں ایڈیشن، نومبر ۱۹۵۸ء ص ۲۰۵
مطلع   جب ہوئے عازم گلگشت شہادت قاسم

زینت لشکر ابن شہ مرداں ہے یہ   چمن فاطمہ کا سرو خراماں ہے یہ
رانڈ اب دختر سلطان زمن ہو وے گی
بے چراغ اب لحد پاک حسن ہو وے گی

کہہ کے یہ طیش میں قاسم نے علم کی تلوار   جا ملے فوج سے گھوڑے کو ڈپٹ کر اکبار
چمکی وہ برق شرر بار بفرق کفار   سر سے تن تن سے سر کا ہوا اک انبار
دم میں وہ تیغ ہزاروں کو فنا کرتی تھی
رشک ہر وار پہ شمشیر قضا کرتی تھی

کٹ کے چہرے پہ ہر اک پیچ عمامے کا گرا   خون میں تر ہوگیا مقیش کا سہرا سارا
جوں کتاں ٹکڑے ہوئی تیغوں سے اس مہ کی قبا   تن جدا زخمی ہوا کنگنا بندھا ہاتھ جدا
دیر تک ٹھہرے رہے خانۂ زیں پر قاسم
برچھی کھا کر گرے گھوڑے سے زمیں پر قاسم

عرض کی نوشاہ نے کھول کے چشم پر نور   میں سرفراز ہوا لائے جو تشریف حضور
اٹھے تعظیم کو کس طرح ہے بندہ مجبور   گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہے سارا بدن چکنا چور
پہلے تو جسم مرا تیروں سے غربال کیا
گر پڑا خاک پہ گھوڑے سے تو پامال کیا

یہ سخن سنتے ہی نوشاہ نے لی خلد کی راہ   لاش کو ڈال کے گھوڑے پہ چلے خیمے کو شاہ
در خیمہ پہ جو ہیں پہونچے بہ احوال تباہ   کہا چلا کے یہ زینب سے بصد نالہ و آہ
لاش گھوڑے سے اتروانے کو آؤ بہنا
فاطمہ رانڈ کو رنڈ سالہ پہناؤ بہنا

حضرت عباسؑ کی جنگ و شہادت

مرزا دبیر

عباسؑ پکارے کہ بھلا مشک تو لاؤ　　تم ہاتھ سے اپنے ہمیں سقا تو بناؤ
اور زیر فلک ننھا سا سجادہ بچھاؤ　　سرکھول کے قبلہ کی طرف ہاتھ اٹھاؤ
حق چاہے تو پتھر بھی ہو جاتے ہیں پانی
بی بی کے لیے نہر سے ہم لاتے ہیں پانی

اسوار ہوا جلد علمدار گرامی　　اکبر نے رکاب اور عناں شاہ نے تھامی
اقبال دو عالم نے دیا خط غلامی　　دے چرخ بریں جھک کے زمیں اٹھ کے سلامی
کیوں دامن دولت نہ کہوں دامن زیں کو
دامن میں لیا زین نے اس دولت دیں کو

جب باگ ہلی آمد محشر نظر آئی　　لشکر میں قیامت ادھر آئی اِدھر آئی
چمکا جو علم چار طرف یہ خبر آئی　　لو کاہکشاں آج فلک سے اتر آئی
جب ہاتھ میں تلوار کا پر تو نظر آیا
خورشید کے پنجے میں مہ نو نظر آیا

جب اٹھ کے گری تیغ صف دشمن دیں پر　　سرکٹ کے ہوا ہوگئے آئے نہ زمیں پر
دہشت سے گرے سر فلک ہفت جبیں پر　　پانی ہوا بجلی کا جگر چرخ بریں پر
باراں نے کہا اڑ تا ہے خوں فوج لعیں سے
سر مردوں کے گردوں پہ برستے ہیں زمیں سے

تلوار کی بجلی خس و خاشاک سے نکلی　　ڈوبی جو زمیں میں تو یہ افلاک سے نکلی

تحسین دل لشکر سفاک سے نکلی مغفر میں چھپی سینۂ ناپاک سے نکلی
پرتو جو پڑا رنگ اڑایا سپروں کا
ہم رنگ سپر چل کے ہوا خون جگروں کا

یہ کہہ کے تبسم کیا پھر لب نہ ہلایا سینہ میں رکی سانس جبیں پر عرق آیا
آنکھوں کی سیاہی کو سپیدی نے چھپایا منکا جو ڈھلا سر قدم شہ پہ جھکایا
غش ہوگئے شبیر قضا کر گئے عباس
تھرا کے بدن رہ گیا اور مر گئے عباس

میر انیس[1]

جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے مشکیزہ دھرا دوش پہ اس بحر کرم نے
روکر یہ برادر سے کہا شاہ امم نے بھائی تمہیں بیٹوں کی طرح پالا ہے ہم نے
مرنے کو نہ جاؤ کہ نشانی ہو علی کی
توڑو نہ ضعیفی میں کمر سبط نبی کی

تڑپا کیے بسمل کی طرح سید ابرار آداب بجا لا کے چلا رن کو علم دار
غل پڑ گیا ہاں لشکریو نہر سے ہشیار آپہونچا وغا کو خلف حیدر کرار
دیکھے کوئی اس صاحب شمشیر کی آمد
ہوتی ہے ترائی میں یونہی شیر کی آمد

کہتا تھا کوئی رعب علمدار تو دیکھو روشن ہے زمیں جلوۂ رخسار تو دیکھو
بجلی ہے تجمل شوخی رہوار تو دیکھو شان علم سید ابرار تو دیکھو

---

1 مرثیہ میر انیس جلد پنجم ص ۱۱۸ مطبع جعفری نخاس لکھنو بار اول ۱۳۱۳ھ
مطلع جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے

پنجے سے تجلی ید بیضا کی عیاں ہے
دامان علم آیۂ رحمت کا نشاں ہے

فرما کے یہ غازی نے کیا گھوڑے کو کوڑا — جوں شیر نظر ٹوٹ پڑا فوج پہ گھوڑا
ماری جسے تلوار نہ جیتا اسے چھوڑا — پامال تھی جس صف کی طرف باگ کو موڑا
تھے کتنے لعیں خوف سے بیہوش زمیں پر
مچھلی سے تڑپتے تھے زرہ پوش زمیں پر

نزدیک جو تیغ آئی تو سرتن سے ہوئے دور — زین گھوڑوں سے خالی تھی زمیں لاشوں سے معمور
گھوڑوں سے زمیں پر جو گرے پڑتے تھے مغرور — چار آئینہ ہوجاتے تھے شیشوں کی طرح چور
تھیں تیغ سے ڈھالیں بھی جو پرزے کہہ و مہ کی
کڑیاں بھی بکھر جاتی ہیں کٹ کٹ کے زرہ کی

کہہ کے یہ سخن مر گئے عباس خوش اطوار — چلاتے رہے شاہ علمدار علمدار
جس درد سے عباس کو روئے شہ ابرار — لکھنے کی نہیں تاب انیس جگر افگار
دن رات دعا ہے یہی در گاہ خدا میں
اک قبر کی جا پاؤں جو ار شہدا میں

جنگ و شہادت حضرت علی اکبرؑ

مرزا دبیر

اکبر جو ہوئے جلوہ فگن دامن زیں پر — پھر زین سے آوازہ کسا مہر مبیں پر
توسن نے قدم ناز سے رکھا نہ زمیں پر — سرعت نے کہا سیر کو چل عرش بریں پر
یکتا تھے دو رہوار جہاں اور جناں میں
جنت میں براق نبوی اور یہ جہاں میں

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال — نک سکھ سے درست اور جواں بخت جواں سال
جادو تھا فدا آنکھ پہ اک معجزہ تھی چال — خورشید کے سم برق کی دم سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا
سرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

یہ تیغ گری ہر سربد خو پہ تڑپ کر — روکو، کیا بے آبرو ابرو پہ تڑپ کر
دل سینوں میں تڑپا کیے پہلو پہ تڑپ کر — بجلی کی طرح پھر گئی بازو پہ تڑپ کر
عامل بھی نہ آسیب کو یوں سر سے اتارے
جس طرح سر اس تیغ نے پیکر سے اتارے

قدموں سے چلی تو سر ناپاک پہ چمکی — ناپاک کا سرکاٹ کے افلاک پہ چمکی
افلاک سے آکر کرۂ خاک پہ چمکی — گہہ سنبلہ پر گہہ خس و خاشاک پہ چمکی
تھی تیز کہ اتری تھی ابھی چرخ پہ چڑھ کر
مچھلی کے تلے گاؤ زمیں چھپ گئی بڑھ کر

اتنے میں کیا اکبر غازی نے تبسم — اور شیر کے نعرہ سے ہوا شور تلاطم

بانو نے کہا یوسف شبیر ہوا گم　　کیوں شیر خدا لے چلے بیٹے کو مرے تم
اس کو کہ جلی کی تو نہ فریاد کو پہونچے
دم توڑنے میں پوتے کی امداد کو پہونچے

پھر لاش سے لپٹی کہ میں قربان علی اکبر　　رخصت نہ ہوئے ہوگئے بے جان علی اکبر
اٹھارہ برس کے ہوئے مہمان علی اکبر　　دنیا سے اٹھے آج پر ارمان علی اکبر
جی کھول کے اب روؤں جو پیارے کی رضا ہو
ڈرتی ہوں کہیں روح تمہاری نہ خفا ہو

میر انیس[1]

میداں میں یہ غل تھا کہ صدا شاہ کی آئی　　اب دلبر زہرا کا بھتیجا ہے نہ بھائی
باقی تھا یہ بیٹا تو ہوئی اس سے جدائی　　یارو مجھے دیتا نہیں آنکھوں سے دکھائی
ہمشکل پیمبر ہے یہ دل بند ہے میرا
اٹھارہ برس کا یہی فرزند ہے میرا

یہ ذکر تھا رن میں جو قیامت ہوئی برپا　　ہر سمت سے اکبر پہ کیا فوج نے نرغا
تلواریں چمکنے لگیں مینہ تیروں کا برسا　　اکبر نے بھی لے نام علی تیغ کو کھینچا
غل تھا کہ کبھی ایسی لڑائی نہیں دیکھی
یہ تیغ کی برش یہ صفائی نہیں دیکھی

لاکھوں میں عجب شان سے لڑتا تھا وہ صفدر　　دو چار ہی حملوں میں صفیں ہوگئیں بے سر
گھوڑے سے اتر لاشوں میں چھپتے تھے ستمگر　　اک برق گری جس پہ پڑی ضربت اکبر

۱　مرثیہ میر انیس جلد چہارم ص ۱۴۱ مطلع: حضرت محبوب خدا تھے علی اکبر

بیٹے کی صدا جس گھڑی سن پاتے تھے شبیر
سجدے کے لیے خاک پہ جھک جاتے تھے شبیر

تا دیر تو سنتے رہے تلواروں کی جھنکار   تکتے تھے پر اکبر نہ نظر آتا تھا زنہار
لشکر میں ستمگاروں کے یہ غل ہوا اکبار   برچھی علی اکبر کے کلیجے سے ہوئی پار
لو سیّد مظلوم کے دلدار کو مارا
مارا اسے کیا احمد مختارؐ کو مارا

آواز پسر سنتے ہی دوڑے شہ ذیشاں   دیکھا کہ ہے فرزند جواں خون میں غلطاں
لاشے سے لپٹ کر کہا بابا ترے قرباں   کیا حال ہے کھایا ہے کہاں زخم مری جاں
رخ زرد ہے سر تا بہ قدم خوں میں بھرے ہو
مجھ سے تو کہو چھاتی پہ کیوں ہاتھ دھرے ہو

یہ کہتے ہی تیور علی اکبر نے پھرائے   ہمراہ دم سرد کے آنسو نکل آئے
سر پیٹ کے شبیر سخن لب پہ یہ لائے   آغوش سے بابا کے چلے بانو کے جائے
کیا بولتے دنیا سے سفر کر گئے اکبر
سوکھی ہوئی دکھلا کے زباں مر گئے اکبر

شہادت علی اصغر

مرزا دبیر

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے　　بچے کی نبض دیکھ کر ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی ملنے کی آس ہے　　پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسین کی
پتلی پھری ہے آج مرے نور عین کی

ہر دم سکینہ سامنے بھائی کے آتی ہے　　ہاتھوں میں لے کے ان کے کھلونے دکھاتی ہے
سہلا کے ننھے تلوے یہ رو کر سناتی ہے　　روٹھو نہ بھائی جان سکینہ مناتی ہے
کڑھتی ہیں اماں آنکھ کو تم کھولتے نہیں
اللہ ہم پکارتے ہیں بولتے نہیں

بانو پکاری ان پہ تو سب رحم کھائیں گے　　بچہ سمجھ کے پانی بھی دشمن پلائیں گے
شہ بولے جو نصیب میں ہوگا وہ پائیں گے　　پہلے انھیں کے آگے انھیں لے کے جائیں گے
خاطر سے ان کی پانی کے سائل بھی ہوئیں گے
انجام کار ہے کہ ہم ان کو روئیں گے

اصغر کو لے چلے جو شہنشاہ بحر و بر　　مڑ مڑ کے اس نے کنبہ پہ حسرت سے کی نظر
ننھا سا ہاتھ ماتھے پہ رکھا جھکا کے سر　　بانو پکاری پھیر کے منہ کو ادھر ادھر
لوگو مرا کلیجہ نکلتا ہے تھام لو
اصغر سدھارتے ہیں جہاں سے سلام لو

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ　　لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا

نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا　　منت بھی گر کروں تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں　　کی حرملہ نے شانہ سے دو ٹانگ کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیر جاں ستاں　　جوڑا کماں میں تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیر نے

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا　　سوکھے گلے میں خون بھرا دم اٹک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا　　ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

میر انیس[1]

جب رن میں حسین اصغر بے شیر کو لائے　　لخت جگر بانوئے دل گیر کو لائے
جلادوں میں اس صاحب توقیر کو لائے　　ہاتھوں پہ دھرے چاند سی تصویر کو لائے
غل پڑ گیا دیکھو شہ والا کے پسر کو
خورشید نے ہاتھوں پہ اٹھایا ہے قمر کو

روشن ہے وہ گل شمع تجلی کی ہے تصویر　　سو اس پہ لگے تیر یہ قسمت کی ہے تحریر
دو روز سے پانی نہ مقدر میں ہے نہ شیر　　اور کنٹھ جو بیٹھا ہے تو ہے موت گلو گیر

1　مرثیہ میر انیس جلد اول ص ۳۸۱ نولکشور ساتواں ایڈیشن اپریل ۱۹۳۷ء
مطلع　　جب رن میں حسین اصغر بے شیر کو لائے!

اب دودھ بھی اور طوق بھی منت کا بڑھے گا
فریاد ہے نیزے پہ یہ سرکٹ کے چڑھے گا

فرماتے ہیں اے غنچہ دہن اے مرے پیاسے بتلاؤ مجھے کیا میں کہوں اہل جفا سے
گویا نہیں اس وقت زباں فرطِ حیا سے کچھ میں نے جو مانگا ہے تو مانگا ہے خدا سے
بے پانی کے مانگے عرق شام میں تر ہوں
مختار جو کوثر کا ہے میں اس کا پسر ہوں

مجھ پر تو ہے بچپن سے نوازش مرے رب کی حاجت متعلق ہے مری ذات سے سب کی
منت کش ادنیٰ ہوں یہ جا گہ ہے عجب کی میں نے تو کسی سے نہیں کچھ چیز طلب کی
ادنیٰ سے سخی مانگے یہ دستور نہیں ہے
اب صبر کرو نہر لبن دور نہیں ہے

یہ کہہ کے پکارا اسد اللہ کا جانی کچھ کہتا ہوں یا رو علی اصغر کی زبانی
اب اٹھ نہیں سکتی تعب تشنہ دہانی کہتے ہیں کہ اک بوند پلادو ہمیں پانی
سب خلق پہ احسان حسین ابن علی ہیں
تم لوگ مسلماں ہو تو ہم آل نبی ہیں

شبیر نے اس چاند کو ہاتھوں پہ اٹھایا چلّے سے کماندار نے واں تیر ملایا
خم ہوکے اسے مثل کماں شہ نے بچایا مانند اجل ناوک ظلم و ستم آیا
شبیر چھپاتے رہے نازوں سے پلے کو
بازو پہ لگا توڑ کے ننھے سے گلے کو

فوارہ چھٹا حلق سے بچے کے لہو کا سب خون میں تر ہوگیا ننھا سا شلو کا
دم آکے رکا حلق میں اس تشنہ گلو کا خوں منہ سے اگلنے لگا وہ دودھ کا بھوکا

ننھی سی وہ ٹوپی بھی گری جاتی تھی سر سے
جب آتی تھی ہچکی تو لپٹتا تھا پدر سے

شہادت امام حسینؑ

مرزا دبیر

دکھلاؤں اب مرقع گلزار کربلا — حصار کو بتاؤں میں زوار کربلا
بسمل پڑے ہیں یوسف بازار کربلا — تنہا کھڑا ہے قافلہ سالار کربلا
ہمدم کوئی بجز دم تیغ دو دوم نہیں
ہے ہے جلو میں تم نہیں افسوس ہم نہیں

بیہوش ہیں سمند کی گردن پہ سر جھکائے — جو چاہے تیر مارے جو چاہے سناں لگائے
زینب تڑپ تڑپ کے نکلتی ہے گھر سے ہائے — تم سا کوئی محب نہیں جو رو کنے کو جائے
ضرب اک طرف کو سایے سے اس کے مفر نہ تھا
پرچھائیں بھی جو پڑ گئی گردن پہ سر نہ تھا

اس سے الجھ گئی کبھی اس سے الجھ گئی — ترش نئی صفائی نئی کج رخی نئی
اک سر سے لگ چلی تو الگ سر ہوئے کئی — گہہ زرد گہہ سفید ہوا چرخ سرمئی
بھاگے ہوؤں کو ضرب پہ لاتی تھی پھیر کے
دو کرتی تھی اڑی ہوئی رنگت کو گھیر کے

سب تھم گئے مگر نہ تھما شمر بدشیم — سر پیٹنے کی جا ہے دھرا کس جگہ قدم
سینہ دبا تو اور بھی تڑپے شہ امم — شور فغاں سنا اسی حالت میں دم بدم

قاتل سے پوچھا دیکھ کدھر غل یہ ہوتا ہے
ہے ہے کوئی حسین کہہ کے رن میں روتا ہے

وہ بولا کوئی ہوگا میں دیکھوں بھلا کدھر   اب تیغ پر نگاہ ہے شہ رگ پہ ہے نظر
ہاں جب سوار ہونے لگا تھا میں سینے پر   سیدانی ایک خیمے سے نکلی تھی ننگے سر
اس دم ہماری فوج میں تو عید ہوتی ہے
مجھ کو یقین ہے یہ وہی بی بی روتی ہے

اے شمر پاس بھائی کے آؤں جو تو کہے   زخموں سے جلتی ریت چھڑاؤں جو تو کہے
چادر بدن کے نیچے بچھاؤں جو تو کہے   بے کل ہے سر میں آ کے اٹھاؤں جو تو کہے
پانی تو یاں ملے گا نہ زہرا کی جائی کو
آنسو چھڑک کے ہوش میں لاؤں گی بھائی کو

اے شمر میں گلے سے لگالوں تو ذبح کر   کچھ درد اپنے دل کا سنالوں تو ذبح کر
سید کو قبلہ رو میں لٹالوں تو ذبح کر   بھائی سے مل کے خیمے میں جالوں تو ذبح کر
پانی نہ بھوکے پیاسے کو اے بد خصال دے
ہے وقت ذبح آنکھوں پہ پردہ تو ڈال دے

یہ کہتے کہتے ست ہوئی دم الٹ گیا   سر پیٹتی یہ رہ گئی سر شہ کا کٹ گیا
یوں لاش پہ گری کہ جگر سب کا پھٹ گیا   باہیں گلے میں ڈال کے لاشہ لپٹ گیا
ماں کی طرح تھی عاشق شاہ زمن بہن
یہ بھائی بھائی کہتی تھی لاشہ بہن بہن

میر انیس[1]

کس سے ہوبیاں تیزی تیغ شہ عالم ہنگام رقم حرف کٹے جاتے ہیں باہم
کہیے اسے برق غضب خالق اکرم خونریز و جفا کار و سر انداز شرر دم
جس غول پہ بجلی سی وہ جا پڑتی تھی تھم کے
سر گرتے تھے مانند تگرگ اہل ستم کے

کیا تیغ تھی کیا ضرب تھی العظمۃ للہ ہاں کوہ جو ہووے تو کٹے مثل پر کاہ
دم لینے نہ دیتے تھے کسی کو شہ ذیجاہ دوزخ کی طرف رن سے چلے جاتے تھے گمراہ
سو جاں سے فدا ضربت دست شہ دیں پر
کتنے ہی تڑپتے نظر آتے تھے زمیں پر

رو رو کے ابھی کہتے تھے یہ سبط پیمبر جو گھیر لیا فوج کو ستم گار نے آکر
تیر ایسے پڑے چھد گیا سارا تن انور سینے پہ پڑیں برچھیاں اور پہلو پہ خنجر
ٹکڑے ہوا تیغوں سے عمامہ شہ دیں کا
آلودۂ خوں ہوگیا جامہ شہ دیں کا

زخمی جو بشدت ہوا زہرا کا وہ جانی طاقت تو گھٹی اور بڑھی تشنہ دہانی
تلواریں لگاتے تھے کھڑے ظلم کے بانی ہونٹوں پہ زباں پھیر کے شہ کہتے تھے پانی
کرتا تھا کوئی رحم نہ اس تشنہ دہن پر
پانی کے عوض تیر برستے تھے بدن پر

---

۱ مرثیہ میر انیس جلد سوم ص ۲۰۷ مطبع نول کشور پانچواں ایڈیشن اگست ۱۹۳۹ء
مطلع جب خیمے میں رخصت کو شہ بحر و بر آئے

اتنے میں چھدا تیر سے حلقِ شہ ابرار پیکان ستم گردن انور سے ہوا پار
حلقوم سے کھینچا جو نہیں وہ ناوک خونخوار فوارے کے مانند چھٹی خون کی اک دھار
صدمہ تھا عجب دوش محمد کے مکیں پر
گرتا تھا گریباں سے لہو دامن زیں پر

چلاتی تھی ڈیوڑھی پہ کھڑی خواہر شبیر اس بیکسی، مظلومی کے صدقے ہو یہ ہمشیر
دم توڑتے ہو پانی پلاتے نہیں بے پیر اب رن میں نکل آئی ہوں میں بیکس و دلگیر
تلواریں پڑیں گی تو نہ گھبراؤں گی بھائی
میں آپ کو خیمہ میں اٹھا لاؤں گی بھائی

ریتی پہ تڑپتے ہو تمھیں کون اٹھائے ہے ہے کسے بھیجوں جو لعینوں سے بچائے
ہے ہے کہوں کس سے کہ تمھیں پانی پلائے ہے ہے کسے ماں جائی ترا حال دکھائے
یا حیدر صفدر تمھیں امداد کو پہونچو
بھائی کا گلا کٹتا ہے فریاد کو پہونچو

لشکر سے بڑھا شمر لعین کھینچ کے خنجر فریاد ہے چھاتی پہ چڑھا شہ کی ستمگر
زانو سے دبا سینۂ زخمی جو سراسر اسوقت لہو منہ سے اگلنے لگے سرور
خنجر کو رکھا شہ کے گلے پر جو لعیں نے
تکبیر کہی کھول کے آنکھیں شہ دیں نے

ظالم کو زباں سوکھی دکھائی کئی باری پانی نہ دیا ذبح لگا کرنے وہ ناری
جب تک کہ نہ گردن کی رگیں کٹ چکیں ساری تکبیر رہی شہ کے لب خشک پہ جاری
جس وقت جدا ہوگیا سر تیغ سے کٹ کر
خم ہوگیا قبلے کی طرف جسم الٹ کر

حالات و واقعات زندان شام

مرزا دبیر

لے کے لاشے کی بلائیں کہوں حال زنداں　　ہند وہاں آئی تھی بھیا میں چلی آئی یہاں[1]
تھا یہی خوف کہ گھبرا کے کرے گی وہ بیاں　　اے پیمبر کی نواسی تو اسیروں میں کہاں
قابل طوق ہوئی لائق زنجیر ہوئی
کیا گنہ تجھ سے ہوا کیا تری تقصیر ہوئی

سب ستم دیکھے یہ اندوہ اٹھائے نہ گئے　　ہند کو خاک بھرے بال دکھائے نہ گئے
قید میں نام بزرگوں کے بتائے نہ گئے　　دربدر پھرنے کے احوال سنائے نہ گئے
ملتی کیا ہند سے میں خاک عزا تھی سر پر
نہ تو تم تھے مرے سر پر نہ ردا تھی سر پر

میں ہوں بیخود مرے کہنے پہ نہ جاؤ واری　　آنے جانے کا کہیں ذکر نہ لاؤ واری
پھوپھی کہہ کہہ کے نہ اب شور مچاؤ واری　　ہند آتی ہے مری گود میں آؤ واری
غیر ملنے کو جو آتا ہے تو چپ رہتے ہیں
پھوپھی کو ایسی جگہ کنبہ موئی کہتے ہیں

ماں کو وہ پوچھے تو آوارہ وطن بتلانا　　نام خواہر کا فقط رانڈ دولہن بتلانا
بھائی کو قیدی زنجیر و رسن بتلانا　　باپ کو سیّد بے گور و کفن بتلانا
دیکھو غیرت سے میں ہوجاؤں گی پانی پانی
ہند کے آگے نہ تم مانگیو جانی پانی

1　حضرت زینب کی زبانی اس کو ادا کیا گیا ہے۔

رو کے وہ بولی کہ اچھا پھوپھی صاحب اچھا   میں بھی اکبر کی بہن ہوں مجھے غیرت نہیں کیا
جان فاقے سے نکل جائے تو مانگوں نہ غذا   اپنے سقے کے لیے روتی ہوں یا کسبا
پانی اس سے نہیں میں تشنہ جگر مانگوں گی
لاش بابا کی ہے بے گور و کفن مانگوں گی

میں نہیں لینے کو میوہ وہ اگر لائے گی   خاک سمجھوں گی اگر خلعت وزر لائے گی
کان دکھلاؤں گی زخمی جو گہر لائے گی   پر دعا دوں گی جو حاجت مری بر لائے گی
پوچھا زینب نے کہ کیا رو کے کہا کہدونگی
بابا صاحب کا جو سر دے گی تو لے لونگی

میر انیس[1]

ہے دختر خاتون قیامت کا عجب حال   بکھرے ہوئے ہیں دوش پہ سب گرد بھرے بال
فضہ سے یہ فرماتی ہیں وہ صاحب اقبال   لادے مجھے گر کوئی ترے پاس ہو رومال
پردہ ہو کچھ ایسا کہ نہ دیکھے مجھے آ کے
پیچھے ترے بیٹھونگی میں چہرے کو چھپا کے

وہ کہتی تھی سر پیٹ کے اور کوٹ کے چھاتی   صدقے کیا رومال یہ لونڈی ابھی لاتی
معصوم کو میں دھوپ میں یوں چھوڑ کے آتی   ہوتا تو میں اصغر کے نہ لاشے پہ اڑاتی .
گھر لٹ گیا زنداں میں سوا خاک کے کیا ہے
رومال نہ حیدر کا نہ زہرا کی ردا ہے

---

1 مرثیہ میر انیس جلد پنجم ص ۱۶۸
مطلع   ہند آتی ہے زنداں میں بڑے جاہ و حشم سے

فرماتی ہیں تب ہاتھ اٹھا کر سوئے افلاک   یارب میں ترے شیر کی ہوں دخترِ غمناک
آتی ہے خرابے میں زن حاکم سفاک   میں قیدیوں میں بیٹھی ہوں چہرے پہ ملے خاک
ہر چند کہ آغوش میں زہرا کی پلی ہوں
اس پر نہ یہ ثابت ہو کہ میں بنت علی ہوں

سمجھا کے سکینہ سے کہا سن لو میں واری   ہے گرم خبر ہند کی آتی ہے سواری
پوچھے جو مجھے کون ہے یہ ظلم کی ماری   کہیو نہ کہ زینب ہے پھوپھی جان ہماری
رشتہ شہ والا سے جتانا نہ کسی کا
قربان گئی نام بتانا نہ کسی کا

گر پوچھے کہ تقصیر تمہاری کہو کیا ہے   کس جرم پہ حاکم نے تمہیں قید کیا ہے
کہیو کہ اس احوال سے آگاہ خدا ہے   مجھ کو نہیں معلوم کہ کیا اپنی خطا ہے
گھر ظلم کے تیغوں سے ہوا صاف ہمارا
اب حشر پہ موقوف ہے انصاف ہمارا

یوں کہنے لگی بھر کے دم سرد وہ ناداں   میں حکم سے باہر نہیں اچھا پھوپھی اماں
نام آپ کا ہرگز نہ بتائے گی یہ ناداں   کھانے کی نہ طالب ہوں نہ پانی کی ہوں خواہاں
ہے دل کو قلق اور تو کیا پوچھوں گی اس سے
بچھڑے ہوئے بابا کا پتہ پوچھوں گی اس سے

شام کا دربار

مرزا دبیر

القصہ انجمن میں حرم بے نقاب آئے — پر کانپتے ہوئے صفت آفتاب آئے
بزم شراب و رقص میں عفت مآب آئے — نذر یزید کے، لیے سب شمع و شاب آئے
ہے شمر کی جفا پہ محل شور و شین کا
زینب کے آگے نذر دیا سر حسین کا

اچھلا خوشی سے تخت پہ وہ دشمن خدا — سجاد کو سنا کے کہا شمر مرحبا
کرسیِ زر حسین کے قاتل کو کی عطا — عابد کو بیٹھنے کی زمیں پر نہ دی رضا
بدمست جام پیتا تھا اور بدحواس تھا
سر شاہِ دیں کا شیشہ و ساغر کے پاس تھا

غل پڑ گیا جلال خدا سر بسر یہ ہے — سرکار ذوالجلال کے مالک کا سر یہ ہے
روشن ہے وقت اوّل فرض سحر یہ ہے — شایانِ تاجداری شمس و قمر یہ ہے
قامت ہے قتل گاہ میں سر انجمن میں ہے
شمع بتول رن میں ہے اور لوگن میں ہے

میر انیس[1]

نذریں ہاتھوں پہ لیے آتے تھے سب درباری — پڑھتے تھے تہنیت فتح کو باری باری
جمع دربار میں تھی شہر کی خلقت ساری — یاں تو تھا جشن کا غل اور ادھر تھی زاری

---

1 مرثیہ میر انیس جلد چہارم ص ۲۶۹
مطلع — دربار میں جب کٹ کے یتیموں کے سر آئے

اس طرف سے تو دف و نے کی صدا آتی تھی
اور اس سمت سے ہے ہے کی صدا آتی تھی

دم بدم تخت سے اٹھ اٹھ کے یہ کہتا تھا شریر　　قیدی کیوں جلد نہیں آتے ہیں کیا ہے تاخیر
بڑھ کے کرتے تھے خبردار یہ اس دم تقریر　　ضعف سے پاؤں کو تھم تھم کے اٹھاتے ہیں اسیر
مارے دہشت کے لہو ان کا گھٹا جاتا ہے
ہر قدم ایک ضعیفہ کو غش آجاتا ہے

ذکر یہ تھا کہ وہ قیدی سر دربار آئے　　سب پکارے کہ وہ حاکم کے گنہگار آئے
آگے روتے ہوئے سجاد دل افگار آئے　　پیچھے سر کھولے ہوئے عترت اطہار آئے
صاف خورشید سے شکلیں جو نظر آتی ہیں
آنکھیں سب ظالموں کی بند ہوئی جاتی ہیں

اہل حرم کی مدینہ واپسی

مرزا دبیر

اس حال کی میں کھینچتا ہوں مومنو تصویر　　یثرب میں ہے یوں داخلۂ عترت شبیر
ہمراہ نہیں کوئی مگر عابد دل گیر　　منہ اہل مدینہ کا ہے فق حال ہے تغیر
سر ننگے وہ سب قافلۂ آل نبی ہے
فریاد میں مانند جرس روح علی ہے

نکلا تھا مدینہ سے جو ابن شہ مرداں　　تھے ہودج و محمل میں حرم شاہ کے پنہاں
اب آئے ہیں سب آل نبی با سر عریاں　　جانے کی تو وہ شان تھی اور آنے کی یہ شاں

یہ قافلہ کیوں بیکس و ناچار نہ ہووے
شبیر سا جب قافلہ سالار نہ ہووے

انبوہ خلائق سے مدینہ میں ہے محشر در پر کوئی روتا ہے کوئی بام کے اوپر
ہے چاک گریباں کوئی اور کوئی کھلے سر گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں سب شہر کے باہر
ام سلمہ خاک پہ بیہوش پڑی ہے
دروازے پہ صغرا بھی عصا تھامے کھڑی ہے

ہیں شہر کے جو لوگ وہ ہیں خاک اڑاتے کچھ تو ہیں سر ننگے خبر لینے کو جاتے
ایک ایک قدم کی ہیں خبر لا کے سناتے ہے دھوم کہ سادات ہیں لوٹے ہوئے آتے
کہتا ہے کوئی بال غریبوں کے کھلے ہیں
کہتا ہے کوئی باغ فدک سے وہ چلے ہیں

ناگاہ صدا زینب بیکس کی یہ آئی اے اہل وطن احمد مرسل کی دہائی
لوٹی گئی پردیس میں زینب کی کمائی بھائی سے چھڑا کر مجھے تقدیر ہے لائی
فریاد کہ بے وارثی ہو آئی ہے زینب
شبیر سے ماں جائے کو کھو آئی ہے زینب

میر انیس[1]

جب حرم مقتل سرور سے وطن میں آئے اشک خوں روتے ہوئے رنج و محن میں آئے
سب سیہ پوش غم شاہ زمن میں آئے خاک اڑانے کو خزاں دیدہ چمن میں آئے

---

1 مرثیہ میر انیس جلد ششم ص ۳۹۲-۳۹۱
مطلع جب حرم مقتل سرور سے وطن میں آئے

بال تھے چہروں پہ سنبل سے پریشاں سب کے
مثلِ گل چاک تھے ماتم میں گریباں سب کے

مگر دیکھتا تھا ناقوں کے سردار مدینہ کا ہجوم　　روکے چلاتے تھے سب ہائے امام مظلوم
سرنگوں آئے تھے سجاد حزین و مغموم　　ہاتھ اٹھاکر یہ بیاں کرتی تھی ام کلثوم
دشت میں سید ابرار کو رو آئے ہم
اے مدینہ ترے سردار کو کھو آئے ہم

رن میں افتادہ ہیں سب مرد ہمارے بے سر　　بھائی مارا گیا سب ذبح ہوئے خویش وپسر
چادریں چھن گئیں قیدی ہوئے ہم خستہ جگر　　لے گئے ہم کو کنیزوں کی طرح بانیِ شر
شہر یثرب کی جو بستی تھی وہ تاراج ہوئی
آپ کی قوم کفن کے لیے محتاج ہوئی

امن میں پھانسے گئے خائف وترساں آئے　　چادریں بھی نہ رہیں با سرعریاں آئے
جمع یہاں سے گئے اور وہاں سے پریشاں آئے　　گھر لٹا قید ہوئے بے سروساماں آئے
تعزیہ دار شہ یثرب و بطحا ہم ہیں
سوگوار پسر حضرت زہرا ہم ہیں

حضرت زینب کی فریاد

دی یہ آواز کہ فریاد ہے یا خیر بشر　　کٹ گیا خنجر بیداد سے شبیر کا سر
لائی ہوں آپ کے پیارے کی شہادت کی خبر　　کیجیے اس رخت مشیک پہ ذرا اٹھ کے نظر
بھر گیا خون میں حضرت کا عمامہ نانا
ٹکڑے تیغوں سے ہوا آپ کا جامہ نانا

مندرجہ بالا مثالوں کو پیش کرتے ہوئے راقم السطور نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ ہر مثال میں شامل سب ہی بند ایک ہی مرثیہ سے لیے گئے ہوں۔ یہ نہیں کہ ایک چست یا حسب ضرورت بند ایک مرثیہ سے انتخاب کیا اور دوسرا بند دوسرے مرثیے سے۔ اس سے راقم یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو مماثلت ان دو شاعروں میں ملتی ہے وہ کہیں اور آسانی سے نہیں ملے گی اور وجہ اس کی ظاہر ہے جس کے بارے میں راقم ان مثالوں سے قبل ہی عرض کرچکا ہے اس درجہ کی مماثلت کے بعد بھی اگر ترجیح کے بارے میں سوچا جائے تو پریشانی اور الجھنوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا البتہ بعض خصوصیات ایسی ضرور ہیں جو میر انیس کے ہاں ہیں اور مرزا دبیر کے یہاں نہیں۔ اور مرزا دبیر کے ہاں ہیں تو میر انیس کے ہاں نہیں ملتیں۔

راقم نے مرزا دبیر کے کلام کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں وہ خصوصیات پیش کردی ہیں۔ یہاں مختصراً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ مرزا دبیر کے مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم وفضل میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ روایات و احادیث کو روانی کے ساتھ نظم کرتے تھے۔

۲۔ مرزا دبیر نے مستعملہ بحروں کے علاوہ بھی چار بحروں میں مرثیے کہے جن کا ذکر اس مقالہ میں پہلے ہوچکا ہے۔

۳۔ مرزا دبیر جدت مضامین کے لحاظ سے اپنے ہمعصر شعرا سے بہت آگے تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد سے لے کر آج تک جس نے بھی مرثیہ پر کام کیا اس نے مرزا دبیر کے تخلیقی ذہن کو سراہا۔ وہ مضمون ایسا اچھوتا نظم کرتے ہیں اور اس طرح سے اس کو تلاش کرتے ہیں کہ ان کے ہمعصر شعرا کا طائر وہم اتنی پرواز ہی نہیں رکھتا۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا راقم ضروری سمجھتا ہے جس کا ذکر پہلے نہیں آیا ہے۔ افضل حسین ثابت کو ''حیات دبیر'' کی اشاعت کے بعد ایک اور شہادت اس بات کی ملی ہے کہ غالب نے دبیر کی قدر دانی کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ نیا مضمون سب سے پہلے وہی نظم کرتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو ان کو نواب سید محمد جعفر صاحب عرف نواب پیارے

صاحب نے لکھا تھا۔ خط کی عبارت اس طرح نقل کرتے ہیں:۔

"میرے (پیارے صاحب کے) والد مرحوم جناب حکیم سید محمد علی صاحب عرف نواب دولہا صاحب شمس آبادی سے مرزا غالب مغفور نے دہلی میں کہا تھا کہ بھائی مبدۂ فیاض کا داروغہ دبیر سے ملا ہوا ہے جو نیا مضمون ہوتا ہے وہ لے جاکر دبیر کو دے آتا ہے۔ دبیر نظم کردیتے ہیں اور سب شاعر معاصر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔"[1]

۴۔ اگرچہ دونوں شاعروں کا ذخیرۂ الفاظ تقریباً ایک ہے جیسا کہ اس سے پہلے پیش کی گئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے مرزا دبیر کے یہاں فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور اکثر انھوں نے عربی کے مصرعے تو کیا بلکہ پورے بند نظم کیے ہیں۔ اس طرح نئے الفاظ بھی ان کے یہاں زیادہ ملتے ہیں۔

۵۔ مذاق زمانہ اور شاعرانہ فنکاری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دونوں اساتذہ نے صنائع بدائع سے کام لیا ہے مگر اس بات پر سب ہی متفق ہیں کہ مرزا دبیر اس میں فوق لے گئے ہیں۔

۶۔ دونوں اساتذہ کا موضوع تاریخی تھا یعنی دونوں نے واقعات ماضی سے لیے اور ان میں تہذیب حال کا رنگ بھر کر مقامی نقوش ابھارے مگر مرزا دبیر کے یہاں تاریخی مواد کے لحاظ سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ عصری تاریخ کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ میر انیس نے بھی بعض واقعات نظم کیے ہیں۔ مثلاً غدر ۱۸۵۷ء پر ان کی چند رباعیاں ملتی ہیں لیکن مرزا دبیر کا ایک پورا مرثیہ ہی ایسا ہے جو اپنے اندر عصری تاریخ کا مواد لیے ہوئے ہے اس کا مطلع ہے:

اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر

۷۔ مرزا دبیر نے قطعات تاریخ زیادہ کہے ہیں جس کا ذکر راقم کر چکا ہے۔

۸۔ مرزا دبیر کا کلام فارسی میں بھی ملتا ہے۔

۹۔ مرزا دبیر نے مثنویاں بھی کہی ہیں۔

---

۱ سبع مثانی۔ دیباچۂ ثابت ص ۳۰

۱۰۔ مرزا دبیر نے نثر میں دونوں زبانوں اردو اور فارسی میں اپنے خیالات محفوظ کیے ہیں۔
۱۱۔ مرزا دبیر اکثر مدح میں آگے نکل جاتے ہیں کیونکہ ان کی طبیعت اس کے لیے زیادہ موزوں تھی۔
۱۲۔ مرزا دبیر جب مرثیہ کہتے ہیں تو مرثیت کا اثر ابتدا سے انتہا تک نظر آتا ہے۔ وہ کچھ بھی کہہ رہے ہوں مگر ایک مصرعہ ایسا ضرور نظم کرتے ہیں یا ایک اشارہ ایسا ضرور کرتے ہیں جس سے مقام مختلف الاثر ہونے کے باوجود مبکی بن جاتا ہے۔
۱۳۔ مرزا دبیر کو میر انیس سے بہت پہلے شہرت حاصل ہوئی تھی۔
۱۴۔ مرزا دبیر کے کلام کی تعداد میر انیس کے کلام سے زیادہ ہے۔
۱۵۔ مرزا دبیر نے غیر منقوط مرثیہ بھی کہا اور کامیاب رہے۔

جہاں تک ان خصوصیات کا تعلق ہے جو دونوں میں مشترک ہیں اور دونوں نے ان کو ترقی دی ان میں کہیں میر انیس آگے نکل جاتے ہیں اور کہیں مرزا دبیر مثلاً منظر نگاری میں جس کا ذکر راقم اس مقالہ میں پہلے بھی کرچکا ہے میر انیس کا کلام بھاری ہے۔

بیشتر تو ایسا ہے کہ اپنے اپنے رنگ میں دونوں لاجواب ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا دبیر کی ایک رباعی ہے:

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا — باقی سامان عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر — اتنا بھی نہ اس کنویں میں پانی نکلا

اور میر انیس کی رباعی ہے:

راحت کا مزہ عدو جانی نکلا — دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیس — نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

دونوں کا مضمون ایک ہے مگر دبیر تخیل کی دنیا اور رعایت لفظی سے کام لے کر اس مضمون کو اچھوتا بناتے ہیں اور میر انیس عملی زندگی سے ثبوت فراہم کرکے مضمون میں جان پیدا کردیتے ہیں بلکہ یہاں میر انیس نے بھی رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ مگر دونوں اپنے اپنے رنگ میں جواب نہیں رکھتے۔ ایسے موقعوں پر کوئی موازنہ کرنے

کی کوشش کرے تو کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔

سلاست اور روانی دونوں میں پائی جاتی ہے البتہ مرزا دبیر کا کلام چونکہ ہر رنگ میں ملتا ہے اس لیے ان کے ہاں ایسے مرثیے بھی ملتے ہیں جن کی زبان میر انیس کے مقابلے میں ادق ہے مگر یہ وہ خصوصیت ہے جس کا جواب ہی نہیں ہے۔ دونوں کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرنا ہو تو دونوں کا یکساں کلام سامنے رکھا جانا چاہیے۔

شبلی وغیرہ کا کہنا ہے کہ میر انیس کے یہاں فصاحت ہے اور مرزا دبیر کے ہاں بلاغت۔ ایسا کہنا اصولاً غلط ہے کیونکہ بلاغت اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک کہ فصاحت نہ ہو۔ ان کے اس بیان کا مطلب اہل ذوق اور اہل علم یہی لیں گے کہ مرزا دبیر کے یہاں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی۔

نجم الغنی بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں:

> "بلاغت کو فصاحت ضرور ہے۔ یعنی جہاں فصاحت ہو وہاں بلاغت ضروری نہیں اور جس جگہ بلاغت ہوگی وہاں فصاحت ضرور ہوگی۔"[1]

ڈاکٹر نیّر مسعود بلاغت کے لیے فصاحت کی شرط کو بہت ہی مشکل میں ڈالنے والی شرط بتاتے ہیں۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کہ فصاحت کی شرط شاعری میں بلاغت کے دائرے کو بہت تنگ کرتی ہے وہ نجم الغنی کے اس قول سے متفق ہیں کہ بلاغت کی تعریف یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو[2] بلکہ وہ یہاں تک لکھدیتے ہیں کہ

> "بلاغت کا ایک غلط تصور بھی کبھی کبھی سامنے آتا ہے جسکے تحت صاحت سے زبان کی سلاست اور بلاغت سے اس کے برعکس مشکل اور صنائع سے گراں بار زبان مراد لی جاتی ہے، مثلاً میر انیس کے کلام کو فصیح اور مرزا دبیر کے کلام کو بلیغ کہا جاتا ہے۔"[2]

ان بیانات کے پیش نظر مولانا شبلی کا فیصلہ قبول کرنے میں ہر باذوق طالب علم کو تامل ہوگا۔

---

۱ نجم الغنی۔ بحر الفصاحت ص ۳۸۲

۲ ڈاکٹر نیر مسعود۔ مضمون غیر مطبوعہ "اردو شعریات کی چند اصطلاحیں" ص ۱۰

راقم پہلے ہی عرض کرچکا ہے کہ اس کا مقصد وکالت نہیں ہے بلکہ حقائق کو سامنے لانا ہے۔ شاید یہ رقم کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اگر شبلی وغیرہ کے قلم سے ایسی چیزیں سامنے نہ آئی ہوتیں جن سے ہر وقت گمراہی کا اندیشہ ہے ورنہ دونوں اساتذہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ مرزا دبیر ہمیشہ میر انیس کا نام ''قبلہ میر صاحب'' کہہ کر زبان پر لاتے تھے۔ کہیں جارہے ہوتے اور راستہ میں ملاقات ہوتی تو مرزا دبیر سواری سے اتر کر ملتے۔ میر انیس کی وفات پر نہ صرف تاریخی قطعہ تاریخ کہا جس میں ان کے کمال کا اعتراف کیا گیا تھا بلکہ اس کے بعد مرثیہ کہنا ہی ترک کردیا۔ دونوں اساتذہ اپنے سامنے ایک دوسرے کی برائی نہیں ہونے دیتے تھے۔

راقم کے خیال میں مندرجہ بالا بیانات کے بعد اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ شبلی کے موازنہ انیس و دبیر میں مرزا دبیر پر کیے گئے ایک ایک اعتراض کا جواب دے کر اس کی تردید کی جائے۔اول تو ان کی تردید ان ہی کتابوں سے ہوتی ہے جن کی فہرست اس باب کی ابتدا میں پیش کی جاچکی ہے اور اس کے علاوہ جو مثالیں دونوں اساتذہ کے کلام کی اس باب میں پیش کی گئی ہیں وہ ثبوت اصلی ہے جس سے اہل علم حضرات خود ہی اندازہ کریں گے کہ ان کے بیان میں کتنی صداقت ہے۔

خوف طوالت سے مثالوں میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور جہاں مثالوں سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ تکرار محض ہوگی وہاں انہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔

باب ہشتم

مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ

شاعری میں مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں اردو مرثیہ کے فنی لوازم کو مدِ نظر رکھنا ہوگا کیونکہ شاعر کے تخلیقی وفنی نظریات میں صنف ادب کے محرکات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کے دائرہ عمل میں شاعر اپنے فکر و احساس کی کیفیت پیش کرتا ہے جو انفرادی و ذاتی نوعیتوں کے باوجود تخلیقی معیاروں پر اجتماعی اور متنوع کیفیتوں کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ضروری نہیں کہ شاعر اپنے تخلیقی وفنی معیاروں کا بذاتہ احساس بھی کر سکے۔ ممکن ہے کہ اس کے قاری و ناقد کے احساس و ادراک میں تخلیق کار سے اختلاف پیدا ہو جائے اس کی بدیہی مثال غالب ہیں جو اپنے اردو دیوان کو کہتے تھے: ''بگذر ازایں مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است'' مگر بعد میں شہرت انھیں اسی اردو دیوان سے ملی، فارسی شاعری سے نہیں۔ مدنظر رہے کہ مرزا دبیر کے کلام کا تجزیہ کرنے میں اس حقیقت کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس مقالہ کے گزشتہ ابواب میں ان کی رباعیوں، غزلوں، قصیدوں، مثنویوں، سلاموں یہاں تک کہ نثری کارناموں کا تجزیہ کیا جاچکا ہے لیکن خصوصیت سے جو صنف سخن ان کی جولانیٔ طبع اور خلاقیِ مضامین سے اتنی زیادہ بلند و آسودہ ہوئی کہ وہ اس کی آب و تاب کا مظہر ہے، اردو مرثیے ہیں جن میں ان کے طرز سخن کا ثانی ہنوز پیدا نہ ہوسکا۔ اس لیے مرزا دبیر کے ادبی مرتبے کا تعین کرنے میں مرثیہ کو خصوصیت سے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیگر اصناف سخن کا ذکر لایعنی ہے مگر صحیح معنوں میں جس صنف کی انھوں نے آبیاری کی، جس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے، جس کو اپنی ایجاد پسند طبیعت سے مالا مال کیا، اس کے آئینہ میں مرزا دبیر کی تصویر زیادہ صاف اور واضح نظر آئے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی آبجیکٹ (Object) کو بجائے کناروں اور گوشوں کے سامنے سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ اس کا بیشتر حصہ نظر میں رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض گوشوں کے نظر انداز ہوجانے کا امکان ہے مگر چہرہ خود بخود بتادے گا کہ یہ کس کا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں کیسے ہیں، نظر کیسی ہے۔ لہٰذا مرزا دبیر کے شاعرانہ مرتبہ اور معیار کو سمجھنے کے لیے ان کے مراثی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مرزا دبیر کے مراثی کا مطالعہ کرکے ان کے شاعرانہ درجہ کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ اس صنف سخن کی ترقی و ترویج میں کہاں تک اس کے ساتھ

رہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ انھوں نے جب اپنے اظہار فن و کمال کے لیے مرثیہ کا انتخاب کیا تو اس کی حالت کیا تھی۔ قدماء نے اس میں کون سی خصوصیات پیدا کی تھیں۔ اس کی ادبی و فنی نوعیتیں کیا تھیں اور مرزا دبیر کے معاصرین نے کن خصوصیات کی بنا پر امتیاز حاصل کیا۔ یہ ان کا غیرارادی اور غیر شعوری عمل تھا یا اس کے پس پشت مثبت فنی رویہ کارفرما تھا۔ جس طرح خس و خاشاک کے ٹکڑے اس کے ساتھ سینکڑوں میل کا سفر کرتے ہیں مگر اس دھارے سے نکل کر ایک انچ ہلنے کی سکت نہیں رکھتے اسی طرح ادب و فن میں تخلیق کار کی ارادی کوشش اور ارادی عمل کی اہمیت ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مرزا دبیر نے ارادتاً اور عملاً مرثیہ کے ارتقا ونشو ونما میں کن پہلوؤں پر توجہ کی۔

مرزا دبیر کے فنی نظریے کے مطالعہ میں اردو مرثیہ کی تاریخ اور اس کے ارتقائی مدارج پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ اس مقالہ کے تیسرے باب کی ابتدا میں اس پر تفصیل سے بحث ہوچکی ہے۔ یہاں مختصر سا تذکرہ کیا جائے گا۔

شمالی ہند میں مرثیہ کی طرف سودا اور میر کے دور سے خصوصی توجہ دی گئی مگر اس کی نوعیت ثانوی تھی۔ میر نے غزل اور مثنویوں کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی جن میں انھیں معراج کمال حاصل ہوئی۔ ان کے نزدیک مرثیہ کی ثانوی حیثیت رہی۔ یعنی میر و سودا کی مرثیہ گوئی ایسی ہی ہے جیسے مرزا دبیر کی مثنوی نگاری یا غزل گوئی یا قصیدہ گوئی۔

مرزا دبیر نے مرثیہ کو اوّلیت دی۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ احساس ہوگا کہ وہ تقریباً تمام اصناف سخن میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے بلند مرتبہ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے ارادتاً مرثیہ کہا جس کا بنیادی سبب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس کے قائل تھے کہ اہل بیتؑ کی مدح کرنا یا ان کے مصائب کا ذکر کرنا باعثِ نجات ہے۔ حوصلہ افزائی کی بات اپنی جگہ اہم ہے لیکن جب کسی کام کی ابتدا ہوتی ہے تو اس کے ظاہری انجام سے انسان بہت کم واقف ہوتا ہے۔ اس وقت میر خلیق اور میر ضمیر کی طرح کے بلند قامت مرثیہ گو موجود تھے۔ مگر مرزا دبیر آگے بڑھے اور گلستان مرثیہ میں ایسے پھول کھلائے جن کی مہک اب تک باقی ہے اور صاحبان علم اور قدر دانان فن کے دل و دماغ کو ان سے اب تک فرحت محسوس ہوتی ہے۔

میر ضمیر اور مرزا دبیر سے قبل صنف مرثیہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کوئی تصور

نہیں کرسکتا تھا کہ اس میدان میں اتنی وسعت ہوگی کہ مرزا دبیر کی طرح کے فنکار کے خیالات اس صنف میں سما سکتے ہیں۔ عام طور پر مرثیہ کو اہل بیت اطہار سے عقیدت کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا اور بس! پھر مذہبی عقائد کی وابستگی کی بنا پر حرف گیری بھی نہیں ہوتی تھی بلکہ منبر پر بیٹھ کر جو کچھ مرثیہ گو نے سنایا اسے عقیدت کے کانوں سے سنتے تھے اور زبان طاعت سے داد دیتے تھے۔ مرثیہ ایک صنف سخن ضرور تھی مگر اس کی حیثیت ایسی تھی کہ جو جس طرح چاہے اس میں داد سخن دے سکتا تھا بلکہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا سوز خوان۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے فنی ہیئت متعین نہیں تھی۔ موجودہ صورت میں جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیر اور ان کے بلند مرتبہ معاصرین کی کاوشیں اردو مرثیے کی ہیئت قرار پائیں۔ جس طرح انھوں نے اسے نظم کیا وہی اس کی ہیئت کہی گئی اور جو خوبیاں انھوں نے اس میں جمع کیں وہی اس صنف کے پرکھنے کا معیار ہوگئیں۔

مرثیہ کو ترقی دینے کے عمل میں کچھ آگے چل کر دوسروں نے بھی مرزا دبیر کا ساتھ دیا مگر مرزا دبیر نے اس کی ابتدا کی اور سوچ سمجھ کر کی۔ جس علم کو میر ضمیر نے ہاتھوں میں لے لیا تھا اس کو مرزا دبیر نے اور بلند کردیا، اس کی آب و تاب اور شان و شوکت میں اضافہ کیا۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کہتے ہیں کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔[1] ان کی بدولت ایسے خیالات اردو شاعری میں آئے جن میں فکری عنصر زیادہ تھا۔ اس معیار کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر و سودا نے مرثیہ کا ہیولیٰ تیار کیا۔ میر ضمیر اور میر خلیق نے اس کے پیکر تراشے اور مرزا دبیر نے اس کو عالمانہ فکر و نظر، منطقی اظہار اور فنکارانہ نقوش عطا کیے، وہ بھی اس طرح کہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام نقوش اس کے اندر سے ابھرے ہیں جن کی وجہ سے یہ صنف دور سے پہچانی جانے لگی اور اس کی ایک انفرادیت قائم ہوگئی۔

مرزا دبیر نے اردو مرثیہ کو تمام اصناف سخن کا سرچشمہ بنادیا۔ اس میں غزل کے دلگداز جذبات آگئے، مثنوی کا بیانیہ حسن آگیا، قصیدہ کا شکوہ اور سطوت آگئی۔ مرزا دبیر نے اپنی نکتہ رس طبیعت سے اس میں وہ جوہر پیدا کیے جس نے اردو شاعری کے دامن سے اس داغ کو مٹا دیا جس کی وجہ سے قدماء اس سے فرار کرکے فارسی کے سایہ میں پناہ لیتے تھے۔

---

1 نقدِ غالب ص ۱۴۴ مرتبہ مختار الدین آرزو۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۶ء

مرزا دبیر کے بلند مرتبت ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو دل سے دماغ تک کا سفر کرایا۔

مرزا دبیر پہلے اردو مرثیہ گو تھے جو علوم مشرقیہ پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا، ہر دعویٰ کے ساتھ دلیل پیش کرنا اور اس دلیل کو اس حد تک پرتاثیر بنا دینا کہ سامعین نہ صرف اس سے قائل ہوجائیں بلکہ اس پر عمل کرنا شروع کردیں، ان کی فنکاری کا ثبوت ہے۔

کسی زبان کے شعری ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے اور کیسے کہا گیا ہے۔ اگر شعر نثر ہوجائے تو اس میں شعریت کم ہوجاتی ہے اور اگر اس میں خیال نہ ہو یا خیال میں عامیانہ پن ہو تو شاعری بنجر زمین کی طرح سے ہوجائے گی جس میں لاکھ ہل چلایئے، بیج بویئے، سینچئے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اگر اس میں وہی پھل ہے جو آپ کو ہر زبان میں ملے تو اس سے بھی اس کی توقیر کچھ زیادہ بلند نہیں ہوتی۔

مرزا دبیر نے اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان کو اس قدر مالا مال کردیا کہ اس میں زرخیزی بھی آگئی اور دوسروں کو اس کا احساس بھی ہوگیا۔ ان کے دور میں فارسی زبان کا بول بالا تھا۔ علمی تبحر معیار قرار دیا جاتا تھا لیکن مرزا دبیر نے باوجود اس کے کہ فارسی میں زبردست شاعرانہ صلاحیت رکھتے تھے، اردو کو اپنے اظہار کمال کا ذریعہ بنایا اور اس کو اس قابل بنایا کہ اس کا قد فارسی کے قد کے برابر نظر آنے لگا۔ اس کی حلاوت اور شیرینی بھی اس میں آگئی اور تمکنت و جلال بھی۔

مرزا دبیر سے قبل تک اردو کو ریختہ ہی سمجھا جاتا تھا مگر مرزا دبیر نے عوام و خواص سے منوالیا کہ اردو کے دامن میں کافی وسعت ہے اور اس میں وہ جواہر موجود ہیں یا پیدا کیے جاسکتے ہیں جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس کو فارسی کا ہم پلہ بنانے میں مرزا دبیر کا بڑا دخل تھا۔ یہ کوئی کرشمہ نہیں تھا کیونکہ فارسی کا جادو اتنا چل چکا تھا کہ نظم تو کیا نثر میں بھی جب اہل علم و دانش کچھ رقم کرنے لگتے تو اردو ذہن سے اتر جاتی تھی اور وہ فارسی کا سہارا لینے لگتے تھے۔ ذاکر حسین فاروقی مرحوم تحریر کرتے ہیں:

''اردو کو فارسی کا ہم پلہ ثابت کرنے کا کارنامہ دبیر ہی نے انجام دیا۔ انھوں

نے مدح میں خاقانی و انوری سے ٹکر لی۔ مبالغہ میں ظہیر فاریابی کا پہلو دبایا۔ شکوہ الفاظ و طنطنہ بیان میں فردوسی کے کمال کا مظاہرہ کیا، اخلاق و موعظت میں سعدی و رومی کی سنت کی تجدید کی، دقت پسندی و مضمون آفرینی میں صائب و بیدل کا مقابلہ کیا اور ان تمام میدانوں میں اپنی پرواز فکر کے جوہر دکھائے جو اب تک ایرانی سخن آفرینوں کی جولانگاہ تصور کیے جاتے تھے۔ مرزا صاحب کی مضمون آفرینیوں، صناعیوں اور ژرف نگاریوں نے ہمیں پہلی مرتبہ وہ سرمایۂ شعر و ادب عطا کیا ہے جسے ہم سخن آفرینان فارس کے مقابلہ میں فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔"[1]

مرزا دبیر نے اپنی طرف سے صنف مرثیہ کی آبیاری کی مگر اس صنف میں وہ خوبیاں پیدا ہوگئیں کہ اس کا عکس بعد کے شاعروں میں بھی ملنے لگا اور معاصرین کا متاثر ہونا تو قدرتی بات تھی۔ یہ ایسی منزل تھی جہاں نہ صرف کسی ایک صنف کا رخ بدل گیا بلکہ پوری زبان پر اس کے اثرات پڑ گئے جو ایسے نتیجہ خیز ثابت ہوئے کہ آج تک باقی ہیں۔

مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ اردو شاعروں اور خصوصاً مرثیہ گویوں میں ان کی ان خصوصیات کو سامنے رکھ کر متعین کیا جانا چاہئیے جن میں انہیں درجہ اجتہاد حاصل ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی ایجاد پسند طبیعت سے مرثیہ کو مضامین عالی عطا کیے۔ عالم اور فاضل ہونے کی وجہ سے انھوں نے مرثیہ کو عالمانہ تبحر عطا کر کے اسے عزاداری کی مجلسوں سے بلند کر کے عالمانہ غور و فکر کا سامان بنا دیا۔ اس صنف میں انھوں نے فکر کا وہ عنصر شامل کر دیا جس سے مرثیہ تو کیا اردو کی پوری شاعری بے بہرہ تھی۔ مرزا دبیر کا تخیل بہت اعلیٰ تھا اور اس کو بروئے کار لا کر انھوں نے اس صنف کو بین اور ماتم کے تنگ دائرے سے نکالا، اس کو اتنی وسعت دی کہ اس میں دنیا کے تمام واقعات نظم کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔

مرزا دبیر کو زبان و بیان پر پوری قدرت تھی۔ وہ الفاظ سے کام لینا جانتے تھے اور الفاظ کو نئے مفہوم بخشنا ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے بعض الفاظ اور تراکیب کا استعمال پہلی مرتبہ کرنے کے علاوہ ان کے مفاہیم میں بھی وسعت پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی چابکدستی سے ان تمام صنائع لفظی کا استعمال کر سکے جو اردو کے کسی

---

1 دبستان دبیر ص ۱۵۴

شاعر کے ہاں یکجا نہیں ہوئیں۔

مرزا دبیر خود اپنے اندر ایک دبستان رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اردو مرثیہ کی نئی روایت قائم کی بلکہ خود ایک روایت ہو گئے اور اس روایت کی حفاظت عمر بھر کرتے رہے۔ اس کو عام کرنے میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور اسے دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ عام طور پر شاعر کو شہرت کمال اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ خود فنا ہو جاتا ہے مگر مرزا دبیر نے نوجوانی کے زمانے میں اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ لوگ ان کی زندگی میں ان کو استاد فن سمجھتے تھے اور کافی تعداد میں لوگ ان کی شاگردی میں آئے جو ان کے بعد بھی اس فیض کو دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ ۳۲ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مرزا دبیر شاعروں میں استاد بالیاقت مشہور تھے۔ میر حسین علی تاسف نے اکثر اساتذہ کے خلاف لکھا ہے لیکن مرزا دبیر کے قدر داں تھے۔ وہ اپنے دیوان صد غزل میں میر محمد حسن کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کے قطعہ تاریخ میں کہتے ہیں:

شاگرد بھی نہ کیونکر عالم میں ہو سخنور استاد بالیاقت جس کا دبیر ہووے[1]

مرزا دبیر کے شاگردوں نے بعد میں اساتذہ کا مرتبہ حاصل کیا۔ مرزا محمد جعفر اوج، منیر شکوہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، شیخ فقیر حسین عظیم، میر بادشاہ علی بقا، حکیم سید محمد علی قدیر، شیخ گوہر علی مشیر، میر واجد علی تسخیر، مرزا محمد تقی خاں اختر، شیخ امداد علی عشیر، میر اولاد حسین قوی، سید کاظم حسین تنویر وغیرہ مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے۔ بلاواسط اور بالواسط شاگردوں کی تعداد شمار میں نہیں لائی جا سکتی۔ مرزا دبیر ایک مکمل دبستان مرثیہ گوئی کے رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذاکر حسین فاروقی مرحوم کا مقالہ "دبستان دبیر" شاگردوں کے ہی ذکر پر مبنی ہے۔ ذیل میں چند اہم شاگردوں کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ مرزا محمد جعفر اوج

مرزا دبیر کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مرزا دبیر کے شاگرد انگر مرحوم سے پائی۔ فارسی شیخ بہادر حسین وحید سے اور عربی مولوی کمال الدین اور مولانا سید تقی سے پڑھی۔ ایک بنگالی ڈاکٹر نوین چندر سے اردو میں ایلوپیتھک

---

۱ تحقیقی نوادر، ص ۱۵۷

ڈاکٹری سیکھی لیکن اسے روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ دو ہزار روپے عظیم آباد سے سالانہ ملتے تھے اور تیس روپے ماہوار امام باڑہ باقر سوداگر لکھنو سے پاتے تھے۔ دربار رامپور سے بھی تعلق رہا۔ اس کے علاوہ بھی آمدنی کے ذرائع تھے۔ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں انتقال کیا اور اپنے والد کے پہلو میں کوچۂ مرزا دبیر میں دفن ہوئے۔

مرزا اوج فطری شاعر تھے۔ اس پر والد اور ان کے شاگردوں کی صحبتوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور فن کی وہ خصوصیات ہوئیں جو کم شاعروں کے حصہ میں آتی ہیں۔ مرزا دبیر کی حیات میں ہی مرزا اوج کے معتقدوں کا حلقہ تیار ہوگیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد انہیں جانشین دبیر تسلیم کیا گیا حالانکہ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۳ سال تھی۔

مرزا دبیر کی وفات کے بعد مرزا اوج مجالس عزا میں مرثیہ پڑھتے رہے اور ہمعصر عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے دادِ سخن لیتے رہے۔ اہلِ کمال نے ان کے کمال کا اعتراف کیا۔

مرزا اوج عروض و بیان اور قواعد و اوزان پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں ''مقیاس الاشعار'' کے نام سے فن عروض و قافیہ پر ایک بلند پایہ رسالہ تصنیف کیا۔ اس کا تاریخی نام ''ارمغان'' ہے جس سے اس کی تاریخ ۱۲۹۲ھ نکلتی ہے۔ یہ کتاب تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ عروض اور فن شعر کے متعلق بحث پر مبنی ہے۔ دوسرے حصہ میں قافیہ کی بحث ہے اور حصۂ سوم میں فن تاریخ کا ذکر ہے۔ اس تصنیف کی بنا پر مرزا اوج کو فن عروض کے اعلیٰ ترین ماہر کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور ان کی شہرت و مقبولیت دور دور تک پہنچ گئی۔ ''مقیاس الاشعار'' سے متاثر ہوکر ان کے ممتاز معاصر داغ نے کہا:

''آج علم عروض کا ماہر مرزا اوج سے بڑھ کر کوئی نہیں۔''[1]

مرزا اوج نے فن مرثیہ گوئی کو نئی سمتوں سے آشنا کیا۔ انھوں نے نہ صرف زبان و بیان کو سنوارا بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی اس میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دہلی اور لکھنو کی اعلیٰ فنی و معنوی روایتوں کو یکساں اہمیت دی اور اپنے تخلیقی رویے سے ندرت پیدا کی، کہتے ہیں:

---

۱ معراج الکلام ص ۱۴ مرزا اوج نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۲ھ

شہرت ہر ایک شہر میں اس گفتگو کی ہے　　　دہلی کا ہے مذاق، زباں لکھنو کی ہے

مرزا اوج کے مراثی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رثائیت پر خصوصی توجہ کی تھی۔ وہ اردو مرثیے کی روایت کے نہ صرف امین تھے بلکہ انھوں نے بیان کو وسعت دی، ندرت سے مالا مال کیا اور مرثیہ میں فلسفیانہ مضامین پیش کیے۔ ان کے مراثی میں علمی اور فکری عناصر نمایاں ہیں۔ انھوں نے مرثیہ میں تعمیری زاویہ نظر کے ساتھ اصلاح معاشرت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرزا دبیر اور میر انیس کے بعد کے دور کے لیے مرثیہ کے نئے رجحانات کے، مرزا اوج نقیب ومحرک تھے۔ ان کے اکثر مراثی میں قومی اور اصلاحی مضامین ملتے ہیں۔ ایک مشہور مرثیہ:

دو رنگی چمن روزگار تو ام ہے

خالص قومی اور اصلاحی مسائل پر مبنی ہے۔

مرزا اوج واقعات کربلا کے بیان میں شاعرانہ ترمیم و تنسیخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے مراثی میں واقعہ کی تاریخی صحت پر خصوصی زور دیا۔ ان کی اسی روایت کو مرزا دبیر کے نامور شاگرد شاد عظیم آبادی نے اردو مراثی میں تحریکی نوعیت عطا کی جس نے بعد کے ادوار کو متاثر کیا۔

مرزا اوج اعلیٰ درجہ کے رزم نگار تھے جس کا اعتراف امداد امام اثر نے کیا ہے۔[1]

مرزا اوج کو صرف ونحو پر عبور حاصل تھا۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ''قواعد حامدیہ'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں اردو رسم الخط کی اصلاح اور اس کو آسان بنانے کے سلسلے میں بعض تجویزیں پیش کیں جو آج بھی قابل توجہ ہیں۔ اس رسالہ سے ان کی زبان دانی اور تاریخ السنہ کی مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مرزا اوج کے کلام میں مرزا دبیر اور دیگر نامور مرثیہ نگاروں کے اسلوب بیان کا امتزاج ہے جس میں ان کی انفرادی صلاحیتیں نمایاں ہیں۔ اردو مرثیہ کو جدید محرکات سے روشناس کرنے، وسیع موضوعات کے بیان اور لکھنو کی معاشرت کے زوال کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں مرزا اوج کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ وہ نہ صرف خود قادر الکلام تھے بلکہ دوسروں کو بھی تربیت کلام دے کر فنی روایت کی حفاظت کرتے رہے۔

۱　کاشف الحقائق ج ۲ ص ۵۳۹

ایک مجموعہ ''معراج الکلام'' شائع ہوا ہے مگر ہنوز معتدبہ کلام غیر مطبوعہ ہے جس کی تدوین و اشاعت کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس باکمال شاعر کے قد و قامت کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکے۔

۲۔ منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی ایسے قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعات، تاریخ گوئی جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا ضخیم کلیات نہ صرف ان کے کمال فن کی دلیل ہے بلکہ ان کے وقار اور شاعرانہ بلندی کا ضامن ہے۔ شکوہ آباد میں ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم پائی۔ ابتداً لکھنو میں رہے، وہیں پر شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور اس میں وہ جوہر دکھائے کہ اردو ادب کی تاریخ میں انہیں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

منیر پہلے ناسخ کے شاگرد ہوئے بعد میں مرزا دبیر کی طرف رجوع کیا۔ منیر کی مثنوی ''معراج المضامین'' شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے قصائد شوکت بیان، بلندی تخئیل، دور از کار تشبیہات و استعارات سے لبریز ہیں۔

غدر میں منیر کو کالے پانی کی سزا ہوئی اور انھیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس سے قبل عبدالغفور نساخ کی تصنیف ''انتخاب نقص'' منصۂ شہود پر آچکی تھی جس میں انھوں نے مرزا دبیر اور میر انیس کے کلام پر اعتراضات کیے تھے۔ منیر نے ان کے جواب میں ایک ضخیم کتاب ''سنان دلخراش'' کے نام سے تصنیف کی جس میں بڑی چابکدستی سے نساخ کے کلام سے اغلاط کی نشاندہی کر کے ان کی زبان بند کردی۔ ''سنان دلخراش'' ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک مخطوط لکھنو یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

منیر باکمال شاعر تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت کی بنا پر مصائب میں گرفتار رہے۔ انھوں نے قید فرنگ کے زمانے میں بھی تصنیف و تالیف کی۔ ان کے دو دیوان چوری ہوگئے۔ دو دیوان اور تین مثنویاں فروخت کردیں اور مرثیے بھی کسی خریدار کی نذر کردیے۔ اس کے باوجود تین دیوان، 'قصائد اور مثنوی، 'معراج المضامین، موجود ہیں جو ان کے کمال فن کے آئینہ دار ہیں۔

اردو کو فارسی کا ہم پلہ بنانے میں منیر نے قابل قدر خدمت انجام دی۔ ان کا کلام مختلف معیار کا نمائندہ ہے۔ اگر کبھی سہل گوئی پر آ گئے تو دریا بہا دیے۔ جب رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا لحاظ رکھا تو اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔

منیر کو مرزا دبیر سے قلبی عقیدت تھی۔ ان کی وفات پر کئی قطعات تاریخ ہائے وفات کہے۔ منیر کے مراثی نایاب ہیں البتہ ایک مرثیہ ''در بار حسین'' میں افضل حسین ثابت نے شائع کر دیا ہے۔ دفتر ماتم کی جلد ۱۷ میں ان کا ایک سلام بھی شائع ہوا ہے۔

منیر کا باکمال اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد لاتعداد ہیں۔

۳۔ صفیر بلگرامی

سید صفیر احمد بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے۔ انتقال ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں ہوا۔ علم و فن کی روایت خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ غزل میں مرزا امان علی سحر سے اصلاح لیتے تھے۔ دہلی چلے گئے تو فارسی کلام میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے جس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے اپنے تذکرہ ''جلوۂ خضر'' میں کیا ہے۔ جلوۂ خضر میں مرزا دبیر کے متعلق مرزا غالب کے خیالات کا ذکر ہے کہ غالب کہا کرتے تھے۔: ''واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔''[1] صفیر نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ذاکر حسین فاروقی مرحوم، صفیر کے پوتے سید وصی احمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے (صفیر نے) چھوٹی بڑی کل تین سو چھیاسی تصانیف چھوڑیں جن میں سے اب بھی اکثر خاندان والوں کے پاس محفوظ ہیں۔ اردو میں غزل کے آٹھ دیوان اور فارسی میں غزل کے تین دیوان کیا کم تھے کہ خمسہ جات رباعیوں اور قطعات کے بھی مکمل دیوان چھوڑے۔ قصائد اور مثنویاں بھی بکثرت کہیں۔ بوستان خیال کی اٹھارہ جلدیں تیار کیں۔ ''جلوۂ خضر کے نام سے ایک تذکرہ اور رشحات صفیر کے نام سے تذکیر و تانیث کے متعلق ایک

---

۱ جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۳۵ صفیر بلگرامی

رسالہ مرتب کیا۔ مرغوب القلوب ترجمہ تفسیر منہج الصادقین، طبقات الکرام،
محشرستان خیال، سراج المعقول، اور جواہر مقالات کے سے ضخیم مجلدات تیار
کیے۔ غرض نظم و نثر میں اتنا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا جسے دیکھ کے انسان حیرت
میں رہ جاتا ہے۔"[1]

صفیر اپنے زمانہ کے مشہور اساتذہ کلام میں شمار ہوتے تھے۔ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کو ترغیب سخن دیتے رہے۔ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) تک ان کے شاگردوں کی تعداد اکسٹھ بیان کی جاتی ہے[2] جبکہ اس کے بعد تیرہ برس تک حیات رہے۔ اتنا یقینی ہے کہ اس کے بعد بھی دیگر شعراء ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتے رہے۔

مراثی میں صفیر اپنے استاد مرزا دبیر کی پوری تقلید کرتے رہے۔ ان کے مراثی میں شکوہ الفاظ، معنی آفرینی، تخیل کی بلند پردازیاں، نادر تشبیہات و استعارات کی فراوانی ملتی ہے۔ صنائع بدائع کی کثرت اور زور بیان میں بھی مرزا دبیر کے اثرات نمایاں ہیں۔ صفیر کے کلام میں فلسفیانہ افکار اور شعریت کا امتزاج ہے۔

۴۔ شاد عظیم آبادی

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان کے بزرگ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اپنی خاندانی وجاہت کی بنا پر عوام و خواص میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاد ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔

شاد ایک مدت تک میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ رہے مگر زندگی کے آخری ایام تنگدستی میں گزرے اس کے باوجود شاد نے اپنی خاندانی آن بان اور وضع قطع برقرار رکھی۔

شاد ابتدا میں صفیر بلگرامی سے اصلاح لیتے تھے جب مرثیہ گوئی کا شوق ہوا تو صفیر کی رہنمائی میں مرزا دبیر سے اصلاح لی۔ انھوں نے خود کہا ہے:

مرا کو در مراثی اوستاد است ۔۔۔ دبیر نکتہ رس قدسی نہاد است

یکتائے زماں تھے میرے استاد دبیر
کرتا ہوں میں جان و دل سے ان کی توقیر

۱۔۲ دبستان دبیر، ص ۲۰۷، ۲۰۸

شاد دبستانِ دبیر کے اساتذہ میں اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔ مرزا اوج کی طرح انھوں نے بھی زبان کے معاملے میں میر انیس کے رنگ کا تتبع کیا مگر مرزا دبیر کے رنگ کو نظر انداز نہ کر سکے۔

شاد مغربی ادب سے متاثر تھے۔ مولانا آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریکوں کو مراثی میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دبستان دبیر میں اصلاحی رویوں کے رہنما مرزا اوج تھے۔ شاد نے مغرب و مشرق کے افکار و خیالات کا امتزاج مراثی میں پیش کیا، جس سے مرثیہ کو نئی سمتوں میں بڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

شاد کے مراثی میں بھی مبالغہ آرائی، مضمون آفرینی اور خیال بندی کی خصوصیات ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی شاد کو لفظی حیثیت سے لکھنو کا اور معنوی حیثیت سے دہلی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔[1]

شاد کثیر التصانیف تھے۔[2] غزل کے بائیس ہزار اور مرثیہ کے چونسٹھ ہزار اشعار کے علاوہ دو ہزار رباعیات، قصائد و مخمسات کے چار ہزار اشعار اور پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل دس مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ نثر میں تاریخ صوبۂ بہار دو جلدوں میں، مردم دیدہ ایک جلد، فکر بلیغ دو جلدیں، نصاب تعلیم سات جلدیں، گیارہ رسائل جو ڈائریکٹر تعلیمات کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔ عروض و قوافی پر ایک رسالہ، خودنوشت سوانح حیات ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' اور ایک اور رسالہ ''نوائے وطن'' ان کی تصانیف ہیں۔

مراثی کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ باقی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ شاد کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے۔

۵۔ شیخ گوہر علی مشیر

مشیر ۱۸۰۰ء میں پیدا[3] ہوئے اور ۱۸۷۶ء میں کلکتہ میں انتقال ہوا۔ نو سال کی عمر میں لکھنو آئے۔ ۱۸۱۷ء میں میر ضمیر سے ملاقات ہوئی۔ میر ضمیر اس نوعمر لڑکے کی ذہانت

---

۱ نقوش سلیمانی، ص ۳۹۸

۲ دبستان دبیر، ص ۲۳۲

۳ دبستان دبیر، ص ۳۱۰

سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے ساتھ رکھ کر عروض وغیرہ کی تعلیم مکمل کرائی پھر ان کی ہدایت سے مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے۔ مرزا دبیر نے ان کے طبعی رجحان کو دیکھ کر ان کو مرثیہ کہنے کی ہدایت کی اور خود اصلاح کرنے لگے۔

مشیر تیز طبیعت کے تھے۔ ان کی سوچ میں شوخی اور طراری تھی۔ ہر ثیہ کہنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ادبی معرکوں میں خوب حصہ لیتے تھے۔

مشیر ایک مسلم الثبوت مرثیہ گو تھے اور اپنا ایک جداگانہ رنگ سخن رکھتے تھے۔ ان کے مرثیے نہایت مبکی ہوتے تھے۔ سوز خوان ان پر سوز رکھ کر پڑھنا پسند کرتے تھے۔ شاہی امامباڑہ میں باقاعدہ مرثیہ خوان کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اپنے استاد مرزا دبیر کے سامنے بادشاہ اور شہزادوں کی مجلسوں میں کلام پڑھتے تھے۔

مشیر کے مراثی میں جدت و اجتہاد کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ طبیعت میں روانی تھی جس سے مختلف رنگوں میں کلام پیش کر کے فنی کمال ظاہر کر دیتے تھے۔ ان کے دو مرثیے دفتر ماتم میں شائع ہوئے ہیں۔ مطلعے یہ ہیں:

۱۔ شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضیٰ

۲۔ یارو غمِ حسینؑ کی عزت عظیم ہے۔

مشیر کے مرثیوں میں ڈرامائی عنصر بھی ملتا ہے۔ وہ واقعات کی بازدید (Flash Back) اس طرح کراتے ہیں جس میں فلم ایڈیٹنگ Parallel Cutting اور Inter Cutting اور Cut Back[1] کا مزہ ملتا ہے اور واقعات کی تصویر اس طرح سامنے آتی ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے جیسے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ اس کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔

مشیر کے کمال کی دلیل ہے کہ وہ زندگی کی دو انتہائیں (Extremeties) کے درمیان کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف کا رخ کرتے ہیں تو اپنے پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے قہقہوں کے زعفراں زار پیش کرتے ہیں جس کو دیکھ کر وہ بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ

---

۱ اس سے مراد فلم ایڈیٹنگ کی وہ تکنیک ہے جس سے واقعات کے ساتھ ان کے پس منظر کے مناظر کو کہانی کے ساتھ ربط دیا جاتا ہے اور مختلف ادوار کے واقعات ناظرین کے سامنے لائے جاتے ہیں۔
The Technique of Film Editing by Karl Reisz and Gavin Miner-Focal Press London & New York, 18th Edition 1972.

ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف کا رخ کرتے ہیں تو مصائب اہل بیتؑ کے وہ دردناک مناظر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے یا سامعین رونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اپنے مرثیوں میں مشیر نے لکھنؤ کی اس زمانہ کی تہذیب اور اس وقت کے لوگوں کے مذاق کو بڑی اچھی طرح سے محفوظ کیا ہے۔ مراثی میں ان کے ساقی نامے بھی کافی مقبول ہوئے۔

ذاکر حسین فاروقی نے مشیر کو ہر شیہ موجد قرار دیا[1] ہے۔ اس طرح مشیر کی طبیعت کے دو رخ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ان کی نظم کے آئینہ میں جھلکتے ہیں۔

مندرجہ بالا باکمال اساتذہ کلام میں نمونہ مشتے از خروارے کے طور پر چند کا ذکر کیا ہے۔ ''دبستان دبیر'' اس موضوع پر مفصل کتاب موجود ہے اگرچہ اپنی ضخامت کے باوجود اس موضوع پر ایک نامکمل مقالہ ہے مگر اس کی حیثیت خشت اول کی ہے۔ اس سے شاگردان دبیر کے کمالات کی نشاندہی کرنے میں مدد مل سکتی ہے، دبستان دبیر کے اساتذہ اور شاگردوں کا نام پیش کرنا بھی تفصیل کے مترادف ہے اس لیے اختصار کے خیال سے ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ سردست اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ جو کام مرزا دبیر نے شروع کیا اسے نہ صرف خود آخر عمر تک نبھاتے رہے بلکہ انھوں نے کاملین فن کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جو بعد کے ادوار میں دبستان دبیر کے مسلک کی امین رہی جس کا سلسلہ تادمِ تحریر قائم ہے۔

مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں ان کے شاگردوں کے فنی کمالات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ اگر کسی چیز یا کسی شخصیت کے مرتبے کا تعین کیا جائے کہ اس کی زندگی کتنی ہے اور اس کے اثرات کتنے دیرپا ہیں تو یہ بات بغیر کسی مبالغہ کے بیان کی جاسکتی ہے کہ مرزا دبیر مرثیہ گوئی میں بلند ترین مرتبے کے حامل ہیں۔ انھوں نے مراثی کی قدیم روایات کو بھی اپنایا اور اپنی طرف سے اس فن میں ایسی جدتیں پیدا کردیں جو آگے چل کر اس فن کا حصہ ہو گئیں۔ اس سے بیان اور طرز بیان دونوں کا فائدہ ہوا۔ جو ایجادات اور اضافے ان سے منسوب ہیں اس کے ضامن ہیں کہ مرزا دبیر ہر زمانے میں یاد کیے جائیں گے اور اردو شعر و ادب کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

---

۱ دبستان دبیر ص ۳۳۰

صفی حیدر دانش نے مرزا دبیر کا ادبی مرتبہ متعین کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''مرزا دبیر نے اردو مرثیہ نگاری میں فکر وفن کے جو چراغ روشن کیے وہ ان سے پہلے نہیں ملتے۔ ان کے یہاں فکر کی پرواز، تخیل کی خلاقی اور رعنائی کے ساتھ صناعی اور مرصع کاری نے حیرت انگیز شاہکار پیش کیے ہیں۔ ان کا رنگ سخن اردو مرثیہ نگاری میں فقید المثال ہے۔ وہ اپنے اسلوب کے خود ہی موجد تھے اور وہ ان ہی کی ذات پر ختم ہوگیا۔ انھوں نے معنی آفرینی اور نکتہ آرائی سے ایجاد وتخلیق کی ایک نئی روایت قائم کی۔ ان کا ذہن نادر اور لطیف خیالات کا ایک خزینہ ہے۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں۔ ان کی نکتہ آفرینیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ختم ہی نہیں ہوتا نظر آتا۔ ان کی قوت تخیل کہیں عاجزی کا اظہار نہیں کرتی۔ وہ اپنی اقلیم سخن وری کے تنہا مالک ہیں۔ دبیر نہ ہوتے تو مرثیہ میں موشگافی اور نازک خیالیوں کے گر کون سکھاتا۔ انیس کی طرح دبیر بھی مرثیہ کی تاریخ میں ایک دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسالیب مرثیہ کی تکمیل کے لیے ان دونوں باکمالوں کی ضرورت ہے۔ انیس و دبیر مرثیہ کے دو رکن ہیں جن کے دم سے یہ عظیم الشان ایوان قائم ہے۔ غزل میں سودا اور غالب ایک مسلمہ حقیقت ہیں تو دبیر بھی نہ صرف اپنے معاصروں میں بلکہ سب مرثیہ نگاروں میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔''[1]

صفی حیدر نے مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کو مدِ نظر رکھ کر ان کے ادبی مرتبہ کو صحیح طور پر متعین کرنے کی کوشش کی ہے جو قابل قدر ہے۔

مرزا دبیر کے مراثی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کا ہیولا میر ضمیر سے لے لیا تھا جس میں پیکر کے آثار تو نظر آتے ہیں مگر اس کے نقوش دھندلے ہیں۔ مرزا دبیر نے اس پیکر کو نہ صرف واضح خد و خال کے ساتھ پیش کیا بلکہ اسے لباس بھی عطا کیا اور اس کے چہرے کے خطوط واضح کیے۔ اس کے اندر اپنی تیز بیں نگاہوں سے وہ جوہر پیدا کیے جو عام آدمی کو نظر نہیں آتے تھے۔ مثلاً ایک بت تراش پتھر میں اپنے پسندیدہ بت کو دیکھ کر اس سے فضول مواد کو الگ کر کے اسے ایک خوبصورت مجسمہ کی شکل

---

1 ماہِ نو، دبیر نمبر، راولپنڈی، ص ۱۹۹

میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر نے مرثیہ کی خصوصیات کا اندازہ کرلیا تھا جو بعد میں ظاہر ہوئیں۔ مرزا دبیر نے نہ صرف مجسمہ گر تھے بلکہ اس مجسمہ کو انھوں نے طرح طرح کے رنگ و روغن سے دیدہ زیب بنایا اور اس کی آب و تاب میں اضافہ کیا کہ اس میں مختلف اصناف کی چمک دمک بھی آ گئی اور اس کے مزاج میں وہ چاشنی بھی پیدا ہوگئی کہ ہر ایک نے اس کی طرف توجہ کی۔ اپنے علمی سرمایہ سے اس کے سر پر فکر کا تاج رکھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اپنی پرشکوہ زبان اور اپنے انداز بیان سے اس بت کو ایسا گویا بنادیا کہ اب تک اس کا جادو اثر رکھتا ہے۔ یہی خصوصیات مرزا دبیر کے مرثیہ گوئی میں بلند مرتبہ ہونے کی ضمانت ہیں۔

اگر مرزا دبیر کی مجموعی شاعری جس میں سلام، رباعی، قصائد، مثنویاں تاریخ گوئی، فارسی شاعری وغیرہ کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرزا دبیر اردو شاعری میں عدیم المثال ہیں۔ ان کی طبیعت میں مختلف قسم کے کمالات کا جوہر موجود تھا جسے انھوں نے صحیح معنوں میں استعمال کیا۔

نثر میں بھی ان کی تصنیف ''ابواب المصائب'' ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر نثر اردو کی صحیح معنوں میں تاریخ لکھی جائے گی تو مرزا دبیر کی اس تصنیف کو نظر انداز کرنا بہت دشوار ہوگا۔

○

کتابیات

کتابیات

غیر مطبوعہ

	کتاب	مصنف	مقام
۱	ایران میں مرثیہ نگاری	سید مسعود حسین رضوی	کتب خانہ نیر مسعود لکھنو
۲	برق لامع	سید علی حسن	مرشد آباد پیلیس لائبریری
۳	تاریخ فرخ آباد		کتب خانہ ندوہ لکھنو
۴	تاریخ اودھ معروف بہ فسانہ عبرت	رجب علی بیگ سرور	ایضاً
۵	دیوان ناسخ		کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد
۶	سنان دلخراش	منیر شکوہ آبادی	مخطوطہ ٹیگور لائبریری لکھنو یونیورسٹی
۷	غزلیات	مرتبہ سلیمان قدر	ایضاً
۸	ایضاً		مخطوطہ ملکیت مرزا صادق صاحب
۹	مراثی قلمی		۱- ذخیرہ ملکیت مرزا صادق صاحب
۱۰			۲- ذخیرہ مرزا امیر علی جونپوری
۱۱			۳- ذخیرہ محمد رشید لکھنوی
۱۲	قصائد دبیر		مخطوطہ ملکیت مرزا صادق صاحب
۱۳	مثنوی تاریخی- بغیر عنوان	مرزا دبیر	مخطوطہ ملکیت مرزا صادق صاحب
۱۴	ریحان معراج	میر ضمیر	مخطوطہ ملکیت ڈاکٹر اکبر حیدری
۱۵	مرزا دبیر- سوانح و کلام	مظفر حسن ملک	کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنو
۱۶	مرزا فصیح کی نثری) تصنیف نخل ماتم)	مضمون مصنفہ سبط محمد نقوی	کتب خانہ نیر مسعود لکھنو
۱۷	متفرق مخطوطات - مراثی		مرشد آباد پیلیس لائبریری
۱۸	ایضاً		ملکیت مرزا امیر علی جونپوری

اخبارات و رسائل

۱	معاصر - سہ ماہی پٹنہ	۱۹۷۳ء
۲	ادب لکھنو	مئی ۱۹۳۰ء
۳	سرفراز لکھنو (دبیر نمبر)	دسمبر ۱۹۷۶ء
۴	ماہِ نو راولپنڈی (دبیر نمبر)	ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء
۵	نگار لکھنؤ (اصناف سخن نمبر)	جنوری فروری ۱۹۵۷ء
۶	نگار لکھنؤ	اکتوبر ۱۹۴۸ء و نومبر ۱۹۴۸ء
۷	ایضاً	ضمیمہ نومبر ۱۹۴۹ء
۸	آج کل دہلی، ج ۳۵ شمارہ ۲	ستمبر ۱۹۷۶ء
۹	مجلہ عثمانیہ (دکنی ادب نمبر)	
۱۰	ارشاد کراچی	۱۶ مئی ۱۹۶۶ء
۱۱	ماہ نو کراچی	نومبر ۱۹۵۰ء
۱۲	کاروان حیات بمبئی (شہید اعظم نمبر) ج ۳ شمارہ ۴	محرم ۱۳۹۱ھ
۱۳	آج کل دہلی	جنوری ۱۹۷۷ء
۱۴	کاروان حیات (مولا علی نمبر) ج ۲ شمارہ ۱۳-۱۴	
۱۵	اودھ اخبار	۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء
۱۶	سرفراز لکھنو (محرم نمبر)	۱۳۵۶ھ
۱۷	یادگاری مجلہ	دبستان انیس راولپنڈی ۱۹۷۴ء

کتب

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱	آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	رام نرائن لال بنی مادھو الہ آباد ۶۲ء
۲	اردو شاعری میں منظر نگاری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۶۸ء
۳	اردو کی نیچر شاعری	ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی	الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۴ء
۴	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۹ء
۵	اردو مرثیے کا ارتقا	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنو ۱۹۶۸
۶	ادبی مقالے	کاظم علی خاں	
۷	اردو مرثیے کی روایت	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنو ۱۹۶۹ء (دلی پرنٹنگ پریس شاہ گنج الہ آباد)
۸	المیزان	مولوی چودھری سید نظیر الحسن فوق مہابنی	مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۹۱۴ء
۹	اصول انتقاد ادبیات	سید عابد علی عابد	کریم احمد خاں معتمد مجلس ترقی اردو لاہور ۱۹۶۰ء۔ مطبع رپن پرنٹنگ پریس، بل روڈ لاہور
۱۰	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی ۶۵ء
۱۱	انتخاب نقص	عبدالغفور نساخ	
۱۲	ابواب المصائب	مرزا سلامت علی دبیر	مطبع یوسفی دہلی (سن اشاعت ندارد)
۱۳	اودھ کیٹلاگ	ڈاکٹر اشپرنگر	
۱۴	امجد علی شاہ	چودھری سبط محمد نقوی	مطبع سرفراز قومی پریس لکھنو ۷۶ء
۱۵	انشائے فرقانی	علامہ سید احمد احسن الفرقانی	سن اشاعت درج نہیں ہے البتہ آخر میں منشی سید کفایت علی کی تاریخ وفات دی ہے جو ۲۴ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد چھپی ہے۔

۱۶	بہار گلشن، حصہ دوم	حافظ برکت اللہ رضا لکھنوی فرنگی محلی	مطبع مجتبائی ۱۹۰۵ء
۱۷	پیمبران سخن (فکر بلیغ حصہ دوم)	شاد عظیم آبادی مرتبہ سید نقی احمد ارشاد فاطمی و ڈاکٹر سید صفدر حسین	بارگاہ ادب، ۴۵ حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور ۱۹۷۴ء مطبع اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور
۱۸	تاریخ اودھ جلد ۴	مولوی حکیم نجم الغنی خاں صاحب	مطبع نولکشور لکھنو ۱۹۱۹ء
۱۹	تجلیات	مرزا محمد ہادی عزیز	نظامی پریس لکھنو
۲۰	تنقید آب حیات	میر محمد رضا ظہیر	اردو پریس گولہ گنج لکھنو ۱۳۰۳ھ
۲۱	تذکرہ خوش معرکہ زیبا	سعادت خان ناصر مرتبہ شمیم انہونوی	نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنو جولائی ۱۹۷۱ء
۲۲	تحقیقی نوادر	ڈاکٹر اکبر حیدری	اردو پبلشرز لکھنو ۱۹۷۴ء
۲۳	تذکرۂ ہزار داستان المعروف بہ خم خانہ جاوید جلد سوم	لالہ سری رام	مطبع دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۷ء
۲۴	تذکرہ بزم سخن	ابوالنصر سید علی حسن ناصر	مطبع نامی مفید عام آگرہ ۱۸۸۱ء
۲۵	تذکرہ صبح گلشن	سید علی حسن خان	مطبع فیض شاہ جہانی ۱۲۹۵ھ
۲۶	تذکرہ بے بہا	سید محمد حسین نوگانوی	جید برقی پریس بازار بلیماران دہلی
۲۷	تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت	سید ہاشمی فرید آبادی	انجمن ترقی اردو کراچی
۲۸	تفضیح الغافلین	ابوطالب لندنی	۱۲۱۱ھ
۲۹	تردید موازنہ	شیخ محمد جان عروج فیض آبادی	تصویر عالم پریس لکھنو
۳۰	تذکرۃ البلاغت	ذوالفقار علی	مطبع مجتبائی ۱۹۲۳ء

کتابیات

۳۱	تطہیر الاوساخ الننح نساخ	مرزا محمد رضا معجز	مطبع شعلۂ طور کانپور ۱۲۹۶ھ
۳۲	تفضیح	مولانا آغا علی	۱۲۹۸ھ
۳۳	تقریظ مسکت شائستہ	سید محمد تقی فیض آبادی	۱۳۰۱ھ
۳۴	تواریخ نادر العصر		مطبع نولکشور لکھنو ۱۸۶۳ء
۳۵	تاریخ ادبیات ایران	ڈاکٹر رضا زادہ شفق مترجم سید مبارز الدین رفعت	ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد چوتھا ایڈیشن جنوری ۱۹۶۹ء
۳۶	تقویم ہجری وعیسوی	مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی	انجمن ترقی اردو ہند دہلی مارچ ۷۷
۳۷	تلاش دبیر	کاظم علی خاں	۱۹۷۹ء
۳۸	تاریخ ادبی ایران (از سعدی تا جامی)	اڈورڈ برون انگلیسی ترجمہ وحواشی علی اصغر حکمت	مطبع دانش گاہ تہران، ایران، دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۹ شمسی
۳۹	جلوۂ خضر ج ا	صفیر بلگرامی	مطبوعہ ۱۸۸۴ء
۴۰	حیات دبیر جلد اول	افضل حسین ثابت لکھنوی	مطبع سیوک سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء
۴۱	" " جلد دوم	" " "	جارج سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۵ء
۴۲	حیات انیس	سید امجد علی اشہری	
۴۳	دیوان برق	برق لکھنوی	مطبوعہ ۱۸۵۳ء (۱۲۶۹ھ)
۴۴	دیوان آغا حجو تخلص شرف	آغا حجو شرف	مطبع جعفری نخاس لکھنو
۴۵	دبستان دبیر	ذاکر حسین فاروقی	نسیم بکڈپو لکھنو ۱۹۶۶ء
۴۶	دبستان عشق کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر جعفر رضا	نیشنل کتاب گھر الہ آباد ۱۹۷۳ء
۴۷	دربار حسین	افضل حسین ثابت	مطبع اثنا عشری دہلی ۱۳۳۸ھ
۴۸	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	نسیم بکڈپو لکھنو چھٹا ایڈیشن ۱۹۶۳ء
۴۹	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۱۹۷۰ء
۵۰	دیوان فائز	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۶ء

۵۱	دیوان رشک	رشک لکھنوی	مطبوعہ ۱۸۴۷ء لکھنو
۵۲	دفتر ماتم جلد ۱-۲۰	مرزا دبیر	
۵۳	رد واقعات انیس	سردار مرزا	اصح المطابع لکھنو ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء
۵۴	ریاض لطافت	سید حسین لطافت لکھنوی	مطبع شوکت جعفری ۱۳۰۵ھ
۵۵	رسالہ سوانح عمری	مرزا محمد کاظم	مطبوعہ ۱۸۸۷ء
۵۶	رزم نامۂ انیس	مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ ۱۹۵۸ء
۵۷	رزم نامۂ دبیر	مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر	نسیم بکڈ پو لکھنو ستمبر ۱۹۶۴ء
۵۸	روح انیس	سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر لکھنو طبع پنجم ۱۹۷۲ء
۵۹	رد الموازنہ	افضل علی ضو	تصویر عالم پریس ۱۳۲۶ھ
۶۰	رباعیات دبیر	مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر	نظامی پریس لکھنو
۶۱	سبع مثانی	,, ,, ,,	,, ,, ,, ۱۳۴۹ھ
۶۲	سراپا سخن	میر محسن علی	
۶۳	سرو ریاض	ریاض الدین امجد اکبر آبادی	مطبع حیدری واقع آگرہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء)
۶۴	سخن شعراء	عبد الغفور نساخ	مرتبہ ۱۲۸۱ھ مطبوعہ ۱۲۹۱ھ
۶۵	سوانح لکھنو (خلاصہ)	نجات حسین عظیم آبادی	کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنو
۶۶	سلطان محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	مطبوعہ اعظم سٹیم پریس حیدر آباد ۱۹۴۰ء
۶۷	سب رس (وجہی)	مرتبہ شمیم انہونوی	نسیم بکڈ پو لکھنو
۶۸	سودا	شیخ چاند	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء

۶۹	شعار دبیر	مرتبہ مہذب لکھنوی	یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنو ۱۹۵۱ء
۷۰	شاہکار سخن	" " "	شائع کردہ انجمن محافظ اردو لکھنو
۷۱	شباب لکھنو (ترجمہ: لائف آف این ایسٹرن کنگ)	نائٹن - مترجم محمد احد علی	پرنٹر و پبلیشر منشی سخاوت علی الناظر ۱۹۱۲ء
۷۲	شاعر اعظم - مرزا دبیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	اردو پبلشرز لکھنو ۱۹۷۶ء
۷۳	شمس الضحیٰ	مولوی صفدر حسین	مطبع اثنا عشری ۱۲۹۸ھ
۷۴	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	شاد عظیم آبادی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۷۵	شعر العجم حصہ ۴	علامہ شبلی نعمانی	مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء
۷۶	شکوہ شاکی (نام تاریخی: گزارش خبیر)	سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی	نور المطابع لکھنو ۱۳۴۰ھ
۷۷	فسانۂ آزاد ج ۱	رتن ناتھ در سرشار	مطبع نامی نولکشور لکھنو جنوری ۱۹۴۹ء
۷۸	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	
		مرتبہ اطہر پرویز	سنگم پبلشرز الہ آباد ۱۹۶۹ء
۷۹	فکر بلیغ (حصہ اول)	شاد عظیم آبادی	مطبع سلیمانی پٹنہ سٹی
۸۰	فکر بلیغ (حصہ دوم)	ایضاً	نسیم بکڈ پو، لکھنو، اگست ۱۹۸۴ء
۸۱	قیصر التواریخ (جلد اول)	سید کمال الدین حیدر	مطبع نولکشور ۱۸۹۶ء
۸۲	قطب مشتری (وجہی)	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
۸۳	کلیات منیر	منیر شکوہ آبادی	مطبع ثمر ہند لکھنو ۱۲۹۶ھ
۸۴	کلام دبیر اور یوم دبیر	ادارہ یادگار دبیر	سرفراز قومی پریس لکھنو اگست ۱۹۶۵
۸۵	کاشف الحقائق (جلد دوم)	سید امداد امام اثر	کارونیشن پریس لکھنو
۸۶	کربل کتھا	فضل علی فضلی	
		مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد	ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ اکتوبر ۱۹۶۵ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۸۷	گستاخی معاف	سید مرتضیٰ بن سید علی امروہوی ۱۲۹۶ھ	
۸۸	گزشتہ لکھنو (مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)	عبدالحلیم شرر	ناشر عزیز الرحمٰن نسیم بکڈپو یونائیٹڈ پریس لکھنو
۸۹	گل رعنا	مولانا حکیم عبدالحی	مطبع معارف اعظم گڑھ چوتھا ایڈیشن ۱۳۷۰ھ
۹۰	لکھنو کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	نیا ایڈیشن اردو پبلشرز لکھنو نظامی پریس لکھنو ۱۹۷۳ء
۹۱	لکھنو کی تہذیبی میراث	ڈاکٹر صفدر حسین	بارگاہ ادب، حیدر روڈ، اسلام پورہ لاہور، ۱۹۷۵ء
۹۲	محمد حسین آزاد (حصہ اول و دوم)	ڈاکٹر اسلم فرخی	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۵ء
۹۳	مرثیہ میر مونس جلد اول	میر مونس	مطبع نولکشور لکھنو ۱۹۱۲ء
۹۴	موازنہ انیس و دبیر	علامہ شبلی نعمانی	چمن بک ڈپو اردو بازار دہلی
۹۵	منظومات میاں دلگیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	مکتبہ ادبستان ۱۳۱ زسنگھ گڑھ سرینگر مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنو ۱۹۷۰ء
۹۶	میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر	ڈاکٹر اکبر حیدری	مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنو ۷۰ء
۹۷	موازنہ انیس و دبیر	شبلی مقدمہ و حواشی عابد علی عابد	انجمن ترقی ادب لاہور ۶۴ء
۹۸	مراثی دبیر جلد اول		نولکشور پریس لکھنو مارچ ۱۹۳۶ء
۹۹	" " جلد دوم		" " " ۱۹۳۶ء
۱۰۰	مراۃ الشعراء ج ا	محمد یحییٰ تنہا	مطبع عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور
۱۰۱	میر ضمیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	مکتبہ ادبستان ۱۳۱ زسنگھ گڑھ سرینگر ۱۹۷۲ء
۱۰۲	مذہب اور شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۵ء
۱۰۳	معیار و میزان	ڈاکٹر مسیح الزمان	رام نرائن بینی مادھو - الہ آباد دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء

نمبر	کتاب	مصنف	مطبع
۱۰۴	مقیاس الاشعار نام تاریخی ارمغان	مرزا محمد جعفر اوج خلف مرزا دبیر	مطبع جعفری نخاس جدید لکھنو
۱۰۵	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	شیخ محمد ظفر تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ۱۹۴۵ء
۱۰۶	مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر	ڈاکٹر شارب ردولوی	
۱۰۷	معراج المضامین	منیر شکوہ آبادی	مطبع خزینۃ الدرر واقع امام باڑہ غفرانمآب سن تصنیف ۱۲۸۶ھ سن طباعت ۱۲۹۱ھ
۱۰۸	مراثی انیس جلد دوم		
۱۰۹	مراثی انیس جلد سوم		
۱۱۰	" " جلد چہارم		
۱۱۱	" " جلد پنجم		
۱۱۲	" " جلد ششم		
۱۱۳	ماہ کامل	مرتبہ مہذب لکھنوی	سرفراز قومی پریس لکھنو جنوری ۶۱ء
۱۱۴	مطالعہ انیس	ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی	شانتی پریس ۱۲ بینک روڈ الہ آباد جولائی ۱۹۵۶ء
۱۱۵	ناسخ حصہ اول	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی	اردو پبلشرز لکھنو ۱۹۷۵ء
۱۱۶	نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء
۱۱۷	نوائب کربلا		مطبع یوسفی دہلی ۱۹۲۸ء
۱۱۸	نخل ماتم	مرزا جعفر علی فصیح	۱- مطبع حیدری رکاب گنج لکھنو ۱۲۶۲ھ ۲- مطبع جعفری نخاس جدید لکھنو
۱۱۹	نقد غالب	مرتبہ مختار الدین آرزو	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۶ء
۱۲۰	واقعات انیس	مہدی حسن احسن لکھنوی	جدید ایڈیشن اردو پبلشرز ۷۵ء

۱۲۱ ہماری شاعری — سید مسعود حسن رضوی ادیب — رام کمار پریس لکھنو ۱۹۵۹ء

۱۲۲ یادگار انیس — امیر احمد علوی — ہندوستان کتاب گھر لکھنو ۱۹۵۷ء تیسرا ایڈیشن سرفراز پریس لکھنو

123 How not to write a play: Walter Kerr Max Reinhardt London 1956

124 The Art of Dramatic Writing: Lajos Egri, Simon & Schuster New York 1946

125 District Gazettier Lucknow: R.H.Neival 1905

126 Observations on the Mussalmauns: Mrs.Meer Hassan Ali of India, Reprint Idarah-i- Adabiyati Delli 1973, Ist published- London 1832

127 The Technique of Film Editing: Karl Reisz & Gavin Miller ,Focal Press Lòndon & Newyork, 18th Edition 1972

چند تبصرے

زیر نظر مطالعہ عرصۂ دراز سے برسرِ عمل دبیر فراموشی کی محض تلافی نہیں ہے بلکہ مرزا دبیر کے ساتھ مثبت انصاف اور ان کے ادبی مقام کی کامیاب جستجو اور فکر انگیز دریافت ہے۔

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے مستند علمی معیاروں کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیقی دنیا کو اپنی بالغ نظری کا ایک تحفہ دیا ہے۔ انھوں نے گدڑی سے لعل، خاکستر سے چنگاری اور ایک صدی کے گرد و غبار میں دبے یا دبائے ہوئے گوہرِ غلطاں کو برآمد کیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ نہ صرف ان کے حسنِ ذوق، رسائیٔ فکر اور محنتِ شاقہ کی گواہی دیتا ہے بلکہ مرثیہ کی تحقیقی اور تنقیدی تاریخ میں بالعموم اور مرزا دبیر کے سلسلے میں بالخصوص مستقل اہمیت اور معنویت کا حامل رہے گا۔ یقین ہے کہ ان کی یہ سعیِ جمیل مرزا دبیر کے متعلق غفلت سے چونکانے کا باعث ہوگی۔

(پروفیسر) شبیہ الحسن
۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

"انیس و دبیر نے مرثیہ کو جس اوج کمال تک پہونچا دیا اس کی دوسری نظیر دنیائے ادب میں مشکل سے ملے گی۔ ایسا کم ہی ہوا ہے کہ پوری صنف کو دو ہمعصر شعراء نے ایسا نمٹا دیا کہ آئندہ آنے والوں کو شدید آزمائش سے دوچار کردیا۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے دبیر پر قلم اٹھایا ہے اور اس شان سے کہ تحقیق و تنقید کا حق ادا کردیا ہے۔ ان کا کام دبیریات میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اور قدر افزائی کا مستحق ہے۔"

(پروفیسر) گوپی چند نارنگ

مرزا دبیر کی شعری شخصیت پر کئی طرح کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ سب سے پہلا اور بھاری پردہ تو علامہ شبلی کا ''موازنہ انیس و دبیر'' تھا جس میں انھوں نے غیر شعوری طور پر مرزا صاحب کے کلام سے وہی مثالیں تلاش کیں جو بہت چبھتی ہوئی تھیں اور فوراً مشہور ہوسکتی تھیں، چنانچہ وہ مشہور ہوئیں بھی۔ اور لوگوں کے ذہنوں میں مرزا دبیر کی شخصیت کے خط و خال اس قسم کے مصرعوں سے قائم ہوئے ع جیسے مکاں سے زلزلے میں صاحب مکاں اور ع زیرقدم والدہ فردوس بریں ہے۔ پھر ''دبیریوں'' نے دبیر کے دفاع میں جو باتیں کہیں وہ کمزور یا کند ذہن دماغ کی آئینہ دار تھیں۔ ضرورت تھی کہ دبیر کا مطالعہ از سر نو کیا جائے اور ہماری شاعری میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے عہد میں کئی لوگوں نے کوششیں بھی کی ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب تک حیات دبیر کے بھی بہت سے گوشے بے نقاب نہ ہوسکے، نقد دبیر تو بہت دور کی بات ہے۔

محمد زماں آزردہ کی یہ کتاب مطالعات دبیر میں انتہائی نمایاں مقام کی مستحق ہے۔ انھوں نے دبیر کے سوانح حیات میں بہت سی نئی باتیں کہی ہیں اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے دبیر کے اصلی اور الحاقی کلام پر بھی کئی اہم اشارے کیے ہیں۔ دبیر کے غیر مطبوعہ اور گمنام کلام (مثلاً ان کی غزلوں) کی نشاندہی میں انھوں نے تلاش اور تفحص سے کام لیا ہے۔ تنقیدی حصہ اگرچہ نسبتہً کم ہے لیکن اس میں بھی ارباب نظر کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب اردو ادب کے طالب علموں اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں کارآمد ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

۹ دسمبر ۱۹۸۱ء

مولانا شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" ایسے انداز سے لکھی تھی کہ میر انیس کے کمالات پر تنقید کی نگاہیں مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ موازنے کے جواب میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن ان تحریروں کی حیثیت ایسی جوابی تحریروں کی رہی جن میں دیر تک زندہ رہنے کی سکت نہیں ہوتی، جوابی تحریریں یوں بھی عموماً ایسی طرفداری سے معمور ہوتی ہیں کہ سخن فہمی کے لیے گنجائش گویا نہیں رہتی۔

پچھلے دس بارہ برسوں میں میرزا دبیر کے حالات زندگی کی طرف کچھ زیادہ توجہ کی گئی ہے اور ضمنی طور پر ان کا کلام بھی معرض بحث میں آیا ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ تنقیدی حیثیت سے مرزا انیس اور مرزا دبیر کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا تھا لیکن حالات زندگی کے متعلق اس قدر توجہ نہیں کی گئی تھی اور یہ بڑی ناکامی تھی اور اس ناتمامی کا کفارہ اب ہمارے بعض اہل قلم ادا کر رہے ہیں۔ مرزا محمد زماں آزردہ نے بڑی ہمت اور جرات کا ثبوت دیا کہ مرزا دبیر کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا اور اس سے زیادہ ہوشمندی کا ثبوت یوں دیا کہ اپنے مقالے کو اس طرح نہیں لکھا جس طرح تحقیقی مقالے عموماً آج کل لکھے جاتے ہیں۔ دل لگا کر اور نظر جما کر ان سب تحریروں کا مطالعہ کیا جو اب تک اس سلسلہ میں لکھی جا چکی تھیں اور پھر یہ کوشش کی کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو جانچا پرکھا جائے اور امکان کی حد تک اس پر اضافے کیے جائیں۔ اس کا خیال رکھا کہ مرزا صاحب کو موضوع تحقیق بنایا جائے ممدوح نہ قرار دیا جائے اور بعض اعتراضات کے جوابات کے ذیل میں وہ انداز اختیار نہ کیا جائے جس نے اکثر جوابی تحریروں کو تنقیدی متانت اور وقار سے محروم رکھا ہے۔ میں نے ان کے مقالے کو جب پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ عام انداز کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ نہیں یہ تو ایک مستقل کتاب ہے جو کسی شخص نے اپنے شوق سے لکھی ہے اور اس لیے لکھی ہے کہ مرزا دبیر کے سلسلہ میں واقعات اور حقائق کا پتہ لگایا جائے۔ بہت جی خوش ہوا تھا اس کتاب کو پڑھ کر۔ اب مرزا آزردہ نے مطلع کیا کہ وہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے ہیں، مکمل نظر ثانی کے ساتھ اور بہت سے اضافوں کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتاب کے چھپ جانے کے بعد وہ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئے بلکہ ایک سچے طالب علم کی طرح دوسروں کی تحریروں کو پڑھتے رہے اور اپنی تحریروں کا جائزہ بھی لیتے رہے اور کوشش کرتے رہے کہ خوب سے خوب تر کی جستجو والی روایت برقرار رہے۔ اسی

ایک بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے محض ڈگری لینے کی خاطر یہ کام نہیں کیا تھا۔ مقصد تھا تلاش اور تفحص، حقائق کی بازیافت اور واقعات کی ایسی ترتیب جس سے مرقع کی تعمیل ہوسکے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نقش ثانی ہمارے علم میں اضافے کا ذریعہ بنے گا اور مرزا دبیر سے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوسکیں گی۔ یہ بھی توقع ہے کہ پہلی اشاعت میں جو بعض ذرا تیز تعریفی جملے ان کے قلم سے نکل گئے ہیں وہ نظر ثانی میں سانچے میں ڈھل جائیں گے اور بعض بیانات جو ناتمام سے معلوم ہوتے تھے وہ اب مکمل صورت میں سامنے آجائیں گے۔ میں مرزا آزردہ کو مبارک باد دیتا ہوں اس تصنیف پر کیونکہ اس سے دبیر فہمی کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور توقع کرتا ہوں دل لگاکر کام کرنے کا جذبہ ان کے یہاں اسی طرح کارفرما رہے گا اور ہماری دانش گاہوں کے تحقیقی کاموں کے متعلق جو بدظنی اب عام ہوتی جارہی ہے یہ کتاب اس کو کچھ کم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

رشید حسن خاں

۱۷ستمبر۱۹۸۴ء

مرزا سلامت علی دبیر بلاشبہ اردو کے عظیم شاعر تھے، جنھوں نے صنف مرثیہ کو ادبی وقار بخشا۔ ان کا نام میر انیس کے ساتھ لیا جاتا ہے اور یہ دونوں شاعروں کے حق میں اچھا نہیں ہوا خصوصاً مرزا دبیر کو اس صورت حال نے بے انصافی اور عدم مفاہمت کا شکار بنایا۔ مرزا دبیر کے فن کا جائزہ لینے والوں نے یا تو ان کے کلام کی کمزوریوں پر زیادہ نظر رکھی یا انھیں انیس ہی کی طرح کا شاعر ثابت کر دینے پر زور قلم صرف کیا۔ ضرورت اس کی تھی کہ مرزا دبیر کا قائم بالذات مطالعہ کیا جائے اور ان کی انفرادی حیثیت کو نمایاں کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مرزا دبیر اور ان کے فن کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس موضوع پر انھوں نے جو محنت اور تلاش و تدقیق کی اسی کا ثمرہ ''مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

مرزا دبیر کے حالات میں افضل حسین ثابت کی کتاب ''حیات دبیر'' ابھی تک حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد کے لکھنے والے اس کتاب میں پیش کی جانے والی معلومات پر کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے اور زیادہ تر اسی سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ ڈاکٹر زماں آزردہ نے ''حیات دبیر'' کے علاوہ دوسرے بہت سے ماخذوں اور دستاویزات کی مدد سے مرزا دبیر کی ایک مربوط سوانح عمری تیار کی اور اس موضوع پر تحقیقات کو ثابت کی کتاب سے آگے بڑھایا۔ اس سلسلہ میں ان کی جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا صحیح اندازہ تو وہ خود ہی کر سکتے ہیں لیکن کتاب کی تکمیل کے دوران جب وہ لکھنو آتے تھے تو میں دیکھتا تھا کہ وہ ایک سچے طالبعلم کی طرح اپنے موضوع کے کسی گوشہ سے سرسری گزرنا نہیں چاہتے اور ہر بات پورے وثوق کے ساتھ معلوم کر کے لکھنا چاہتے ہیں۔

کلام دبیر کے تنقیدی جائزے میں انھوں نے صحیح طریق کار اختیار کیا ہے اور دبیر کے فن کو دبیر ہی کے فن کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس ضمن میں میر انیس اور دوسرے شاعروں کا ذکر انہیں موقعوں پر کیا ہے جہاں مباحث کی وضاحت کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ ادبی حلقوں میں ڈاکٹر زماں آزردہ کی اس کتاب کا گرمجوشی سے خیر مقدم ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ یہ کتاب سلسلۂ دبیریات کی اہم ترین کڑیوں میں سے ہے اور اس نے مرزا دبیر کا وہ قرض جو ہم سب پر تھا بڑی حد تک ادا کر دیا ہے۔

(ڈاکٹر) نیر مسعود

ڈاکٹر زماں آزردہ کشمیری کی کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر'' کے نقش ثانی کا مسودہ پیش نظر ہے۔ کتاب انشاء اللہ امروز و فردا میں سب شائقین علم و ادب کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اس سے کتاب کی افادیت اور مقبولیت ظاہر ہوتی ہے۔ خود موصوف ایک ذی علم، وسیع المطالعہ اور وسیع القلب دانشور ہیں۔ لکھنوی نہ ہونے کے باوجود یہاں کی ادبی شخصیات اور تہذیبی روایات کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرثیہ اور مرثیہ گو کا مقصد جتنا واضح ہے اتنی ہی اس سلسلہ میں غلط فہمیاں اور الجھنیں پیدا کردی گئی ہیں اس کی ایک واضح مثال مرزا دبیر ایک ایسے باکمال شاعر کے جوہر سخن سے بے اعتنائی ہے۔ اپنی کم علمی اور دانشورانہ لاپرواہی کے نتیجے میں لوگ مرزا دبیر کے نام اور کلام دونوں سے بہت دور ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں شبلی کی مشہور کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' سے ہی لوگوں نے مرزا دبیر کے مدارج کو کم کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ڈاکٹر ظہیر فتحپوری لاہور مرتب کتاب ''منتخب مراثی دبیر'' کے الفاظ میں ''جب میر انیس اپنی مختصر سی بیاض لے کر لکھنو پہنچے تو دبیر اس وقت مرثیہ کی روایت کو پختگی دے چکے تھے۔۔۔''

مرزا دبیر کے کمال کو پرکھنے کے سلسلے میں جناب آزردہ نے ہمدردانہ مگر منصفانہ انداز اختیار کیا ہے اور یہ کہیں نہیں ظاہر ہونے دیا ہے کہ مرزا دبیر سے عقیدت ہونے کے باوجود انھوں نے حقیقت کو نظر انداز کیا ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی بہت متوازن ہے۔ ڈاکٹر آزردہ کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ انھوں نے مرزا دبیر کو پھر سے پورے طور پر متعارف Re-introduce کرانے کا مشکل کام بڑی خوبی سے انجام دے ڈالا ہے۔

اس کام کے لیے انھوں نے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور دو نئے ابواب مرزا دبیر کی نثر نگاری — موازنہ انیس و دبیر کا علمی تجزیہ — کا خاص طور پر اضافہ کیا۔ اس حصہ پر ڈاکٹر صاحب نے بہت محنت کی ہے اور پہلی بار مرزا دبیر کے نثری کارناموں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابھی تک اس موضوع پر ہندوستان اور پاکستان میں بھرپور کام نہیں ہوا ہے۔ لوگ مرزا دبیر کی نثری تحریر ''ابواب المصائب'' کے شاید نام سے بھی ناواقف ہوں۔ یہی نہیں ڈاکٹر آزردہ نے ایک اور باکمال مرثیہ گو مرزا فصیح کی نثری تحریر ''نخل ماتم'' کا پتہ لگا کر دونوں نثری شہ پاروں کا تقابلی مطالعہ ہمارے سامنے پیش کیا

ہے۔ مجھے امید ہے کہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کے اس کارنامے کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

ایک بالغ نظر دانشور ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ اب تک علمی ادبی حلقوں میں کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کے اثرات پورے طور پر حاوی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں دستیاب تمام ماخذات کو یکجا کر کے مرزا دبیر کو ان کا صحیح مقام دلانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

مجھے امید ہے کہ کتاب کا موجودہ اڈیشن پہلے ایڈیشن سے بہت زیادہ لوگوں میں مقبول ہوگا اور مرثیہ پر کام کرنے والے طالب علموں کے لیے رہبری کا کام انجام دے گا۔

(سید) محمد رشید

کشمیر میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کا کارواں صاحب نظر مسافروں کی بڑی تعداد پر مشتمل ہے اور کشمیر کے مخصوص حالات کو دیکھتے ہوئے یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ کارواں تیز گام بھی ہے اور خوش خرام بھی۔ اسی قافلے کے ممتاز راہی ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ بھی ہیں۔

میں ڈاکٹر آزردہ کو ''ممتاز'' اس لیے کہتا ہوں کہ ان کے پاس کچے مال کا اتھاہ ذخیرہ نہ ہو لیکن جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں وہ بہت ٹھوس اور مستحکم اور جس طرح پیش کر سکتے ہیں وہ انداز نہایت پرکشش اور دلکش ہوتا ہے۔

مرزا سلامت علی دبیر کی نسبت ہمارے بیشتر ارباب نظر کی رائے یہ ہے کہ ان پر جتنا اور جیسا کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا دبیر کو مرحوم افضل حسین ثابت کی طرح کا قریب العہد سوانح کار اور نقد نگار میسر ہوا جو ان کے کسی معاصر کو نہیں مل سکا تھا۔ حیات دبیر کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی متاع تحقیق منظر عام پر آئی لیکن ڈاکٹر آزردہ کی جستجو، چھان بین اور انداز پیش کش کی توقیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب دبیر پر ان کے کام کو ان کے پیشرووں کی پیش کش کے تناظر میں دیکھا جائے۔

سبط محمد نقوی

(چودھری سید سبط محمد نقوی)

ادھر ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۴ء تک گذشتہ بیس برس کے عرصہ میں ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں دبیر شناسی کی جو سازگار فضا تیار ہوئی ہے اسے دبیر فہمی کی تاریخ کا ایک خوش آئند اور یادگار دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ دبیر شناسی کے لیے اس سازگار فضا کو تعمیر کرنے میں جن اہل قلم نے قابل ذکر کام کیا ہے ان میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا نام بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر آزردہ کی کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' دسمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکی ہے۔ یہ خبر میرے لیے باعث مسرت ہے کہ اب مفید اضافوں کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آرہا ہے۔

مطالعۂ دبیر کے سلسلے میں ڈاکٹر آزردہ کی کتاب ایک ایسے ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں دبیر کے متعدد ادبی آثار پہلی بار منظر عام پر لائے گئے تھے۔ اس میں مستند مآخذ سے دبیر کے حالات کو جمع کرکے ان کا معروضی تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ کتاب میں دبیر کے تمام اہم ادبی اکتسابات کا احاطہ کرکے ان پر تنقید کی گئی ہے اور ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ آخری باب میں مرزا دبیر کے ادبی مرتبے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں ڈاکٹر آزردہ نے دبیر پر تنقید کرنے میں توازن کو برقرار رکھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اپنے ان تمام مثبت پہلوؤں کی بنیاد پر یہ کتاب مطالعۂ دبیر میں مفید و معاون ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں اس کی جدید اشاعت بھی مقبول ہوگی۔

کاظم علی خاں

اردو تحقیق و تنقید کی دنیا میں بعض کارنامے اپنے موضوع کی مناسبت سے اور بعض اپنے مواد کی بنیاد پر اہمیت رکھتے ہیں لیکن ایسے تحقیقی کارنامے چند ہی نظر آتے ہیں جن میں تحقیق کے تقاضوں کو بھی پوری طرح برتا گیا ہو اور اپنے موضوع کی وضاحت کے لیے نہایت باریک نکات کی تلاش وجستجو کر کے ایسے علمی انداز میں پیش کیا گیا ہو کہ ہر صاحب ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم ہو جائے اور فنکار کی قدر و قیمت کا تعین بھی پوری طرح ہو جائے۔ چنانچہ ادھر چند برسوں میں جو تحقیقی کام سامنے آئے ان میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کی کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے'' ہر لحاظ سے امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کام کی کاوش کے سلسلے میں جب قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لکھنو سے دور رہ کر کشمیر کی حسین وادیوں میں کوئی محقق اتنے سنگلاخ اور دقیق موضوع کی تحقیق کے سلسلے میں انصاف کرسکتا ہے تو اس کے مطالعے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا دبیر سے عقیدت اور ان کی علمیت سے اعتراف کے باوجود لکھنو یا اودھ میں کوئی محقق اتنی جامعیت سے ان نکتوں کی طرف توجہ نہ دے سکا جو ڈاکٹر زماں نے پیش کردیا۔ یہ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کا مطالعہ رہا ہو یا شاعرانہ سرمایہ کی فراہمی میں کوتاہی، بہر حال اردو ادب کی بدقسمتی تھی کہ اس سے پہلے مرزا دبیر کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی تھی اور ڈاکٹر زماں کی یہ کاوش اس لیے اور بھی قابل قدر ہے کہ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود ان کی یہ کوشش جامع، ہمدردانہ اور فکر انگیز ہے۔ انھوں نے کوشش اور کاوش سے نہ صرف مرزا دبیر کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے متعلق بہت سے پیچیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے بلکہ ان کی تخلیقات کے سبھی اہم پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے خاص کر مرزا دبیر کی نثری تصنیفات اور ''ابواب المصائب'' کا تفصیلی تجزیہ مرزا دبیر کے مطالعہ میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کتاب نہ صرف اردو تحقیق و تنقید میں ایک قابل قدر تصنیف ہے بلکہ اس سے جدید اردو تحقیق کے وقار میں غیر معمولی اضافہ بھی ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر صاحب علم و ذوق اس ادبی کارنامے کے لیے انہیں مبارکباد دے گا۔

سید محمود الحسن

"آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے اور جہاں تک جستہ جستہ دیکھ سکا ہوں تحقیقی اعتبار سے کام سیر حاصل ہے۔ دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی کی بحث اچھی ہے۔"

پروفیسر گیان چند

"کتاب پڑھ کر دبیر کی قادر الکلامی، تخیل کی بلند پردازی اور ہمہ گیری مزاج، شخصیت، کردار کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کی بنا پر اب یہ خواہش ہو رہی ہے کہ ان کے پورے مراثی مل سکیں تو پڑھ کر دیکھا جائے۔ آپ نے دبیر کے کلام سے جتنی مثالیں دی ہیں ان سے خود آپ کی خوش ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر وحید اختر

"ڈاکٹر آزردہ کی تحقیقی کاوشیں اس لیے بھی داد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے محض پہلے سے موجود مواد سے استفادہ کرنے یا ان کی از سرِ نو ترتیب پر اکتفا کرنے کے بجائے بہت ساری غیر مطبوعہ تحریروں تک بھی رسائی حاصل کی ہے اور مختلف چیزوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد خود اپنے طور پر نتائج اخذ کیے ہیں۔"

فضیل جعفری۔ بلٹز، بمبئی، ۱۲ فروری ۱۹۸۲ء

"مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے" تحقیق اور تجزیہ کا جو معیار سامنے لاتی ہے وہ غیر معمولی جستجو، محنت شاقہ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ کہ اس میں دبیر کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے کسی دوسرے مصنف یا شاعر کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی ہے۔"

ڈاکٹر الیاس عشقی پاکستان

ہماری زبان دہلی ۸ جون ۱۹۸۲ء

'' مصنف نے واقعات اور حالات کو حاصل کرنے اور ان کی صحت کو جانچنے میں کافی محنت سے کام کیا ہے۔ متن کتاب کے علاوہ مصنف نے حواشی میں بھی کافی معلومات فراہم کی ہیں اور اس سے کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔''

میر غلام رسول نازکی
ریڈیو کشمیر سرینگر

'' ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے جس تحقیق و تدقیق سے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، ادب اردو میں اس کے اضافوں سے آنے والے محقق ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں گے۔''

کسریٰ منہاس
رضا کار، لاہور ۱۲/۸ اگست ۱۹۸۲ء

''مصنف نے اس تحقیقی مقالہ پر اپنی محنتوں اور مشقتوں کی مہر لگائی ہے۔ شعر و ادب کا طالب علم اس سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔''

عاطر ہاشمی
نوائے وقت پاکستان، ۱۴ مئی ۱۹۸۲ء

''مرزا سلامت علی دبیر، نہ صرف دیدہ زیب ہے بلکہ معلومات سے بھرپور اور معیاری تخلیق ہے اور تحقیق کا مکمل و مبسوط نمونہ، اتنا سیر حاصل مقالہ مشکل سے ہی نظر نواز ہوتا ہے۔''

خواجہ عبدالغفور

اشاریہ

الف

ب

ث

ج

چ

ح

ذ

ر

ش

ط

ظ

ع

غ

ق

ک

گ

ل

م